جولائی 2014

خواتین اور دوشیزاؤں کے لیے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

کہنی ونتی — مدیر — 14

کرن کرن روشنی — ادارہ — 15

ہمارے نام — نادرہ خاتون — 272



ہم نے بھی فلم دیکھی — انشاء جی — 20



میری ڈائری سے — امت الصبور — 266



سلمیٰ حسن — شاہین رشید — 268



ظفر معراج — شاہین رشید — 27

نیکیوں کا موسم بہار — امت الصبور — 22

خامشی کو زباں ملے — ادارہ — 33



کوہ گراں تھے ہم — عنیزہ سید — 234

بن مانگی دعا — عفت سحر طاہر — 36



عہد الست — تنزیلہ ریاض — 118

نمل — نمرہ احمد — 182

گمان — صائمہ بشیر — 66



جھوک دیپ — ایمل رضا — 156



ادھوری داستان — سائرہ رضا — 106

جوابِ جاہلاں — راشدہ رفعت — 56

مہمان — قانتہ رابعہ — 62

چاند سا مکھڑا — آسیہ مقصود — 226

طعنہ — کنیز نبوی — 256



غزل — جعفر شیرازی — 260

غزل — خلیل صدیقی — 260

نظم — جمیل عظیم آبادی — 261

غزل — اعتبار ساجد — 261





رنگارنگ سلسلہ ، شگفتہ جاہ 262
خبریں ویریں ، واصفہ سہیل 280



آپ کی بیاض سے ، خالدہ جیلانی 265



آپ کا باورچی خانہ ، حمیرا رضا 283
عید منائیں ہمارے ساتھ ، صبا سحر 285



نفسیاتی ازدواجی الجھنیں ، عدنان 288



بیوٹی بکس کے مشورے ، امت الصبور 290

جولائی 2014
جلد 42 شمارہ 3
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیر

کہی ان کہی

خواتین ڈائجسٹ کا جولائی کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

رمضان المبارک کے بابرکت مہینے کا آغاز ہوچکا ہے۔ آپ سب کو ماہ صیام کی مبارک باد۔ اس مہینے میں عبادت و ریاضت میں اضافے کے ساتھ ساتھ اپنی حیثیت و استطاعت کے مطابق سحر و افطار میں بھی زیادہ سے زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ دوسروں کا روزہ افطار کرا کے ثواب حاصل کرتے ہیں۔

افسوس ایسے وقت میں ہمارے ملک کے ایک حصے میں لاکھوں افراد ایک کٹھن ترین آزمائش سے دوچار ہیں۔ وہ جنگ جو ہماری نہ تھی، ہم اس کا حصہ بنے یا بنا دیے گئے۔ اس کی آگ ہمارے گھروں تک آپہنچی ہے۔

عسکری قیادت نے فوجی آپریشن کا اعلان کر دیا ہے۔ شمالی وزیرستان میں بمباری جاری ہے۔ اچانک کسی پیشگی اطلاع اور منصوبہ بندی کے بغیر وہاں رہنے والے لوگوں کو اپنے گھروں سے انخلا کا حکم دے دیا گیا ہے۔ وہ اپنی عمر بھر کی پونجی، مال مویشی، گھر بار چھوڑ کر نقل مکانی پر مجبور ہو گئے ہیں۔

لاکھوں افراد کی نقل مکانی جن میں باپردہ خواتین، پھول سے بچے، معذور، بیمار بوڑھے شامل ہیں۔ بہت بڑا انسانی المیہ ہے۔

یہ دربدر، بے سروساماں لوگ گاڑیوں کی عدم دستیابی کی بنا پر کئی کئی میل پیدل چل کر محفوظ مقامات تک پہنچ رہے ہیں۔ کھانا تو کیا، انہیں پینے کے لیے پانی بھی مہیا نہیں ہے۔ متعدد بچے لو لگنے اور پانی کی کمی کی وجہ سے بیمار ہو گئے ہیں۔

یہ دربدر، بے سروسامان، آفت زدہ لوگ پاکستانی ہیں، مسلمان ہیں۔ اس سرزمین پر ان کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا ہمارا اور آپ کا ہے لیکن اس وقت ان پر زمین تنگ ہو گئی ہے۔ مشکل کی اس گھڑی میں ان کا ساتھ دیں، ان کی مدد کریں۔ جتنی بھی استطاعت ہو، جو بھی ممکن ہو۔ اللہ تعالیٰ نیتوں کو دیکھتا ہے۔ ممکن ہے آپ کا چھوٹا سا عطیہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں اجر عظیم کا مستحق ٹھہرے۔

ناولٹ نمبر،

اگست کا شمارہ حسب روایت ناولٹ نمبر ہوگا۔ یہ عید سے پہلے آئے گا۔ اس لیے اس میں عید کے حوالے سے بھی تحریریں اور سلسلے شامل ہوں گے۔

اس شمارے میں،

- نیکیوں کا موسم بہار۔ رمضان المبارک کے حوالے سے خصوصی سروے،
- تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول۔ عہد الست، ، نمرہ احمد کا مکمل ناول۔ نمل،
- صائمہ بشیر کا مکمل ناول۔ گمان، ، ایمل رضا کا ناولٹ۔ جھوک دیپ،
- سائرہ رضا، راشدہ رفعت، فانتہ رابعہ، آسیہ مقصود اور کنیز نبوی کے افسانے،
- معروف ڈراما نگار اور شاعر ظفر معراج سے ملاقات،
- ٹی وی فنکارہ سلمیٰ حسن سے باتیں، ، خامشی کو بیاں ملے۔ قارئین سے تعارف کا سلسلہ،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے۔ اس لیے، ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ، ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

نماز تسبیح

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا۔

"اے چچا جان عباس! کیا میں آپ کو کچھ عطا نہ کروں؟ کیا آپ کو کچھ عنایت نہ کروں؟ کیا میں آپ کو کوئی تحفہ پیش نہ کروں؟ کیا میں آپ کو (درج ذیل عمل کی وجہ سے) دس اچھی خصلتوں والا نہ بنا دوں؟ کہ جب آپ یہ عمل کریں تو اللہ ذوالجلال آپ کے اگلے پچھلے نئے پرانے، انجانے میں اور جان بوجھ کر کیے گئے تمام چھوٹے بڑے پوشیدہ اور ظاہر گناہ معاف فرمادے۔"

آپ چار رکعات نفل اس طرح ادا کریں کہ ہر رکعت میں سورہ فاتحہ اور کوئی دوسری سورت پڑھیں۔ جب آپ اس قرات سے فارغ ہو جائیں تو قیام ہی کی حالت میں یہ کلمات پندرہ بار پڑھیں۔

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ

پھر آپ رکوع میں جائیں۔ (تسبیحات رکوع سے فارغ ہو کر) رکوع میں ان ہی کلمات کو دس بار دہرائیں۔

پھر آپ رکوع سے اٹھ جائیں اور (سمع اللہ لمن حمدہ وغیرہ سے فارغ ہو کر) دس بار یہی کلمات پڑھیں۔

پھر سجدے میں جائیں اور (سجدے کی تسبیحات اور دعائیں پڑھنے کے بعد) یہی کلمات دس بار پڑھیں۔

پھر سجدے سے سر اٹھائیں اور (اس جلسے میں جو دعائیں ہیں، وہ پڑھ کر) دس بار یہی کلمات دہرائیں۔

پھر (دوسرے) سجدے میں چلے جائیں۔ (پہلے سجدے کی طرح) دس بار پھر یہی تسبیح ادا کریں۔

پھر سجدے سے سر اٹھائیں (اور جلسہ استراحت میں کچھ اور پڑھے بغیر) دس بار اس تسبیح کو دہرائیں۔ یوں ایک رکعت میں کل پچھتر تسبیحات مکمل ہو جائیں گی۔ اسی طرح چاروں رکعات میں یہ عمل دہرائیں۔

اگر آپ طاقت رکھتے ہوں تو نماز تسبیح روزانہ ایک بار پڑھیں۔ اگر آپ ایسا نہ کر سکتے ہوں تو ہر جمعے میں ایک بار پڑھیں' یہ بھی نہ کر سکتے ہوں تو ہر مہینے میں ایک بار پڑھیں۔

یہ بھی نہ کر سکیں تو سال میں ایک بار۔ اگر آپ سال میں بھی ایک بار ایسا نہ کر سکتے ہوں تو زندگی میں ایک بار ضرور پڑھیں۔

فوائد و مسائل

1 اہل دنیا کو ہفتہ کی مدت معلوم ہے' مسلمانوں کے ہاں جمعہ سے' یہودیوں کے ہاں ہفتہ سے اور عیسائیوں کے ہاں اتوار کے دن سے اس مدت کا آغاز ہوتا ہے۔ جس طرح "ہفتہ" ایک خاص دن کا نام ہے اور اس سات دنوں کی مدت کو بھی ہفتہ کہتے ہیں۔ اسی طرح "جمعہ" بھی ایک خاص دن کا نام ہے اور اس سات دنوں کی مدت کو بھی "جمعہ" کہتے ہیں۔ عربی میں اس مدت کو "اسبوع" بھی کہتے ہیں۔ مذکورہ حدیث کا منشا یہ نہیں ہے کہ نماز تسبیح ہر جمعہ کے دن پڑھو' بلکہ مقصد یہ ہے کہ پورے سات دنوں کی مدت میں کسی وقت بھی پڑھ لو' چنانچہ صرف جمعے کا دن نماز تسبیح کے لیے خاص کرنا صحیح نہیں۔

2۔ "یاد رہے کہ اس حدیث شریف میں نماز تسبیح باجماعت ادا کرنے کا ذکر نہیں ہے۔ صرف انفرادی عمل کے طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا جان کو اس کی ترغیب دی ہے۔ لہٰذا جو مسلمان نماز تسبیح ادا کرنا چاہے' اسے چاہیے کہ پہلے نماز تسبیح کا طریقہ سیکھے۔ پھر اسے تنہائی میں اکیلا پڑھے اور یہ رویہ بھی انتہائی مہلک ہے کہ بندہ فرض نمازوں پر تو توجہ نہ دے' مگر نماز تسبیح (باجماعت) ادا کرنے کے لیے ہمہ وقت بے تاب رہے۔ لہٰذا فرض نمازوں کے تارک کو پہلے سچی توبہ کرنی چاہیے اور فرض نمازوں کی مکمل حفاظت کرنی چاہیے' پھر وہ نماز تسبیح پڑھے تو اسے یقیناً "فائدہ ہوگا۔ ان شاء اللہ العزیز۔ (ع ر)

3۔ نماز تسبیح میں تسبیحات' تشہد میں التحیات سے پہلے پڑھیں۔ بخلاف دوسرے ارکان کے۔

4۔ نماز تسبیح کے بعد پڑھی جانے والی دعا کی سند سخت ضعیف ہے۔ اس کے راوی عبدالقدوس بن حبیب کو حافظ ہیثمی نے متروک اور عبداللہ بن مبارک نے کذاب کہا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روزوں کا بیان

حضرت ابو سلمہ رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا۔ میں نے حضرت عائشہؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روزوں کے بارے میں سوال کیا تو ام المومنینؓ نے فرمایا۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم روزے رکھتے تھے' حتیٰ کہ ہم کہتے کہ اب تو آپ روزے ہی رکھتے جائیں گے۔ اور روزے چھوڑتے تو ہم کہتے کہ اب تو آپ نے روزے چھوڑ ہی دیے ہیں۔ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی شعبان سے زیادہ کسی مہینے میں روزے رکھتے نہیں دیکھا۔ آپ چند دن کے سوا ماہ شعبان کے (سارے) روزے رکھ لیتے تھے۔"

فوائد

1۔ نفلی روزے مسلسل رکھنا بھی جائز ہے' جبکہ ہر روز افطار کیا جائے' یعنی وصال نہ کیا جائے' کیونکہ وہ ہمارے لیے ممنوع ہے۔

2۔ نفلی روزے سال کے ہر مہینے میں رکھے جا سکتے ہیں۔

3۔ مسلسل ایک مہینہ نفلی روزے رکھنا خلاف سنت ہے۔

4۔ ماہ شعبان میں نفلی روزوں کا اہتمام زیادہ ہونا چاہیے۔

5۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مسلسل) روزے رکھتے تھے' حتیٰ کہ ہم کہتے' آپ افطار نہیں کریں گے۔ اور افطار کرتے حتیٰ کہ ہم کہتے' آپ روزے نہیں رکھیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب سے مدینہ تشریف لائے' آپ نے رمضان کے سوا کبھی مسلسل ایک مہینہ روزے نہیں رکھے۔

6۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے' انہوں نے کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اللہ کو سب سے زیادہ محبوب روزہ داؤد علیہ السلام والا روزہ ہے۔ آپ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن چھوڑتے تھے اور اللہ کو سب سے زیادہ جو نماز پسند ہے وہ داؤد علیہ السلام کی نماز ہے۔ آپ آدھی رات تک سوتے اور تہائی رات میں نماز پڑھتے اور رات کا چھٹا حصہ سوئے رہتے۔"

فوائد

1۔ نفلی عبادات کی مقدار کم و بیش ہو سکتی ہے۔ آدمی چاہے تو زیادہ نوافل ادا کرے' چاہے کم رکعتیں پڑھ لے۔ اس طرح چاہے زیادہ روزے رکھے' چاہے کم رکھ لے' البتہ ان امور سے اجتناب کرے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

2۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے انداز پر نفلی روزے رکھنا سب سے افضل ہے۔ اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اس سے زیادہ نفلی روزے رکھنے سے ثواب کم ہو جائے گا۔

3۔ حضرت داؤد علیہ السلام والے روزے اس لیے افضل ہیں کہ اس طریقے سے انسان کو جسم کا' اہل و عیال کا اور دوسرے لوگوں کا وہ حق ادا کرنے کا بھی موقع مل جاتا ہے' جو ہمیشہ روزے رکھنے کی صورت میں ادا نہیں کیا جا سکتا اور اللہ کی عبادت کر کے ثواب بھی حاصل ہو جاتا ہے اور ایک لحاظ سے یہ دائمی عمل بھی بن جاتا ہے۔ جو اللہ کو پسند ہے۔

4۔ نماز تہجد رات کے کسی بھی حصے میں ادا کی جا سکتی ہے' تاہم مذکورہ بالا صورت افضل ہے' کیونکہ اس میں بھی جسم کے حق اور اللہ کے حق کا ایک خوب صورت توازن موجود ہے۔

5۔ داؤد علیہ السلام والی نماز کی صورت یہ ہے' مثلاً "ایک رات بارہ گھنٹے کی ہو تو اس میں چھ گھنٹے آرام کیا جائے' پھر اٹھ کر چار گھنٹے نماز تہجد اور عبادت میں گزارے جائیں' پھر دو گھنٹے تک آرام کر لیا جائے۔

شوال کے چھ روزے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس شخص نے عیدالفطر کے بعد چھ روزے رکھے اس کے پورے سال کے روزے ہو گئے۔ جو شخص نیکی کرے' اس کے لیے اس کا دس گنا ثواب ہے۔"

روزہ رکھنے کی فضیلت

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "یوں تو بنی آدم کا ہر عمل اس کے لیے ہے' سوائے روزے کے کہ وہ خاص میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا اور روزہ (گناہوں سے) سپر (ڈھال) ہے پھر جب کسی کا روزہ ہو تو اس دن گالیاں نہ بکے اور آواز بلند نہ کرے پھر اگر کوئی اسے گالی دے یا لڑنے کو آئے تو کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں۔ اور قسم ہے اس پروردگار کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان اس کے ہاتھ میں ہے کہ بے شک روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے آگے قیامت کے دن مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ اور روزہ دار کو دو خوشیاں ملتی ہیں جن سے وہ خوش ہوتا ہے۔ ایک تو وہ اپنے افطار سے خوش ہوتا ہے اور دوسرا

وہ اس وقت خوش ہوگا جب وہ اپنے روزے کے سبب اپنے پروردگار سے ملے گا۔"

ماہِ رمضان کی فضیلت

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔

"جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور شیاطین زنجیروں میں کس (باندھ) دیے جاتے ہیں۔"

ماہ رمضان سے پہلے ایک دو روزے نہ رکھو

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔

"رمضان سے پیشگی ایک دو روزے مت رکھو، سوائے اس شخص کے جو ہمیشہ ایک مقررہ دن میں روزہ رکھ رہا تھا اور وہی دن آگیا تو وہ اپنے مقررہ دن میں روزہ رکھ لے۔ (مثلاً "جمعرات اور جمعہ کو روزہ رکھتا تھا اور انتیس اور تیس تاریخ میں شعبان کے وہی دن آگئے تو روزہ رکھ لے۔)"

روزہ چاند دیکھنے پر ہے

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے چاند کا ذکر فرمایا اور فرمایا۔

"جب تم چاند دیکھو تو روزہ رکھو اور جب تم اس کو دیکھو، تب ہی افطار کرو پھر اگر بادل آجائیں تو تیس روزے پورے رکھ لو (اس کے بعد عید کرو)۔"

بے شک اللہ نے اسے لمبا کردیا ہے

"سیدنا ابو البختری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم عمرہ کو نکلے اور جب (مقام) نخلہ کے درمیان میں پہنچے تو سب نے چاند دیکھنا شروع کردیا اور بعضوں نے دیکھ کر کہا کہ یہ تین رات کا چاند ہے (یعنی بڑا ہونے کی وجہ سے) اور بعضوں نے کہا کہ دو رات کا ہے پھر ہم سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملے اور ان سے ذکر کیا کہ ہم نے چاند کو دیکھا اور کسی نے کہا کہ تین رات کا ہے اور کسی نے کہا، دو رات کا ہے، تب انہوں نے پوچھا کہ تم نے کون سی رات میں دیکھا؟ تو ہم نے کہا کہ فلاں فلاں رات میں انہوں نے کہا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔"

"اللہ تعالیٰ نے اس کو دیکھنے کے لیے بڑھا دیا اور وہ اسی رات کا تھا جس رات تم نے دیکھا۔"

ہر شہر (ملک) کے لیے ان لوگوں کی رؤیت

کریب کہتے ہیں کہ سیدہ ام فضل بنت حارث رضی اللہ عنہا نے انہیں سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس (ملک) شام بھیجا۔ انہوں نے کہا کہ میں شام گیا اور ان کا کام کردیا اور میں نے جمعہ (یعنی پنجشنبہ) کی شب کو رمضان کا چاند دیکھا پھر مہینے کے آخر میں مدینہ آیا اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھ سے پوچھا اور چاند کا ذکر کیا کہ تم نے کب دیکھا؟ میں نے کہا کہ جمعہ کی شب کو۔ انہوں نے کہا کہ تم نے خود دیکھا؟ میں نے کہا، ہاں اور لوگوں نے بھی دیکھا اور روزہ رکھا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اور لوگوں نے بھی۔ تو سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ ہم نے تو ہفتہ کی شب کو دیکھا اور ہم پورے تیس روزے رکھیں گے یا چاند دیکھ لیں گے تو میں نے کہا کہ آپ سیدنا معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا (چاند) دیکھنا اور ان کا روزہ رکھنا کافی نہیں جانتے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں، ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایسا ہی حکم کیا ہے اور یحییٰ بن یحییٰ کو شک ہے کہ حدیث میں "نکتفی" کا لفظ ہے یا "تکتفی" کا۔

عید کے مہینے (اجر و ثواب کے اعتبار سے)

سیدنا ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔ "عیدوں کے دو ماہ ناقص نہیں ہوتے۔ ایک رمضان شریف اور دوسرا ذی الحجہ۔"

روزہ کے لیے سحری کا بیان

سیدنا انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔
"سحری کھایا کرو کیونکہ سحری میں برکت ہے۔"

سحری میں تاخیر کا بیان

سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ سحری کی پھر صبح کی نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ میں (راوی) نے کہا کہ (سحری اور نماز) دونوں کے درمیان کتنی دیر ہوئی؟ انہوں نے کہا کہ پچاس آیات کے موافق۔ (سحری سے فراغت اور نماز کی تکبیر کے درمیان تقریباً" دس منٹ کا فاصلہ تھا۔)

اللہ تعالیٰ کے اس قول حتیٰ یتبین لکم..... کے بارے میں

سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری کہ:
"کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ سفید دھاگہ نمودار ہوجائے۔"

تو آدمی جب روزہ رکھنے کا ارادہ کرتا تو دو دھاگے اپنے پیر میں باندھ لیتا۔ ایک سفید اور دوسرا سیاہ اور کھاتا پیتا رہتا یہاں تک کہ اس کو دیکھنے میں کالے اور سفید کا فرق معلوم ہونے لگتا، تب اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد "فجر سے" کا لفظ اتارا، تب لوگوں کو معلوم ہوا کہ دھاگوں سے مراد رات اور دن ہے۔

بے شک بلال (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) رات کو اذان دیتے ہیں پس تم کھاؤ اور پیو

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دو مؤذن تھے۔ ایک سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے سیدنا ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو کہ نابینا تھے تو آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔
"بلال رات کو اذان دیتے ہیں، پس تم کھاتے پیتے رہو۔ یہاں تک کہ ابن ام مکتوم اذان دیں۔"

سورج غروب ہوجائے تو روزہ افطار کرلو

سیدنا عبداللہ بن ابی ۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ رمضان کے مہینے میں سفر میں تھے پھر جب آفتاب غروب ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔
"اے فلاں! اترو اور ہمارے لیے ستو گھول دو۔"
انہوں نے کہا۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم! ابھی آپ پر دن ہے۔" (یعنی ان صحابی کو یہ خیال ہوا کہ جب غروب کے بعد جو سرخی ہے، وہ جاتی ہے جب رات آتی ہے، حالانکہ یہ غلط ہے)۔ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے پھر فرمایا۔
"اترو (یعنی اونٹ پر سے) اور ہمارے لیے ستو گھولو۔"
پھر وہ اترے اور ستو گھول کر آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس لائے اور آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے نوش فرمایا اور پھر اپنے ہاتھ سے اشارہ فرمایا۔
"جب سورج اس طرف غروب ہوجائے (یعنی مغرب میں) اور اس طرف (یعنی مشرق سے) رات آجائے تو پس روزہ دار کو روزہ کھول لینا چاہیے۔"

نماز عید میں کیا پڑھیں

عبیداللہ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اضحیٰ اور فطر میں کیا پڑھتے تھے؟" انہوں نے کہا کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں ق والقرآن المجید اور اقتربت الساعۃ وانشق القمر پڑھتے تھے۔" (مسلم)

ہم نے بھی فلم دیکھی

انشا جی

مومن ہونے کا دعویٰ رکھتے ہوئے بھی ہم ایک سوراخ سے دوسری بار ڈسے گئے یعنی پنجابی فلم دیکھنے کے پہلے تجربے کے باوجود جس پر ہم نے یہ پاگل پاگل پاگل پاگل فلمی دنیا والا کالم لکھا تھا۔ ہم کل پھر ایک سینما میں ایک پنجابی فلم دیکھتے اور بڑھکیں سنتے پائے گئے۔ معلوم ہوا ہمارے پہلی فلم دیکھنے کے بعد سے پنجابی فلمسازی ترقی کے اور کئی مدارج طے کر گئی ہے۔ اس فلم میں تو صرف ولن بڑھک مارتا تھا۔ اس میں ہیرو بھی، ہاتھ جھٹک جھٹک کر بڑھک مارتا ہے۔ مسخرا بھی بڑھک مارتا ہے اور ہیروئن بھی موقع پا کر بڑھک مارنے سے باز نہیں رہتی۔ ایک بڑھک سے دوسری بڑھک کے درمیان پانچ منٹ سے زیادہ کا فاصلہ آجائے تو ہال میں بیٹھے ناظرین بڑھک مار اٹھتے تھے۔ "اوئے بڑھک مار شیر دیا پترا۔ تیریاں باگاں کھچ دیاں گے۔"

اس فلم میں ہم نے گانوں یعنی ایک گانے اور دوسرے گانے کے درمیان بھی فاصلہ تکلیف دہ حد تک زیادہ پایا تھا۔ یعنی انتظار کرتے کرتے دس دس منٹ گزر جاتے تھے۔ تب کوئی گانا یا رقص آتا تھا۔ یہاں پہلے گانے کی گونج ابھی کانوں میں باقی ہوتی ہے کہ دوسرا آجاتا ہے۔ ایک بات اس فلم کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوئی کہ آج کل فلم پہلے فلمائی جاتی ہے اس پر کہانی بعد میں مڑھی جاتی ہے۔ ڈائریکٹر کیمرہ مین کو حکم دیتا ہے کہ چند سین صحت افزا مقامات مری اور سوات وغیرہ کے، مکے بازی کے، عشق بازی کے خوشی کے، غمی کے، شادی کے، ہجر اور فراق کے اور مسخرے کی مسخری کے لے آ باقی میں جانوں میرا کام۔ بعض اوقات سب سے پہلا مرحلہ گانوں کا ہوتا ہے۔ گانے پکچرائز کرنے کے بعد فلم کا کوئی ٹوٹا بچے تو اس میں باقی سین ڈالے جاتے ہیں۔ کہانی نویسوں کی بہرحال چھٹی کردی گئی ہے۔ یہ اچھا ہی ہوا۔ بہت نخرے کرتے

تھے۔ پیسے بھی مانگا کرتے تھے۔

ہمارا تعلق پنجاب سے ہے یعنی گرداں نہیں تو داں کے نکالے ہوئے تو ہیں اور بود و باش بھی دیہات کی رہی ہے لیکن اب بہت برس سے ادھر جانا نہیں ہوا۔ پنجاب کے دیہات کی عدیم المثال ترقی کا جو حال معلوم ہوتا ہے۔ پنجابی فلموں سے ہوتا ہے۔ مکانات اگرچہ گتے اور ہارڈ بورڈ اور ٹاٹ کے بنے ہوئے ہوتے ہیں اور ہوا چلنے سے جھولتے ہیں لیکن صاف ستھرے، کھڑکیاں بھی کم خرچ بالا نشین یعنی شیشے کے بجائے پلاسٹک لگا ہوا۔ تعلیم بھی گاؤں گاؤں میں پھیل گئی ہے کیونکہ دیہات کی الھڑ لڑکیوں کے مکالموں سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے خواتین کے رائج الوقت تمام ناول پڑھ رکھے ہیں۔ اور کوئی مکالمہ نہیں جو رومانیت یا نکتہ رسی سے خالی ہو۔ بیوٹی سیلون بھی دیہات میں جابجا کھل گئے ہیں کیونکہ ہیروئن تو بڑی بات ہے۔ پنجابی فلموں میں کوئی فقیرنی یعنی بھکارن بھی آتی ہے تو نئے فیشن کا جوڑا بنوا کر بال سیٹ کرا کر پاؤڈر سرخی لگوا کر۔

عورتوں کے علاوہ مرد بھی ترقی کی دوڑ میں پیچھے نہیں رہے۔ مکالمے بازی کے علاوہ شمشیر زنی، پستول بازی، مکا بازی اور گھٹکے بازی میں طاق۔ ہر کردار دھڑا دھڑ مارتا ہے۔ اور مار کھاتا ہے۔ خوبی یہ ہے بچا کر مارتا ہے تاکہ حریف کے لگ نہ جائے اور مکے کے بجائے مکے کی آواز سے کام چل جائے۔ جو فلم والوں نے ریکارڈ میں بھر رکھی ہے۔ مکا کھا کر گرنے والا ضرب کے صدمے سے گرنے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ایک پھکنی اپنی طرف سے اور کھاتا ہے۔ لاٹھیوں کی لڑائی بھی نہایت شریفانہ ہوتی ہے کہ سانپ مر جائے لاٹھی نہ ٹوٹے۔ سر کے اوپر سے گھماتے ہیں یعنی فلم کے تماشائی بھی مطمئن ہو جائیں کہ بڑے گھمسان کا رن پڑ رہا ہے اور کسی کا بال بھی بیکا نہ ہو۔ ہر گاؤں میں ایک باغیچہ بھی ہوتا ہے۔ جہاں تنہائی کا معقول انتظام رہتا ہے۔ بھی ہر پھر کر اس میں گانے اور ناچنے کودنے آتے ہیں خواہ ہیرو اور ہیروئن ہوں یا سائڈ ہیرو یا سائڈ

ہیروئن یا مسخرہ د مسخرن کیونکہ ڈائریکٹر اسٹوڈیو کے محدود رقبے میں درختوں کی ٹہنیاں گاڑ کر ایک ہی باغ کا انتظام کر سکتا ہے۔ ایک درخت کی شاخ پر تو اس فلم کے فاضل ڈائریکٹر نے کوئل کا انتظام بھی کیا ہے۔ ہر سین میں ہیرو ہیروئن اور دلہن وغیرہ دھما چوکڑی مچاتے پاس سے گزرتے ہیں۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ ربڑ کی چڑیا کو آپ ٹہنی پر دھاگے سے ذرا مضبوط باندھیں تو ہو بھی کیسے سکتی ہے۔

یہ کل والی فلم ہم نے جناب جمیل الدین عالی کی معیت میں انہی کی ترغیب بلکہ تخویف کے تحت انہی کے پیسوں سے دیکھی' وہی بتاتے بھی گئے کہ جو ایکٹریس اس وقت ہوش ربا ناچ' ناچ کر دل گداز گانا گا رہی ہے۔ مسماۃ روح رواں ہے۔ جس کا نام فلموں میں آنے سے پہلے مس اللہ رکھی تھا۔ یہ فلم ایثار' سچی محبت اور مار کٹائی سے بھرپور ہے۔ اس میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ یعنی چوہدری' ظلم' معصوم دوشیزہ شہری نوجوان' بظاہر عجمی لیکن آٹھوں گانٹھ کمیت' بہادری میں شیر دا پتر۔ ایک ماں بھی ہوتی ہے۔ خالص دیہاتن لیکن سلیقہ مند یعنی بال اس کے بھی بیوٹی سیلون میں سیٹ کیے ہوئے لہجہ کینرڈ کالج کی بی۔ اے پاس لڑکیوں کا۔ بالوں سے ساٹھ برس کی۔ چہرے سے تیس برس کی اور آواز سے بیس برس کی معلوم ہوتی ہے۔ اس فلم میں تو وہ اپنی دونوں آنکھیں تماشائیوں کے دیکھتے دیکھتے پھوڑ لیتی ہے تاکہ اپنے بیٹے کو ڈاکو کے روپ میں نہ دیکھنا پڑے۔ خون کی نالیاں بہتی ہیں لیکن مکالمہ جاری رہتا ہے۔ چہرے سے کسی خاص تکلیف کا اظہار نہیں ہوتا۔ بیٹا سامنے کھڑا اظہار افسوس کر کے اپنا اخلاقی فرض ادا کرتا ہے بلکہ لیکن یہ نہیں کہ اسے اسپتال وغیرہ لے جانے کی کوشش کرے۔ فلم کے ڈائریکٹر کی ہدایات ماں کی محبت پر غالب آجاتی ہیں۔ فلم میں ایک کردار غالبا" منشی کو مرناد کھاتے ہیں۔ دس آدمیوں کے کھڑے کھڑے لڑھک کر نیچے گر جاتا ہے۔ کسی سے یہ نہیں ہوتا کہ اسے اٹھائے۔ دیکھے کہ مرگیا ہے یا کوئی سانس باقی ہے۔

ساری فلم میں لوگ اس حصے سے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں جو انٹرویل کہلاتا ہے۔ جس میں لوگ کوکا کولا پیتے ہیں۔ مونگ پھلی ٹھونگتے اور کانوں سے پرانی روئی نکال کر نئی روئی ان میں رکھتے ہیں۔ ہر کردار اتنا اونچا بولتا ہے کہ آغا حشر کی اولاد نرینہ معلوم ہوتا ہے۔ پنجابی فلموں میں ہال کے اندر اصلی فائر لگانے کے بجائے سائلنسر لگانے کی ضرورت ہے۔ معلوم ہوتا ہے پنجاب کے دیہات میں بہرہ پن عام ہے۔ ہیروئن اور سائڈ ہیروئن کے والدین اور لواحقین بلکہ تمام گاؤں والے بہرے ہوتے ہیں ورنہ تو کردار جس طرح چیخ چیخ کر ایک دوسرے سے اظہار عشق کرتے ہیں فورا" پکڑے جائیں اور جوتے کھائیں۔ ہیروئن اور دوسری لڑکیوں کی کود پھاند ایک طرح کی ورزش البتہ ہے اور یہی ہماری ہیروئنوں کی قابل رشک صحت کا راز بھی ہے اور کسی پہلو سے ہم نہیں کہتے۔ صحت اور تندرستی میں شمیم آرا بھی فردوس کو نہیں پہنچ سکتی۔

پنجابی زبان میں فلمیں کوئی تیس پینتیس برس سے بنتی آرہی ہیں۔ لیکن کمال یہ ہے کہ جس فلم کو بھی دیکھیے — یہی محسوس ہوگا کہ یہ اس زبان میں فلمسازی کی پہلی کوشش ہے۔ تہمد باندھ کر ناچنا ہر بات کود کر اور گا کر بتانا حتی کہ طوائف کا زندہ ناچ گانا بھی اس فلم میں موقع محل سے قطع نظر محض ناظرین کی تفریح طبع کے لیے شراب اور کنجری کا جلسہ ڈالا گیا ہے اور کنجری اپنی ٹڈے کی سی آواز میں گاتی ہے چونکہ پستول بازی کا معقول بندوبست ہے لہٰذا پولیس بھی آتی ہے لیکن اس پولیس میں وردی کے علاوہ اور کوئی بات پولیس کی سی ہمیں تو نظر نہیں آئی۔ مرحبا غلام ربانی شاباش اور شیر دے پترو' پنجابی فلمیں بنانے والو' پینتالیس گانوں' چوں لیاڈگیوں' پھیتڑ پاچوں' بارہ غلط فہمیوں' تین باراتوں' چار قتلوں پر مشتمل اس فلم کا نام ہے لیکن آپ کو فلم کا نام بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ فلم ہمارے شہر کے درجن بھر سینماؤں میں لگی ہے۔ آپ نے ہم سے پہلے دیکھ لی ہوگی۔

عظمت اور برکت کا مہینہ رمضان المبارک سایہ فگن ہے۔ اس ماہ رحمتوں کی بارش ہوتی ہے۔ ہر مسلمان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس ماہ کی رحمتوں اور برکتوں سے اپنا دامن بھر لے۔ روزہ' نماز' تراویح' تلاوت پاک' عبادت و ریاضت بڑھ جاتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ صدقہ' خیرات کر کے رب کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ایک خاتون خانہ کی ذمہ داریاں بھی اس ماہ میں بڑھ جاتی ہیں۔ سحری کے لیے وقت پر اٹھنا۔ یہ سوچنا کہ کیا تیار کیا جائے جو سب خوش ہو کر کھا سکیں۔ کیونکہ سب گھر والوں نے روزہ رکھنا ہے۔ پھر شام سے ہی افطاری کی تیاری کا اہتمام۔ افطاری کے وقت تو دستر خوان کی رونق ہی اور ہوتی ہے۔ جو صرف خاتون خانہ کی توجہ' شوق اور دلچسپی کی مرہون منت ہوتی ہے۔

رمضان المبارک کے حوالے سے ہم نے قارئین سے سروے کیا ہے' سروے کا سوال یہ ہے۔

س: رمضان المبارک میں ہر گھر میں خاص اہتمام ہوتا ہے۔ سحری' افطاری کی تیاری کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ اللہ کو راضی کرنے کی کوشش بھی ہوتی ہے۔ آپ سحری' افطاری پر کیا خاص اہتمام کرتی ہیں اور رمضان کی خصوصی عبادت تلاوت کلام پاک' تراویح وغیرہ کے لیے کیسے وقت نکالتی ہیں؟

آیئے دیکھتے ہیں قارئین نے اس سوال کا کیا جواب دیا ہے۔

نیکیوں کا موسمِ بہار

اداره

ثمینہ اکرم۔ لیاری کراچی

رمضان المبارک وہ بابرکت مہینہ ہے۔ جس کی برکات سے ہر کوئی مستفید ہو سکتا ہے۔ کھانے پینے اور کام کے اوقات کار میں تبدیلی' سحری و افطاری میں دستر خوان کی وسعت اور انواع و اقسام کے کھانے اللہ پاک کا خاص انعام ہوتا ہے۔ رمضان المبارک خصوصی عبادات و اذکار ہر چیز پر سکون ہو کر اپنے وقت پر انجام پاتی ہے۔ شاید اس ماہ شیاطین جو قید ہو جاتے ہیں۔ ٹی وی' فلم اور میوزک سے رغبت نہیں رہتی' اس لیے عبادات کے لیے زیادہ سے زیادہ ٹائم مل جاتا ہے۔ میں تو ویسے بھی ٹی وی نہیں دیکھتی۔

چونکہ میں عام دنوں میں بھی بہت سحر خیز ہوں اور تہجد کے وقت ہی اٹھتی ہوں لہٰذا رمضان المبارک میں مجھے سحری کے لیے اٹھتے ہوئے کچھ مشکل نہیں ہوتی۔ پھر کچن میں جب تک مصروف رہوں' تیسرا کلمہ اور درود پاک صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل پڑھتی رہتی ہوں۔ سحری کے لیے آٹا رات کو ہی گوندھ کر فریج میں رکھ دیتے ہیں۔ سالن بہت کم روغن اور ہلکی مرچ والا بناتی ہوں۔ اکثر کباب بنا کر فریز کر دیتی ہوں۔ مختصر سی فیملی ہے۔ سحری کے دستر خوان پر عموماً ہم تین نفوس ہوتے ہیں۔ اکرم سادہ روٹی' دہی اور سالن کے ساتھ کھاتے ہیں۔ غنوی انڈا بریڈ اور میں ایک ڈبل روٹی کے سلائس پر مکھن لگا کر کھاتی ہوں۔ میٹھے میں پھینی بناتی ہوں اور کھیتی کسی بھی۔ چائے بہت کم پی جاتی ہے۔ کھجور کی افادیت سے انکار نہیں۔ یہ توانائی کا خزانہ ہے۔ سحری میں کھجور کا شیک پورا دن

توانائی فراہم کرتا ہے اور دن بھر روزہ بھی نہیں لگتا۔

کھجور کا شیک

چند کھجوریں، حسب ضرورت دودھ اور چند بادام لے کر برف کی کیوب کے ساتھ بلینڈر میں ڈال کر بلینڈ کرلیں۔ سحری ختم کرتے وقت پی لیں۔

غنویٰ سحری کے بعد پورا کچن سمیٹتی ہے میں نماز فجر کے بعد تلاوت قرآن کے بعد کچھ دیر کے لیے لیٹ جاتی ہوں۔ دونوں چھوٹے بیٹے اسود اور مومن تھوڑا بہت سحری میں ہی ناشتا کرلیتے ہیں لہٰذا ناشتے اور دوپہر کے کھانے کا کوئی بکھیڑا نہیں ہوتا۔ شام تک کچن کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہم پرسکون ہو کر اپنی نفلی عبادات کرسکتے ہیں اور آرام کے لیے بھی ٹائم مل جاتا ہے۔

ہر گھر کی طرح ہمارے ہاں بھی افطاری پر بہت زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ ہر چیز ہم گھر میں ہی تیار کرتے ہیں۔ غنویٰ بھی مسلسل میرے ساتھ لگتی رہتی ہے۔

چھولے کی چاٹ، دہی بڑے، آلو کے پکوڑے، فروٹ چاٹ اور ملک شیک یہ تو ہر روز دسترخوان کی زینت بنتے ہیں مگر مختلف قسم کے سموسے، رول، کھٹے آلو، پاپڑ اور مختلف شربت کی ورائٹی، میکرونی اور کسٹرڈ وغیرہ بھی پورے مہینے بننے والی چیزیں ہیں۔ مگر میں افطاری میں کھجور اور فروٹس کو خاص اہمیت دیتی ہوں۔ تازہ پھلوں کا جوس بھی تیار کرتی ہوں۔ زیادہ تلی ہوئی چیزوں سے پرہیز کرتی ہوں۔ میں افطاری میں بننے والی ایک مزیدار ریسپی آپ سے شیئر کررہی ہوں۔

کالے چھولے کی چاٹ و کھٹے آلو

سحری میں ہی کالے چھولے سوڈا ڈال کر بھگودیں۔ شام میں ابال لیں۔ اس کا پانی رہنے دیں اس کے ساتھ ہی آلو بھی ابال لیں املی بھگودیں۔ تھوڑی سی پیاز براؤن کرکے نکال لیں، براؤن پیاز میں ثابت لال مرچ اور املی ڈال کر پیس لیں۔ آلو بڑے بڑے کاٹ لیں۔ ٹماٹر بھی کاٹ لیں۔ گرم تیل میں سفید زیرہ، گورا سا لہسن کا پیسٹ ڈال کر فرائی کریں۔ ٹماٹر بھی ڈال دیں اس میں کالے چنے ڈال کر بھونیں پھر املی اور براؤن پیاز کا پیسٹ بھی شامل کردیں۔ جب چنوں کا پانی خشک ہوجائے تو ابلے ہوئے آلو ڈال کر مکس کرلیں۔ اوپر سے چاٹ مسالا، ٹماٹر، ہری مرچ، ہرا دھنیا، پیاز باریک کاٹ کر شامل کردیں اور افطاری کا لطف اٹھائیں۔

فروٹ چاٹ ود کریم

آم اور دیگر پھل آڑو، خربوزہ، کینو، چیکو، کیوب میں کاٹ لیں۔ چیس بوے رکھیں۔ اس میں ٹن والا اورنج جوس اور کریم ملا کر فریزر میں رکھ کر ٹھنڈا کرلیں۔ اگر اورنج جوس نہ ہو تو اورنج فلیور میں ریڈی میڈ کوئی ساشے ملادیں۔

تخم ریحاں والا شربت

تخم ریحاں پہلے سے بھگودیں۔ ٹھنڈے دودھ میں شکر ملالیں۔ پھر دودھ میں تخم بالنگا لال شربت ملالیں۔ برف کی کیوب ڈال کر خوب ٹھنڈا کرلیں (اس میں پانی نہیں ڈالا جاتا) یہ شربت بھی بہت توانائی دیتا ہے۔ بازاری اشیا کی خریداری سے بہتر ہے کہ ہر چیز گھر پہ ہی تیار کی جائے۔

افطاری کے بعد سب کچھ غنویٰ کرتی ہے۔ میں مغرب سے دوسرے دن سحری تک بالکل فارغ ہوتی ہوں۔ پھر میرا یہ سارا ٹائم عبادت اور تسبیحات پڑھنے میں گزرتا ہے۔ سوتی بھی ہوں گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر میں رمضان میں بازار نہیں جاتی اور نہ سلائی کرتی ہوں۔ یہ سب کام پہلے ہی کرلیتی ہوں۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

1۔ رمضان المبارک کا مہینہ میرے لیے اسپیشلی ایک گولڈن مہینہ ہے کیوں کہ عام دنوں میں کچن میں میری انٹری بہت ہی کم ہوتی ہے، زیادہ سے زیادہ چائنیز بنانا ہو یا میٹھا بنانا ہو تو خصوصی طور پر مجھے یاد کیا جاتا ہے۔

ورنہ عام دنوں میں کچن میں میری ضرورت محسوس ہی نہیں ہوتی۔ البتہ رمضان المبارک میں کچن کی رونق دیکھنے والی ہوتی ہے۔ سحری میں امی کے ساتھ اور افطاری میں بہنوں کے ساتھ میں کچن میں جوش و خروش کے ساتھ پائی جاتی ہوں 'سوہیہ' کو لندن چالیس سال میں ایک بار ہی ملتا ہے۔

سحری میں اور امی مل کر بناتے ہیں۔ شروع کے دنوں میں تو آلو کے پراٹھے' قیمہ پراٹھا اور کبھی کبھی بوائل انڈوں کے ساتھ دودھ والی سویوں کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ امی پراٹھے رات کو ہی تراویح کے بعد بنا کر ہاٹ پاٹ میں رکھ دیتی ہیں۔ سحری تک ویسے ہی فریش رہتے ہیں۔

ہم سحری میں پلاؤ کا خاص اہتمام کرتے ہیں کیوں کہ ہم پلاؤ بہت شوق سے کھاتے ہیں اسی لیے امی سالن رات کو بنا کر رکھ دیتی ہیں اور سحری میں بس چاول ڈال کر دم دے دیتی ہیں۔ اب پلاؤ فش کا ہو یا جھینگے کا' چنے کی دال کا ہو یا چکن کا امی بہت ہی مزے دار بناتی ہیں۔ کبھی کبھی بمبئی بریانی یا چکن یخنی پلاؤ بھی بناتی ہیں۔ ہم افطاری کے بعد کھانا نہیں کھاتے اسی لیے سحری میں نفاست و شوق اور رغبت سے کھایا جاتا ہے۔

2۔ افطاری کے لیے ہمارے گھر میں بہت ہی خاص اہتمام کیا جاتا ہے اسی لیے عصر کے بعد ہی افطاری کی تیاری شروع ہوجاتی ہے افطاری صائمہ میں اور ندا مل کر بناتی ہیں ام رباب ہماری ہیلپ کرتی ہے۔ گھر والوں کو میرے ہاتھ کے ذائقے' دہی بھلے' چھولے چاٹ' آلو چاٹ اور لب شیریں بہت پسند ہے صائمہ پکوڑے بنانے میں ایکسپرٹ ہے۔ ہر ٹائپ کے پکوڑے بناتی ہے جب کہ ندا آلو کے کباب' چکن نگٹس اور چائنیز رول مزے دار بناتی ہے اس کے علاوہ فروٹ چاٹ' آلو کے چپس' چائنیز پکوڑے اور جیلی وغیرہ کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ سموسے بھی ہمارے گھر میں ہر ٹائپ کے بنائے جاتے ہیں بابو کو باہر کے سموسے بالکل نہیں پسند اسی لیے ہم گھر میں خود بناتے ہیں۔

ایک خاص بات... افطاری میں کھجور کے ساتھ نمکین لسی کا ہونا لازمی ہے اس کے ساتھ ساتھ شربت کا بھی خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہ مہینہ سال میں صرف ایک بار آتا ہے اسی لیے اس کا اہتمام بہت ہی دل لگا کر کرتے ہیں اور اس کی نعمتوں سے بھرپور فائدے اٹھاتے ہیں۔

رمضان المبارک کا مہینہ دینی اعتبار سے ہمیں اللہ کے بہت ہی قریب کرتا ہے۔ دل کو ایک سکون کا احساس ہوتا ہے رمضان کا چاند نظر آتے ہی تراویح کے ساتھ ساتھ خصوصی عبادات کے لیے بھی ٹائم نکالتی ہوں۔

سحری کرنے کے فوراً" بعد دو رکعت نفل تہجد لازمی پڑھتی ہوں۔ فجر کی اذان تک پورے دل سے دعا کرتی ہوں' فجر کی نماز ادا کر کے قرآن پاک کی ایک سے ڈیڑھ گھنٹے تک تلاوت کر کے سو جاتی ہوں۔ گیارہ بجے اٹھ کر اپنے حصے کے کام سرانجام دیتی ہوں۔ فریش ہو کر ظہر کی نماز ادا کر کے دو سے تین گھنٹے تک قرآن پاک کی تلاوت کر کے تھوڑا سا لیٹ جاتی ہوں۔ پھر عصر کی نماز کے بعد افطاری کی تیاری شروع۔ مغرب کی نماز کے بعد برتنوں کا ڈھیر ہمیں ڈرانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ جس کی باری ہو وہ برتن دھوتا ہے۔ سب بہنیں مل کر اس کی ہیلپ کرتے ہیں۔ عشاء کی اذان کے فوراً" بعد تراویح کے لیے کھڑی ہو جاتی ہوں۔

رمضان المبارک رحمتوں' نعمتوں اور برکتوں کا مہینہ ہے جو اللہ کی طرف سے اپنے بندوں کے لیے خاص تحفہ ہے اس کے جانے کے بعد اس کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے رمضان المبارک کی عبادات سے میرے دل کو راحت کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔

یاسمین حنفی۔ کراچی

سحری اور افطاری میں اہتمام کیا کرتی تھی چند سال پہلے' جب ہم بہن بھائی سب ساتھ ہوتے تھے' ابو

مسجد کے پیش امام تھے۔

میری بہن مرحومہ صدف حنفی سحری کے لیے ڈھائی بجے ہی اٹھ جایا کرتی تھی کیونکہ سب کچھ اسے اسی وقت بنانا ہوتا تھا۔ سالن چڑھا کروہ آٹا گوندھتی... پھینی بناتی... سفید چاول ابو کی فرمائش پر بناتی تھی۔ پھر ساڑھے تین بجے ہم سب اٹھتے۔ پہلے دو رکعت نفل پڑھتے پھر میں سحری کے لیے دستر خوان لگاتی۔ سب ایک ساتھ کھانا شروع کرتے۔ ایک ساتھ کھانا کھانے میں کتنا مزا آتا ہے' یہ احساس آج ہوتا ہے جب ہم سب اپنے اپنے گھروں میں ہیں۔ فیملی بھی ہے پھر بھی اکیلا پن محسوس ہوتا ہے۔ پھر ابو نماز پڑھانے چلے جاتے۔ بھائی بھی ان کے ساتھ جاتے۔ بھائی شفیق جو خود مولوی ہیں انہیں نماز کے بعد درس دینا ہوتا تھا۔ آج ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اکیلے رہ گئے ہیں۔ اس بات کا احساس رمضان میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔

پھر نماز کے بعد ہم سب قرآن شریف پڑھتے تھے۔ امی کو پڑھنا نہیں آتا تھا تو وہ ہمارے پاس بیٹھ کر سنتی تھیں۔

پھر ظہر کے بعد بھی ہم سب ایک ساتھ بیٹھ کر قرآن پاک پڑھتے۔

افطاری کی ذمہ داری میری ہوتی تھی۔ پکوڑے' سموسے اور فروٹ چاٹ۔ ہمارے ہاں افطاری پر اتنا اہتمام نہیں ہوتا تھا کیوں کہ امی ابو افطاری میں کھانا کھاتے تھے۔ کھانے کی ذمہ داری بھابھی ریحانہ پر ہوتی تھی۔ اور دستر خوان میری بہن لگاتی تھی' پھر نماز سے فارغ ہو کر ہم سب چائے پیتے۔ اور تراویح کی تیاری کرتے۔ ہماری مسجد میں خواتین کے لیے علیحدہ تراویح کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ واپسی پر بیٹھ کر باتیں کرتے۔ کبھی راحیلہ یا باجی آجاتیں تو اس دن تو کوئی سوتا ہی نہیں تھا۔ بہت اچھی تھی ہماری زندگی۔ پر جانے کس کی نظر لگ گئی اب نہ امی رہیں نہ بہن۔

میری بھی شادی ہو گئی۔

اب بس گھر میں ہمیں اور میرے میاں ہوتے ہیں۔ جو سحری گھر پر کرتے ہیں اور افطاری اپنی شاپ پر تو بس افطاری کے وقت اب میں اکیلی بیٹھی ان گزرے دنوں کو یاد کرتی ہوں۔

اللہ میری امی اور بہن کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

حمیرا اعجاز۔ ساہیوال

بہت لمبے عرصے کے بعد خواتین کی محفل میں شرکت کر رہی ہوں۔ چونکہ رمضان المبارک کے حوالے سے سروے تھا تو دل نے بے اختیار کہا۔

"مرحبا رمضان"

رمضان المبارک کا مہینہ جہاں ہر مسلمان کے لیے بے حد اہم ہوتا ہے وہیں مجھے بھی رمضان کا مہینہ ہمیشہ دلشاد کر دیتا ہے۔ سحری اور افطاری میں چاروں طرف گونجتی اذانیں' مسجدوں کی رونق' چہل پہل یہ سب عام مہینوں میں کہاں نصیب ہوتا ہے۔ اگرچہ اسلامی مہینوں کی اپنی اپنی انفرادیت ہے مگر رمضان المبارک جیسی رحمتیں' برکتیں اور بخششیں کہاں مل سکتی ہیں۔

جب بچے چھوٹے تھے تو بہت سادگی سے سحری اور افطاری کرتے تھے میرے میاں صاحب کا فرمانا ہے کہ صرف روٹی سالن' لیکن میرا بڑا بیٹا اور بیٹی دونوں پچھلے چار سالوں سے روزے رکھ رہے ہیں اور روزہ رکھ کر اسکول کے نام نہاد "سمر کیمپ" بھی اٹینڈ کرتے تھے۔ اس لیے میں ان کے لیے سحری اور افطاری بہت روایتی بناتی ہوں۔ مثلاً" سحری میں دیسی گھی کے پراٹھے' میٹھی لسی کوئی سا بھی سالن یا پھر آملیٹ بنا دیتی ہوں۔

جبکہ افطاری پر بہت اہتمام کرتی ہوں۔ بیٹے کی پسند کی فروٹ چاٹ اور بیٹی کی پسند کے فرنچ فرائز افطاری کا لازمی جزو ہیں۔ باقی لیموں ملا ہوا شربت بیٹی کو چاہیے تو بیٹے کو دودھ سوڈا۔ بس اسی طرح روز بدل بدل کر بچوں کا دل خوش کرتی ہوں تاکہ بچے شوق و ذوق سے روزے رکھیں۔ میرے خیال میں بچے اگر چھوٹی عمر

سے روزے رکھنے کے عادی ہو جائیں تو جوانی میں کوئی روزہ نہیں چھوڑتے۔

رہی بات عبادات کی تو جناب رمضان سے پہلے عید کی شاپنگ پوری کرلیتی ہوں تاکہ رمضان میں بازاروں کی خاک چھاننے کے بجائے عبادات پر زور ہو۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ کم از کم دو قرآن پاک ضرور ختم کروں اور تراویح بھی ضرور پڑھتی ہوں۔ پہلے تو اپنی جٹھانی کے گھر ہم سب مل کر حافظ لڑکی کے ساتھ تراویح پڑھتے تھے مگر جب سے گھٹنے اور کمر کی تکلیف شروع ہوئی ہے گھر پر ہی پڑھتی ہوں۔

سنبل ملک اعوان۔ ونڈالہ

سب سے پہلے تو آپ سب کی موجودگی میں اللہ

رب العزت کا شکر ادا کروں گی کہ مجھے زندگی میں ایک مرتبہ پھر سے رمضان المبارک کی خوبصورت پاکیزہ سعادتیں نصیب ہوئیں۔ اپنی مما اور پاپا کا بے حد شکریہ ادا کروں گی کہ انہوں نے مجھے دین کی سمجھ بوجھ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ اپنے ہمسایوں، کولیگ دوستوں اور سب ملنے جلنے والوں کو اشاف ڈائجسٹ خواتین کو رمضان المبارک کی مبارک باد دوں گی۔

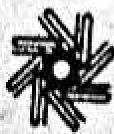
رمضان کے آنے سے پہلے ہی ہم لوگ شاپنگ کرلیتے ہیں تاکہ رمضان کے پورے مہینے میں یکسوئی کے ساتھ عبادت کی جائے اور اس دفعہ تو رمضان گرمیوں میں آرہا ہے تو روزے کے ساتھ دوپہر میں شاپنگ کرنا دل گردے کا کام ہے اور افطاری کے بعد اتنا ٹائم ہی نہیں ہوتا کہ شاپنگ کی جاسکے کیونکہ افطاری کے بعد نماز اور کھانے کے بعد عشا تراویح پھر رات گئے بستر پر جانا بہت تھکا دیتا ہے لہٰذا میں تو ہمیشہ شاپنگ عید سے پہلے ہی کرلیتی ہوں۔ البتہ چوڑیاں اور مہندی کے لیے چاند رات کو بازار ضرور جاتی ہوں۔ اس طرح چاند رات کو بھی انجوائے کرلیتی ہوں۔

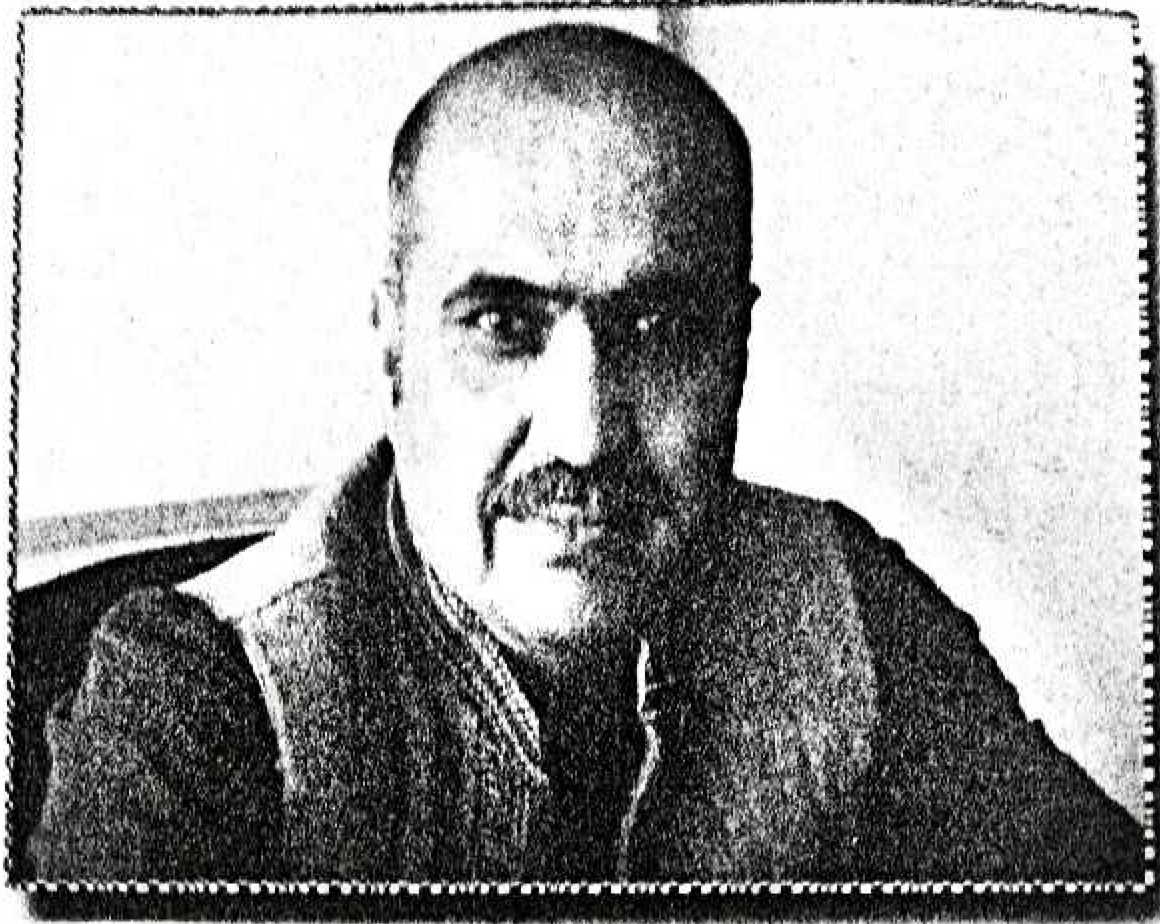
رمضان کا چاند دیکھ کر دعا کرتی ہوں پھر فوراً دو رکعت نفل ادا کرتی ہوں۔ پھر جلدی سے سحری کے لیے مینو سوچتی ہوں۔ کوئی ضروری چیز ہو تو وہ رات کو ہی منگوا لیتی ہوں پھر عشا کی نماز کی ادائی کے بعد تراویح، پھر سحری سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے اٹھتی ہوں، سب سے پہلے آٹا گوندھتی ہوں کیونکہ ماما کو تازہ گوندھے آٹے کے پراٹھے پسند ہیں، پھر میں اور ماما نماز تہجد ادا کرتے ہیں۔ ماما قرآن مجید کی تلاوت کرتی ہیں اور میں پاس ہی کچن کے کام نبٹاتی ہوں۔ لسی بناتی ہوں، تازہ سالن، دہی اور پراٹھوں سے روزہ رکھ کر برتن سمیٹتی ہوں۔ نماز فجر پڑھ کر قرآن مجید کی تلاوت کرتی ہوں کیونکہ مجھے فجر کے بعد نیند نہیں آتی تو قرآن مجید کی تلاوت کے بعد برتن دھوتی ہوں اور پھر جاب پر جانے کی تیاری۔ وہاں سے ایک بجے آکر ایک گھنٹہ آرام کرتی ہوں پھر نماز ظہر کی ادائی۔ اس کے بعد قرآن مجید، کیونکہ ایک سپارہ صبح ایک سہ پہر کو ختم کرنا ہوتا ہے۔

تھوڑا سا وقت سلائی کے لیے نکالتی ہوں کیونکہ ہم نے اپنے کپڑے خود ہی سینے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد عصر کی نماز کے فوراً بعد افطاری کی تیاریاں۔

ہمارے گھر میں ایک وقت میں ایک ہی ڈش بنتی ہے تاکہ رزق ضائع نہ ہو۔ اگر فروٹ چاٹ ہے تو اگلے دن دہی بھلے۔ اگر ایک دن پکوڑے ہیں تو سموسے اگلے دن اس طرح بجٹ بھی خراب نہیں ہوتا ہے اور رزق بھی ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے۔

صدقہ و خیرات تو ماما ہر ماہ تنخواہ میں سے کچھ فیصد دیتی ہیں مگر فطرہ بھی پندرہ روزے تک دے دیا جاتا ہے تاکہ ضرورت مند بھی اپنے لیے کچھ نہ کچھ خرید لے۔





معروف مصنف ڈراما نگار اور شاعر

ظفر معراج سے ملاقات

شاہین رشید

کوئی ڈرامہ ہو' سوپ ہو یا ٹیلی فلم' اگر کہانی اسٹرانگ ہے تو ڈائریکٹر کو بھی کام کرنے کا مزہ آتا ہے اور فنکار بھی اپنی بھرپور صلاحیتیں دکھاتے ہیں۔ آج کل بہت ڈرامہ لکھا جا رہا ہے اور ہر کوئی ڈرامہ لکھ رہا ہے مگر کامیاب وہی رائٹر ہیں جو ڈرامے کی تمام جزئیات کا خیال رکھتے ہیں۔۔۔ ظفر معراج انہی میں سے ایک ہیں جو ڈرامہ لکھنے کا فن جانتے ہیں اور جن کا نام ڈرامے کی کامیابی کی ضمانت ہوتا ہے۔ عنقریب آپ ان کے "منکر" اور "دل فریب" دیکھ سکیں گے۔ گزشتہ دنوں ڈرامے کے حوالے سے ان سے خاصی تفصیلی بات ہوئی' جو آپ قارئین کی نذر ہے۔

"کیسے مزاج ہیں۔۔۔ اور کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"

"مزاج اچھے ہیں اور مصروفیات کے بارے میں تو میں سب کو یہی کہتا ہوں کہ دکانداری اچھی چل رہی ہے۔ آج کل آن ایئر کوئی سیریل نہیں ہے' حال ہی میں "دل آویز" اختتام پذیر ہوا ہے اور عنقریب "منکر" آن ایئر ہونے والا ہے جیو سے۔"

"آپ بتا رہے ہیں کہ سیریل "دل آویز" پی ٹی وی سے آن ایئر ہوا تھا۔ تو کیا پی ٹی وی لوگ دیکھتے ہیں؟"

"بالکل۔۔۔ بلکہ پی ٹی وی تمام چینلز سے زیادہ دیکھا جاتا ہے اور یہ چینل اور بھی زیادہ دیکھا جائے اگر پی ٹی وی والے اپنے اتنے بڑے ادارے کی اہمیت کو سمجھیں اور جتنا فیڈ بیک مجھے پی ٹی وی کے ناظرین سے ملتا ہے کسی اور سے نہیں ملتا اور آج بھی لوگ پی ٹی وی

کو ایک فیملی چینل کے طور پر لیتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے' خاص طور پر میرے لیے کہ پی ٹی وی میں میں ایشوز کو ایڈریس کر سکتا ہوں۔ یہاں لگے بندھے فریم ورک میں کام نہیں ہوتا۔۔۔۔ جبکہ دیگر چینلز پہ ایک خاص ایشو پہ بات کر سکتے ہیں بلکہ وہ ایشوز ہی نہیں ہوتے بلکہ مختلف قسم کے کرداروں کی نفسیات کو ملا کر ایک ڈرامہ بنا دیا جاتا ہے وہی لوٹرائی اینگل ہے یا ایکسٹرا Love افیرز ہیں۔ پھر عورت کو اشتہار بنا کر پروڈکٹ کو بیچتے ہیں۔۔۔۔ اور میرے خیال میں عورت کی مخالفت میں یہ چیزیں جاتی ہیں۔ مردوں کی سوسائٹی میں رہ کر ہم جس طرح سے اس کے ایشوز کو بیچ رہے ہیں وہ ٹھیک نہیں ہے اس سے مجھے لگتا ہے کہ ایک تماش بین کی طرح مرد عورتوں کی لڑائی کے مزے لیتا ہے تو ہمارا ڈرامہ بھی اسی فریم ورک میں داخل ہو گیا ہے کہ ہم عورتوں کی لڑائی کا تماشا دیکھتے ہیں اور عورت کی طاقت کو ہم ختم کر رہے ہیں۔"

"بارہ مسالا کی چاٹ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ تاکہ ریٹنگ اچھی آ جائے۔ ذائقہ منہ کو نہیں لگا ہوتا مگر ہم لگا دیتے ہیں؟ کیا خیال ہے؟"

"آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے۔۔۔۔ اور دیکھا جائے تو اوور آل تاثر یہی ملتا ہے لیکن اب پرابلم یہ ہے کہ ہم اس کو (ڈرامے کو) انٹلیکچوئلی نہیں دیکھتے۔ میڈیا کا تو اب یہ حال ہے کہ نیوز جس کو زیادہ تر لوگ نہیں دیکھنا چاہتے' لیکن اس کو بریکنگ کے چسکے میں لگا دیا ہے ہم نے لوگوں کو۔۔۔۔ لیکن ہم جو کچھ ڈراموں میں دکھا رہے ہوتے ہیں اس کا معاشرے پہ بڑا اثر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ تو جو اوپر بیٹھا ہوا آدمی ہوتا ہے وہ خواہ contant کا ہو یا چینل کا اس پر ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ سوسائٹی کو کس طرح ڈرائیو کرنا چاہتا ہے اور یہ جو آج کل ہم نے ریٹنگ کا گیم شروع کیا ہوا ہے' یہ مجھے ایک ٹیکنیکل بدعنوانی لگتی ہے کیونکہ اس تکنیک کو بہت کم لوگ جانتے ہیں اور اسے کسی بھی طرف ڈرائیو کیا جا سکتا ہے۔ ہزار بارہ سو میٹرز پہ ہم پوری قوم کی سائیکی کو واضح نہیں کر سکتے اور نہ ہی اس فریم ورک میں لا سکتے ہیں۔ یہ کوئی پیمانہ نہیں ہوتا۔ بعض اوقات بہت اچھے ڈرامے ہوتے ہیں مگر میٹرز کچھ اور کہہ رہے ہوتے ہیں۔"

"آپ نے زیادہ تر پی ٹی وی کے لیے لکھا۔ تو اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

"جی بالکل۔ پی ٹی وی کے لیے میں نے زیادہ کام کیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پی ٹی وی میں ایک لبرٹی ہوتی ہے۔ میں نے "پیاری ایمپریس' دیوانہ' گھر کی خاطر' پانی" کیا۔ ابھی ول آویز ختم ہوا ہے تو ان میں ایک پیغام تھا تو پی ٹی وی میں یہ لبرٹی ہوتی ہے کہ ایشوز کو لے کر ایڈریس کر سکتے ہیں لیکن پرائیویٹ چینل ایک خاص قسم کی دکان لیے بیٹھے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو سیکیور رکھنے کے لیے چاہتے ہیں کہ چمک دمک سطحی۔ اور نمائشی چیزیں پیش کرتے رہیں۔ انہیں دوسری چیزوں سے یا ایشوز سے زیادہ سروکار نہیں ہوتا۔ جتنا پی آر پی کے چکر کا ہوتا ہے اور اس پی آر پی میں بھی ایک عجیب بھیڑ چال ہے۔ "مثلاً" اگر کوئی ایک ڈرامہ کسی وجہ سے ہٹ ہو گیا تو پھر یہاں کے لوگ ہر ڈرامہ کو ویسا ہی بنانا چاہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ انٹلیکچوئلی ہم اتنے Fake ہیں کہ اگر کوئی چیز اچانک سے کلک کر گئی تو ہم اس کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔۔۔۔ پھر قسمت سے کوئی اور چیز کہیں سے نکل آتی ہے۔ کسی اسٹار کی وجہ سے یا سبجیکٹ کی وجہ سے تو پھر ہم اس کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔"

"اب ڈرامہ بکتا ہے۔ پہلے زمانے کے رائٹر اپنی ذہنی تسکین کے لیے' اپنی تخلیق کو پروموٹ کرنے کے لیے لکھتے تھے۔ اب ایسا نہیں ہے؟"

"جہاں تک بکنے کی بات ہے تو "پکاسو" بھی بکتا تھا اگر آرٹ کی بات کریں تو۔۔۔۔ اور کسی گلی پہ کھڑا ہو کر جو پانچ پانچ منٹ میں تصاویر بناتا تھا' وہ بھی بکتا تھا اور دنیا میں جو چیز نہ بکے' اسے میں آرٹ نہیں سمجھتا۔ اگر آپ کوئی ڈرامہ بنا رہے ہیں اور اسے آپ اس انداز کا

نہیں بناتے کہ وہ بکے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ اس کام میں ویک (کمزور) ہیں۔"

"بکنے سے مراد یہ ہے کہ ایک ٹاپک پہ اگر کوئی ڈرامہ ہٹ ہوتا ہے تو دوسرا بھی اسی موضوع پر لکھے گا تاکہ اسے بھی ایسے دام مل جائیں۔"

"آپ کی بات بھی صحیح ہے مگر اس کے فیکٹرز کو بھی ذرا دیکھنا پڑے گا۔ اس کے فیکٹر میں صرف رائٹر انوالو نہیں ہوتا۔ اس کے فیکٹر میں بہت ساری چیزیں چینلائز ہونا شروع ہو جاتی ہیں مطلب یہ کہ جو خریدار ہے' وہ خود ایک کارپوریٹ کلچر کا نمائندہ ہوتا ہے۔۔۔ اب آپ جس ادارے سے وابستہ ہیں جہاں واقعی آپ ایشوز کو مسلسل ایڈریس کر رہی ہوتی ہیں۔ تو آپ کے یہاں contant ' فلاسفی ' سائیکولوجی یا اصلاح کا پہلو نکلتا ہے۔ لیکن جس شخص نے 2+2 کرنا ہوتا ہے' وہ خود کو اس سارے عمل سے باہر رکھتا ہے۔ میں آپ کو ایک چھوٹی سی مثال دوں کہ ہم جب مارکیٹنگ کی بات کرتے ہیں یا کوئی اور بات کرتے ہیں۔ ان میں ایک چیز کی سمجھ نہیں ہے۔ ہم جب آرٹ کی بات کرتے ہیں تو حسن کہتے ہیں اسے۔ اور وہ اسی چیز کو مصنوعی بنا کر گلیمر کا نام دیتے ہیں۔ ہمارے اور ان کے درمیان یہی ایک بڑا فرق ہے۔ ہم نے اتنی ساری حسین چیزیں' جو ہمارے اردگرد بکھری ہوتی ہیں جیسے ہم بات کریں پاکستان کی' کلچر کی' رویوں کی' یا اس کے اندر کی خوب صورتیوں کی تو ہم نے اس کو ایکسپوز کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اس وقت ہمارا ڈرامہ ' خاص طور پر پرائیویٹ چینل کا ڈرامہ ' وہ کراچی یا لاہور کی پندرہ بیس لوکیشنز تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ تو جب آپ اپنے آپ کو محدود کر لو گے تو پھر آپ کے پاس چیزوں کا جو تنوع ہے' جو پھیلاؤ ہے' وہ تو رک ہی گیا۔"

"کیا رائٹر اپنی مرضی کی چیز لکھ کر دے سکتا ہے؟"

"جہاں تک میری بات ہے تو میں تو اپنی مرضی کا ہی لکھتا ہوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے ماحول کو ایسا بنا دیا ہے کہ مرضی بھی آہستہ آہستہ اسی لائن پہ آکر رک گئی ہے۔ میں اپنی مرضی کا لکھنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن یہ انسانی رویہ ہے کہ میں بھی یہ کہوں گا کہ میری چیز کی بھی ویلیو بنے' وہ ہٹ ہو جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں سارے رائٹرز کے حوالے سے یہ بات کر رہا ہوں تو ایک خاص قسم کی ایک ان سیکورٹی پھیلا دی تو آپ اس لائن سے نہیں ہٹ سکتے۔ آج کل ایک چیز کی باریکی کو کوئی نہیں دیکھتا۔ مثلاً" جب پی ٹی وی کا ڈرامہ ہوتا تھا۔ اس میں اسکرپٹ ایڈیٹر اور contant کا آدمی سب سے آخر میں آتا تھا۔ اس میں بھی اردو ٹھیک کرنی ہوتی تھی یا کوئی چیز جو سینسر کے ساتھ ٹکرائے۔ اسے دیکھنا ہوتا تھا یعنی وہ پالیسی کو چیک کرتا تھا۔۔۔ پی ٹی وی کے جو ڈائریکٹر یا پروڈیوسر ہوتے تھے۔ وہ رائٹر کے ساتھ بیٹھ کر contant کو پروڈیوس کرتے تھے۔ جیسے طارق معراج' شعیب منصور' یاور حیات اور ان جیسے دوسرے ڈائریکٹر و پروڈیوسر کے ساتھ مجھے بھی کام کرنے کا اتفاق ہوا۔۔۔ تو میں طارق معراج کے ساتھ پوری سیریل کے دوران اس کے گھر میں رہتا تھا سا اسکرپٹ پروف ہونے کے بعد ایڈیٹر کے پاس بھجوایا جاتا تھا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے چینلز نے ایک contant ایڈیٹر بٹھایا ہوا ہے۔ وہ اکلوتا شخص کہانیوں کو جنریٹ کرواتا ہے دس لوگوں سے وہ مزید لکھوا رہا ہوتا ہے یعنی اس تنوع کو ایک سوراخ سے گزارنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ایک شخص ایک فریم آف مائنڈ ہے اور زیادہ تر contant میں بیٹھے ہوئے وہ لوگ ہوتے ہیں' جو خود ایک ناکام رائٹر ہوتے ہیں۔۔۔ یا تھک گئے ہیں۔ تو جب ایک شخص سب کام کرنے لگا۔ تو پھر ڈراموں میں یکسانیت تو آئے گی۔ کیونکہ ان کا ویژن محدود ہو گا تو پھر ایک جیسی چیز ہی دیکھنے کو ملے گی ہونا تو یہ چاہیے کہ ڈائریکٹر' پروڈیوسر اور رائٹر کو ایک ساتھ بیٹھ کر ڈسکس کریں۔ تب ہی اچھے اور مختلف موضوعات پر ڈرامے دیکھنے کو ملیں گے مگر اب جو طریقہ ہے' وہ بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔ آج میں کچھ لکھتا ہوں تو نا contant ایڈیٹر اس

کو دیکھتا ہے۔ اپنے مخصوص سوراخ سے گزارتا ہے۔ اس کے بعد ایک فائل لے جا کر کسی ایک ڈائریکٹر کو دے دیتا ہے اور وہ بھی آدھا پڑھتا ہے اور آدھا نہیں پڑھتا۔"

"آپ کا ایک نام ہے۔ آپ نے بہت لکھا ہے۔ تو جن کا نام نہیں ہوتا لیکن درحقیقت وہ بہت اچھے رائٹر ہوتے ہیں تو وہ اپنی جگہ کیسے بناتے ہوں گے؟"

"میں یہ سمجھتا ہوں کہ جن کے پاس ٹیلنٹ ہوتا ہے انہیں اپنی جگہ بنانے میں تھوڑی محنت تو کرنی پڑتی ہے مگر وہ اپنے ٹیلنٹ سے جگہ بنا ہی لیتے ہیں انھیں روکا نہیں جا سکتا۔ ہمارے یہاں ایسا کوئی پلیٹ فارم نہیں ہے جہاں ٹیلنٹ اپنے آپ کو پیش کرے اور آگے بڑھے' یہ معاملہ صرف رائٹر کے ساتھ نہیں ہے بلکہ ہر ٹیلنٹ کے ساتھ ہے' مسئلہ یہ ہے کہ میں اکثر دیکھتا ہوں کہ یہ ہمارے ڈائریکٹر' پروڈیوسر اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ ایک شوٹ ختم ہوئی' دوسری کا اسکرپٹ پڑھ رہے ہیں' تیسرے کی ایڈیٹنگ میں ہیں بس یہ گئے بندھے 2+2 یہ ہیں کسی نے اگر باپ کا رول اچھا کرلیا تو بس پھر اس کو باپ کے ہی رول ملیں گے۔ اگر کوئی لڑکی رونے کا کردار اچھا کرسکتی ہے تو بس اس کو رونے دھونے والے ہی رول ملیں گے۔ تو ایسا نہیں ہونا چاہیے اس بھیڑ چال سے اب باہر نکلنا چاہیے۔۔۔ مجھے یاد ہے کہ انڈس ویژن چینل کے غضنفر علی ٹیلنٹ کو ڈھونڈ کر لایا کرتے تھے۔ میں نے خود ان کے ساتھ کام کیا ہے اور آج بہت سارے اچھے فنکار' رائٹر اور دیگر لوگ ان ہی کے متعارف کرائے ہوئے ہیں۔ انہوں نے میڈیا کو بہت ٹیلنٹ دیا ہے۔"

"آپ نے انڈیا کے لوگوں کے ساتھ بھی تو کام کیا ہے۔ کیسا پایا ان لوگوں کو؟"

"جی۔ میں نے انڈین لوگوں کے ساتھ کام کیا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے یہاں اس کام کو بطور انڈسٹری نہیں لیتے ہیں' جبکہ انڈین اسے بطور انڈسٹری لیتے ہیں۔ وہ نئے رائٹرز لے کر آتے ہیں۔ ایکٹر نئے لاتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ اس انڈسٹری کی جتنی گروتھ ہوگی اتنی ہی یہ انڈسٹری مضبوط ہوگی۔ وہ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ ہماری معاشی زندگی کا انحصار اس کے اوپر ہے۔ مگر ہم اسے وقتی طور پر لے رہے ہیں کہ ہاں ہو جائے گا' یہ گزر جائے گا وغیرہ وغیرہ۔۔۔ فلم کو اسی طرح ہم نے تباہ کردیا بلکہ اکھاڑ کر پھینک دیا۔"

"پاکستان فلم انڈسٹری کے لیے آپ نے کام کیا؟"

"میں نے زیبا کے ساتھ ایک فلم کی اور فلم "وار" کی شروع کی جو اسکرپٹنگ scripting ہے وہ میری ہے۔ پھر اسی پروڈیوسر کے لیے ایک فلم لکھی۔ زیبا کے لیے جو فلم لکھی ہے وہ "ایک" کے نام سے ہے جاوید فاضل کے ساتھ کام کرچکا ہوں "اک دن لوٹ کے آؤں گا" کاشف نثار کے ساتھ ایک فلم کے لیے بات چیت چل رہی ہے اور فلم کے حوالے سے میں اپنی پہچان پاکستان کے حوالے سے چاہتا ہوں۔"

"اسٹار پلس کے ڈراموں کو پاکستانی ڈراموں سے آگے دیکھتے ہیں یا پیچھے؟"

"یہاں میں یہ بات کرنا چاہوں گا کہ اسٹار پلس بہ ذات خود ایک کارپوریٹ کلچر کا ڈرامہ ہے۔ وہ نہ انڈین کلچر کو Represent کرتا ہے نہ کام کرتا ہے وہ ایک دکان ہے چونکہ انڈیا میں بہت بڑی مارکیٹ ہے تو وہاں پہ "بنیا" جا کر پیسے لگاتا ہے اور وہ مخصوص قسم کی کہانیاں کرتے جاتے ہیں۔۔۔ مگر میں نے دیکھا ہے کہ پاکستانی ناظرین حقیقت پر مبنی ڈراموں کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور ڈراموں میں حقیقی ورائٹی بھی چاہتے ہیں اور مزے کی بات یہ کہ جو ڈراموں کو نہیں دیکھتے انہیں ڈراموں کا سینس بھی نہیں ہے' ہم ان کی باتوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ حقیقی ڈرامہ دیکھنے والوں کی زیادہ تعداد رورل ایریاز (دیہی علاقوں) میں رہنے والوں کی ہے۔۔۔ اسٹار پلس کے ڈراموں کو شروع شروع میں لوگوں نے بہت پسند کیا۔ شروع شروع میں ذائقہ بہت میٹھا لگا لیکن کوئی کتنا میٹھا کھائے گا۔ جس طرح بریانی پسند ہوتی ہے لوگوں کو مگر ہر وقت نہیں۔۔۔ اسٹار پلس کا



سحر جلدی ختم ہوا کیونکہ وہ سب مصنوعی تھا اور ہے۔"

"سوپ اور سیریل ۔۔۔ ان دونوں میں ناظرین کیا چیز با آسانی ہضم کر سکتے ہیں؟"

"میں کہتا ہوں کہ 40 منٹ کا ڈرامہ ہو یا 40 منٹ کی 100 اقساط ہوں کہانی کہنے کا ہنر ہونا چاہیے۔ میں اپنی نانی کو ہزار داستان کو 'عمرو عیار اور قصہ چہار درویش کو ۔۔۔ سوپ کہتا ہوں۔ لیکن ان کو کہانی کہنے کا ہنر آتا تھا۔ اپنی نانی کا ذکر اس لیے کیا کہ انہیں بھی کہانی کہنے کا سلیقہ آتا تھا۔ تو بس سب کچھ ہضم ہو جاتا ہے اگر کہانی کہنے کا سلیقہ آتا ہو۔"

"ہمارے یہاں جب خود اتنے اچھے ڈرامے بن رہے ہیں تو پھر ترکی ڈراموں کی کیا ضرورت ہے؟"

"اب ترکی ڈراموں کا گراف بھی ایک خاص حد میں آکر بیٹھتا جا رہا ہے۔ ترکی ڈراموں کی مثال میں اس طرح دوں گا کہ جب ہم کسی نئے شہر میں جاتے ہیں یا کوئی نیا گھر لیتے ہیں تو ہم اسے بڑے شوق اور تجسس کے ساتھ دیکھتے ہیں کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے۔ ترکی ڈرامے آئے 'میرا سلطان' 'عشق ممنوع ٹائپ کے ڈراموں کو لوگوں نے بہت پسند کیا اور economically ان کو یہ بہت سستا پڑتا ہے۔ ترکی کی ڈرامہ انڈسٹری انڈین ڈراموں کی انڈسٹری سے بہت آگے ہے۔ مگر پھر بھی فائنلی ہمیں گھر کے دال چاول ہی پسند آئیں گے۔"

"ڈراموں پر تو بہت باتیں ہو گئیں۔ اب کچھ ہلکی پھلکی باتیں ہو جائیں کچھ اپنے بارے میں بتائیں' کچھ یہ بتائیں کہ لکھنے کا ادراک کب سے ہوا؟"

"ہم گھر میں بچپن سے فارسی زبان میں بات کرتے تھے اور ہمارے گھر کا ماحول خاصا ادبی تھا' سعدی' رومی' اقبال کو بہت پڑھا۔ شروع شروع میں یہ لوگ سمجھ میں نہیں آتے تھے مگر پھر آنے لگے۔ میں اپنے دوستوں کو کہتا ہوں کہ بھئی آپ اپنے بچوں کو کہانیاں پڑھ کر سنایا کریں اس طرح ان کے اندر کردار بنتے ہیں۔ تو پھر ادراک بھی آجاتا ہے ۔۔۔ میں زندگی میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ میں "کوہ قاف" جاؤں گا اور ایک لڑکی کے لیے گل بکاؤلی کا پھول لے کر آؤں گا' تو اس فینٹسی نے آج تک مجھے انرجی دی ہوئی ہے ۔۔۔ بنیادی طور پر میں سول انجینئر ہوں اور دنیا میں بڑے رائٹر دراصل ڈاکٹر ہوتے ہیں یا کسی اور شعبے سے وابستہ ہوتے ہیں مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"اپنی فیملی کے بارے میں بھی بتایئے؟"

"میرا تعلق مستونگ سے ہے اور یہ بہت خوب صورت علاقہ ہے۔ بہت پڑھے لکھے لوگ ہیں یہاں کے اور جب دہشت گردی کے معاملے میں مستونگ کا نام آتا ہے تو مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ زیادہ تر میں کوئٹہ میں سیٹل رہا۔ میری تاریخ پیدائش 11 اکتوبر 1968ء ہے۔ ہم چار بھائی اور تین بہنیں ہیں مگر کوئی پروفیشنلی اس طرف نہیں آیا۔"

"شادی؟"

"جی بالکل شادی ہوئی' میری تین بیٹیاں ہیں اور ایک بیٹا ہے اور ماشاء اللہ چاروں پڑھ رہے ہیں بیگم

میری اگرچہ ہاؤس وائف ہے مگر ادبی ذوق بہت رکھتی ہے اور بہت پڑھتی ہے۔ خاص طور پر آپ کے ڈائجسٹوں کا بہت شوق سے مطالعہ کرتی ہے اور آپ سب کے ناموں سے بہت اچھی طرح واقف ہے۔"

"آپ کے ڈرامے شوق سے دیکھتی ہیں۔۔۔؟ کچھ اپنے مشہور ڈراموں کے نام بھی بتائیے۔"

"میرے مشہور ڈراموں میں "ماسوری' ونی' اشک' ملاقات' گونج' عیاری' ایکسپریس' شانتول' ماں اور ممتا' عورت اور چار دیواری' گھر کی خاطر اور سرگوشی" ہیں اور میری بیگم میرے ڈرامے بہت شوق سے دیکھتی ہے اور میری تحریروں کی سب سے بڑی تنقید نگار بھی ہے۔"

"مزاج کے کیسے رہے۔۔۔ لکھنے والے ذرا خشک مزاج مشہور ہوتے ہیں' رعب رہا آپ کا؟"

"رعب والی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میں بڑا رومانٹک آدمی ہوں بلکہ انتہائی رومانٹک ہوں میرے مزاج کے اندر ابھی بھی ایک عجیب بچپنا ہے۔ میری شادی کو چودہ سال ہو گئے ہیں اور جب میں اپنے بچوں کے نام لکھوانے جاتا تھا تو بچوں کے نام کے ساتھ اپنے والد کا نام لکھواتا تھا میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں باپ بن گیا ہوں۔ بچوں کے ساتھ میں بہت فرینڈلی ہوں اور ان کے ساتھ ایسے ری ایکٹ کرتا ہوں جیسے ایک بچہ دوسرے کے ساتھ کرتا ہے مثلاً" وہ اپنی چیز کے لیے لڑتا ہے تو میں بھی ویسے ہی لڑتا ہوں۔۔۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں اپنے بچوں کا بڑا بھائی ہوں۔۔۔"

"بیٹیاں خدا کی رحمت ہوتی ہیں' کچھ کہیں گے آپ اور عورت کے بارے میں کیا سوچ ہے آپ کی؟"

"میری ماشاء اللہ تین بیٹیاں ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ اللہ نے عورت بہت کمال کی چیز بنائی ہے' کوئی بہت ہی حسین چیز ہے۔ اس کی مٹھاس' اس کی کمپنی اس کی محبت' اس کے رویے۔

اب آجایئے بیٹیوں پر۔۔۔ میں نے اپنی سوسائٹی میں دیکھا ہے کہ بھائی ایک خاص وقت تک ایک ساتھ رہتے ہیں۔ مگر بہنوں کو دیکھا ہے کہ وہ آخری عمر تک ایک دوسرے کے ساتھ رہتی ہیں۔ ایک دوسرے کا ساتھ دیتی ہیں اور بیٹیاں آخری وقت تک اپنے والدین کا بھی ساتھ دیتی ہیں۔ تو بیٹی تو بہت ہی حسین تحفہ ہے والدین کے لیے رب کی طرف سے' مگر ہم نے ڈراموں میں عورت بیٹی کا' بہن کا امیج خراب کر دیا ہے۔"

اور اس خوب صورت بات کے ساتھ ہم نے ظفر معراج صاحب سے اجازت چاہی۔ بہت اچھی بات چیت رہی ان سے۔۔۔ اور بہت کچھ سمجھنے اور سیکھنے کا موقع ملا۔



میری خامشی کو بیاں ملے

ادارہ

ثمینہ کوثر عطاری.....ڈوگہ گجرات

1 گھر والوں نے تو ہمارا نام ثمینہ کوثر رکھا تھا پر گزرتے وقت نے جیسے ہر چیز پہ اثر کیا اسی طرح ہمارے بھی کئی نام معرض وجود میں آتے گئے جس کا جو دل کرتا ہے وہ ہمیں اسی نام سے بلاتا ہے مثلاً "مینا، خاری، مینو، مینا کالسو، حافظو وغیرہ باقی کچھ ایسے بھی ہیں جو لکھنے والے ہرگز نہیں باقی ایک خاصیت جو مجھ میں یہ ہے کہ میں سب کی باجی ہوں ان کی بھی جو مجھ سے چار سال چھوٹے ہیں اور ان کی بھی جن کے چار بچے ہیں۔ سب باجی کہتے ہیں اور ہم فقط ایک مسکراہٹ پاس کرنے پہ اکتفا کرتے ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں جس نے اتنی عزت دی ورنہ ہمارے اعمال کہاں اس قابل۔

چار بہن بھائیوں میں میرا پہلا نمبر ہے میں نے الکلیتہ الغوثیہ للبنات سے چار سالہ فاضل عربی کا کورس کیا ہے اور اب دنیاوی تعلیم کی طرف دھیان دے رہی ہوں میری نظر میں ہاسٹل کی زندگی بہت خوبصورت ہوتی ہے کیونکہ ایک دوسرے کو دیکھ کے سیکھنے کے بہت سے مواقع میسر آتے ہیں اور سب سے بڑی بات چوبیس گھنٹے دوستیں ساتھ ہوتی ہیں اور دوستیں ساتھ ہوں تو ہر دن عید اور ہر رات شب برات ہوتی ہے۔

بہن بھائیوں میں نوک جھونک ہر وقت چلتی رہتی ہے میں بھائیوں سے کافی ڈرتی ہوں پر گھر میں زیادہ میری ہی چلتی ہے گھر میں حکم کی سمجھیں عادت پڑھ چکی ہے آج کل بی اے کی تیاری اور مذہبی اسکالر کے فرائض سرانجام دے رہی ہوں۔

مجھے ڈاکٹر بننے کا بہت شوق تھا جو پورا نہیں ہو سکا پھر نرس بننے کا شوق جاگا پر اجازت نہیں ملی (ہائے!!)

2 خوبیاں اور خامیاں جاننے کے لیے میں نے دوستوں سے رجوع نہیں کیا کیونکہ میں سمجھتی ہوں انسان خود کو زیادہ بہتر جانتا ہے دوسروں کی نسبت اور ویسے بھی دوستیں پرانی ہیں اور ہم اب پہلے سے بہت زیادہ بدل چکے ہیں۔

دوسروں کی مدد کر کے خوش ہوتی ہوں۔ اپنا ظرف ہمیشہ بلند رکھتی ہوں، غم یا خوشی ہو رب کی بارگاہ میں جھکنا اور اس ذات کا شکر ادا کرنا کبھی نہیں بھولتی اور اپنے سے جڑے ہر رشتے سے محبت کرتی ہوں۔ اپنے شوق سے زیادہ پاپا کے شوق کو اہمیت دیتی ہوں کھانا بہت اچھا بناتی ہوں ویسے اگر آپ میری امی سے رجوع کریں تو ڈھونڈنے سے بھی کوئی خوبی امی کو نہیں ملتی مجھ میں۔

خامی یہ ہے کہ اکثر غصہ آجاتا ہے۔ لوگوں کی باتوں پر لیکن میں مسکرا کے نظرانداز کر دیتی ہوں جس سے سامنے والے کو یہ لگتا ہے کہ اسے کوئی فرق نہیں پڑتا اور اگلا بندہ بہت ہرٹ ہوتا ہے۔

3۔ جب میں ہاسٹل میں تھی تو لڑکیاں اس کی بہت تعریف کرتی تھیں جو بھی گھر سے آتی تھی اس سے خواتین کی قسط وار کہانیاں سنتی تھیں اور ہر ویک اینڈ پر میری دوست عطیہ کو گھیر کے بیٹھ جاتی تھیں اور اس سے ناول سنتی تھیں تب مجھے بہت غصہ آتا تھا کہ یہ کیسی حرکتیں کرتی ہیں پر اب میں خود پڑھتی ہوں اور دل چاہتا ہے کسی کو سناؤں پر کوئی سننے والا نہیں ہے۔ خواتین سے تعلق زیادہ پرانا تو نہیں البتہ گہرا ضرور ہے۔

4۔ ہمارے گھر میں سالگرہ کا کوئی اہتمام نہیں ہوتا ——— ایک دفعہ عطیہ نے 12 بجے وش کر کے گھڑی گفٹ کی تھی جو میں نے آج بھی بہت سنبھال کے رکھی ہے۔ اب بھی ہر سال وہ مجھے فون پہ وش کرتی ہے اور یہ لمحے میرے لیے بہت اہم ہیں کیونکہ عطیہ خود میرے لیے بہت اہم ہے۔

5۔ شاعری سے مجھے بہت گہرا لگاؤ ہے خود بھی لکھتی ہوں اور دوسروں کی بھی شوق سے پڑھتی ہوں۔

میرے پسندیدہ شاعر وصی شاہ، محسن نقوی، ارشد ملک اور احمد فراز ہیں۔ اگر ایک شعر کا انتخاب کرنا پڑے تو بہت مشکل ہے پھر بھی ایک شعر سب کی نذر۔

ماہ تاباں سے جا کے کہہ دو وہ اپنی کرنیں سنبھال رکھیں
میں اپنی ذات کے ذرے ذرے کو خود چمکنا سکھا رہی ہوں

آخر میں ایک بات کہنا چاہوں گی کہ جب بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں تو سب کو دعاؤں میں شریک کریں کیونکہ ہو سکتا ہے کسی کے نصیب کی بہت ساری خوشیاں آپ کے لفظ آمین کی منتظر ہوں۔

مبرا اشرف..... حاصل پور

1 میرا نام مبرا اشرف ہے لیکن صرف کاغذوں کی حد تک، ورنہ مجھے جن ناموں سے پکارا جاتا ہے وہ برا، بری، برو اور ان ناموں کو سننے کی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ اب اگر کوئی مجھے مبرا کہے تو میں چونک سی جاتی ہوں کہ یہ کس کا نام ہے۔ یہ تو ہو گیا میرے نام کا تعارف اب میری شخصیت کا تعارف یہ ہے کہ ایف۔ اے کے پیپر دے کے اب رزلٹ کے جان لیوا انتظار میں ہوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ بہت بے چینی سے رزلٹ کا انتظار کر رہی ہوں کہ کب مجھے اپنے رزلٹ کی خبر ملے اور مجھے سکون کی سانس نصیب ہو۔ صبح سے لے کر شام تک گھر کے کام کاج کرتے، ریڈیو سنتے، رسالے پڑھتے اور اگر قسمت سے بجلی دستیاب ہو تو ٹی وی دیکھتے دن گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ میری منگنی اپنے پھوپھی زاد سے ہو چکی ہے جو سعودیہ میں مقیم ہیں اور میں دل و جان سے ان کی واپسی کی راہیں تک رہی ہوں کہ کب یہ ہجر ختم ہو اور ہم ایک ہو جائیں۔ (آپ بھی دعا کیجیے گا میرے لیے)

2۔ جہاں تک خوبیوں اور خامیوں کی بات ہے تو دنیا میں کوئی بھی انسان پرفیکٹ نہیں بس اتنا ہے کہ انسان کو اپنی خامیوں سے آگاہ ضرور ہونا چاہیے تاکہ وہ کم از کم ان سے نجات پانے کی کوشش کر سکے۔ تو میں سب سے پہلے اپنی خوبیوں کو بیان کرنا چاہوں گی کیونکہ وہ زیادہ ہیں صفحات کم نہ پڑ جائیں خامیوں کا کیا ہے نہ بھی بتائی تو کوئی بات نہیں ویسے بھی کہ آپ کو پہلے بتایا ہے کہ میں منگنی شدہ ہوں اب اگر اتفاق سے "خواتین" وہ بھی پڑھ لیں تو وہ بھی میری خامیوں سے آگاہ ہو جائیں گے جو اچھی بات نہیں آپ ماشاء اللہ خود سمجھدار ہیں میری بات سے اتفاق تو ضرور کریں گی۔

تو جناب خوبیاں جو ماہ دولت میں پائی جاتی ہیں وہ یہ ہیں کہ بہت زندہ دل ہوں۔ مخلص ہوں۔ دوستی کر لوں تو نبھاتی بھی ہوں۔ دل میں بغض نہیں رکھتی۔ ہر بات صاف کہہ دینے کی عادت ہے۔ اپنی خوبیوں کے لیے اپنی بہت پیاری اور اکلوتی دوست عمیرہ سے رابطہ کیا تو اس نے یہ خوبیاں بتائیں۔ بہت معصوم ہو۔ بہت صاف دل کی مالک ہو۔ بہت ادب سے پیش آتی ہو سب سے۔ میرا خیال ہے اتنی خوبیاں کافی ہیں اب کیا میرے سسرالیوں کو ہارٹ اٹیک کروانے کا ارادہ ہے۔ (آہم آہم)۔

3 خواتین تقریباً" 2007 سے پڑھنا شروع کیا۔ اور جو بھی ڈائجسٹ رسالہ، میگزین، اخبار مل جائے چاٹ کے رکھ دیتی ہوں۔ اور میری فیورٹ رائٹر لبنیٰ جدون، نگہت سیما، نمرہ احمد، عنیزہ سید، سائرہ رضا، نایاب جیلانی، عفت سحر طاہر، سمیرا حمید، فرحت اشتیاق ہیں۔

4 سالگرہ کبھی بھی اہتمام سے نہیں منائی۔ صرف میری اکلوتی دوست عمیرہ ہے جو مجھے وش بھی کرتی ہے اور گفٹ بھی بھیجتی ہے۔

5 شاعری سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے اور مختلف شاعروں کی نظموں اور غزلوں سے میری ڈائریاں بھری ہوئی ہیں۔ اور جو بھی نظم غزل یا شعر اچھا لگے تو اسے فوراً" نوٹ ضرور کرتی ہوں۔ اپنا پسندیدہ شعر یہاں لکھ رہی ہوں۔

مجھ سے بچھڑ گیا جو گئے سال کی طرح
اس کا بھی حال ہو گا میرے حال کی طرح
آیا نہیں وہ رہ گئے رستے سجے ہوئے
یہ سال بھی گزر گیا ہر سال کی طرح

عفت سحر طاہر

بن مانگی دعا

امتیاز احمد اور سفینہ کے تین بچے ہیں۔ معیز' زارا اور ایزد۔ صالحہ' امتیاز احمد کی بچپن کی منگیتر تھی مگر اس سے شادی نہ ہو سکی تھی۔ صالحہ دراصل ایک شوخ' الھڑسی لڑکی تھی۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی خواہش مند تھی مگر اس کے خاندان کا روایتی ماحول امتیاز احمد سے اس کی بے تکلفی کی اجازت نہیں دیتا۔ امتیاز احمد بھی شرافت اور اقدار کی پاس داری کرتے ہیں مگر صالحہ ان کی مصلحت پسندی' نرم طبیعت اور احتیاط کو ان کی بزدلی سمجھتی تھی۔ نتیجتاً" صالحہ نے امتیاز احمد سے محبت کے باوجود بدگمان ہو کر اپنی سہیلی شازیہ کے دور کے کزن مراد صدیقی کی طرف مائل ہو کر امتیاز احمد سے شادی سے انکار کر دیا۔ امتیاز احمد نے اس کے انکار پر دلبرداشتہ ہو کر سفینہ سے نکاح کر کے صالحہ کا راستہ صاف کر دیا تھا مگر سفینہ کو لگتا تھا جیسے ابھی بھی صالحہ' امتیاز احمد کے دل میں بستی ہے۔

شادی کے کچھ ہی عرصے بعد مراد صدیقی اپنی اصلیت دکھا دیتا ہے۔ وہ جواری ہوتا ہے اور صالحہ کو غلط کاموں پر مجبور کرتا ہے۔ صالحہ اپنی بیٹی ابیہا کی وجہ سے مجبور ہو جاتی ہے مگر ایک روز جوئے کے اڈے پر ہنگامے کی وجہ سے مراد کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ صالحہ شکر ادا کرتے ہوئے ایک فیکٹری میں جاب کر لیتی ہے۔ اس کی سہیلی زیادہ تنخواہ پر دوسری فیکٹری میں چلی جاتی ہے جو اتفاق سے امتیاز احمد کی ہوتی ہے۔ اس کی سہیلی صالحہ کو امتیاز احمد کا وزیٹنگ کارڈ لا کر دیتی ہے۔ جسے وہ اپنے پاس محفوظ کر لیتی ہے۔ ابیہا میٹرک میں ہوتی ہے۔ جب مراد رہا ہو کر آ جاتا ہے اور پرانے دھندے شروع کر دیتا ہے۔ دس لاکھ کے بدلے جب وہ ابیہا کا سودا کرنے لگتا ہے تو صالحہ مجبور ہو کر امتیاز احمد کو فون کرتی ہے۔ وہ فوراً" آ جاتے ہیں اور ابیہا سے نکاح کر کے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کا بیٹا معیز احمد باپ کے اس راز میں شریک ہوتا ہے۔ صالحہ مر جاتی ہے۔ امتیاز احمد' ابیہا کو کالج میں داخلہ دلا کر ہاسٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ وہاں حنا سے اس کی



دوستی ہے۔ جو اس کی روم میٹ بھی ہوتی ہے' مگر وہ ایک خراب لڑکی ہوتی ہے۔

معیز احمد اپنے باپ سے ابیہا کے رشتے پر ناخوش ہوتا ہے۔ زارا اور سفیر احسن کے نکاح میں امتیاز احمد' ابیہا کو بھی مدعو کرتے ہیں مگر معیز اسے بے عزت کرکے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زارا کی نند رباب' ابیہا کی کالج فیلو ہے۔ وہ تفریح کی خاطر لڑکوں سے دوستیاں کرکے' ان سے پیسے بٹور کر ہلا گلا کرنے والا مزاج رکھتی ہے اور اپنی سہیلیوں کے مقابلے اپنی خوب صورتی کی وجہ سے زیادہ تر ٹارگٹ جیت لیا کرتی ہے۔ رباب' معیز احمد میں بھی دلچسپی لینے لگتی ہے۔ ابیہا کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے مگر وہ اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ وہ معیز احمد کی گاڑی سے ٹکرائی تھی کیونکہ معیز اپنے دوست عون کو آگے کردیتا ہے۔ ایکسیڈنٹ کے دوران ابیہا کا پرس کہیں گر جاتا ہے۔ وہ نہ تو ہاسٹل کے واجبات ادا کرپاتی ہے۔ نہ ایگزامز کی فیس۔ بہت مجبور ہوکر وہ امتیاز احمد کو فون کرتی ہے مگر وہ دل کا دورہ پڑنے پر اسپتال میں داخل ہوتے ہیں۔ ابیہا کو بحالت مجبوری ہاسٹل اور ایگزامز چھوڑ کر حنا کے گھر جانا پڑتا ہے۔ وہاں حنا کی اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کی ماما جو کہ اصل میں "میم" ہوتی ہیں' زور زبردستی کرکے ابیہا کو بھی غلط راستے پر چلنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا بہت سر پٹختی ہے مگر میم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ امتیاز احمد دوران بیماری معیز سے اصرار کرتے ہیں کہ ابیہا کو گھر لے آئے مگر سفینہ بھڑک اٹھتی ہیں۔ امتیاز احمد کا انتقال ہوجاتا ہے۔ مرنے سے قبل وہ ابیہا کے نام پچاس لاکھ گھر میں حصہ اور ماہانہ دس ہزار مقرر کرجاتے ہیں۔ اس بات پر سفینہ مزید سیخ پا ہوتی ہیں۔ معیز' ابیہا کے ہاسٹل جاتا ہے۔ کالج میں معلوم کرتا ہے' مگر ابیہا کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ وہ چونکہ رباب کے کالج میں پڑھتی تھی۔ اس لیے معیز باتوں باتوں میں رباب سے پوچھتا ہے مگر وہ لاعلمی کا اظہار کرتی ہے۔

عون' معیز احمد کا دوست ہے۔ ثانیہ اس کی منکوحہ ہے۔ مگر پہلی مرتبہ بہت عام سے گھریلو حلیے میں دیکھ کر وہ ناپسندیدگی کا اظہار کردیتا ہے۔ جبکہ ثانیہ ایک پڑھی لکھی' ذہین اور بااعتماد لڑکی ہوتی ہے۔ وہ عون کے اس طرح انکار کرنے پر شدید ناراض ہوتی ہے۔ پھر عون پر ثانیہ کی قابلیت کھلتی ہے تو وہ اس کی محبت میں گرفتار ہوجاتا ہے مگر اب ثانیہ اس سے شادی سے انکار کردیتی ہے۔ دونوں کے درمیان خوب تکرار چل رہی ہے۔

میم' ابیہا کو سیفی کے حوالے کردیتی ہیں جو ایک عیاش آدمی ہوتا ہے۔ ابیہا اس کے دفتر میں جاب کرنے پر مجبور کردی جاتی ہے۔ سیفی اسے ایک پارٹی میں زبردستی لے کر جاتا ہے' جہاں معیز اور عون بھی آئے ہوتے ہیں مگر وہ ابیہا کے یکسر مختلف انداز حلیے پر اسے پہچان نہیں پاتے تاہم اس کی گھبراہٹ کو محسوس ضرور کرلیتے ہیں۔ ابیہا پارٹی میں ایک ادھیڑ عمر آدمی کو بلاوجہ بے تکلف ہونے پر تھپڑ مار دیتی ہے۔ جواباً" سیفی بھی اسی وقت ابیہا کو ایک زوردار تھپڑ جڑ دیتا ہے۔ عون اور معیز کو اس لڑکی کی تذلیل پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ گھر آکر سیفی میم کی اجازت کے بعد ابیہا کو خوب تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اسپتال پہنچ جاتی ہے۔ جہاں عون اسے دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا معیز کی گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ عون کی زبانی یہ بات جان کر معیز سخت حیران اور بے چین ہوتا ہے۔ وہ پہلی فرصت میں سیفی سے میٹنگ کرتا ہے۔ مگر اس پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ ثانیہ کی مدد سے وہ ابیہا کو آفس میں موبائل بھجواتا ہے۔ ابیہا بمشکل موقع ملتے ہی باتھ روم میں بند ہوکر اس سے رابطہ کرتی ہے مگر اسی وقت دروازے پر کی دستک ہوتی ہے۔ حنا کے آجانے سے اسے اپنی بات ادھوری چھوڑنی پڑتی ہے۔ پھر بہت مشکل سے ابیہا کا رابطہ ثانیہ اور معیز احمد سے ہوجاتا ہے۔ وہ انہیں بتاتی ہے کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ میم اس کا سودا کرنے والی ہیں لہٰذا اسے جلد از جلد یہاں سے نکال لیا جائے۔ معیز احمد' ثانیہ اور عون کے ساتھ مل کر اسے وہاں سے نکالنے کی پلاننگ کرتا ہے اور یہیں اسے اپنا پرانا راز کھولنا پڑتا ہے۔

دسویں قسط

"وہ بہت مشکل میں ہے معیز بھائی! آپ سب نفع نقصان چھوڑ کر صرف یہ سوچیں کہ وہاں محض اس کی جان کو خطرہ نہیں ہے۔"

ثانیہ دبے لفظوں میں کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گئی۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنی پینٹ کی جیب میں رینگ گیا اور جب باہر آیا تو اس میں ایک پیپر دبا ہوا تھا۔

"یہ لو۔ شاید یہ کچھ کام آجائے۔" اس نے وہ پیپر عون کی طرف بڑھایا۔ عون اس کے بدلے ہوئے تاثرات پہ غور کرتا حیران سا ہو کر وہ پیپر دیکھنے لگا۔

اور اس پیپر کا متن پڑھتے ہی جیسے اسے چار سو چالیس والٹ کا جھٹکا لگا۔ اس نے بے اختیار بے یقینی سے معیز کی طرف دیکھا۔

عون کے تاثرات اس قدر شاکنگ تھے کہ ثانیہ بے اختیار اس کے شانے پر سے جھک کر اس کے ہاتھ میں تھما پیپر دیکھنے لگی۔

"یہ......"

"اسے تو وہ فوراً" چیلنج کرسکتے ہیں۔ کمیٹی آفس جاتے ہی قلعی کھل جائے گی کہ یہ تم نے نقلی بنوایا ہے۔"

لحاتی جھٹکے کے اثر سے نکلتے ہوئے عون نے کہا تو ثانیہ نے بھی خاصی مشکوک نظروں سے معیز کو دیکھا۔

"ہوں...." اس نے ایک نظر عون کو دیکھا۔ اور ہلکے سے اثبات میں سر ہلایا۔ "وہ جائیں گے تو ضرور پتا چل جائے گا.... اس نکاح نامے کی اصلیت کا۔"

معیز نے ان دونوں کی سماعتوں پر گویا کوئی دھماکا کر دیا تھا۔

عون کی نگاہوں میں حد درجہ بے یقینی اتر آئی۔ وہ بے اختیار صوفے پر آگے کو ہو بیٹھا۔ "یہ.... یو مین.... یہ اصلی ہے....؟"

"وہ لڑکی تین' ساڑھے تین سال سے آپ کے نکاح میں ہے؟" ثانیہ کی بھی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی۔

اور معیز.... وہ اپنے آپ کو بے حد ذہنی اذیت میں گرفتار محسوس کر رہا تھا۔

اپنے آپ کو کسی کے سامنے کھولنا کس قدر تکلیف دہ امر تھا' یہ وہی جانتا تھا۔ مگر صورت حال ایسی تھی کہ بتائے بنا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

"اوہ گاڈ...." ثانیہ کو صحیح معنوں میں تاسف نے گھیرا۔ پوری کہانی میں ایبھا کا کردار بہت قابل رحم تھا۔

"کیا قسمت ہے اس بے چاری کی۔ مظلوم ہوتے ہوئے بھی وہی پس رہی ہے۔"

"مگر معیز.... تو نے کیا کیا یار.... اس قدر معتبر رشتے میں باندھ کر ایسی لاپروائی....؟" عون کو یقین کرنے میں دشواری تھی۔

"میں اپنی صفائی پیش نہیں کروں گا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرے لیے یہ نکاح صرف ایک حادثہ تھا اور بس۔ ابو نے کہا تھا کہ اسے وہاں سے نکال کر وہ کہیں اور اس کی مرضی سے شادی کروا دیں گے۔"

معیز نے سرد لہجے میں کہا۔

"مگر وہ ابھی بھی آپ کے نکاح میں ہے۔ آپ نے اسے طلاق نہیں دی ہے۔ وہ آپ کی ذمہ داری ہے۔"

ثانیہ کو افسوس ہوا۔ وہ معیز سے ایسی بے وقوفی بلکہ سنگ دلی کی توقع نہیں رکھتی تھی۔

"اسی لیے تو خوار ہو رہا ہوں۔ ورنہ ایک بہترین لائف گزار رہا تھا میں۔" وہ تلخ ہوا۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" عون واقعی ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں گھرا تھا۔ اسے پچھلے تین سالوں سے معیز کی بدلتی نیچر اور ذہنی الجھاؤ کی کیفیت یاد آنے لگی۔

تو یہ راز تھا اس "بدلاؤ" کے پیچھے۔
"تم نے اپنے ہاتھوں سے اسے گنوایا ہے معیز! اگر انکل کا کہا مان کر تم نے ایک نیکی کر ہی لی تھی تو کم از کم اسے سنبھال کر رکھتے۔"
عون سے معیز کی طبیعت کا یہ پہلو برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔ سوجتانے والے انداز میں بولا۔ معیز نے سرخ ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھا اور بے حد ناگواری سے بولا۔
"میں نے یہ سب اس لیے نہیں بتایا کہ تم جوابا" مجھے ہی کٹہرے میں گھسیٹ لو۔ اگر تمہارے ذہن میں کوئی حل ہے تو بتاؤ۔"
"اوکے۔ معیز بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں عون!" ثانیہ نے فی الفور معیز کے غصے کو محسوس کیا اور فورا" ہی عون کو ٹوک دیا۔ "فی الحال تو اہم مسئلہ ہے ایبھا کو وہاں سے نکالنے کا۔ ان کی کھنچائی تو تم بعد میں بھی کر سکتے ہو۔"
عون نے گہری سانس بھرتے ہوئے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ درحقیقت وہ اس انکشاف کو قبول ہی نہیں کر پا رہا تھا جو یک لخت ہی معیز نے سامنے لا رکھا تھا۔
"تو اب کیا کیا جائے۔؟" عون کا انداز خفا خفا سا تھا۔ معیز نے تیکھی نگاہ اس پر ڈالی۔ اس کا موڈ بھی ٹھیک نہیں تھا۔
ثانیہ نے کھنکھارتے ہوئے ثالثی کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔
"میں کل رات کافی سوچتی رہی ہوں اس معاملے پر' میرے پاس ایک آئیڈیا ہے اگر آپ لوگوں کو پسند آئے تو۔" وہ آہستہ آہستہ بتانے لگی۔
معیز کے تاثرات بتاتے تھے کہ وہ اس خیال سے متفق ہے۔
"ارے واہ۔ بہت خوب ثانی! جی چاہ رہا ہے تمہارا منہ۔" عون تو پھڑک ہی اٹھا' بے اختیار والہانہ انداز میں کہنے لگا تو ثانیہ اونچی آواز میں اسے ٹوک گئی۔
"عون۔" تو وہ حیرت سے دونوں کو باری باری دیکھتے ہوئے معصومیت سے بولا۔
"موتیوں سے بھردوں یار۔ میں اور کیا کہنے والا تھا؟" معیز کو اس ٹینشن زدہ ماحول میں بھی ثانیہ کا تلملاتا سرخ پڑتا چہرہ دیکھ کر ہنسی آنے لگی۔ عون کی بدمعاشیوں سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔
ثانیہ منہ پھلائے چائے کے مگ لے کر چلی گئی تو وہ دونوں اس کے بتائے ہوئے خیال کو ٹھونک بجا کے دیکھنے لگے۔



میڈم رعنا کی اجازت کے بعد ان دونوں کو جس سٹنگ روم میں بٹھایا گیا تھا اس کے در و دیوار پر آویزاں جذبات کو برانگیختہ کرنے والی تصاویر پر نگاہ پڑتے ہی ان دونوں نے بے ساختہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور نگاہ چرالی۔ ملازم انہیں بٹھا کر ان کے وزیٹنگ کارڈ واپس تھما گیا۔
"اگر میں مزید آدھا گھنٹہ اس ماحول میں بیٹھا تو مجھے الٹی ہو جائے گی۔"
ایک نے کہا۔ دوسرے نے تحمل انداز میں مشورہ دیا۔
"صرف پچیس منٹ تک سیدھی کیے رکھو پھر بیشک الٹی کر دینا۔"
اسی وقت دروازے سے خوشبوؤں کا ایک جھونکا سا اندر آیا۔
وہ دونوں بے اختیار کھڑے ہو گئے۔

"اچھا۔" میڈم چہکیں۔ "وزیٹنگ کارڈ دیکھ کر تو میں سمجھی کہ کوئی بڑی عمر کے صاحب ہوں گے۔"
انہوں نے ناز سے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا جسے دونوں نے ہلکا سا تھام کر چھوڑ دیا۔ انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتی میڈم ان کے سامنے سنگل صوفے پر ٹانگ پہ ٹانگ جما کر بیٹھ گئیں۔
تپائی پر رکھے سگریٹ کیس میں سے ایک سگریٹ نکال کر میڈم نے اسے لائٹر سے شعلہ دکھایا اور ایک طویل کش لیا۔
وہ دونوں سامنے بیٹھے ہونق بنے یہ "لائیو شو" دیکھ رہے تھے۔
"میڈم کے ڈریم لینڈ میں آنے کا مطلب سمجھتے ہو نا؟" میڈم نے دیواروں پر لگی پینٹنگز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معنی خیزی سے کہا۔
"جی۔۔۔ جی۔۔۔"
بلیک ہاف سلیوز شرٹ میں ملبوس یہ عون عباس تھا۔ عون کو ثانیہ کا یہ آئیڈیا اچانک زہر لگنے لگا تھا۔
"کیا چاہیے۔۔۔؟" میڈم نے معنی خیز نگاہوں سے باری باری ان دونوں کو دیکھا۔ معیز کو سخت کراہیت محسوس ہوئی۔
"کوئی بھی۔ نیا پیس۔ ان ٹچ۔"
وہ جیسے ست پیشہ ور بن کے بولا۔ میڈم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔
معیز کا خون کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ اس نے دانتوں پر دانت جما کر سرد نظروں سے میڈم کو دیکھا۔
"دراصل! مجھے چاہیے۔ آفس ورک کے لیے۔ اس ہفتے یورپی ڈیلی گیشن آ رہا ہے۔ میں نے کوئی لیڈی سیکریٹری نہیں رکھی ابھی تک۔ سیفی سے آپ کا سنا تھا۔۔۔" سیفی کا نام سن کر میڈم مطمئن ہو گئیں۔
انہوں نے تپائی پر رکھا البم اٹھا کر آگے بڑھایا۔
"پیس تم خود سلیکٹ کرو۔ قیمت میں بتاؤں گی۔" عون نے البم پکڑ کر معیز کے حوالے کیا۔
البم کھولتے ہی جیسے جہنم کا در وا ہوا تھا۔ وہ میڈم کے پاس کام کرنے والی لڑکیوں کی غیر مہذب تصاویر تھیں۔
معیز نے فی الفور البم بند کیا۔ عون تو باقاعدہ اس کی طرف سے تھوڑا سا پہلو بدل کے بیٹھ گیا تھا۔ درحقیقت اس کی طبیعت مکدر ہو رہی تھی۔
"یہ سب نہیں۔۔۔ ایکچوئلی میرے آفس کا ماحول ایسا نہیں ہے۔" معیز نے معذرت خواہانہ انداز اپنایا۔
"ہوں۔۔۔" میڈم نے سوچنے میں لمحہ لگایا۔
"ایسا نادر پیس بھی ہے میرے پاس۔ مگر قیمت ڈبل ہو گی۔ سمجھتے ہو نا تم۔ ان ٹچ ہے وہ۔"
"نام کیا ہے۔۔۔؟" معیز رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔
"ایہانام ہے اس کا۔ ابھی نئی ہے اس لیے اس کا سارا حساب کتاب میرے ہاتھ میں ہے۔"
میڈم نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔
"ٹھیک ہے۔ دیکھ لیتے ہیں۔" معیز نے فوراً "اوکے" کر دیا۔ وہ تو شکر تھا کہ میڈم نے خود ہی ایہا کا نام لے دیا، ورنہ۔۔۔ خود نام لیتے ہوئے اسے۔ بہت پریشانی ہوتی۔ اس صورت میں میڈم بھی مشکوک ہو سکتی تھیں۔
میڈم نے انٹرکام اٹھا کر ایک نمبر دبایا۔
"ایہا کہاں ہے؟" تحکمانہ انداز میں پوچھا۔
"ہوں۔۔۔ ٹھیک ہے۔ پارلر سے جائے تو فوراً میرے پاس بھیجنا۔"
انٹرکام رکھتے ہوئے میڈم نے معذرت خواہانہ انداز میں ان دونوں کو دیکھا۔

"ابھی وہ پارلر گئی ہوئی ہے۔ ورنہ تمہاری ملاقات ہوجاتی۔"
"ڈونٹ وری۔ ہمیں آپ کے کہے پر یقین ہے۔" معیز کو اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے میں قیامت کا سامنا تھا۔
اسے شدت سے یہ احساس اندر ہی اندر کچوکے لگا رہا تھا کہ ایہا مراد کی وجہ سے آج وہ وہاں آنے پر مجبور ہو گیا تھا' جہاں آنے کا کبھی وہ خواب میں بھی سوچ نہ سکتا تھا۔
اور میڈم رعنا جیسی بے حمیت' بے غیرت اور بد قماش عورت کو تو وہ کبھی منہ بھی نہ لگاتا مگر یہ ایہا مراد....
معیز نے جبڑے بھینچے۔
"میرے خیال میں اب باقی کی ڈیٹیلز طے کر لیتے ہیں۔"
میڈم کے ہونٹوں پر شاطرانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔



وہ ڈرائیور کے ساتھ پارلر آئی تھی۔
میڈم کی دی مہلت آج ختم ہوئی تھی' سو آج سے اسے میڈم کے بتائے "راستے" پہ چلنا تھا۔
وہ پورا راستہ اپنی آنے والی زندگی کے متعلق سوچتی رہی اور آنسو بہاتی رہی۔
اور ایک قیمتی متاع۔
اس نے اپنے شولڈر بیگ کو دبوچ کر سینے سے لگایا۔
اس شولڈر بیگ کی تہہ میں ٹشو پیپرز میں لپٹا موبائل فون رکھا تھا۔
اس کی نجات کا ذریعہ۔ شاید آخری۔
پارلر میں کسٹمرز کا رش بے پناہ تھا مگر میڈم رعنا کی بھیجی ہوئی لڑکی پر خصوصی توجہ دی گئی۔
کھٹ' کھٹ' کھٹ
ایک لڑکی کے ماہرانہ انداز میں چلتے ہاتھ اس کے کمر تک آتے بالوں کو نئی لک دینے لگے اور وہ بے تاثر نگاہوں سے سامنے شیشے میں دیکھتی موبائل کو استعمال کرنے کا طریقہ سوچ رہی تھی۔
"چلیں میم! مینی کیور اور پیڈی کیور کے لیے۔" کٹنگ سے فارغ ہو کر کپڑا جھاڑتے ہوئے لڑکی نے اسے چونکایا اور ساتھ ہی ہاتھ سے اسے ایک کیبن کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔
"باتھ... باتھ روم کہاں ہے؟" وہ ہکلائی۔
"اس کیبن کے سامنے والے کیبن کے اندر ہے۔" لڑکی اسے بتا کر اگلی کسٹمر کی طرف متوجہ ہو گئی۔
وہ چور نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی اپنا شولڈر بیگ دبوچے باتھ روم کی طرف آگئی۔ اندر آکر اس نے پھرتی سے شولڈر بیگ کھول کر اندر سے موبائل فون نکالا۔ فی الحال کیبن میں کوئی نہیں تھا اور وہ ثانیہ سے بات کر سکتی تھی۔
لرزتے ہاتھوں سے ثانیہ کو کال ملا کر دھڑکتے دل کے ساتھ وہ انتظار میں تھی۔
اس کا نام دیکھ کر ثانیہ نے فوراً" ہی کال اٹینڈ کر لی۔
"م... میں ایہا...!" اس کا حلق خشک تھا۔
"ہاں... بولو ایہا۔ خیر سے ہو تم؟" ثانیہ نے بے چینی سے پوچھا۔
"وہ... میں... پارلر آئی ہوئی ہوں۔ ابھی مجھے یہاں کافی ٹائم لگے گا... آپ پلیز۔ میری ہیلپ کریں پلیز۔"
اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

آخری داؤ تھا جو وہ اپنی جان پہ کھیلنے جا رہی تھی۔ اس کے بعد تو شاید ایمہا مراد کو کوئی دیکھ بھی نہ پاتا۔ اور اگر دیکھ بھی لیتا تو شاید دامن بچا کے آگے نکل جاتا۔

"کون سا پارلر ہے ایمہا! ریلیکس۔ میں ابھی فوراً آؤں گی۔ تم نام جانتی ہو پارلر کا؟" اور اپنی قسمت آزمانے کے لیے ایمہا نے آتے ہوئے سائٹ ایریا اور پارلر کا نام اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا۔ اس نے ثانیہ کو نوٹ کروا دیا۔

"تم بے فکر رہو ایمہا! اور کوشش کرو کہ زیادہ سے زیادہ وقت پارلر میں ٹھہر سکو۔ میں فوراً آ رہی ہوں۔" ثانیہ نے اسے سمجھایا۔

"جلدی... پلیز۔ یہ پارلر بھی میڈم کی جاننے والی کا ہے۔" وہ بھنچے ہوئے لہجے میں بولی۔ خوف اس کی آواز اور ہر ہر انداز سے ظاہر تھا۔

"او کے... بس میں نکل رہی ہوں۔ ڈونٹ وری ایمہا!" ثانیہ نے رابطہ منقطع کر دیا۔

ایمہا کے دل کو کچھ ہوا۔ شاید یہ آخری رابطہ تھا۔

وہ موبائل کو بیگ میں ڈال کر جلدی سے باہر آئی تو اسے دیکھ کر ایک لڑکی تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

"آپ میم رعنا کی ایمپلائی ہیں ناں؟"

"جج... جی..." وہ گڑبڑا کر خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"جلدی سے جا کر اپنا کام ختم کروائیں۔ میم کا فون دوبار آچکا ہے۔"

اس نے کہا تو ایمہا کا دل اچھل کر حلق میں آ اٹکا۔ میڈم کا کام بہت منظم تھا۔

ایمہا جب پارلر پہنچی تب ڈرائیور نے اس کے پہنچ جانے کی اطلاع کی تھی اور اب ایمہا باہر تب ہی جا سکتی تھی، جب پارلر والی فون پر ڈرائیور کو انفارم کرتی کہ ایمہا باہر آنے لگی ہے۔ پھر وہ میڈم کو اطلاع دیتا اور اسے لے کر پہنچتا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ مینی کیور پیڈی کیور سیکشن کی طرف بڑھ گئی۔

لرزیدہ دل جلد از جلد ثانیہ کے آنے کی دعا مانگ رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

ثانیہ نے پہلے تو معیز کو فون کرنے کا سوچا مگر پھر اسے دھیان آیا کہ وقت بہت مختصر تھا۔ جو بھی کرنا تھا اسے خود ہی کرنا تھا۔

اس نے جلدی سے الماری کھول کر اپنا عبایا نکالا۔ بہت زیادہ رش والی جگہ پر جاتے ہوئے وہ اکثر عبایا استعمال کرتی تھی۔

ابھی اس کے ذہن میں کوئی واضح پلان تو نہ تھا مگر وہ احتیاطاً "وہاں اپنی پہچان چھپا کر جانا چاہتی تھی۔

جلدی سے عبایا پہن کر وہ خالہ سے گاڑی کی چابی لینے آگئی۔

"ہائیں۔ کدھر چل دیں اس وقت۔ وہ بھی عبایا پہن کر؟"

"ڈرائیور کے ساتھ جاؤں گی خالہ! پارلر میں اپائنٹمنٹ ہے۔"

اس نے شرافت سے کہا۔

"تو عون کو بلا لیتیں۔"

"وہ کہیں بزی ہے خالہ! اور میرے پاس انتظار کرنے کا بالکل بھی وقت نہیں۔"

ثانیہ نے آگے بڑھ کے دراز کھول کے چابی نکال لی۔ وہ گہری سانس بھر کے رہ گئیں۔

ثانیہ جلدی سے باہر آئی ڈرائیور کو بلایا۔ گاڑی کی چابی اس کی طرف اچھالی۔

"جلدی۔۔۔ فوراً"

اسے ایڈریس بتاتے ہوئے ثانیہ نے بعجلت کہا۔ وہ کسی طور بھی اس موقع کو کھونا نہیں چاہتی تھی اور نہ ایبھا مراد کو۔



میڈم حنا پر برس رہی تھیں۔

"میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ جب تک وہ ایک طرف لگ نہیں جاتی۔ اس کے ساتھ ساتھ رہو۔ پھر اسے اکیلے ڈرائیور کے ساتھ کیوں بھیجا تم نے؟"

"سوری میم! میں بزی تھی۔ اور ویسے بھی شاہانہ کا پارلر ہے تو میں نے سوچا۔۔۔" حنا منمنائی۔

"اتنا مت سوچا کرو۔" میڈم نے اونچی آواز میں اس کی بات کاٹی۔ "یہاں سوچنے کا کام صرف میرا ہے۔ جاؤ دفع ہو جاؤ اور اسے فارغ کروا کر یہاں لاؤ۔ ڈیل ہو چکی ہے اس کی شام کو پارٹی آرہی ہے اسے لینے۔"

"جی۔۔۔" حنا نے کان لپیٹ کر وہاں سے کھسکنے میں ہی عافیت جانی۔ دوسرا ڈرائیور مالی سے گپیں لڑا رہا تھا۔ وہ جلدی سے آکر گاڑی میں بیٹھی۔

"شاہانہ کے پارلر جانا ہے۔" تحکمانہ انداز میں اس نے کہا۔

"جی میم۔۔۔" وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور گاڑی پارلر کی طرف رواں ہوگئی۔



ڈرائیور کو پارلر کے نزدیک ہی گاڑی پارک کرنے کا کہہ کر وہ نیچے اتری۔

"میں بس ابھی آرہی ہوں۔" اس نے ڈرائیور کو الرٹ رکھنے کی خاطر کہا۔ "گاڑی میں ہی رہنا۔ پان سگریٹ کے لیے مت نکل جانا۔ مجھے زیادہ ٹائم نہیں لگے گا۔" ثانیہ کو دھیان آیا۔

"جی میڈم۔" وہ مودب ہوا۔

ثانیہ ادھر ادھر دیکھتی جلدی سے پارلر میں گھس گئی۔ اب اسے اتنے رش اور اتنے وسیع پارلر میں ایبھا کو ڈھونڈنا تھا۔

مختلف کیبنوں میں جھانکتی، پیڈی کیور کراتی ایبھا اسے دکھائی دے ہی گئی تو وہ اطمینان کا سانس لیتی اس کی طرف بڑھی۔



ایبھا کے دل کی حالت اس وقت خدا ہی جانتا تھا۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ آج اگر وہ یہاں سے میڈم کے اڈے پر دوبارہ چلی گئی تو زندگی بھر وہاں سے نکل نہ پائے گی۔

"کیا ثانیہ آجائے گی۔۔۔ ابھی تک تو اسے آجانا چاہیے تھا۔۔۔ اور اگر نہ آئی تو۔۔۔"

اس کی رنگت زرد پڑتی جا رہی تھی۔

اسی وقت کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دباؤ بڑھایا تو وہ چونک کر دیکھنے لگی۔

"واہ۔۔۔ بڑی موجیں ہو رہی ہیں۔" وہ چہکی اور اسے سامنے دیکھ کر ایبھا کا دل رکتے رکتے بچا۔ وہ خبیث مسکراہٹ لیے چہکتی حنا تھی۔



"تو کیا... میری باقی کی زندگی میڈم کے جہنم میں گزرنے والی ہے؟"
ایبہا کے وجود پر دھڑدھڑ کرتی ٹرین سی گزرنے لگی۔



وہ جوش سے آگے بڑھی۔ ارادہ ایبہا کو متوجہ کرنے کا تھا مگر اسی وقت ایک شوخ سی لڑکی نے ایبہا کے شانے پر ہاتھ رکھ کے اسے متوجہ کر لیا تو وہ ٹھٹک گئی۔
ایبہا کے چہرے کا خوف اس سے چھپا نہ رہ سکا۔ ثانیہ کا دل ڈوب سا گیا۔
مطلب میڈم کا کارندہ ایبہا کو لینے اس سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ وہ مایوس ہو کر ایک طرف پہ بیٹھ گئی۔
"جی۔ آپ نے کیا کروانا ہے؟" ایک لڑکی نے اس سے پوچھا۔
"وہ... میں ان کے ساتھ ہوں۔" ثانیہ نے گڑبڑا کر دور بیٹھی مینی کیور، پیڈی کیور کراتی ایک عورت کی طرف اشارہ کیا۔
"آپ ویٹنگ روم میں چل کے بیٹھیں۔ یہاں صرف کسٹمرز الاوڈ ہیں۔"
وہ خاموشی سے ایبہا کو دیکھتے ہوئے اٹھ گئی۔
اس لڑکی کو سامنے دیکھ کر ایبہا کے چہرے سے جھلکتا خوف بہت واضح تھا۔
ثانیہ کا دل پریشانی کا شکار ہونے لگا۔
اسے ویٹنگ روم میں آکر بیٹھے ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایبہا بھی اس لڑکی کے ساتھ آگئی۔ اس کا کام یقیناً" ختم ہو چکا تھا۔
"حنا... میں ذرا... واش روم جانا ہے مجھے..." ثانیہ نے قریب آنے پر ایبہا کی آواز سنی۔
اس کا دل بے ترتیبی سے دھڑکا۔
"ایبہا یقیناً" واش روم جا کر مجھ ہی سے رابطہ کرنا چاہتی تھی۔"
"ہوں... جلدی آنا۔ میم کا موڈ پہلے ہی بہت خراب ہے۔"
حنا نے ناگواری سے کہا اور پھر پارلر والی لڑکی سے گفت و شنید میں مصروف ہو گئی۔
ثانیہ موقع پا کر تیزی سے اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھی اور ایبہا کے پیچھے ہی وہ بھی اندر داخل ہو گئی۔
اس نے چہرے کو قدرے ڈھانپنے والے اسکارف کو سرکا کر ایبہا کو آواز دی۔
"ایبہا...!" وہ کرنٹ کھا کر پلٹی... بے یقینی سے ثانیہ کو دیکھا پھر روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔
"مجھے بچا لو پلیز... وہ... حنا آگئی ہے مجھے لینے پلیز۔"
ثانیہ نے لمحہ بھر کچھ سوچا پھر تیزی سے اپنا عبایا اتارنے لگی۔
"جلدی سے یہ پہنو اور اچھی طرح اسکارف اوڑھ لو۔ جیسے میں نے اوڑھا ہوا تھا۔"
ثانیہ نے بعجلت کہا تو وہ فوراً" اس کی بات سمجھ کر اس کے کہے پر عمل کرنے لگی۔
ثانیہ نے اس کا شولڈر بیگ ٹٹولنا شروع کیا۔
"اس میں کچھ قیمتی چیز تو نہیں؟"
"صرف موبائل ہے۔" ایبہا نے کہا۔
"ثانیہ نے موبائل نکال کر اپنے بیگ میں رکھا اور ایبہا کا بیگ سائیڈ پر ڈال دیا۔
اس نے ایبہا کا اسکارف بالکل اپنی طرح سیٹ کیا اور اپنا شولڈر بیگ بھی اسے تھما دیا۔

"ثانیہ ایبھا۔ اٹس یور ٹرن۔ (ایبھا! اب تمہاری باری ہے)" ثانیہ نے اپنے لفظوں پہ زور دیتے ہوئے کہا۔

"بی کانفیڈنٹ! آرام سے سیدھے چلتے ہوئے دروازے سے باہر نکل جاؤ۔ تمہیں کوئی بھی نہیں روکے گا۔ ڈرنا مت۔ یہ تمہارا شاید آخری چانس ہے۔ حوصلے اور ہمت سے کام لینا۔"

ایبھا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ دونوں اکٹھی باہر آئیں۔

"میں تم سے باتیں کرتی رہوں گی۔ تم جلد بازی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔ خصوصاً" حنا کے قریب سے گزرتے ہوئے۔ مت بھولو کہ اس وقت تم اپنے نہیں میرے والے حلیے میں ہو۔"

ثانیہ ہلکی آواز میں اس کے ساتھ چلتے ہوئے اسے سمجھا رہی تھی۔

انہوں نے دفعتاً" حنا کو اپنی طرف آتے دیکھا تو ثانیہ ٹھٹکی۔ ایبھا نے بے اختیار ثانیہ کا بازو تھام لیا۔



"دیکھ لیا تم نے اپنی سنگ دلی کا انجام۔ کس قدر بے ہودہ بلکہ انسانیت سے عاری ماحول میں رہ رہی ہے وہ بے چاری۔ صرف تمہاری بے کار کی ضد اور بے جا انا کے ہاتھوں۔"

عون سارے راستے اس سے الجھتا آیا تھا۔

میڈم رعنا کے اڈے کا ماحول رہ رہ کر اس کے خون میں چنگاریاں دوڑا رہا تھا۔

"اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ وہ لڑکی ایک مصیبت کی طرح میرے سر پر لادی گئی تھی۔"

معیز خود بھی عجیب پژمردہ سے احساسات کا شکار تھا۔

وہ مرد تھا۔ میڈم کے ماحول نے اس ایک گھنٹے میں اس کے ذہن پر اتنا برا اثر ڈالا تھا تو وہ نازک سی لڑکی۔۔۔۔

اسے میڈم کا کھلاڈلا لہجہ یاد آیا۔

ایسے ہی وہ ایبھا سے بھی باتیں کرتی ہوگی۔

"وہ ایک نیکی تھی معیز احمد! جو تم جیسے ناشکرے سے کروائی گئی۔ مگر تم نے اس کے ثواب کو سمجھے بغیر اسے کسی بوجھ کی طرح سر پہ لاد لیا۔" عون نے برہمی سے کہا۔

"میں کبھی بھی اس رشتے کو نبھانا نہیں چاہتا تھا عون! تم کبھی ماما کے جذبات سنو اس کی ماں کے بارے میں تو تمہیں پتا چلے۔"

معیز بے زار ہوا۔

"رشتے نبھانے نہ آتے ہوں تو رشتے بنانے ہی نہیں چاہئیں معیز۔۔۔!" عون نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

"ابھی بھی اس کا سودا ہو رہا ہے۔ پہلے ہی ہو جانے دیتے۔"

"اچھا شٹ اپ! اب کوشش کر تو رہا ہوں اپنی غلطی کو سدھارنے کی۔"

معیز کو دفعتاً" "بہت ہوا" کا خیال آیا تو عون کو فوراً" ہی جھاڑ دیا۔

عون نے گھور کے اسے دیکھا تھا۔



ایبھا کی ٹانگیں کپکپانے لگیں۔

"میں ذرا اس الو کی پٹھی کو دیکھوں۔ اتنا ٹائم ویسٹ کر رہی ہے۔"

حنا اس لڑکی سے کہتی ان کے قریب سے گزر گئی۔ تب ثانیہ نے ایبھا کا ہاتھ تھاما اور تیزی سے دروازے کی

طرف بڑھی۔

باہر آکر اس نے جلدی سے اپنی گاڑی اور ڈرائیور پر نگاہ کی تو دل میں سکون سا اُتر آیا۔

وہ ایبہا کو لیے گاڑی میں آبیٹھی۔

"جلدی کرو۔ فوراً" گاڑی نکالو یہاں سے۔" وہ ڈرائیور کو حیرت سے اپنی طرف دیکھتا پا کر ڈپٹ کر بولی تو وہ جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔

وہ یقیناً" اس کے حلیے پر الجھا تھا۔ گاڑی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔

"اب گھر جاکے سب سے پہلے شکرانے کے نوافل پڑھنا۔" ایبہا کا ہاتھ دباتے ہوئی ثانیہ نے دھیمی مگر پرجوش آواز میں کہا تو آزادی کا طاقت ور احساس پا کر ایبہا کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ اللہ کی شکر گزار تھی۔



میڈم رعنا کے اڈے پر گویا بھونچال آیا ہوا تھا۔

میڈم نے خود حنا کو تھپڑوں لاتوں پر رکھ لیا۔ بال نوچ پہلے اس کے اور پھر اپنے۔

"وہ کہاں غائب ہو گئی اور کیسے؟ چڑیا تھی کہ روشندان میں سے اڑ گئی۔ تم نے اُسے جانے کیسے دیا وہاں سے۔"

میڈم کف اڑا رہی تھیں۔

ابھی کچھ دیر پہلے انہوں نے ایک ہفتے کے لاکھوں طے کیے تھے ایبہا کے۔

بنا چھوئے۔ بنا ہاتھ لگائے، وہ ایک ہفتے میں واپس آجاتی اور لاکھوں بھی مل جاتے۔

ایسے بے وقوف شکار روز روز تھوڑی ملا کرتے تھے۔

اور حنا تو خود بے یقینی سے شل دماغ لیے پٹ رہی تھی۔ واش روم میں ایبہا کا بیگ موجود تھا۔

وہ کچھ دیر انتظار کرتی رہی۔ پھر دروازہ دھکیل کر دیکھا تو وہ کھلا ہوا تھا۔

اس نے جلدی سے دوسرا واش روم چیک کیا۔ وہ بھی خالی تھا۔

اور اب۔ ساری مصیبت اس کے سر۔

وہ خطا کار ٹھہرائی جارہی تھی۔ وہ پٹتی جارہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ آخر وہ گئی کہاں؟



گھر آکے وہ تحفظ کے احساس میں گھری ثانیہ سے لپٹ کے خوب روئی۔

بے تحاشا۔ اونچی آواز میں پھوٹ پھوٹ کر۔

ثانیہ اس کے جذبات سمجھتی اسے تھپکتی رہی۔

وہ جہنم سے نکل کے آئی تھی۔ پھر ثانیہ اس کے لیے ٹھنڈا پانی لے کر آئی۔ اسے آرام سے اپنے بستر پر بٹھایا اور گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ گھونٹ گھونٹ کر کے پانی حلق سے اتارنے لگی۔

ثانیہ نے بغور اسے دیکھا۔

پہلی ملاقات میں وہ ایک سادہ غربت زدہ اچھی شکل و صورت کی لڑکی لگی تھی۔ مگر میڈم رعنا نے تو اس کے حالات ہی بدل ڈالے تھے۔ بنا میک اپ کے چمکتی جلد اور جدید انداز میں تراشے بال اتنے خوب صورت اور صحت مند کہ ایک ساتھ ترتیب سے اس کے شانوں پہ گرے ہوئے تھے۔

کھور سیاہ آنکھوں اور سیاہ بالوں والی وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ جس کے ہونٹ بنا سرخی کے ہی لال تھے۔

ثانیہ کو اس کی خوب صورتی دیکھ کر اس کی قسمت پر ترس آیا۔

رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

"اللہ جب کسی کو بچانا چاہتا ہے تو ہزار راستے خود بخود بن جاتے ہیں ایہا۔۔ اور تم صرف یہ یاد رکھو کہ اللہ تمہیں بچانا چاہتا تھا۔" ثانیہ نے نرمی سے کہا۔

"میں آپ کا احسان کبھی چکا نہیں پاؤں گی۔" اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

"یہ اس اللہ کا احسان ہے تم پر، ورنہ کئی لڑکیاں اسی دلدل میں دھنسی ہوئی ہیں۔"

ثانیہ نے اسے ٹوک دیا۔ وہ عون کا نمبر ملا رہی تھی۔ ایک بار پھر ملا اور اس کے بعد ثانیہ کے موبائل کی بیٹری ڈاؤن ہوگئی۔ معیز یا عون سے رابطہ نہ ہو پایا تھا۔

"تم فریش ہو جاؤ۔ یہ میری وارڈ روب ہے، جو بھی دل چاہے کپڑے نکالو اور چینج کر لو۔" وارڈ روب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ثانیہ نے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے مسکرا کر کہا اور موبائل چارجنگ پہ لگانے لگی۔

"میں ذرا خالہ جان کے پاس چکر لگا کے آتی ہوں۔" ثانیہ اسے کچھ دیر تنہا رہنے کا موقع دینا چاہتی تھی۔

اس کے جانے کے بعد ایہا نے گہری سانس بھرتے ہوئے اپنی آزادی کا احساس کرنا چاہا تو آنکھیں پھر بھر آئیں۔ اس نے اٹھ کر ثانیہ کی وارڈ روب کھولی اور ایک سادہ سا لان کا سوٹ نکال کر واش روم میں گھس گئی۔

پہلے وہ اپنے جسم پر سے میڈم کی غلامی کی علامت اس ٹراؤزر شرٹ کو اتار پھینکنا چاہتی تھی۔

اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر وہ کتنی ہی دیر آنسو بہاتی اور اس کا شکر ادا کرتی رہی۔

ثانیہ کمرے میں لوٹی تو وہ دوپٹا نماز کے اسٹائل میں لپیٹے تکیے سے ٹیک لگائے اونگھ رہی تھی۔ ثانیہ کو دیکھ کر چونک گئی۔

"اوں ہوں۔۔" ثانیہ نے اسے اٹھتے دیکھ کر منع کیا۔ "تم آرام کرو بلکہ کچھ دیر نیند لے لو۔ جانے کب سے ٹھیک طرح سے نہیں سوئی ہو گی۔ میں اپنا موبائل چیک کرنے آئی تھی۔" ایہا کو جوس سے لبریز گلاس تھمانے کے بعد وہ موبائل کی چارجنگ چیک کرنے لگی۔

ثانیہ کے جانے کے بعد وہ لیٹی تو ذہن اس قدر ٹینشن فری تھا کہ اسے بنا کچھ بھی سوچے سونے میں محض چند منٹ لگے۔



"آئم سوری۔۔ یہ ڈیل نہیں ہو سکے گی مسٹر معیز!" میڈم کا انداز فون پر معذرت خواہانہ تھا۔

معیز کو جھٹکا لگا۔

"مگر کیوں؟ آپ کی مرضی کے مطابق ڈیل ڈن ہوئی ہے اور ایڈوانس بھی پے کر دیا تھا میں نے۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔

"وہ سب میں مانتی ہوں لیکن وہ لڑکی اب میں تمہیں نہیں دے سکتی یوں سمجھو کہ وہ اب میری رینج سے باہر ہو چکی ہے تم آ کے اپنی ایڈوانس پے منٹ واپس لے سکتے ہو بلکہ چاہو تو اس کی جگہ کوئی دوسرا پیس۔۔" میڈم کے انداز میں شگفتگی تھی۔ معیز کا دل خوف زدہ سا ہو گیا۔

"اس لڑکی کا کیا ہوا۔۔ کہیں اور ڈیل ہو گئی ہے کیا؟"

"نہیں۔ یہ ہمارے بزنس کا اصول نہیں ہے۔ تم سے ڈیل ہوئی تھی تو وہ صرف تم ہی کو ملتی مگر وہ کم بخت بھاگ نکلی۔ کم بخت کو عزت سے جینے کا بہت شوق تھا مگر یہ نہیں جانتی کہ یہاں سے بھاگ کے کن کن ہاتھوں میں مسلی جائے گی۔"

میڈم کے انداز میں ایبہا کے لیے نفرت تھی۔
معیز کے اندر ایک گونہ سکون بھرتا چلا گیا۔
وہ اس دنیا میں کہیں بھی تھی۔ مگر میڈم کے اڈے پر نہیں تھی۔ اس سے بڑھ کے اطمینان بخش بات اور کوئی نہ تھی۔

"سوری میڈم! مگر اب میں آپ سے مزید کوئی ڈیل نہیں کرنا چاہتا کیونکہ اب بھروسے والی بات نہیں رہی۔"
میڈم نے کسی اور لڑکی کے لیے اسے کنوینس کرنے کی کوشش کی مگر معیز نے فون بند کر دیا۔ اس کے دل میں موہوم سی خوشی تھی۔ ایبہا چاہے کیسے بھی حالات میں تھی مگر اپنی عزت کی حفاظت کیے ہوئے تھی۔

اسی وقت اس کے آفس کا دروازہ کھلا اور آندھی و طوفان کی طرح عون اندر داخل ہوا۔
"میڈم نے ڈیل کینسل کر دی ہے کیونکہ ایبہا وہاں سے فرار ہو گئی ہے۔"
معیز نے اپنے تئیں دھماکا کیا مگر ادھر عون نے کوئی خاص رسپانس نہیں دیا۔ کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے طنزیہ بولا۔
"چلو۔ تمہاری جان چھوٹی۔ اسے وہاں سے نکال کے بھی تم کون سا اپنی ذمہ داری نبھانے والے تھے۔"
معیز کو جھٹکا سا لگا۔
"میں اسے وہاں سے نکالنا چاہتا تھا اپنی پوری نیک نیتی کے ساتھ۔"
معیز نے لفظوں پر زور دیتے ہوئے اسے باور کرایا۔
"ہاں۔ اسے پوری نیک نیتی سے وہاں سے آزاد کرواتے پھر طلاق دے کر اسے در در کی ٹھوکریں کھانے کو چھوڑ دیتے۔ اچھا ہے نا اس نے خود ہی یہ راہ چن لی۔" عون کا انداز ابھی بھی وہی تھا۔
"بکواس مت کرو عون! میں کیا کہہ رہا ہوں اور تم کیا فضول بولے جا رہے ہو۔" معیز جھلایا۔
میز کی سطح پہ دونوں بازو رکھ کے جھکتے ہوئے عون نے تلخی سے کہا۔
"یہ ایک حقیقت ہے اور تم اسے جھٹلا نہیں سکتے۔ ایک لڑکی۔۔۔ جس کی ماں مر چکی ہے اور باپ نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ تمہارے نکاح میں ہے اور تم اسے چھوڑنا چاہتے ہو۔ پھر یہ بھی بتا دینا کہ وہ اپنی ماں کے پاس لوٹے یا باپ کے پاس۔"
معیز سُن ہو گیا۔
"تم طلاق دے کے اسے کسی دارالامان میں داخل کروا دو گے؟ آدھے سے زیادہ دارالامان بھی میڈم والا دھندا چلا رہے ہیں اور اگر اپنے باپ کے پاس جائے گی تو وہ بھی میڈم رعنا ہی ثابت ہو گا اس کے لیے۔" عون واقعی سچ کہہ رہا تھا۔
"مگر اس سارے میں میرا کیا قصور ہے۔ میں تو اسے ان حالوں میں نہیں لایا؟"
معیز کو بھی غصہ آیا۔ صورت حال ہی کچھ ایسی تھی۔
"مگر اللہ نے اس کا نصیب تمہارے ساتھ جوڑ کر تمہیں اس قابل تو کر دیا ہے کہ اسے ان حالوں سے بچا سکو۔"
عون نے برجستہ کہا۔
"اس ساری بکواس کو چھوڑو اور یہ سوچو کہ وہ میڈم کے ہاں سے فرار ہو چکی ہے۔" معیز کو ایک اور ٹینشن ہو گئی تھی۔
"جانتا ہوں میں۔" عون نے کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے آرام سے کہا۔

معیز نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"اور تمہارا کیا خیال ہے کہ اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں؟"

"تم کس بات کے لیے پریشان ہو پہلے وہ واضح کردو۔ اپنی منکوحہ کے لیے یا مل جانے پر اسے طلاق دینے کے لیے؟" عون نے خفیف سا طنز کیا تو وہ جھنجلا اٹھا۔

"جو بات طے ہے اس پر کیوں بحث کیے جارہے ہو تم۔"

"مگر اس میں اس لڑکی کا کیا قصور ہے معیز! ایک بے بس و بے سہارا کو سہارا دینے کی ایک نیکی کرہی لی ہے تو اسے احسن طریقے سے نبھا بھی لو۔"

"تم میرے گھر کے حالات نہیں جانتے۔ ماما کا ری ایکشن تمہیں بتا چکا ہوں پھر بھی تم نہیں سمجھ رہے۔"

معیز نے بمشکل تحمل کا مظاہرہ کیا۔

"تم نے لو میرج کرنے والے لڑکے لڑکیوں کو دیکھا ہے معیز...؟ ماں باپ زہر کھالیں یا ٹرین کے نیچے آجائیں۔ وہ اپنی پسند کی شادی کرکے ہی چھوڑتے ہیں۔"

"وہ لڑکی اب نہیں نہیں ہے عون!" معیز نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں... کیونکہ وہ ثانیہ کے پاس ہے۔ وہی اسے پارلر سے فرار کرا کے لائی ہے۔"

عون کا انداز اس قدر غیر متوقع تھا کہ لحہ بھر تو معیز نا سمجھی کے عالم میں اسے دیکھتا رہا۔

عون نے اثبات میں سرہلایا تو گہری سانس لے کر خود کو کرسی پر ڈھیلا چھوڑتے وہ ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔

"کیا کمال کی بیوی پائی ہے تو نے یار!" معیز کا انداز ہلکا پھلکا تھا۔

"ہاں۔ جو ٹھان لیتی ہے کسی بھی طور کر گزرتی ہے۔" عون کا انداز تفاخر سے بھرپور تھا۔

"اور جو تمہارے بارے میں وہ ٹھان چکی ہے اس کا کیا؟" معیز نے اسے یاد دلایا۔

"محبت سب کچھ بدل دیتی ہے میری جان! میں نے بھی بڑے چکر میں پھانس لیا ہے اسے۔ دوست بن گیا ہوں اس کا اور تمہیں تو پتا ہے دوستوں سے محبت ہو ہی جایا کرتی ہے۔"

معنی خیزی سے کہتے ہوئے آخر میں عون نے قہقہہ لگایا تو معیز کو بھی ہنسی آگئی۔

"خبیث..."

"سیم ٹو یو..." وہ بڑی نیاز مندی سے بولا۔

چند لمحوں کی خاموشی... بدلی ہوئی بات بھی ختم ہو چکی تھی۔

عون نے ہی پہل کی۔

"اب کیا ارادہ ہے۔ ملو گے جا کے اس سے؟"

اور یہ موضوع معیز کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ وہ جتنا پہلو بچاتا' یہ پھر سامنے آجاتا تھا۔

"ظاہر ہے۔ بہت سے معاملات طے کرنے ہیں اس کے ساتھ' پھر اسے گھر لے کے جانا ہے۔ اس کا حصہ اس کے حوالے کرنا ہے۔ پھر وہ جو چاہے کرے۔" معیز نے سنجیدگی سے کہا۔

"اور اگر وہ تمہیں نہ چھوڑنا چاہے تو...؟" عون نے اسے امتحان میں ڈالا۔

"وہ چھوڑ دے گی۔ کیونکہ میں اسے چھوڑنا چاہتا ہوں۔" معیز نے قطعیت سے کہا۔

عون نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"وہ بہت اچھی لڑکی ہے معیز!"

"مگر میں اتنی اچھی لڑکی ڈیزرو نہیں کرتا۔" معیز نے بات ختم کردی۔ عون تاسف سے اسے دیکھ رہا تھا۔

معیز ٹیبل پر سے اپنی چیزیں سمیٹنے لگا۔

"اس کے وہاں رہنے میں کوئی پرابلم ہے تو میں ابھی اسے گھر لے جاتا ہوں۔"

"نہیں۔ پرابلم تو کوئی نہیں۔ ثانی اسے دو دن وہیں رکھنا چاہتی ہے۔ کہہ رہی تھی وہ بہت خوف زدہ اور ذہنی ٹینشن کا شکار ہے۔ انیکسی میں اکیلی شاید نہ رہ پائے۔" عون نے بتایا تو اس کے ہاتھ ٹھٹکے۔ پھر وہ موبائل اٹھاتے ہوئے لاپروائی سے بولا۔

"اوکے۔ ٹھیک ہے۔ جیسا وہ مناسب سمجھے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ عون نے بھی اس کی تقلید کی۔

"میں دو دن کے بعد ہی چکر لگاؤں گا۔"

"ملو گے نہیں جا کر ابھی؟" عون نے اسے گھورا۔

"شٹ اپ۔" معیز نے ناگواری سے کہا۔

"وہ ٹھیک ہے اور محفوظ بھی۔ پھر مجھے ایسی بے قراری دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"خدا کرے میری طرح تو بھی پچھتائے۔ پھر وہ بھی تجھے منہ نہ لگائے ثانی کی طرح۔"

آہ بھر کے کہتے ہوئے وہ معیز کے پیچھے آفس سے نکلا۔



معیز نے کہا تھا۔

"اسے وہیں ابو کی ڈیتھ کا بتا دینا۔ میں خوامخواہ کی جذباتیت افورڈ نہیں کر سکتا۔" اور عون کے کہنے پر ثانیہ نے اسے بتا کر گویا کسی قیامت میں دھکیل دیا تھا۔

وہ بے طرح روئی تھی کرلائی تھی۔

"اب میرا کیا ہو گا ثانیہ....؟" وہ تھوڑی دیر کے بعد پوچھتی تو ثانیہ اسے تسلی دیتی۔

رات اسے نیند کی مسکن دوا دے کر سلایا ورنہ تو شاید وہ ساری رات روتے ہوئے گزار دیتی۔

"ایک تم اور دوسرا تمہارا دوست۔ دونوں بالکل ایک جیسے ہو۔" ثانیہ نے فون پر عون کو سنائیں۔

"مگر میں تو اب ٹھیک ہو گیا ہوں۔" وہ منمنایا۔

"معیز بھائی کو سمجھاؤ۔ بڑی مظلوم اور معصوم لڑکی ہے۔ اسے چاہے کیسے بھی حالات ملے ہوں مگر بہت باحیا اور باعزت ہے وہ۔"

ثانیہ کو بہت دکھ تھا۔ ایہا کی ساری داستان ہی رلا دینے والی تھی۔

اور ایسے میں اب اگر معیز بھی اس کا ساتھ نہ دیتا تو اس بے چاری کا جانے کیا بنتا۔

"میں نے تو اسے کونیس کرنے کی پوری کوشش کی ہے مگر فی الحال تو وہ اپنے ہی نفع و نقصان میں گھرا ہے۔ امید ہے آگے چل کے حالات بہتر ہو جائیں۔" عون نے ایمان داری سے کہا۔



اسے رباب سے کیا وعدہ یاد تھا مگر اب بیچ میں ایہا والے معاملے نے ایک نئی کروٹ لے کر گویا اسے ڈسٹرب سا کر دیا تھا۔

پھر بھی اتوار کو وہ بہت فریش سا موڈ بنا کر رباب کے لیے گلاب کے خوب صورت سرخ پھولوں کا گلدستہ لے کر مقررہ جگہ پہنچا تو اسے دیکھ کر مزید فریش ہو گیا۔

سرخ اور سبز ٹراؤزر اور شرٹ میں وہ کمال شے لگ رہی تھی۔

ہائے ہیلو کے بعد وہ خاموشی سے بیٹھ رہی۔

"کیا ہوا۔ پھول پسند نہیں آئے؟" معیز ٹھٹکا۔

"میں تم سے خفا تھی بزنز۔ تم نے کہا تھا اچھے سے مناؤ گے کسی بہت خاص انداز میں۔" وہ دلکشی سے مسکرائی۔

اس کے انداز میں ادا تھی، بے تکلفی تھی۔ معیز بھی مسکرا دیا۔

"میرا خاص انداز یہی ہے۔" اس نے پھولوں کے بکے کی طرف اشارہ کیا تو رباب نے اسے گھورنے کے بعد ناگواری سے ناک چڑھائی۔

"اس میں خاص کیا ہے۔ ہزاروں لوگ روزانہ ایک دوسرے کو دیتے ہیں۔"

"مگر وہ ہزاروں لوگ رباب احسن کو تو نہیں دیتے نا۔"

معیز نے جتایا تو وہ اس کی بات پر غور کرتی مسکرا دی۔

"چلو۔ لانگ ڈرائیو پہ چلیں، پھر سمندر کے کنارے خوب ٹہلیں گے۔"

اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے رباب کا انداز بہت رومانس لیے ہوئے تھا۔

معیز کو وہ بہت اچھی لگی۔ منفرد سی۔

"پہلے آئس کریم کھائیں۔ پھر چلتے ہیں۔ جہاں کہو گی وہیں۔" معیز نے بشاشت سے کہتے ہوئے ویٹر کو اشارہ کیا۔ رباب تفاخر سے معیز احمد کو "ڈھیر" ہوتا دیکھ رہی تھی۔



ایبہا کی طبیعت بمشکل سنبھلی۔ مگر اس کے اپنے بہت سے خدشات تھے۔

"امتیاز انکل مجھے اپنی ذمہ داری پر یہاں لائے تھے۔" وہ ابھی بھی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کہہ اٹھتی۔

"پریشان مت ہو ایبہا! معیز بھائی ہیں نا۔ تمہارا نکاح ہوا ہے ان کے ساتھ۔"

اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر ثانیہ نے اسے تسلی دی تو وہ پھپک کر رو دی۔

"انہوں نے تو آج تک طلاق کے علاوہ دوسری کوئی بات ہی نہیں کی کبھی۔"

ثانیہ کو تاسف نے گھیرا۔ اس قدر پڑھا لکھا اور مہذب بندہ....

"سب ٹھیک ہو جائے گا ایبہا! پہلے حالات اور تھے اب تو بہت کچھ بدل چکا ہے۔" ثانیہ نے نرمی سے اسے سمجھایا۔

"اور تمہیں پتا ہے کل وہ تمہیں اپنے گھر لے جائیں گے پھر تم وہیں رہو گی۔"

ثانیہ کی بات گویا کوئی دھماکا تھی۔

ایبہا نے رونا بھول کر بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ثانیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"انکل نے تمہارے نام وصیت میں کافی حصہ رکھا ہے۔ وہ بھی تمہیں ملے گا اور مہینے کا خرچ الگ سے ہو گا۔" ثانیہ نے تفصیل بتائی تو وہ پھر سے رونے لگی۔

جانے والا اس کے جینے کے جتن کر کے گیا تھا۔ اب اسے کیا ملتا' یہ نصیب کی بات تھی۔

عون آیا۔ ثانیہ اس کے ساتھ لان میں چلی آئی۔ شام کے وقت موسم خاصا اچھا ہو رہا تھا۔

ایک چکر دونوں نے ہم قدم خاموشی سے لگایا۔ پلٹنے پر ثانیہ کا موڈ خوش گوار تھا۔

"ایسے ہی کالج میں ہم دوستیں گراؤنڈ کے چکر لگایا کرتی تھیں۔"

"تو سمجھو ہی دور واپس آ گیا ہے۔ دوستی اور دوستوں والا۔" عون کا لہجہ واقعی دوستانہ تھا۔ ثانیہ چپ ہو گئی۔ پھر

بولی تو انداز کسی بھی لچک سے پاک تھا۔
"ہم صرف کچھ عرصہ ہی دوست رہیں گے عون!اس دوران اگر تم میری سمجھ میں نہیں آئے تو میں اپنی مرضی کا فیصلہ کرلوں گی۔"

کافی دیر کے بعد عون نے ہنکارا بھرا۔
"ہوں۔۔اوکے۔۔میں تو پہلے ہی یہ آفر تمہیں کرچکا ہوں۔"
"اور۔ابیہا کا کیا بنے گا اب؟"
"معیز اسے کل گھر لے جائے گا۔"عون نے بتایا تو وہ خوش ہوئی۔
"دیٹس گریٹ۔۔"
"اتنا بھی گریٹ نہیں۔ وہ کسی صورت اس رشتے کو نبھانے کے حق میں نہیں۔ گھر لے جانے کا مقصد صرف وصیت کے مطابق ابیہا کا حق اسے دینا ہے اور بس۔ اس گھر میں بھی تھوڑا سا حصہ چھوڑا ہے انکل نے۔"عون نے مفصل بتایا۔

"ایک تو مجھے ان مردوں کی سائیکی سمجھ میں نہیں آتی۔ بہتر سے بہتر چیز بنا مانگے مل جائے پھر بھی ان کی سیری نہیں ہوتی۔" وہ خفگی سے بولی۔ عون نے نظر بھر کے اسے دیکھا۔
"اور لڑکیوں کی ضد کے بارے میں تمہارا کیا نظریہ ہے۔"
اس کا انداز چھیڑنے والا تھا۔ ثانیہ نے اس کی بات سے صرف نظر کیا۔ اس کی خاموشی پر عون نے بات بدل ڈالی۔
"ابیہا کیسی ہے اب۔؟"
"پہلے سے بہت بہتر۔"

"معیز کے متعلق اس کی کیا سوچ ہے۔ اس بات کا پتا نہیں کیا تم نے؟" عون کو خیال آیا۔

"ہونہہ۔ اس کی کیا سوچ ہوگی۔ وہ تو خود معیز بھائی کے رحم و کرم پر ہے۔ مائنڈ مت کرنا، مگر مرد کے پاس یہ جو طلاق کا ہتھیار ہوتا ہے نا، وہ ہر وقت اسے استعمال کرنے کو تیار رہتا ہے۔"

ثانیہ کا انداز تلخ تھا۔ پھر چلتے چلتے وہ رخ موڑ کر عون کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ وہ بھی رک گیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا عون! ایک نکاح نامے پر جب تک لڑکا اور لڑکی دونوں کے سائن نہ ہوں تب تک نکاح نہیں ہو سکتا، مگر طلاق دیتے وقت صرف مرد ہی کا فیصلہ کیوں۔۔۔؟"

وہ جذباتی ہو رہی تھی۔

"خیر! کبھی کبھار یہ حق عورتیں بھی استعمال کرلیتی ہیں۔" عون نے بات کو ہلکا پھلکا رنگ دیتے ہوئے خلع کی طرف اشارہ کیا۔

"ان کے پاس یہ لاسٹ آپشن ہوتا ہے جبکہ ہر مرد کے پاس فرسٹ آپشن۔" عون نے بغور اسے دیکھا۔

وہ ضدی تھی اور اپنی بات پر اڑ جانے کی فطرت رکھتی تھی۔ عون نے یہ بات شدت سے محسوس کی تھی۔

"یہ بحث ایک نشست میں ختم نہیں ہو سکتی۔ تم یوں کرو کہ مجھے اگلی تاریخ دے دو۔"

وہ سر جھٹک کر اس کے ساتھ چلنے لگی۔

"بہرحال تم ایبہا کو سمجھا دینا۔ آگے کی زندگی اس کے لیے پھولوں کی سیج نہیں ہوگی۔" عون نے کہا۔

"ہاں۔ پہلے تو جیسے پھولوں کی سیج تھی نا۔" وہ طنزاً بولی۔

"بس بھی کرو یار! نہ چائے نہ پانی۔ کب سے تلخ گفتگو پہ ٹرخا رہی ہو۔ ایسے ہوتے ہیں دوست۔۔۔؟" عون نے اسے چھیڑا تو وہ مسکرا دی۔

"آؤ۔ تمہیں چائے پلواتی ہوں۔"

"شکریہ۔" وہ ممنون ہوا تھا۔



ثانیہ نے اسے معیز کے گھر والوں کے متوقع ردعمل کے متعلق صاف صاف بتا دیا تھا۔

"آپ کو یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ معیز کا اپنا رویہ بھی ان کے گھر والوں ہی کی عکاسی کرتا ہے۔"

ایبہا کا انداز بہت ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے اپنے اندر بہت ٹھہراؤ پیدا کرلیا تھا۔ ذلت کی زندگی کے بعد ملنے والی زندگی کو وہ صبر و شکر کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔

معیز کی ماں جتنی بھی تلخ ہوتی، میم جیسی گندی زبان تو استعمال نہ کرتیں۔

اس گھر کی چار دیواری میں تحقیر تو ملتی، مگر زمانے بھر کے اوباش مردوں کی غلیظ نظریں تو اس کی چادر کے تقدس کو پامال نہ کرتیں۔

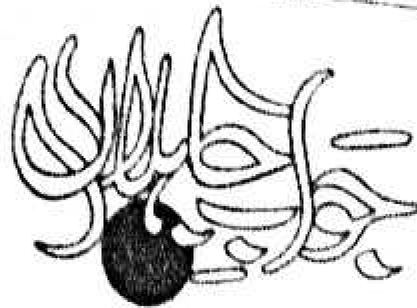
اس کے جواب نے ثانیہ کو خاموش کروا دیا مگر معیز کے سامنے وہ ضرور بولی، جب وہ ایبہا کو لینے آیا۔

"ہم کہیں بیوی خدا کا تحفہ ہوتی ہے معیز بھائی! ایبہا کی قدر کیجیے گا۔ اس گھر میں اسے کوئی بھی حیثیت آپ کا رویہ دلائے گا۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ اپنا ذہن کلیئر کر کے اسے لے کر جائیں۔"

"میں کوئی وعدہ نہیں کروں گا ثانیہ! ہاں مگر وہ حالات کے مطابق اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہے۔"

معیز نے صاف لفظوں میں بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ ایہا باہر آئی تو وہ اسی عبایا میں ملبوس تھی۔
"اسے باہر نکلتے ہوئے بہت احتیاط کی ضرورت ہوگی اس لیے اسے عبایا پہننا پڑے گا۔" ثانیہ نے کہا تو معیز نے ایک اچٹتی نگاہ نقاب سیٹ کرتی ایہا پر ڈالی۔
اس کے دل میں عجیب بے زار کن سے احساسات پیدا ہونے لگے۔
وہ ایک ان چاہی شے کی طرح اس پر مسلط کی گئی تھی اور ان چاہے رشتے فقط بوجھ ہوتے ہیں۔ بوجھ۔ جو نبھائے نہیں ڈھوئے جاتے ہیں۔ وہ گہری سانس بھرتا ثانیہ کو خدا حافظ کہتا باہر نکل گیا۔
ایہا کو ثانیہ نے لپٹا لیا۔
اسے اس معصوم لڑکی سے بہت ہمدردی تھی۔
"میں تم سے ملنے آتی رہوں گی اور موبائل میں نے تمہارے اس بیگ میں ڈال دیا ہے۔ تم جب جی چاہے، مجھ سے رابطہ کر سکتی ہو۔ بڑی بہن سمجھ کر۔" ایہا کی آنکھیں بھر آئیں۔
اثبات میں سر ہلا کر وہ بیگ اٹھائے باہر کی طرف بڑھی تو ثانیہ بھی اس کے ساتھ تھی۔
معیز ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ثانیہ نے اس کا بیگ پچھلی سیٹ پر رکھ دیا اور اس کے لیے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔
اس کے بیگ میں اپنے دو چار جوڑوں کے ساتھ ثانیہ نے مقدور بھر اس کی ضرورت کی چیزیں بھر دی تھیں۔ وہ ثانیہ کی ممنون تھی۔
سفر شروع ہو گیا تھا۔
گاڑی میں بھید بھری خاموشی تھی۔ اور دونوں کی سوچوں کی پرواز کا رخ الگ سمتوں میں تھا۔
حالانکہ منزل دونوں کی ایک ہی تھی۔
گاڑی بہت خوب صورت سی کوٹھی کے پورچ میں آ کر رکی۔ گاڑی سے اُتر کر جھجکتے ہوئے ابھی اس نے ادھر ادھر دیکھا بھی نہیں تھا کہ اندر سے دروازہ کھول کر ایک عورت باہر نکلی۔
"تو لے ہی آئے اس حرافہ کو تم میرے گھر تک۔"
ایہا کا چہرہ فق ہو گیا۔
اس نے معیز کی ماں کے بارے میں بہت کچھ سوچا تھا مگر یہ انداز گفتگو اس کے ذہن میں قطعاً نہ تھا۔ اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس عورت نے آگے بڑھ کر ایہا کے قریب پڑا اس کا بیگ اٹھایا اور دور پھینک دیا۔
"دفع ہو جاؤ یہاں سے گندگی کی پوٹ......"
معیز تیزی سے بے قابو ہوتی ماں کی طرف لپکا جبکہ ایہا جیسے وہیں ساکت ہو گئی تھی۔
(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

راشدہ رفعت



ان کے خاندان کی لڑکیاں سسرال میں بہت آسانی سے ایڈجسٹ کرلیتی تھیں۔ سسرال چاہے جتنا مرضی تیکھا ہو بچیاں زبان پر اف اور ماتھے پر شکن لائے بغیر ہر طرح کے حالات میں گزارہ کرلیتی تھیں۔ رافعہ سمیت ان کی پانچوں بہنیں اپنے اپنے سسرال کی ہر دل عزیز بہوئیں تھیں۔ یہ ہر دل عزیزی راتوں رات نہیں ملی تھی۔ سسرال میں ایک عمر گزار کر یہ تمغہ ملا کرتا ہے۔ منجھلی آپا اور سب سے چھوٹی صفورہ کے سسرالوں کا شمار تو "اوکھے ترین" سسرالوں میں ہوتا تھا۔ لیکن انہیں بھی سسرال میں ایڈجسٹ ہونے میں بہت زیادہ دقت اور دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

اس کی خالہ زاد بہنوں کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہ تھا۔ زبان دراز نندوں اور تیز طرار ساسوں کو انہوں نے بھی بخوبی ہینڈل کررکھا تھا۔ بچپن کی دھندلی دھندلی یادیں۔ رافعہ بیگم کے ذہن میں موجود تھیں۔ ساس کی اپنی دادی اور پھوپھیاں کسی نہ کسی بات پر گھر میں ہنگامہ برپا کیے رکھتیں۔

اماں اس دوران اپنے لب مکمل طور پر سیے رکھتیں۔ دادی کی طرف سے اماں کو اکثر گھنی کا بھی خطاب ملتا۔ لیکن اماں کی چپ نہ ٹوٹتی۔ یہ ہی چپ اماں کا ہتھیار تھی۔ جس کے آگے آہستہ آہستہ سسرال والے اپنے ہتھیار ڈالتے گئے۔ پھر پھوپھیوں کی شادی ہوگئی۔ رہیں دادی تو آخری عمر میں دادی کی زبان پر صرف اماں ہی کے قصیدے تھے۔ منجھلی اور چھوٹی چچی کافی زبان دراز قسم کی بہوویں ثابت ہوئی تھیں۔ پھر دادی کو صحیح معنوں میں چپ چاپ رہنے والی اماں کی قدر — ہوئی۔ اماں بتاتی تھیں کہ چپ کا یہ کامیاب نسخہ ان کو اپنی ماں سے اور ان کی ماں کو بھی اپنی ماں سے ملا۔ اس خاندان کی مائیں رخصتی کے وقت یہ نسخہ چپکے سے اپنی بیٹیوں کے کان میں بتادیتی تھیں۔

ماؤں کی کامیاب زندگی بیٹیوں کے سامنے ہوتی۔ سو وہ یہ نصیحت نہ صرف پلو میں باندھ لیتیں بلکہ اپنی زندگی بھی اسی نصیحت اور مشورے پر عمل کرکے گزارتیں۔ نتیجتاً" کامیابی ان کا بھی مقدر بنتی۔ رافعہ کو یاد تھا بیس برس پہلے اس کی مہندی والی رات سب لوگوں کے سوجانے کے بعد اماں اس کے پاس آئی تھیں۔

"سوگئی ہو رافعہ؟" اماں نے پیار سے پکارا۔

رات کا آخری پہر تھا، لیکن نیند رافعہ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ بظاہر آنکھیں موندے پڑی تھی۔ لیکن آنے والی زندگی کے متعلق طرح طرح کے خیالات دماغ میں اودھم مچارہے تھے۔ بیاہ میں ایک دن باقی ہو تو نیند کس لڑکی کو آسکتی ہے۔ رافعہ بھی ماں کی آواز سن کر کروٹ لے کر اٹھ بیٹھی۔ پہلے تو ماں بیٹی نے رات کی تنہائی میں ایک دوسرے سے لپٹ کر خوب نیر بہائے۔ پھر آخر اماں نے ہی اس کے اور اپنے آنسو پونچھے تھے۔

"جیتی رہو، شاد رہو، سدا آباد رہو، آنے والی زندگی میں تمہیں اتنی خوشیاں ملیں کہ تمہارا دامن چھوٹا پڑ جائے۔" اماں نے اس کی پیشانی چوم کر ڈھیروں دعائیں دے ڈالی تھیں۔ پھر آخر میں سسرال میں کامیاب زندگی گزارنے کا گر بھی چپکے سے رافعہ کو بتا



"دیکھو بیٹی! ماں، باپ کے گھر اور سسرال میں بہت فرق ہوتا ہے۔ حالانکہ میکے میں بھی ماں، باپ، اولاد پر روک ٹوک کرتے ہی ہیں اور بہن بھائیوں میں آپس میں تکرار بھی ہو جاتی ہے۔ میں کبھی تمہارے بھائی کی طرف داری کروں تو تم مجھ سے خفا ہو کر یہ بات جتا دیتی ہو، پھر بھی سکون نہ ملے تو شام کو ابا کی آمد پر ان سے بھی میری شکایت لگا دیتی ہو۔ لیکن اس سب کے باوجود تم میری پیاری بیٹی ہی رہتی ہو اور میں تمہاری ماں۔ جس کے بغیر تم کھانا، کھانے بھی نہیں بیٹھتیں۔"

اماں بول رہی تھیں اور رافعہ چپ چاپ انہیں سن رہی تھی۔ بے آواز آنسو اب بھی گال بھگو رہے تھے۔

"اپنے بھیا سے یا صفورہ سے تمہاری جتنی مرضی کھٹ پٹ ہو جائے۔ آدھے گھنٹے بعد تم بہن بھائی پھر گپیں لڑا رہے ہوتے ہو، پتا ہے کیوں؟" اماں نے پوچھا، رافعہ نے دھیرے سے نفی میں گردن ہلا دی۔

"کیونکہ تم لوگ ایک دوسرے پر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہو۔ جس کسی کی زیادتی ہو۔ بنا جھجکے اسے جتا دیتے ہو۔ اس طرح دل کا غبار ختم ہو جاتا ہے اور دل میں ایک دوسرے کے لیے کدورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن سسرال میں یہ سب ممکن نہیں۔ اگر سسرال کی اجنبی سرزمین پر اپنے قدم مضبوطی سے جمانے ہیں تو وہاں کسی کی ناجائز بات کو بھی چپ کر کے سہنا ہوگا۔ کم از کم شروع شروع میں تو یہی وطیرہ اپنانا ہوگا۔" اماں بہت پیار سے اسے سمجھا رہی تھیں۔

"جانتی ہوں اماں!" رافعہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"کوشش بھی یہی کروں گی۔ آپا کی اور بجو کی مثال میرے سامنے ہے۔ لیکن اماں میرے اندر اتنی برداشت اور حوصلہ نہیں ہے۔ آپ جانتی ہیں، میں غلط کو غلط کہے بغیر نہیں رہ سکتی۔ بغیر قصور کے میں کسی کی زیادتی کیسے برداشت کروں گی۔ مجھے ڈر ہے میری وجہ سے آپ کی تربیت پر حرف نہ آجائے۔" رافعہ نے دلی خدشہ ماں کو بتایا۔

"تمہارا خیال ہے تمہاری آپا اور بجو میں بہت برداشت اور حوصلہ تھا؟" اماں مسکرائیں۔

"میری پگلی بیٹی، کسی کی ناجائز بات برداشت کرنے کا حوصلہ کسی میں بھی نہیں ہوتا۔ دل اور دماغ مشتعل ہو کر زبان کو کچھ بولنے پر اکساتے ہیں اور اگر کچھ بھی نہ بولا جائے تو اعصاب جھنجلا جاتے ہیں۔ اپنے اعصاب پر سے یہ دباؤ ختم کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو بولنا پڑتا ہی ہے۔ ورنہ تو دماغ ایک پریشر ککر بن جائے گا۔ اگر

تھوڑا بہت پریشر ریلیز نہ کیا جائے تو بہت مشکل ہو جاتی ہے بیٹا۔" اماں کے کہنے پر اس نے حیرانی سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"آپ مجھے کچھ بولنے کا سبق دے رہی ہیں اماں! میں سمجھی تھی کہ آپ اپنی چپ مجھ میں منتقل کرنا چاہیں گی وہی چپ جو آپ نے آپا اور بجو کو جہیز میں دی ہے۔ دونوں بنا اف کیے سسرال میں زندگی گزار رہی ہیں۔ میں تو یہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں کہ میری زبان تو چڑے کی ہے۔ چپ کے پھلکے بنا رہ ہی نہیں سکتی۔" رافعہ کے کہنے پر اماں کے چہرے پر ایک پل کو تشویش ظاہر ہوئی۔ مگر اگلے ہی پل وہ مسکرا دیں۔

"اپنی ماں کا نسخہ آزما کر دیکھنا۔ تمہاری نانی نے مجھے اور تمہاری خالاؤں کو یہ نسخہ بتایا اور ہم نے اپنی اپنی بیٹیوں کو۔ دیکھ لو' سب کتنی کامیاب بہوئیں ثابت ہوئی ہیں۔" رافعہ ناسمجھی سے ان کا چہرہ تکنے لگی۔

"سسرال میں جب کسی کی بات پر غصہ آئے تو پلٹ کر جواب دینے کے بجائے دل ہی دل میں کہنا۔ جواب جاہلاں باشد خموشی۔ پھر دیکھنا کیسے دل و دماغ پر ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار برسنے لگے گی۔ کوئی آگے سے کچھ بھی کہے' تم یہ وظیفہ دہراتی رہنا۔ کامیابی قدم چومے گی۔ آزمائش شرط ہے۔" اماں آخر میں شوخی سے مسکرائی تھیں۔ رافعہ بس ماں کو دیکھ کر ہی رہ گئی۔

آئندہ آنے والے برسوں نے ثابت کر دیا کہ ماں کا بتایا ہوا نسخہ کتنا کارگر اور آزمودہ ثابت ہوا۔

رافعہ کا سسرال کم و بیش ایک روایتی سسرال ہی تھا۔ ساس' نندیں ہر بہو کو "ٹف ٹائم" دینے کی ہر ممکن کوشش کرتیں۔ اس کی دیورانیاں اور جیٹھانی صبر کا پیمانہ لبریز ہونے پر پلٹ کر ساس' نندوں کو جواب دے دیتیں اور پھر گھر میں وہ ہنگامہ مچتا کہ الامان الحفیظ۔ رافعہ بھی ساس' نندوں کی پیاری نہیں تھی۔ اسے بھی بہت کچھ سننے کو ملتا۔

"تمہارے گھر والوں نے پہناؤنیوں میں ایسے سستے اور گھٹیا کپڑے دیے ہیں۔ میرے سسرال میں تو میری ناک ہی کٹ گئی۔" بڑی نند کے کہنے پر رافعہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔ "ان گھٹیا کپڑوں" کی خریداری میں ابا کی حق حلال کی کمائی کے ہزاروں روپے صرف ہوئے تھے۔

"جواب جاہلاں باشد خموشی۔" وہ دل ہی دل میں بہت چبا چبا کر یہ فقرہ دہرا لیتی۔

"کیوں بہو! اتنے دن چڑھے سو کر اٹھی ہو۔ ماں نے سسرال میں رہنے کا تمیز' سلیقہ نہیں سکھایا۔ گیلے بالوں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئیں۔ حد ہے بے شرمی کی۔"

"جواب جاہلاں باشد خموشی۔" دل میں وظیفہ جاری رہتا۔

"بھابھی! اتنا تیز جامنی رنگ کیا سوچ کر پہن لیا آپ نے۔ پتا بھی ہے کیسی کارٹون لگ رہی ہیں۔" چھوٹی نند تو بدتمیزی کی حد تک منہ پھٹ تھی۔

"جواب جاہلاں باشد خموشی۔"

"روٹی تک گول نہیں بنائی جاتی تم سے۔ پتا نہیں میکے سے کیا سیکھ کر آئی ہو۔"

"جواب جاہلاں باشد خموشی۔" رافعہ دل ہی دل میں کھلکھلا کر کہتی۔

اماں کا بتایا گیا نسخہ تو جادوئی تھا۔ رافعہ جانتی تھی کہ اکثر مائیں اپنی بیٹیوں کو ایک چپ سو سکھ والا فارمولا بھی بتاتی ہیں۔ مگر دل میں جو ٹھنڈک جواب جاہلاں باشد خموشی کہہ کر پڑتی تھی۔ وہ کسی اور چیز سے کہاں ملتی تھی۔

شب و روز یوں ہی گزرتے رہے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ رافعہ کے قدم سسرال میں مضبوطی سے جمتے گئے۔ اوپر تلے چار بچوں کی پیدائش نے زندگی کو بہت مصروف بھی کر دیا۔ نندیں بھی اپنے گھربار کی ہو گئیں۔ جیٹھانی اور دیورانیوں کے پورشن الگ الگ ہو گئے۔ ساس بھی دوسرے بیٹوں کے پورشن میں بھی چلی جاتیں۔ لیکن ان کا مستقل ٹھکانا رافعہ والا پورشن ہی تھا۔ بڑھتے بچوں کا ساتھ' مہنگائی' اوپر تلے کے ڈھیروں اخراجات' ثاقب کی محدود آمدنی' غرض زندگی میں اب بھی مسائل کم نہ تھے۔ لیکن ہاں اب رافعہ کو

"جواب جاہلاں باشد خموشی" والا مقولہ دہرانے کی نوبت کم ہی آتی تھی۔ شاید یہ ہی زندگی کا فطری بہاؤ ہے۔ جو مسئلے کبھی بہت بڑے لگتے تھے۔ اب ان کے متعلق سوچ کر ہنسی آتی تھی۔

اماں کا نسخہ اپنا کر اس نے شادی کے شروع کے مشکل دنوں میں اپنے لیے قدرے آسانی پیدا کرلی تھی۔ سسرال والوں کی طرف سے۔ بہت عرصہ گزرنے کے بعد سمجھ دار بہو کا سرٹیفکیٹ بھی مل گیا تھا۔ اس نے کبھی سسرال والوں کے سامنے "زبان درازی" نہیں کی تھی۔

سسرال والوں کے نزدیک یہ ہی خوبی دیگر تمام خوبیوں پر حاوی رہی۔ بہت عرصہ گزرنے کے بعد آج رافعہ کو اماں مرحومہ کا "کارگر نسخہ" یاد آیا تھا۔ آج کل گھر میں اس کے جیٹھ کی بڑی بیٹی کی شادی کے ہنگامے برپا تھے۔ سبین اس کے جیٹھ' جیٹھانی کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بہت پیاری' نٹ کھٹ اور چلبلی سی لڑکی تھی۔ رافعہ کو اپنے شوہر کی یہ بھتیجی بہت عزیز تھی۔ شادی کے بعد جب تک رافعہ کی گود میں اس کی اپنی اولاد نہیں آئی تھی اس نے جیٹھانی کے بچوں کے ہی لاڈ اٹھائے تھے۔ جس طرح میکے میں وہ اپنے بھانجے' بھانجیوں کے لاڈ اٹھاتی تھی۔ بچے' رافعہ کی ہمیشہ سے ہی کمزوری رہے تھے۔ پھولے پھولے گلابی گالوں اور توتلی زبان میں بولنے والی سبین اسے پہلی نگاہ میں ہی بہت پیاری لگی تھی۔ ثاقب کو بھی اپنی بھتیجی سے بہت پیار تھا۔ اکثر شام کو رافعہ اور ثاقب گھومنے باہر نکلتے تو ثاقب سبین کو بھی بائیک پر بٹھالیتا۔

رافعہ کو بھی اس بات پر اعتراض نہ ہوتا۔ بلکہ شادی کے شروع شروع کے دنوں میں میاں کے ساتھ اکیلے کسی تفریحی مقام پر جاتے ہوئے اسے شرم سی آتی۔ سبین ساتھ ہوتی تو دنیا والوں کے سامنے اپنا آپ معتبر سا لگتا۔

"بچہ ساتھ ہو تو ریلیشن شپ میاں' بیوی والا ہی لگتا ہے۔ ورنہ بندہ مشکوک مشکوک سا لگتا ہے۔" اس کی اپنی ہی منطق تھی۔

"یہ مشکوک مشکوک سے تمہاری کیا مراد ہے۔" ثاقب اس کی بات سن کر خوب ہی لطف اٹھاتے۔ وہ جھینپ کر ہنس پڑتی تھی۔ رافعہ اور ثاقب نے سبین کے جتنے لاڈ اٹھائے تھے وہ سبین نے ان کے بچوں سے بے تحاشا لاڈ پیار کرکے سود سمیت واپس لوٹا دیے تھے۔

رافعہ کے بچوں میں سبین کی جان تھی۔ بچے بھی سبین سے خوب ہی مانوس تھے اور اب بچوں کی پیاری سبین آپی پیا دیس سدھارنے والی تھی۔ وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے۔ آج مایوں کی دلہن کے روپ میں سبین کو دیکھ کر رافعہ کو اس پر ڈھیروں پیار بھی آیا۔ ساتھ ہی آنکھوں میں نمی بھی اتر آئی۔

سبین کی ماں یعنی رافعہ کی جیٹھانی بھی بار بار آنکھوں کے گیلے گوشے پونچھ رہی تھیں۔ فنکشن اختتام کو پہنچا اور مہمان اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہوگئے تو رافعہ بھی بچوں سمیت واپس اپنے پورشن میں آگئی ۔ بچے اور ثاقب سو گئے تو اس کے قدم آپوں آپ جیٹھانی کے پورشن کی طرف اٹھ گئے۔ حسب توقع سبین اور کلثوم بھابھی جاگ رہے تھے۔

"لو بھئی۔ تم ہی سنبھالو اپنی بھتیجی کو۔ رو رو کر خود کو ہلکان کر رکھا ہے۔" کلثوم بھابھی نے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے کہا۔

"سبین سے زیادہ تو آپ ہلکان ہو رہی ہیں بھابھی۔" رافعہ نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"پریشانی تو ہے رافعہ! بیٹی سے بچھڑنے کا دکھ اپنی جگہ' لیکن مجھے تو اس کی ساس' نندوں کے تیور دیکھ دیکھ کر ہول اٹھ رہے ہیں۔ ان کی طنزیہ گفتگو ابھی سے شروع ہوگئی ہے۔ میں تو یہ ہی سوچتی ہوں کہ کہیں ہم نے سبین کا رشتہ جلد بازی میں تو طے نہیں کردیا۔ عفان بلاشبہ ہیرا لڑکا ہے۔ لیکن اس کی ماں' بہنیں بہت تیز ہیں۔ خود عفان کی ماں آج مجھ سے یہی بات کہہ رہی تھیں کہ اپنی بیٹی کو ذہنی طور پر تیار کرکے سسرال بھیجیں۔ اس کا پالا انتہائی تیز ساس' نندوں سے پڑنے والا ہے۔"

"امی! آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ میں سمجھ داری سے کام لے کر سب کو ہینڈل کرلوں گی۔" سبین نے انہیں یقین دلایا تھا۔

"اتنی سمجھ داری تمہاری ماں میں نہیں تھی۔ ساری عمر تمہاری دادی' پھوپھیوں سے الجھتے ہوئے گزری' تمہارے اندر کہاں سے اتنی سمجھ داری آجائے گی۔" کلثوم بھابھی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر رافعہ کو دیکھا تھا۔

"صرف رافعہ کو گر آتا تھا۔ ساس' نندوں کو قابو کرنے کا' لیکن اس میں صبر بہت تھا۔ چپ چاپ ان کی بری بھلی سن لیتی تھی۔ تھک ہار کر ان کی زبانیں بھی خاموش ہوجاتیں۔ لیکن تمہاری چھوٹی' بڑی چچی اور میں' نہ بھئی ہم ہر بات کے جواب میں خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔" کلثوم بھابھی صاف گوئی سے بولی تھیں۔

رافعہ نے ایک نگاہ کلثوم بھابھی کی پریشان شکل پر ڈالی۔ پھر سبین کے روئے روئے چہرے کو دیکھا۔ رافعہ کو لگا کہ ان کا خاندانی چپ کا نسخہ سبین کو منتقل نہ کرنا بڑی زیادتی ہوگی۔ اپنے شوہر کی اس پیاری سی بھتیجی سے اسے خود بھی بہت پیار تھا۔ اس نے پیار سے سبین کی ٹھوڑی چھوئی تھی۔

"کلثوم بھابھی! آپ جاکر آرام کریں۔ میں کچھ دیر سبین کے پاس بیٹھی ہوں۔ سسرال میں ایڈجسٹ کرنے کے لیے کچھ گر کی باتیں اسے میں بھی بتادیتی ہوں۔" کلثوم بھابھی گہرا سانس کھینچ کر اثبات میں سر ہلاتی اٹھ گئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد رافعہ نے من و عن وہی باتیں سبین سے کی تھیں۔ جو برسوں پہلے اس کی شادی سے ایک رات پہلے اماں نے اسے سمجھائی تھیں۔ آخر میں چپکے سے اسے اپنا خاندانی جادوئی نسخہ بھی بتادیا۔

"بس کوئی بھی مسئلہ ہو دل میں یہی الفاظ دہرالینا۔ کلیجے میں ٹھنڈ پڑجائے گی اور سارا غصہ بھاپ بن کر اڑ جائے گا۔" رافعہ نے مسکراتے ہوئے سبین کو مخاطب کیا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا رافعہ چچی کہ محض چند الفاظ کہنے سے غصہ اور جھنجلاہٹ کس طرح ختم ہوسکتے ہیں۔ جب تک دل کی پوری بھڑاس نہ نکلے میں تو اس وقت تک پرسکون نہیں ہوتی۔" سبین نے رافعہ کی بات پر بے یقینی کا اظہار کیا تھا۔

"میری جان' سسرال میں ایک حد تک تو برداشت سے کام لینا ہی پڑتا ہے اور تم ان چند الفاظ کی تاثیر تو دیکھنا۔ میں نے کہا نا کہ یہ جادوئی لفظ ہیں۔ انہیں بول کر آپ خود بخود پرسکون ہوجاتے ہیں۔ شادی کے بعد جب بھی تم یہ نسخہ آزماؤ گی تمہیں اپنی رافعہ چچی کی بات کی صداقت پر یقین آجائے گا۔ لیکن خبردار یہ راز کی بات صرف تمہارے اور میرے درمیان ہی رہنی چاہیے۔"

رافعہ نے آخر میں رازداری کی شرط بھی رکھ دی تھی۔ سبین نے دھیرے سے اثبات میں گردن ہلادی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اسے رافعہ کی بات پر سو فیصد یقین نہیں آیا ہے۔ رافعہ کو یاد تھا کہ اسے خود اماں کی بات پر تب یقین آیا تھا جب اس نے یہ نسخہ خود آزما کر دیکھا تھا۔ اس کی دلی دعا تھی کہ سبین کے سسرال والوں سے متعلق کلثوم بھابھی کے خدشات غلط ثابت ہوں' لیکن اگر خدانخواستہ سبین کے سسرالی کچھ ٹیڑھے بھی ثابت ہوئے تو اس کے بتائے گئے نسخے پر عمل کرکے سبین کی زندگی قدرے آسان ہوسکتی تھی۔ سبین کو اس کی آنے والی زندگی سے متعلق ڈھیروں دعاؤں سے نواز کر رافعہ مطمئن انداز میں اپنے پورشن کو لوٹی تھی۔ اپنے تئیں اس نے اپنا فرض پورا کردیا تھا۔

تین دن بعد سبین پیا دیس سدھار گئی تھی۔ ولیمہ والے دن اس کے چہرے پر پھوٹتی شفق دیکھ کر اس کے میکے والوں کے دل شانت ہوگئے تھے۔ پھر سبین اور عفان کا دعوتی پیریڈ شروع ہوگیا تھا۔ شروع میں اس نے اپنی سسرالی دعوتیں نپٹائی تھیں۔ پھر میکے والوں کا نمبر آیا تھا۔ رافعہ نے بھی بہت چاؤ سے نئے نویلے جوڑے کو دعوت پر بلایا تھا۔ ہنستی مسکراتی سبین

کو دیکھ کر وہ مطمئن ہو گئی تھی۔ پھر بھی موقع پا کر اس سے پوچھے بنا نہ رہ پائی۔

"سسرال میں تو سب ٹھیک ہیں نا تمہارے ساتھ۔"

"ابھی تک تو ٹھیک ہی ہیں۔" سبین مسکرائی۔

"چلو شکر ہے۔ کلثوم بھابھی بلاوجہ پریشان ہو رہی تھیں۔" رافعہ کو دلی سکون ملا تھا۔ لیکن کچھ دن گزرنے کے بعد سبین میکے آئی تو کچھ بجھی بجھی سی تھی۔ رافعہ سبین سے ملنے جیٹھانی کے پورشن میں گئی تو سبین کے چہرے کی پژمردگی نوٹ کیے بنا نہ رہ پائی۔ اس کے استفسار پر سبین پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

"کیا بتاؤں رافعہ چچی۔۔۔ سسرالی مسئلے مسائل شروع ہو گئے ہیں۔ امی کو میری ساس تیز لگتی تھیں۔ ساس پھر بھی اتنی بری نہیں۔ لیکن نندیں توبہ۔۔۔ اتنی تیز طرار ہیں کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ سب سے چھوٹی نند کی زبان سب سے لمبی ہے۔ ذرا لحاظ نہیں کرتی کہ میں اس کی بڑی بھاوج ہوں، جو منہ میں آتا ہے بول دیتی ہے اور ہاں آپ کا بتایا گیا نسخہ بھی۔۔۔ فیل ہو گیا ہے۔" سبین نے منہ بناتے ہوئے بتایا۔

"کیسے؟" رافعہ کو سنتے کے ساتھ ہی دھچکا لگا تھا۔

"بس کل الشبی میرے پکائے گئے کھانوں میں نقص نکال رہی تھی۔ بلکہ میرا خوب ہی مذاق اڑا رہی تھی۔ میں نے کہا۔۔۔ ہونہہ۔۔۔ جواب جاہلاں باشد خموشی، پھر کیا تھا فٹ میری ساس کے پاس جا پہنچی، کہنے لگی امی بھابھی۔۔۔"

"ایک منٹ سبین! تم دوبارہ بتاؤ کہ تم نے کیسے کہا۔ میرا مطلب ہے کہ دل میں ہی کہا تھا نا؟" رافعہ نے بوکھلا کر بھتیجی کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں۔۔۔ کیا دل میں کہنا تھا؟" سبین نے الٹا ہونق پن سے پوچھا۔ رافعہ نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"آپ نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ یہ لفظ دل میں بولنے ہیں؟" سبین حیران ہوتے ہوئے تصدیق چاہ رہی تھی۔

"پھر ہوا کیا۔ تمہاری نند نے ساس کو بتایا تو خوب ہنگامہ ہوا ہو گا۔ ہے نا۔"

رافعہ نے اس کا سوال سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ دل ہی دل میں وہ اس وقت کو کوس رہی تھی جب سبین کی محبت میں اس نے اسے اپنا خاندانی نسخہ بتایا تھا۔ اردو کے مضمون میں گر پڑ کے پاس ہوئی سبین کو اس فارسی مثل کا مطلب ہی سمجھ میں نہ آیا تھا۔ جب ہی تو بے دھڑک نند کے سامنے بول گئی اور اسی لیے تو اس دن اتنا بے یقین ہو کر پوچھ رہی تھی کہ کیا یہ واقعی جادوئی لفظ ہیں۔ اس بے وقوف لڑکی نے ان جادوئی لفظوں کا کیسا استعمال کر ڈالا تھا۔

رافعہ چشم تصور سے اس کے سسرال میں بپا ہونے والے ہنگامے کو دیکھ سکتی تھی۔ سارا قصور شاید اسی کا تھا۔ صدمے اور افسوس سے رافعہ کا برا حال ہو رہا تھا۔

"آپ اتنی بھی پریشان نہ ہوں رافعہ چچی۔ اب ایسا بھی کچھ برا نہیں ہوا تھا۔" سبین نے اس کے چہرے پر اندتی پریشانی دیکھ کر فوراً" تسلی بھی دے ڈالی۔

"کیوں تم تو کہہ رہی ہو کہ تمہاری نند نے تمہاری ساس کو بتا دیا۔ پھر انہوں نے آگے سے کچھ نہیں کہا۔" رافعہ نے اچنبھے سے پوچھا۔

"میری نند کو کون سا میری بات سمجھ آئی تھی۔ کہنے لگی امی ابھی بھابھی نے مجھے کچھ کہا۔ مطلب مجھے سمجھ نہیں آیا۔ مگر بھابھی کے انداز سے لگ رہا تھا کہ بات غیر مناسب ہے۔ میری ساس نے پوچھا کیوں بہو کیا کہا ہے تم نے۔ میں بات ہی ٹال گئی۔ لیکن شاید بات کا مطلب واقعی کچھ ٹھیک نہیں ہو گا۔ ہے نا رافعہ چچی۔ سامنے والے کو جاہل کہا گیا ہے نا اس میں، لیکن آپ تو کہہ رہی تھیں کہ یہ جادوئی لفظ ہیں۔ آپ کے آزمائے ہوئے ہیں۔ دادی اور پھوپھو یہ سن کر کبھی نہیں جھگڑتی تھیں آپ سے۔"

سبین حیرت سے پوچھ رہی تھی۔ رافعہ ٹھنڈا سانس لے کر رہ گئی۔ سبین کے سوالوں کے جواب میں اس کے پاس سوائے خاموشی کے کچھ نہ تھا۔

☆

قانتہ رابعہ



"توبہ ہے امی! آپ کے بس میں ہو تو زبان سے چاٹ چاٹ کر پورا گھر صاف کریں۔" نمرہ نے جھنجھلا کر کہا۔ "یہاں سے دوبارہ بلکہ سہ بار پوچا لگاؤ۔ یہاں دھبہ کیوں پڑا ہوا ہے، فنائل کیوں نہیں ڈالا۔ بندہ سیدھی سادی صفائی کرے، ہلکی سی جھاڑ پونچھ کی اور پوچا لگا دیا۔"

صبح سے صفائیاں کر کر کے وہ صحیح معنوں میں ہلکان ہو رہی تھی۔ ابھی کھانا بنانا باقی تھا۔ آج زندگی میں پہلی دفعہ اسے شدت سے بہن کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ جب سسرالی اسے دیکھنے آئے۔ اس نے امی کی بات پر کان ہی نہ دھرا۔۔۔ امی بار بار کہتی رہیں۔

"گھر اچھی طرح چمکتا نظر آئے۔۔۔ کونے کھدروں میں سے میل جھانکتا نظر آ رہا ہے۔"

نمو کا موقف تھا کہ جسے دیکھنا ہے، وہ مجھے دیکھے گا یا چمکتا لشکتا گھر دیکھے گا؟ گھر لشکارے مار رہا ہو تو یہ کام والی ماسی کا کمال ہو گا ناں۔۔۔ میرے نمبر تھوڑا ہی بڑھیں گے۔"

سو نمرو بی بی کو پسند کرنے والے آئے اور پسند کر کے چلے گئے۔ آج اس کی بات طے ہونا تھی۔ رسم زمانہ کے برعکس دونوں گھرانوں کا مشترکہ موقف یہ تھا کہ منگنی کی کوئی باقاعدہ شرعی حیثیت سے نہیں، رہتے تو وہ منگیتر ہی ہیں، ایک دوسرے کے لیے نامحرم۔ لہٰذا بس بات پکی کر لی جائے اور نمرو کے امتحانات کے بعد باقاعدہ تقریب نکاح ہو۔۔۔!

آج بات پکی کرنے کے لیے لڑکے کی والدہ محترمہ، پھوپھی، خالہ دادی اور تینوں بہنیں بھی آ رہی تھیں لہٰذا امی کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ گھر کا ایک ایک کونا صاف کر کے بھی وہ مطمئن نہیں تھیں، ہوا کے گھوڑے پر سوار۔۔۔ ہاتھ لگا لگا کر فرنیچر پر دھول چیک کرتی رہیں۔ نمرو نے کام والی ماسی کو بھی ساتھ لگایا ہوا تھا۔ پھر بھی چھ سات گھنٹے لگ گئے۔ بیڈ شیٹس نئی بچھائی گئیں۔ صوفوں کے کشن کور، پردے یہاں تک کہ جائے نماز بھی نئی نکالی گئیں۔ جب عصر کی نماز کے بعد مہمان آئے تو نئے سوٹ اور ہلکے سے میک اپ کے باوجود تھکاوٹ نمرو کے چہرے سے نمایاں تھی۔ چائے کے ساتھ نگٹس، شامی کباب، فروٹ چاٹ، چکن سموسے اور چاکلیٹ کیک تھا۔ مزے کی بات یہ کہ سب کی سب چیزیں نمرو نے اپنے دست مبارک سے بنائی تھیں۔ پکانے ریندھنے اور نئی نئی ڈشز بنانے کا اسے شوق تھا اس لیے یہ کام ذرہ بھر مشکل نہ لگتا۔۔۔ ایک ہی وقت میں سری پائے بھی چولھے پر رکھے ہوئے ہیں۔ پزا بھی بیک ہو رہا ہے، پلاؤ کی یخنی بھی بن رہی ہے۔

دیکھنے والے دیکھتے تو حیران رہ جاتے کہ زمانہ طالب علمی میں بالعموم لڑکیاں ایسی دیسی اشیا بنانے سے بدکتی ہیں لیکن نمرو سب کچھ مزے سے کر لیتی ہے۔ برتن بھی وہ رو رو کے ہی دھوتی تھی لیکن کپڑے پریس کرنے اور صفائی ستھرائی کے کاموں سے اس کی جان نکلتی تھی۔ آج اللہ کی مرضی پسندیدہ اور ناپسندیدہ سارے ہی کام کرنے پڑ گئے۔ اس کی سسرال والے سادہ طبیعت تھے لہٰذا بغیر تصنع اور تکلف کے گھریلو موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ نمرو کی دادی ساس نے نمرو کو کچھ سست سا دیکھ کر پوچھا۔

"کیوں بیٹے! طبیعت ٹھیک نہیں ہے تمہاری؟"



"نہیں... ہاں... وہ اصل میں۔" نمرہ لڑبڑا گئی نئے نئے سسرالیوں سے کیا کہے اور کیا نہ کہے اس کی مشکل نمرہ کی امی نے ہی آسان کی۔

"خالہ... نمرہ سارے ہی کام شوق سے کر لیتی ہے، بس صفائی کا کام تھوڑا سا بھی کر لے تو تھک جاتی ہے اور آج تو اس نے سارا کام خود ہی کیا ہے۔"

نمرہ کی ماں کے اس فقرے کے بعد تمام خواتین نے سر اٹھا اٹھا کر اور چاروں طرف جھانک جھانک کر کی گئی صفائی کا جائزہ لیا... پھر نمرہ کی بڑی نند نے سرٹیفکیٹ عنایت کیا۔

"واقعی صفائی بھی غضب کی ہے۔ مجال ہے، کہیں کوئی مٹی کا ذرہ نظر آ جائے۔ لیکن بھئی، ہمارے ہاں کسی کو اتنی صفائی کی عادت نہیں۔" انہوں نے صاف گوئی سے کہا۔

"کیا مطلب؟" امی کچھ پریشان سی ہو گئیں۔

"آنٹی! بات یہ ہے کہ بہت تفصیلی صفائی ہمارے ہاں صرف رمضان سے ہفتہ دس دن قبل ہوتی ہے پھر سارا سال روٹین کا کام چلتا ہے۔" نمرہ کی چھوٹی نند نے کہا۔

اب کے نمرہ بھی حیران تھی۔ "اس کا مطلب ہے عید، بقر عید یا کسی مہمان کے آنے پر تفصیلی صفائی نہیں ہوتی؟"

نمرہ کی سب سسرالی رشتہ داروں کے چہروں پر مسکراہٹ آ گئی، وہ گھر کی بھیدی تھیں بڑی نند پھر بولیں۔

"بالکل... بس عام روٹین سے تھوڑی سی زیادہ لیکن رمضان سے قبل ابا سارے گھر میں نیا پینٹ کرواتے ہیں، نئی چادریں، تولیے، جائے نماز ابا کہتے ہیں، سال میں ایک دفعہ ہی تو اللہ کی طرف سے مہمان آتا ہے... خوب اہتمام ہونا چاہیے۔"

"کیا... واقعی روزوں کے لیے اتنا اہتمام اور عید پر کچھ نہیں؟" نمرہ نے بے یقینی سے کہا۔

"جی ہاں... ابا تو بڑے حساس ہو جاتے ہیں کہ

مہمان تو معمولی سی بات پر ناراض ہو سکتا ہے' آتا تو برکتیں رحمتیں لے کر ہے' ناراض ہو گیا تو سب کچھ واپس ہی نہ لے جائے اس لیے ابا نے باقاعدہ چارٹ پر فہرست لکھ کر لٹکائی ہوتی ہے عنوان درخواست برائے محترم ''اہلیان خانہ'' لکھا ہوتا ہے کہ اللہ کا خاص مہمان ایک مہینہ کے لیے آرہا ہے برائے مہربانی اسے یہ یہ کام کر کے اسے ناراض مت کریں اور نمرہ! یقین مانو ابا نے غیبت، چغلی، فضولیات کے ساتھ ساتھ اس مہمان کو راضی رکھنے کے طریقے بھی لکھے ہوتے ہیں۔''

''وہ کیا؟'' بے ساختہ نمرہ نے پوچھا اور اپنی بے تابی پر خود ہی شرمندہ ہو گئی۔

''وہ یہ کہ برائے مہربانی اس مہینہ کے اختتام تک اپنی زبانوں کو ذکر الٰہی سے' اپنے دل کو شکر سے لبریز رکھا جائے اور پتا ہے کیا؟'' بڑے ذو معنی انداز میں انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر پوچھا۔

''اور یہ کہ برائے مہربانی پکوڑوں کی پندرہ اقسام بنا کر بھی وقت ضائع نہ کیا جائے۔ یہ آلو کے پکوڑے، میتھی کے پکوڑے، بینگن کے پکوڑے' پالک کے پکوڑے' اور چکن پکوڑے کے بجائے دعا میں اٹھے ہاتھوں سے زیادہ راضی رہتا ہے۔ سو رمضان میں ہمارے ہاں راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ ہمارے دسترخوان پر دودھ' پھلوں کی چاٹ اور سادہ سا کھانا ہوتا ہے اور یہ کہ رمضان میں بھی سارا مہینہ ابا کی ایک ہی گردان ہوتی ہے۔ با آواز بلند ارشادات پورا ماہ جاری رہتے ہیں۔

''بی کڑیو یہ بہت قیمتی مہمان ہے پکوڑے سموسے بنا کر وقت ضائع کر کے اس کو ناراض نہ کرنا' یہ آلو بینگن کے پکوڑوں سے نہیں تقویٰ سے راضی ہوتا ہے۔'' یوں ہمارے ہاں رمضان اللہ کا مہمان بن کر سکون ہی سکون لاتا ہے۔ نہ غیبت نہ چغلی' ڈرامے نہ فلمیں نہ پکوڑے نہ سموسے' ہلکا پھلکا سا کھانا اور اللہ کے مہمان کی میزبانی۔۔۔ اللہ اللہ خیر صلا۔''

نمرہ دیدے پھاڑے ان کو دیکھ رہی تھی۔۔۔ مہمان کی اس قسم اور میزبانی کے اس انداز کا تو اسے علم ہی نہ تھا۔

صائمہ بشیر



گیٹ پر ہارن بجنے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کروٹ بدلی مگر نیند غائب ہو چکی تھی۔ اٹھ کر کھڑکی سے جھانکا تو گاڑی اندر آرہی تھی اور چوکیدار گیٹ بند کر رہا تھا۔ اس نے گہرا سانس لیا اور واش روم میں چلی گئی تھوڑی دیر میں وہ فریش ہو کر کچن میں پہنچ گئی۔ موحد یقیناً" اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ اس کا بیگ سامنے صوفے پر رکھا تھا۔ اس نے کھانا نکال کر مائیکرو ویو میں رکھا اور باہر جھانکا تو موحد چینج کر کے ٹانگیں میز پہ پسار کر ٹی وی آن کر چکا تھا۔

کھانا گرم ہوا تو ٹرے میں رکھ کر باہر آئی اس کے سامنے سے گزر کر ڈائننگ ٹیبل پر جا کر بیٹھ گئی اور مزے سے کھانے لگی۔

پندرہ منٹ تک وہ اپنے پچھلے پروگرام کی ریکارڈنگ دیکھتا رہا مگر جب مزید بھوک برداشت نہ ہوئی تو کچن میں چلا گیا۔ کوکنگ رینج پر رکھی کڑاہی میں سالن رکھا تھا اس نے فریج سے ڈبل روٹی نکالی اور کھانا گرم کرنے لگا پھر اپنی ٹرے لا کر وہ پھر ٹی وی کے آگے بیٹھ گیا' کھانا مزے کا تھا یا بھوک زیادہ لگی تھی۔ جو بھی تھا اس کے اعصاب پر سکون ہونے لگے' سامنے ٹی وی پر اس کا شو اپنے اختتامی مراحل میں تھا جس میں موحد ذوالفقار ہمیشہ کی طرح انتہائی جذباتی اور پر اثر تقریر کر رہا تھا۔

"نہ جانے یہ بندہ ایک ہی وقت میں اتنے لوگوں کو بے وقوف کیسے بنا لیتا ہے۔" اس نے ڈائننگ ٹیبل

مکمل ناول



برتن سمیٹتے ہوئے سوچا۔



"شکر ہے انگزامز سے جان چھوٹی۔" عنایہ نے کرنے کے سے انداز میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں صحیح کہہ رہی ہو۔ اب دوبارہ اس منحوس یونی ورسٹی کی شکل نہیں دیکھنی پڑے گی۔" مریم نے سپاٹ چہرے کے ساتھ کہا اور آنکھیں موند لیں۔

"کم آن مریم! اب اس ایک شخص کی وجہ سے پوری یونیورسٹی کو تو منحوس نہ کہو۔" عنایہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تو اور کیا کہوں؟ میرے لیے اس سے زیادہ فضول اور منحوس جگہ اور کوئی نہیں ہے۔ میں تو دوبارہ کبھی اس جگہ کو دیکھنا نہیں چاہتی۔" مریم کی آواز بھرا گئی۔

"مریم! میں جانتی ہوں ابھی تمہارا دکھ نیا ہے' وقت لگے گا مگر تم دیکھنا' ہم یہیں پر بہت اچھے اور خوب صورت دنوں میں دوبارہ آئیں گے... بیٹھیں گے۔ گزرے وقتوں کو یاد کرکے ہنسیں گے اور ان سب کی ہنسی اڑائیں گے جن کے لیے آج رو رہے ہیں۔" عنایہ نے مریم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سمجھایا۔

"پتا نہیں یار! فی الحال تو مجھے ہنسی اور خوشی جیسے لفظ اجنبی سے محسوس ہوتے ہیں۔" مریم نے بے بسی سے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھا۔

"تو پھر کیوں اسے نئی زندگی شروع کرنے کی دعا دے رہی تھیں۔ جب وہ اپنی جھوٹی سچی کہانی سنا رہا تھا' اگر تمہاری زندگی اس کے بغیر بے معنی تھی تو پھر کیوں اتنی اعلیٰ ظرف بن گئی تھیں... کیوں اس کو اپنی محبت سے آزاد کیا اور اگر تم میں اتنی ہمت تھی تو اب رو کیوں رہی ہو؟ جاؤ اس کی شادی میں جو لوگوں میں خوشی خوشی کارڈ بانٹ رہا ہے۔" عنایہ پھٹ پڑی۔

"کیسے چلی جاؤں... وہ شخص جو کل تک میرے لیے دنیا چھوڑنے کی بات کرتا تھا اور آج اپنی شادی کی خوشی میں مست پھر رہا ہے۔ آج آخری پیپر والے دن مجھے لگا کہ میں تو کسی اور سلمان ہمدانی سے ملتی رہی ہوں۔ یہ شخص تو کوئی اجنبی ہے۔ لوگ چند دنوں میں بھی بدل جاتے ہیں؟"

مریم جو کافی دنوں سے امتحان میں مگن ہونے کی وجہ سے اندر ہی اندر سسک رہی تھی۔ اب اپنا غم نکال رہی تھی اسے دھچکا بھی تو بہت شدید لگا تھا وہ شخص جو یونیورسٹی کے پہلے دو سال اس کے آگے پیچھے پھرتا رہا اور وہ لفٹ نہیں کراتی تھی مگر تیسرے سال وہ مجبور ہو گئی۔ سلمان ہمدانی کی شخصیت کو نظرانداز کرنا کچھ اتنا آسان بھی نہ تھا' سلمان جیسا شخص اتنی مستقل مزاجی کے ساتھ اس کی طرف متوجہ رہا کہ وہ بہت پریکٹیکل سوچ رکھنے کے باوجود ہار گئی اور سلمان کی محبت جیت گئی۔ اگلے دو سال انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ مستقبل کی پلاننگ کرتے گزار دیے۔ فائنل سے قبل جب وہ منتظر تھی کہ سلمان اپنے والدین کو اس کے گھر بھیجے گا تو سلمان نے اچانک دھماکا کر دیا۔ وہی فرسودہ سی کہانی... اس کی امی بیمار پڑ گئیں اور جذباتی بلیک میلنگ کرکے اسے اپنی بھانجی کے لیے راضی کر لیا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے' وہ واقعی تمہارے لیے سیریس تھا؟ مریم تم بھی نا! ویسے تو بہت سمجھ دار بنتی ہو۔" عنایہ نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"محبت سب سے پہلے انسان کی عقل ہی تو چھینتی ہے۔ میں نہیں جانتی کہ وہ میرے ساتھ مخلص تھا یا نہیں' مگر میں اس کے ساتھ بہت مخلص تھی میں نے واقعی محبت کی تھی سلمان سے اور شاید اب میں کبھی کسی سے محبت نہ کر پاؤں۔"

مریم کو کبھی بھی عنایہ نے یوں روتے نہیں دیکھا تھا' مگر آج کی بات جدا تھی۔ چوٹ گہری تھی... یونی ورسٹی کا آخری دن تھا اور دل سے قریب اس کی دوست اس کے ساتھ تھی۔ ضبط کرتی بھی تو کیسے۔



وہ کچن میں گندے برتن سنک میں رکھ رہی تھی' جب لاؤنج سے موحد کی آواز آئی۔ کسی دوست کا فون

لگ رہا تھا۔

"ہاں یار! آجاؤ۔ یاروں کے لیے تو میں فارغ ہی فارغ ہوں...... ارے نہیں کیسا تکلف۔ وہ نہیں مائنڈ کرتی۔ وہ جانتی ہے۔ ہم دونوں کتنے کلوز فرینڈ ہیں تم پہنچو۔ میں ویٹ کر رہا ہوں۔" موحد نے عجلت میں فون بند کیا اور کچن کے دروازے میں آکھڑا ہوا۔

"میرا دوست آرہا ہے اگر زحمت نہ ہو تو چائے وغیرہ بنا دینا۔" موحد نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے زحمت ہوگی۔" اس نے برتن دھوتے دھوتے جواب دیا۔

"دیکھو میں جانتا ہوں ملازم نہ ہونے کی وجہ سے مسئلہ ہو رہا ہے۔"

"اٹس اوکے...... مجھے اپنا کام کرنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" اس نے اپنا پر زور دیا۔

"ہاں تو میرا کون سا کام کرتی ہو تم...... میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ میرا دوست کیا سوچے گا تمہارے بارے میں، تمہاری ہی عزت کے لیے کہہ رہا تھا۔" موحد نے ہمیشہ کی طرح بات کو اس کی طرف گھمایا۔

"دوست تمہارا سو عزت بھی تمہاری۔ وہ جو بھی سوچے گا تمہارے لیے ہی سوچے گا...... مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس نے رکھائی سے کہا۔

"اوکے نکلو پھر کچن سے تاکہ میں اپنے حصے کے برتن دھولوں اور اس کے آنے سے پہلے ٹرالی سیٹ کرلوں۔ اسے بھی تو پتا لگے کہ اب میں شادی شدہ ہوں، چھڑا نہیں ہوں۔" موحد نے جھنجلا کر اسے باہر نکلنے کا اشارہ کیا تو وہ مزے سے کندھے اچکا کر چلی گئی۔

"یار! بھابھی نظر نہیں آرہیں۔" موحد کے قریبی دوست علی نے آتے کے ساتھ ہی پوچھ لیا۔

"بس اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ یہ چائے وغیرہ اسی نے بنائی ہے ابھی کچھ دیر پہلے کمرے میں سونے چلی گئی ہے شاید۔" موحد نے جلدی سے کہا۔

"توبہ...... کیا فراٹے سے جھوٹ بولتا ہے۔" وہ جو کمرے میں ان کی آوازیں سن رہی تھی کوفت سے بڑبڑائی۔



"آنٹی! مریم کہاں ہے؟" عنایہ نے مریم کی ماما کو سلام کیا جو لاؤنج میں بیٹھی ڈراما دیکھ رہی تھیں۔

"نہ سلام نہ دعا لڑکی! کیا ہو گیا ہے...... بیٹھو ادھر اور یہ ڈراما دیکھو۔" مریم کی ماما نے اسکرین سے نظریں ہٹائے بغیر اسے جھڑکا۔

"آنٹی پلیز...... میں نے یہ ناول پڑھا ہوا ہے۔ میرے مزے کو برقرار رہنے دیں۔" عنایہ نے جلدی سے جان چھڑاتے ہوئے کہا اور مریم کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔

"ارے واہ عنایہ آپی آئی ہیں۔" فہد جو مریم سے چھ سال چھوٹا تھا عنایہ کو دیکھتے ہی نعرہ بلند کیا تو عنایہ دور سے ہی اسے ہاتھ ہلا کر مریم کے کمرے میں گھس گئی۔

"کہاں گم ہو میڈم! ایک تو اس گھر میں تم تک پہنچنا بہت ہی مشکل کام ہے۔" عنایہ نے مریم کے اوپر سے کمبل کھینچا تو دھک سے رہ گئی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

"مریم!" عنایہ پریشانی سے اس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کے گال سہلانے لگی۔

"پلیز عنایہ! ماما کو کچھ نہ بتانا۔ وہ بہت ٹینشن لے لیتی ہیں ہر چیز کی۔" مریم نے تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے اپنے آنسو پونچھے۔

"سمجھی تھی تم کافی حد تک سنبھل چکی ہوگی...... مریم اب بس بھی کرو یار! اور کتنا سوگ مناؤ گی۔" عنایہ نے ڈانٹا۔

"ٹھیک ہوں میں...... تم بتاؤ کیسے آنا ہوا۔" مریم نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا۔

"تمہاری ان سوجی ہوئی آنکھوں کو ابھی تمہارے گھر میں کسی نے نوٹس نہیں لیا؟" عنایہ نے حیرانی

سے پوچھا۔

"نہیں یار! یہ تو آج طبیعت بھر سی آئی تھی ورنہ میں بالکل ٹھیک ہوں' اتنی پاگل نہیں ہوں اپنے قریبی لوگوں کو پریشان کروں۔ میں نے اس شخص کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا ہے اپنے اندر' آئندہ تم میرے منہ سے اس کا نام نہیں سنو گی۔" مریم نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"اسے کہیں بھی دفن کرو مگر اپنے اندر نہیں مریم! میں نہیں چاہتی کہ۔ زندہ یا مردہ کسی بھی حالت میں وہ تمہارے دل میں رہے۔" عنایہ نے مریم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو مریم نے ہونٹ کاٹتے ہوئے سر جھکا لیا۔



صبح وہ ناشتے کے لیے کچن میں آئی تو ہر چیز چمک رہی تھی' کوئی گندے برتن سنک میں نہ تھے۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ رات کوئی مہمان آیا تھا اور نہ ہی ناشتے کے برتن پڑے تھے۔ یقیناً" رات والی بات کا اثر تھا۔ اس نے مزے سے ناشتا بنایا اور لاؤنج میں آ گئی۔ ٹی وی آن کیا تو موحد ذوالفقار صاحب براجمان تھے۔

"اف! گھر میں بھی اس شخص کو برداشت کرو اور ٹی وی پر بھی دیکھو' حد ہو گئی۔" اس نے کوفت سے چینل بدلا اور ڈراما لگا کر بیٹھ گئی۔ فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف ماما تھیں۔

"السلام علیکم ماما!"

"کیسی ہو بیٹا! کچھ ہوا ماسی کا؟" انہوں نے پہلا سوال ماسی کے بارے میں کیا۔

"نہیں ماما! موحد نے کافی لوگوں کو کہا ہوا ہے۔" اس نے بات بنائی۔

"اوہو! ایک تو یہ تمہارا شوہر۔۔۔ اپنے اسلام آباد والے گھر سے ہی کوئی ملازم بلوا لے۔ میں نے اور تمہارے بابا نے بھی کتنی دفعہ ملازم بھیجنے کا کہا مگر بات ہی بدل دیتا ہے۔ ایسی بھی کیا بے اختیاری سماجی شخصیت ہے تو اپنے ہی سسرال والوں سے احتیاط۔"

ماما نے شکوہ کیا تو وہ چپ سی رہ گئی۔

"ویسے ماما! مجھے اتنی پرابلم نہیں ہوتی چھوٹا سا تو گھر ہے۔ ایک کھانا ہی تو بنانا ہوتا ہے۔"

"مگر بیٹا! جب تم دوبارہ جاب کرو گی' پھر تو تمہیں ضرورت محسوس ہو گی۔"

"اسی وقت دیکھوں گی ماما!" اس نے بے زاری سے کہہ کر بات ختم کی۔



"تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں اتنی ایکسائیٹڈ کیوں ہوں؟" عنایہ نے مریم کو باہر لان میں لا کر کہا۔

"اس لیے کہ تم بتا ہی دو گی میں پوچھوں نہ پوچھوں اور یقیناً" اس کا تعلق موحد ذوالفقار سے ہو گا۔" مریم نے بالکل صحیح اندازہ لگایا۔

"تمہیں کیسے پتا۔۔۔ میں واقعی اس کے لاہور آنے کی وجہ سے ایکسائیٹڈ ہوں۔" عنایہ نے جلدی سے بتایا۔

"اگر میں غلط نہیں ہوں تو وہ ہر دوسرے ہفتے لاہور میں ہوتا ہے پھر اب کیا خاص بات ہے؟" مریم نے حیرت سے کہا۔

"خاص بات یہ ہے کہ آج وہ رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائے گا۔ اس نے صبح ڈیڈی کو فون کیا تھا کہ شام میں آؤں گا۔ سو ڈیڈی نے ڈنر کی دعوت دے ڈالی۔" عنایہ نے مزے سے بتایا۔

"تو پھر تم یہاں کیا کر رہی ہو۔۔۔ جاؤ اپنے گھر اور مزے مزے کی ڈشیں بناؤ تاکہ وہ امپریس ہو کر ہی جائے۔" مریم نے شوخی سے کہا۔

"اسی لیے تو آئی ہوں تمہارے پاس۔۔۔ ہمیشہ کی طرح تمہاری ہیلپ چاہیے۔ جو اسے پسند ہے وہ مجھے بالکل نہیں بنانے آتے۔" عنایہ نے بے بسی سے کہا۔

"تمہیں کیسے پتا کہ اسے کیا پسند ہے؟" مریم نے اسے گھورا۔

"میں نے فیس بک پہ میسج کیا تھا اسے اور اس

نے آٹھ دس نہ جانے کون کون سی ڈشیں لکھ دیں۔ پلیز مریم! میرے ساتھ چلو۔" عنایہ نے چہرے پر مسکینی طاری کی۔

"تو تمہیں کس پاگل نے کہا تھا کہ اس سے پوچھو اب بھگتو۔" مریم نے بے نیازی سے کہا۔

"ایسے مت کہو پلیز!" عنایہ نے مریم کے کندھے دبانے شروع کیے تو مریم مسکرا دی۔

"اچھا ٹھیک ہے میں ماما کو بتا کر آتی ہوں۔"

"ان کی فکر نہ کرو، میں نے پہلے ہی پوچھ لیا تھا۔" عنایہ بولی۔

"بہت ہی بڑی چیز ہو تم۔" مریم نے غصے سے گھورا، پھر دونوں عنایہ کی گاڑی پر عنایہ کے گھر آ گئیں۔

عنایہ مریم کچن میں گھسی یوں ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ یوں ہی نئی ڈشیں ٹرائی کر رہی ہیں اور شام میں اگر کوئی آ رہا ہے تو اس میں انہیں زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔

"تم لوگوں کو پتا بھی ہے کہ وہ تمہارے بابا کی فیملی کا ہے اور پہلی دفعہ گھر آ رہا ہے۔ پتا نہیں تم کیا الم غلم بنا رہی ہو، ہٹو پیچھے اور نوازش کو کرنے دو۔" ماما نے عنایہ کو گھرکا۔ ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بھی رات والے مہمان کی وجہ سے ٹینشن میں ہیں۔

موحد عنایہ کے دور پار کا رشتہ دار تھا۔ عنایہ کے بقول وہ ایک پیدائشی جرنلسٹ ہے۔ ان لوگوں کا ایک دوسرے کے گھر بہت زیادہ آنا جانا نہیں تھا۔ موحد کے والدین حیات نہیں تھے۔ ایک بڑی بہن کراچی میں تھیں اور وہ اپنے آبائی گھر اسلام آباد میں رہائش پذیر تھا۔ ایک دو خاندانی تقریبات میں عنایہ کا موحد سے سامنا ہوا تو وہ پہلی ملاقات میں ہی اس سے شدید متاثر ہو گئی۔ اس کے خیالات، اس کی باتیں اور متاثر کن لہجہ عنایہ کی زبان پر ہر وقت موحد ذوالفقار کا نام رہنے لگا۔



"تم کہاں جا رہی ہو؟" موحد جو عجلت میں ناشتا کر رہا تھا اسے بیگ لٹکائے نک سک سے تیار دیکھ کر چونک گیا۔

"آفس اور کہاں؟ چابی ہے نا تمہارے پاس؟" وہ سمجھی نہیں کہ موحد کو حیرت کس بات پر ہو رہی ہے۔

"تم نے تو جاب چھوڑ دی تھی۔"

"میں نے کب کہا تھا کہ میں جاب چھوڑ رہی ہوں۔ تمہارے خیال میں میں گھر بیٹھ کر تمہارے لیے کھانے پکاؤں، تمہارا انتظار کروں۔" اس نے طنزاً کہا۔

"خیر گھر بیٹھ کر بھی تم نے ایسا کوئی کام نہیں کیا، جو مجھے تمہاری جاب سے کوئی تکلیف ہو۔" موحد نے بھی فوراً سے پیشتر جواب دیا۔

"اوکے۔۔۔ پھر جو پکا ہوا سالن مل جاتا تھا نا جسے صرف گرم کرنے کی زحمت کرتے تھے، آئندہ وہ بھی

خود ہی بنانا...... مجھے دیر ہو رہی ہے۔" اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر نکل گئی۔ موحد پیچھے کھول کر رہ گیا۔

ابھی اس نے گاڑی اسٹارٹ ہی کی تھی کہ موحد بھی باہر آگیا اور ایک غصیلی نظر اس پر ڈال کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

"ویسے تم مجھ سے اتنی پوچھ گچھ کے مجاز ہو نہیں۔ میں کہاں آتی جاتی ہوں...... جاب کرتی ہوں یا نہیں ...... آئندہ خیال رکھنا۔" یہ جملہ اس نے موحد کو بتانے کے لیے کہا تھا اور وہ تپ بھی گیا۔ اپنی گاڑی میں بیٹھنے کے بجائے وہ اس کی گاڑی کی طرف بڑھا اور اس کے دروازے پر ہاتھ رکھ کر جھکا۔

"میں نے کھانا پکانے کا شیڈول فریج پر لگا دیا ہے۔ واپسی پر پڑھ لینا۔" یہ کہہ کر وہ واپس چلا گیا۔

"ہونہہ...... شیڈول۔" اس نے چابی گھمائی۔

☆ ☆ ☆

"اور کیا مصروفیات ہیں بیٹا آپ کی؟" کھانے کی میز پر عنایہ کے والد نے موحد سے پوچھا۔

"بس انکل تھوڑا بہت پیپرز میں لکھ رہا ہوں۔ کبھی کوئی چینل والے بلالیں تو چلا جاتا ہوں۔" موحد نے انکساری سے کہا۔

"ہوں...... عنایہ تمہارے کالمز کی بہت تعریف کرتی ہے بلکہ اکثر ہی ہمارے گھر میں بات ہو رہی ہوتی ہے۔ میں پڑھ تو نہیں سکا مگر یقیناً اچھا لکھتے ہو گے۔" عنایہ کے والد جو کہ بزنس مین تھے۔ اس سے زیادہ تبصرہ نہ کر سکے جبکہ عنایہ مکمل محویت سے موحد کی طرف متوجہ تھی۔ موحد نے بھی مسکرا کر عنایہ کو دیکھا۔

"اچھا تو آپ پڑھتی ہیں میرے کالم...... خوشی کی بات ہے۔" موحد نے کھانے سے انصاف کرتے ہوئے کہا۔ مریم موحد کے آنے سے پہلے ہی جا چکی تھی۔ اگرچہ اسے بہت شوق ہو رہا تھا موحد سے ملنے کا مگر اسے یوں فیملی ڈنر میں شامل ہونا اچھا نہیں لگا تھا اور عنایہ کے لاکھ روکنے پر بھی وہ واپس چلی گئی۔

"جی انکل میں بہت فین ہوں آپ کے لکھنے کے اسٹائل کی۔ بہت زبردست لکھتے ہیں آپ۔" عنایہ نے کھلے دل سے تعریف کی تو موحد نے شکریہ ادا کیا۔

"آنٹی! کھانا تو بہت ہی مزے کا پکا ہے۔ لگتا ہے آپ کا کک کافی پروفیشنل ہے۔" موحد کے انداز سے لگ رہا تھا کہ یا تو اس نے زمانے بعد گھر کا کھانا کھایا ہے۔ یا پھر وہ اچھے کھانے کا بہت دلدادہ ہے۔

"بیٹا! میرے کک نے تو بس یہی چند مخصوص سے کھانے بنائے ہیں۔ یہ جو عجیب و غریب سی ڈشز ہیں یہ عنایہ اور اس کی دوست کے تجربات ہیں۔" ماما نے صاف لفظوں میں بتایا تو عنایا جتانے والے انداز میں موحد کو دیکھ کر مسکرائی۔ موحد نے ستائشی انداز میں بھنوئیں اٹھائیں۔

"بہت عمدہ مس عنایا! مگر پلیز آپ مجھے ان ڈشز کا تھوڑا سا تعارف بھی کروادیں کیونکہ میرا ابھی اتفاق نہیں ہوا انہیں کھانے کا۔"

موحد نے بھولپن سے کہا تو عنایہ کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ وہ سمجھ گئی کہ موحد نے صرف مذاق میں ان مشکل ڈشوں کے نام لکھے تھے۔

عنایہ نے نظر بچا کر مریم کو موبائل پر میسج کر کے موحد کے مذاق کا بتایا۔ جواباً" مریم کا خونخوار شکل والا میسج آگیا۔ موحد اس کارروائی کو محظوظ انداز میں دیکھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

واپسی پر اس نے فریج کے دروازے پر چپکا کاغذ دیکھا جس پر موحد نے پورے ہفتے کا کھانے پکانے کا ٹائم ٹیبل لکھ رکھا تھا۔ تین دن کھانا موحد کی ذمہ داری تھا اور تین دن اس نے پکانا تھا اور ساتویں دن...... ؟ اتوار کے آگے سوالیہ نشان لکھا تھا۔ انصاف کے تقاضے پورے کیے گئے تھے مگر اتوار کو کیا فاقہ کریں گے، اس نے سوچا۔

آج موحد کی باری تھی۔ اس نے فریج اور چولہے پر نظر دوڑائی مگر کہیں پر کھانے کے آثار نظر نہ آئے۔ ابھی وہ اپنے لیے کچھ بنانے کا سوچ رہی تھی کہ ڈور بیل

ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو ایک مشہور فاسٹ فوڈ چین کا یونیفارم پہنے ایک بندہ آرڈر لیے کھڑا تھا۔ وہ حیران ہوئی۔

"جی پے منٹ ہو چکی ہے۔" اس بندے نے اسے مڑتے دیکھ کر کہا تو اس نے فوراً آرڈر پکڑ لیا اور اندر آکر صوفے پر بیٹھ کر کھولا۔ پیزا برگر تھا اس کا پسندیدہ بغیر سلاد کے۔

وہ ہوم ڈلیوری کی ٹائمنگ پر حیران تھی۔ ابھی اس نے گھر میں قدم رکھا تھا اور پانچ منٹ بعد بس وہ حاضر۔

"ہونہہ..... اچھا طریقہ ہے کھانا پکانے سے بچنے کا۔"



"آنٹی پلیز! مان جائیں۔ صرف چھ ماہ کی بات ہے۔ پلیز پلیز آنٹی!" عنایہ کارپٹ پر پنجوں کے بل بیٹھی مریم کی ماما کی منت کر رہی تھی۔

"تم بھی عجیب بات کر رہی ہو عنایہ! تمہاری تو وہ پھپھو ہیں مریم کا وہاں کیا کام، اور دوسرے لاہور جیسے بڑے شہر کو چھوڑ کر اسلام آباد جا کر کورس کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" مریم کی ماما مسلسل نفی میں سرہلا رہی تھیں پیچھے کھڑی مریم بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں عنایہ کو منع کر رہی تھی مگر عنایہ بھی سوچ کر آئی تھی کہ آسانی سے ہار نہیں مانے گی۔

"آنٹی! پھپھو بالکل اکیلی ہوتی ہیں۔ آپ انہیں جانتی ہیں۔ ماما بابا چھ ماہ کے لیے امریکہ جا رہے ہیں۔ میں ان کے ساتھ نہیں جانا چاہتی اور اس کورس کے لیے انہوں نے صرف ایک ہی شرط رکھی ہے کہ مریم ساتھ ہوگی تو..... ورنہ نہیں۔" عنایہ نے مکمل داستان سنائی۔

"بھئی ایسا کون سا کورس ہے، جو لاہور میں نہیں ہوتا اور وہاں ہوتا ہے، تم لوگ یہاں پر جو مرضی کر لو اور تم مت جاؤ امریکہ۔ یہاں مریم کے ساتھ رہ لو..... حالات دیکھو، دوسرے شہر میں، جوان جہاں اکیلی لڑکیاں۔" ماما نے جذباتیت سے کہا۔

"کیا یہاں چل رہا ہے بھئی خیریت ہے نا؟" فیضان صاحب نے اندر آتے ہی پوچھا۔

"انکل! پلیز ہیلپ می..... اتنا زبردست کورس کروا رہے ہیں ٹیکسٹائل ڈیزائننگ میں۔ کل اگر میں اور مریم باہر جاتے ہیں تو اس کی بیس پر ہمارا کہیں بھی ایڈمیشن ہو سکتا ہے اور جاب کے لیے بھی بہت ہی ہیلپ فل ہے۔" عنایہ نے جلدی سے اپنی توپوں کا رخ فیضان صاحب کی طرف کیا۔

"تو کیا مسئلہ ہے، بھئی ضرور کرو۔" فیضان صاحب نے حسب توقع جواب دیا۔

"آگے بھی تو سن لیں۔" پاپا نے لقمہ دیا۔ مریم خاموش تماشائی بنی دیکھ رہی تھی، عنایہ نے ساری کہانی سنا ڈالی۔

"کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں ان خاتون کو اچھی طرح جانتا ہوں، تمہارے والد کی رشتے کی بہن ہیں۔ بہت ہی نیک خاتون ہیں..... چلو تم لوگ جانے کی تیاری کرو۔" فیضان صاحب اسی طرح فیصلے کرتے تھے ایک لمحے میں اور قطعی۔

"مگر دوسرا شہر....." ماما نے ٹانگ اڑائی۔

"اوہو بیگم صاحبہ! آپ نے کیا مڈل کلاس ماؤں والی گفتگو شروع کر دی ہے۔ لگتا ہے آج کل ڈرامے مڈل کلاس پر بن رہے ہیں۔" ان کا یہ کہنا تھا کہ فد، مریم اور عنایہ کے لیے ہنسی چھپانا مشکل ہو گئی۔



"ویسے عنایہ میڈم! اگر میرے اور تمہارے پیرنٹس کو پتا چل جائے کہ تم اسلام آباد جانے کی ضد کسی کورس کے لیے نہیں بلکہ اس جرنلسٹ کے لیے کر رہی ہو تو خیر نہیں ہے۔" مریم نے پیکنگ کرتی عنایہ کو ڈرانے کی کوشش کی۔

"تو ان کو بتائے گا کون..... تم؟ کبھی نہیں، تم میری دوست ہو..... میری پیٹھ میں چھرا نہیں گھونپ سکتیں۔" عنایہ نے مزے سے کہا۔

"ہاں یہ تو ہے..... چلو یار! تھوڑا چیلنج بھی ہو جائے

گی، میں بھی لاہور سے اکتا گئی ہوں۔" مریم نے بیڈ پر لیٹتے ہوئے کہا۔

"سچ بتاؤں مریم! موحد کے علاوہ میں ایسا صرف اور صرف تمہارے لیے کر رہی ہوں۔ مجھے لگتا ہے تمہیں چینج کی بہت سخت ضرورت ہے۔" مریم نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"تم بتاؤ نہ بتاؤ مگر میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ تم ابھی تک سوگ منا رہی ہو اور میں چاہتی ہوں کہ تم اس فیز سے باہر نکلو۔" عنایہ نے سوٹ کیس بند کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو تمہارے خیال میں اسلام آباد جا کر میرا دل بدل جائے گا۔" مریم نے استہزائیہ کہا تو عنایہ کو دکھ ہوا کیونکہ مریم نے اس کے اندازے کی نفی نہیں کی تھی۔

"دل تو نہیں بدلے گا مگر بہل ضرور جائے گا اور آہستہ آہستہ شاید بدل بھی جائے۔" عنایہ نے مریم کی آنکھوں میں نرمی سے دیکھ کر کہا اور مسکرا دی۔

اگلے دن ڈرائیور دونوں کو بمعہ سامان اسلام آباد چھوڑ گیا، جہاں پر عنایہ کی پھپھو آمنہ خاتون نے ان کا پرتپاک استقبال کیا۔ ان کا بنگلہ کافی کشادہ تھا۔ مگر وہ اکیلی رہتی تھیں۔ ساری اولاد ملک سے باہر تھی۔ دونوں نے پہلے اپنا کمرا دیکھا اور پھر مزیدار سا کھانا کھایا۔ عنایہ تو عنایہ مریم کو بھی اپنائیت کا بے پناہ احساس ہوا۔



آج اتوار کا دن تھا اور پچھلے تین ہفتوں سے اتوار کو کھانا نہیں پکتا تھا۔

دونوں بیٹھ کر انتظار کرتے رہتے کہ شاید دوسرا کچھ بنا لے مگر دونوں ہی اصول کے پکے تھے اور پھر موحد تو گاڑی نکال کر کہیں چلا جاتا تھا اور وہ فریج سے کچھ نہ کچھ نکال کر کھا لیتی۔ اکثر اتوار کو موحد گھر نہیں ہوتا تھا مگر آج وہ نہ صرف موجود تھا بلکہ کچن کے تین چار چکر بھی لگا چکا تھا۔ خلاف معمول خالی فریج بھی منہ چڑا رہا تھا۔ وہ جانتی تھی موحد بھوک کا کچا ہے۔

"انسان میں تھوڑی سی شرم ہونی چاہیے۔۔۔ اصولاً" اتوار کے دن تمہیں کچھ بنانا چاہیے۔ باہر کا کھانا کھا کھا کے میرا تو پیٹ خراب ہو گیا ہے۔" موحد نے اس کو نمکو کھاتے دیکھ کر افسوس سے کہا تو اس نے موحد کے چہرے پر غور کیا۔ وہ تھوڑا نڈھال سا لگ رہا تھا مگر اس نے بے نیازی اختیار کر لی۔

"اس بحث سے قطع نظر کہ کن اصولوں کے تحت مجھے آج کھانا بنانا چاہیے' کیا میں نے کہا تھا کہ ہوٹلوں کا کھانا کھاؤ۔"

"تو کیا کروں؟ اپنے سسرال جا کر کھاؤں؟ یا پھر داتا صاحب پر جا کر بیٹھ جاؤں۔" موحد نے اسے پھر شرم دلانی چاہی۔

"تم بلاوجہ ہی مجھے آنکھیں دکھا رہے ہو۔ ہوٹلوں سے کھانا تم نے منگوایا ہے' میں نے نہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔۔۔ اور میں نے جو یہ سوچا کہ آج تم کچھ پکاؤ گی' ایسا سوچنے پر بھی مجھے معذرت کرنی چاہیے۔ لگتا ہے مجھے کراچی سے رابی آپی کو بلانا پڑے گا۔ وہی کھچڑی بنا کر دیں گی۔۔۔ یہاں تو کسی کو احساس نہیں ہے۔"

موحد آواز میں مزید نقاہت پیدا کرتے ہوئے صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ اسے ایک دم کرنٹ لگا۔ اگلے لمحے وہی ہوا جو وہ چاہتا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی مزیدار خوشبو اڑاتی کھچڑی اس کے سامنے تھی' اس نے فاتحانہ مسکراہٹ اچھالی۔

"ارے واہ! مزہ آ گیا۔ ایسی کھچڑی تو رابی آپی کے فرشتے بھی نہیں بنا سکتے۔" اس نے کھلے دل سے تعریف کی مگر انداز چڑانے والا ہی تھا۔ وہ کھول کر رہ گئی۔

یہ نہیں تھا کہ اسے موحد کی بہن سے کوئی پرخاش تھی۔ وہ انتہائی مخلص اور محبت کرنے والی تھیں مگر موحد اور ان میں ایک بات مشترک تھی دونوں ہی فل اسٹاپ کا مطلب نہیں جانتے تھے۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اگر وہ اپنے دو بچوں کے ساتھ اس اپارٹمنٹ میں آ جاتیں تو یہاں صرف دو ہی بیڈ روم تھے۔ اس لیے

کھچڑی پکانا کوئی بڑی ڈیل نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

عنایہ کی گرم جوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ پھپھو کیا اور اسلام آباد کیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہر کسی کو آگے بڑھ کر گلے لگا لے۔ اس نے موحد کو بھی میسج کر دیا تھا پھر جب موحد ان کے گھر آیا۔ تو عنایہ اور اس کے درمیان موبائل نمبرز کا تبادلہ بھی ہو گیا تھا اور اب عنایہ اس کے ساتھ مستقل رابطے میں تھی۔

عنایہ اسلام آباد آ کر بے حد خوش تھی اور مریم عنایہ کو دیکھ کر خوش۔ وہ جانتی تھی محبت یوں رنگوں کی صورت کسی کے چہرے پر کیسے نکھرتی ہے۔ وہ دل ہی دل میں ان رنگوں کے برقرار رہنے کی دعا کرتی تھی۔ پھپھو نہایت شفیق خاتون تھیں۔ مریم کو وہ بہت اچھی لگیں۔

"تمہیں پتا ہے عنایہ! تمہارے بابا اور میری کزن کا ایک بیٹا ہے جو یہیں اسلام آباد میں ہوتا ہے۔" دوپہر کے کھانے پر اچانک ہی پھپھو نے تذکرہ کیا تو دونوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ "کافی نام ہے اس کا اخباروں میں کالم لکھتا ہے اور۔۔۔"

"موحد ذوالفقار؟" عنایہ نے فوراً لقمہ دیا۔ مریم نے اس کی جلد بازی پر گہرا سانس لیا۔ محبت شاید یوں ہی بے اختیار کرتی ہے۔ اگر پھپھو ذرا سا بھی عنایہ کے چہرے کو غور سے دیکھ لیتیں تو انہیں مزید اس بندے کے تعارف کی ضرورت نہ پڑتی۔

"ہاں ہاں وہی' میرا خیال تھا کہ تم شاید نہ جانتی ہو آج کل کے بچے کہاں ملتے ہیں رشتہ داروں سے بہت ہی اچھا اور نیک بچہ ہے۔" پھپھو گویا ہوئیں۔

"ارے نہیں پھپھو! میں تو سب کو ہی جانتی ہوں۔ ایسی بھی بات نہیں ہے۔" عنایہ تھوڑی سنبھل کر بولی۔ پھپھو دوبارہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گئیں تو عنایہ کو بے چینی ہوئی۔

"تو پھپھو! آپ کیا کہہ رہی تھیں؟"

"ہاں میں کہہ رہی تھی کہ بڑا ہی اچھا بچہ ہے۔ کتنی دفعہ وہ مجھے اصرار کر چکا ہے کہ میں اس کے گھر شفٹ ہو جاؤں۔ اس بے چارے کے ماں باپ نہیں رہے تو میری ساری اولاد باہر اب بندہ کیا کہے اولاد کو بھی۔۔۔" پھپھو رنجیدگی سے اولاد کا ذکر کرنے لگیں تو عنایہ نے ایک دم کہا۔

"آپ کہہ رہی ہیں کہ موحد یہاں آتا رہتا ہے آپ کے پاس۔" عنایہ نے پھپھو کی بات ان سنی کر کے اپنے مطلب کی بات پوچھی۔ مریم نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"لو جی عنایہ بیگم! آپ کے لیے تو بڑا ہی مبارک ثابت ہوا ہے یہاں آنا۔" مریم نے آہستہ سے عنایہ کا ہاتھ دبایا تو وہ کھل کر مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

موحد کا پیٹ لگتا تھا کہ ابھی بھی گڑبڑ ہے کیونکہ دو دن سے وہ صرف دہی پہ گزارا کر رہا تھا مگر نقاہت شاید دور ہو گئی تھی کیونکہ پچھلے دو گھنٹے سے وہ فون پر اپنے دوست علی سے بات کر رہا تھا اور وہ کچن میں چائے بناتے ہوئے مسلسل اس کی بلند و بانگ اور سیر حاصل بحثوں پر اپنا سر بھی دبا رہی تھی۔

"پتا نہیں یہ شخص کہاں سے اتنی انرجی لاتا ہے بولنے کے لیے اور ہمت ہے اس کے دوست کی' جو دو گھنٹے سے مسلسل اسے سن رہا تھا۔"

"ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے بولنے کے لیے انرجی کی نہیں زبان کی ضرورت ہوتی ہے' بس وہ پاس ہونی چاہیے۔"

اچانک ہی موحد نے فریج کا دروازہ کھول کر اسے ڈرا دیا۔ پتا نہیں کس وقت اس نے فون بند کیا اور اس کے بڑبڑاہٹ بھی سن لی۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں اتنا تیز' شاطر' چست اور چالاک بندہ نہیں دیکھا تھا۔

"جی نہیں' زیادہ بولنے کے لیے صرف زبان نہیں' ہمت بھی چاہیے ہوتی ہے اور کچھ لوگوں کو تو سننے کے لیے بھی اتنی ہی ہمت درکار ہوتی ہے۔" اس نے طنز

[illegible]

"تمہیں بد نظر ۔۔۔ [illegible] نظر سے۔" انہوں نے فوراً تصحیح کی تو موحد کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"بد اچھا بد نام برا، بد کردار، بد زبان، بد اخلاق، بد تمیز، بد عہد، بد ذات اور اب بد نظر اور یقیناً مرنے کے بعد بد روح۔۔۔ نہ جانے کتنے اور بد رہتے ہیں ابھی۔"

موحد نے بد کی گردان کرنے کے بعد سکار ابھرا۔ وہ باہر نکلتے نکلتے رک گئی۔ "مقفیوں کا پوسٹ مارٹم تو تم پر ختم ہے۔"

"اسی بات کے تو پیسے ملتے ہیں مجھے۔ ویسے بائی دا وے یہ تعریف تھی یا طنز؟" موحد نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے؟" اس نے الٹا موحد سے سوال کر ڈالا۔

"میری پھپھو۔۔۔ مجھے تو دونوں ہی لگتا ہے بہت زور سے لگتا ہے۔" موحد نے پھر الٹا کو زور کا موڑا تو وہ لمبا سانس لے کر رہ گئی۔

"تمہاری زبان تھکتی نہیں ہے۔ باہر بھی بولتے ہو گھر میں بھی بولتے ہی رہتے ہو۔ مجھے تو شک ہے کہ تم سوتے ہوئے بھی چپ نہیں ہوتے ہو گے۔" موحد کچن سے نکل ہوا فرار کر گیا۔

"تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ دو رات کو ایک چکر لگا لیا کرو میرے بیڈ روم تک اگر میں بولتا ہوں تو چپ

چڑا دیا کرو۔" موحد اور سیدھا جواب دے دے ایسا ممکن نہ تھا۔

"پتا نہیں کتنے ڈھیٹ مرے تھے جب یہ پیدا ہوا تھا۔" وہ سوچ کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

پھپھو کا ڈرائیور گاڑی گیٹ سے اندر لایا تو سامنے ہی سلور ٹویوٹا کھڑی نظر آئی "یہ تو موحد کی گاڑی ہے۔ اوہ۔ اُف گاڈ! میرا حلیہ۔" بجائے خوش ہونے کے عنایہ کو اپنے حلیے کی ٹینشن ہو گئی۔

"اوہ تو موصوف تشریف لے ہی آئے۔" مریم بھی پرجوش ہوئی۔

"یار! میں سائیڈ ڈور سے اندر جا رہی ہوں پہلے فریش ہوں گی پھر آؤں گی۔" عنایہ نے گاڑی سے چھلانگ لگائی اور عجلت میں مریم کو کہہ کر غائب ہو گئی۔

"افوہ! ایسی بھی کیا بات ہے۔۔۔ توبہ ہے اس لڑکی سے۔" مریم نے داخلی دروازہ کھولا تو اچانک ہی پھپھو کے کمرے سے ایک بندہ تیزی سے باہر آیا اور اسے دیکھ کر اتنی ہی تیزی سے واپس پلٹ گیا۔ وہ جو سلام کرنے کا سوچ رہی تھی پھر اچانک ہی ایک بلند آواز آئی۔

"خالہ! آپ کی میڈ آئی ہے باہر۔"

"کیا کہہ رہے ہو موحد۔۔۔" پھپھو ابھی حیران ہی ہو رہی تھیں کہ مریم لال بھبھوکا چہرہ لیے دروازے پر نمودار ہوئی۔

"یہ تو مریم ہے عنایہ کی سہیلی۔ آؤ بیٹا اندر آجاؤ۔" پھپھو نے جلدی سے تعارف کروایا مگر مریم کو کہاں ہوش تھا وہ تو بس جا کر آئینے میں اپنی شکل دیکھنا چاہ رہی تھی کیا واقعی اس کا حلیہ انتارف ہو رہا تھا۔

"اوہ آئی سی السلام علیکم۔" موحد نے جلدی سے کہا۔ اس نے اپنے اندازے کی غلطی پر نہ تو حیرت کا اظہار کیا تھا اور نہ ہی معذرت کی۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ کیسے ہیں آپ؟" وہ جو بہت پرجوش سی تھی موحد سے ملنے کے لیے اب انتہائی

سپاٹ انداز میں بولی۔

"الحمد للہ۔۔۔ آپ کیسی ہیں؟ اور وہ آپ کی سہیلی کہاں غائب ہو گئیں۔"

موحد نے سامنے کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ چونک گئی۔ وہ جس رخ پہ بیٹھا تھا۔ اس نے دونوں کو نہ صرف گاڑی سے اترتے دیکھا تھا بلکہ عنایہ کو دوسرے دروازے کی طرف جاتے بھی دیکھ لیا تھا۔

"ہیلو! ارے آپ۔۔۔ کب آئے؟" عنایہ نے چونکنے کی فضول اداکاری کی تو مریم کو اس پر بری طرح ترس آیا کیونکہ وہ ساری بیرونی کارروائی دیکھ چکا تھا اور اب اندرونی کارروائی پر یقیناً حیران تھا کیونکہ عنایہ باہر والے حلیے سے یکسر مختلف لگ رہی تھی۔

"وعلیکم ہیلو! بس تھوڑی دیر ہی ہوئی ہے' آپ سنائیں۔ ویلکم تو اسلام آباد" موحد نے اکٹھی بہت سی باتیں نپٹائیں۔

"کیسا لگا آپ کو ہمارا شہر۔ کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟ ویسے یہاں آنے والوں کو کوئی مسئلہ ہو نہیں سکتا۔ کہاں لاہور کی آلودہ فضا اور کہاں اسلام آباد کا امن اور سکون' اس شہر میں ایک خاص طرح کا چارم ہے۔"

عنایہ نے دو دفعہ جواب دینے کے لیے منہ کھولا تھا مگر موحد ذوالفقار کو شاید جواب سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

مریم تھوڑی دیر بعد ہی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسے رہ رہ کر عنایہ پر تاؤ آ رہا تھا اور وہ خبیث شخص۔۔۔۔ پہلی ملاقات میں ہی اسے میڈ بنا دیا۔ وہ جو اپنی شخصیت اور حسن کے متعلق انتہائی پر اعتماد تھی۔ پہلی دفعہ کسی نے اس کے اعتماد کو یوں ہلا یا تھا۔ اسے موحد کچھ خاص اچھا نہ لگا۔



وہ آفس سے باہر نکلی تو اچانک ہی اس کی نظر سامنے بنے ایک فاسٹ فوڈ کی پارکنگ کی طرف گئی۔ موحد گاڑی سے اتر رہا تھا مگر وہ اکیلا نہیں تھا دوسرے دروازے سے جو شخصیت باہر نکلی اسے دیکھ کر اس کی تمام حسیات سُن ہو گئیں۔ ایسا نہیں تھا کہ اسے موحد میں کوئی دلچسپی تھی یا اس نے کبھی موحد کو کسی لڑکی کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ وہ کوئی بھی ہو سکتی تھی مگر "عفاف پیرزادہ" کا ہونا حیرت انگیز تھا گیا بھی کوئی تھوکے ہوئے کو بھی چاٹتا ہے' نہ جانے اس شخص کے کتنے روپ ہیں اور ہر روپ پہلے سے زیادہ نفرت انگیز' نفرت تو شاید بہت چھوٹا سا احساس تھا اسے شدید وحشت محسوس ہوئی۔

گھر آ کر بھی وہ بے چین سی رہی۔۔۔ اگر میں نے اس سے ذکر کیا تو یہ ڈھٹائی پر اتر آئے گا مجھے خاموش ہی رہنا چاہیے جو مرضی کرے میری بلا سے' اس نے بے چینی سے چینل بدلا تو سامنے اسکرین پر عفاف کا ڈراما چل رہا تھا جس میں وہ انتہائی بے ہودہ لباس میں ہیرو کے ساتھ بے باک سین کر رہی تھی۔ اس نے غصے سے ریموٹ پٹخا اور صوفے پر لیٹ گئی۔

"السلام علیکم ناظرین! میں ہوں ایم ذی آپ کا ہوسٹ۔۔۔ پروگرام "آج کا سچ" کے ساتھ۔۔۔ ناظرین! آج ہمارا موضوع ہے "معاشرے میں بڑھتی ہوئی فحاشی کا ذمہ دار کون؟"

"اف اب کیا اس شخص کی آواز خوابوں میں بھی آنا شروع ہو گئی ہے۔" نیم غنودگی میں اس کے دماغ نے سگنل دیا اور اگلے لمحے وہ ہوش میں آ گئی۔ وہ خواب نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ سامنے ہی اس گھٹیا شخص کا پروگرام چل رہا تھا اور وہ گھٹیا شخص خود بھی سامنے ہی براجمان تھا۔ نہ جانے کب آیا تھا۔ کب سے یہاں بیٹھا تھا اور وہ نہ جانے کتنی دیر سے یوں صوفے پر آڑی ترچھی سو رہی تھی۔ اس نے دوپٹا سنبھالا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ موحد اس کی طرف متوجہ نہیں تھا اور ہوتا بھی کیسے' سامنے اس کے پروگرام کے مہمانوں میں عفاف پیرزادہ بھی شریک تھی۔ ایک دم اسے دن والا منظر یاد آ گیا اور ان دونوں کی اتنے عرصے بعد کی ملاقات بھی سمجھ میں آ گئی۔

"لوگ تو بالکل فٹ بلائے ہیں موضوع کے حساب سے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ تبصرہ کرنے سے خود کو روک نہ سکی۔

"ہوں۔" موحد نے بس اسی پر اکتفا کیا۔ یقیناً وہ سکون سے ریکارڈنگ دیکھنا چاہ رہا تھا ورنہ اتنا مختصر جواب اور موحد..... ناممکن۔



"تمہیں کیا ہوا تھا۔ نہ تم نے موحد سے کوئی بات کی اور نہ ہی زیادہ دیر بیٹھیں۔ کیا سوچتا ہوگا وہ۔" عنایہ موحد کے جانے کے بعد کمرے میں آئی تو۔

"اس بد تمیز شخص کے سوچنے کی بہت پروا ہے تمہیں، جس نے دیکھتے ہی تمہاری سہیلی کو میڈ بنا دیا۔ مذاق کا بھی کوئی وقت ہوتا ہے۔ کوئی پہلی ملاقات میں بھی ایسے فرینک ہوتا ہے۔" مریم ابھی تک سخت دکھی تھی اور پھپھو نے بھی تو اس کو نہیں ٹوکا تھا۔

"کیا؟ اس نے تمہیں میڈ کہا..... اومائی گاڈ! شکر ہے۔ میں تو فریش ہو کر سامنے آئی تھی۔" عنایہ کی ہنسی نہیں رک رہی تھی۔

"اوہ یار! کیا پتا اس نے مذاق نہ کیا ہو۔ واقعی وہ تمہیں....." عنایہ نے ہنسی روکتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑا۔

"جی نہیں۔ وہ تمہیں اور مجھے گاڑی سے اُترتے دیکھ چکا تھا۔" مریم نے سیدھی بات بتائی۔ اب شاک کی کیفیت عنایہ کی تھی۔

"تمہارا مطلب ہے کہ اس نے مجھے پیچھے کی طرف سے....."

"جی جی بالکل میرا یہی مطلب ہے۔ انتہائی تیز شخص ہے یہ اور تم اتنی ہی بے وقوف۔" عنایہ مریم کے تبصرے کے بعد ایک دم خاموش ہو گئی پانچ منٹ کے بعد نارمل ہو گئی۔

"اچھا دفع کرو اس بات کو۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں کیسا لگا موحد۔" عنایہ دوبارہ پُرجوش ہوتے ہوئے بولی۔

"جیسا لگا میں نے بتا دیا۔" مریم نے لیپ ٹاپ کھول لیا۔

"میں اس کے لکس کی بات کر رہی ہوں۔" عنایہ نے جھنجلا کر کہا۔

"پتا نہیں میں نے زیادہ غور نہیں کیا۔ اس وقت مجھے اپنی لکس کی فکر پڑ گئی تھی۔" مریم نے صاف گوئی سے کہا تو عنایہ سخت بدمزا ہوئی۔

"اگر تم جیسی لڑکیوں کو بھی لکس کی فکر ہونے لگی تو پھر باقی سب کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔" عنایہ نے چڑ کر کہا وہ موحد کی تعریف سننا چاہ رہی تھی۔

"اچھا چھوڑو، تم سناؤ کیسی رہی تمہاری ملاقات اور کیا کہہ رہا تھا وہ؟" مریم کو عنایہ پہ ترس آ ہی گیا۔

"ہائے! وہ اتنا زبردست بولتا ہے کہ دل چاہتا ہے بس سنتے جاؤ۔" عنایہ نے آنکھیں میچ کر مزے سے کہا۔

"میں تمہاری فیلنگز سمجھ سکتی ہوں۔" مریم نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔



"رالی آپی آ رہی ہیں۔" وہ آفس میں تھی، جب موحد کی کال آ گئی۔

"کیا؟" اس کی چیخ نما آواز سے کافی لوگ متوجہ ہو گئے تو اس نے بڑی خفت محسوس کی۔

"آرام سے..... بہن ہیں وہ میری، تم گھر آؤ تو بات کرتے ہیں۔" موحد کی اپنی آواز اسپیکر سے باہر گونج رہی تھی۔ اس نے فوراً سیل آف کر دیا۔ خبر ایسی تھی کہ فی الحال اس کا کام سے دل اچاٹ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی چھٹی لے کر وہ گھر آ گئی۔ موحد نے صلح جو انداز میں چائے کا کپ اس کے ساتھ والے میز پر رکھا اور خود دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"یہ مہربانی کس خوشی میں؟" اس نے چائے کی طرف اشارہ کیا۔

"ایک عظیم مفکر کا کہنا ہے کہ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو کہیں سے بھی ملیں، کوئی بھی دے تو انکار نہیں کرنا چاہیے۔ ان چیزوں میں چائے بھی شامل ہے۔ ویسے بھی رالی آپی آ رہی ہیں۔ میں نے سوچا تھوڑی پریکٹس کر لوں اچھا شوہر بننے کی..... اور تم بھی اپنے ماتھے کے بل کم کر لو۔" موحد نے انتہائی سنجیدہ مسئلے کو

بھی غیر سنجیدگی سے بیان کیا۔

"تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔ اس چھوٹے سے گھر میں وہ کہاں ٹھہریں گی۔" اس نے پریشانی سے کہا۔

"میں انہیں روک تو نہیں سکتا نا۔ اگر تم چھٹی لے لو اور ان کے ساتھ اسلام آباد چلی جاؤ..... آگے تمہاری مرضی' وہ پرسوں کی فلائٹ سے پہنچ رہی ہیں۔" موحد ساتھ ساتھ اس کے تاثرات بھی دیکھتا جا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے میں کل ہی چھٹی لے لیتی ہوں۔ اس ڈربے میں کسی تیسرے کی گنجائش کہاں ہے۔" اس نے کوفت سے کہا مگر اسے موحد کا آئیڈیا صحیح لگا تھا۔ پھر اس نے آفس سے پندرہ دن کی چھٹی لے لی اور اپنا رخت سفر رابی آپی کے پہنچنے سے بھی پہلے باندھ لیا۔ رابی آپی نے دوپہر کا کھانا کھایا اور پھر وہ دونوں اسلام آباد روانہ ہو گئیں۔



یہ کرشماتی شہر جو اپنے اندر بے پناہ خوب صورتیاں لیے ہوئے آج بھی ویسے کا ویسا ہے۔ چھ ماہ پہلے بیاہ کر وہ اسی شہر میں آئی تھی۔ اسلام آباد ہائی وے سے آغا شاہی روڈ پر چڑھتے چڑھتے نہ جانے کیا کچھ یاد آ گیا تھا۔ کسی کی اذیت تو کسی کی محبت' کہیں کی نفرت کہیں کا اعتبار..... اور ان سب سے بڑھ کر کسی کی بھرپور شفقت اور اپنائیت۔ اس شہر سے وابستہ تمام یادیں اسے نظریں چرانے پر مجبور کرتی تھیں۔ موحد ذوالفقار کو اس شہر سے محبت تھی' اسلام آباد اپنی خاموشی کے پیچھے انتہائی سرد اور بے حس ہے' یہ شہر کسی کے دکھ میں آنسو نہیں بہاتا۔ ایک زعم اور تفاخر لیے مارگلہ کی پہاڑیاں رونے والوں کو دیکھتی ہیں مگر کسی کے روٹھنے کسی کی اذیت سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

"میرا اسلام آباد۔ میرا پیارا شہر..... آئی مسڈ یو سو مچ۔" رابی آپی کو اچانک فیصل مسجد کا منظر دکھائی دیا تو جھومنے لگیں۔

"ویسے موحد بھی ساتھ آجاتا تو مزا ہی آجاتا۔"

اچانک ہی رابی آپی نے اس کی طرف رخ موڑا۔

"وہ آنا چاہ رہے تھے مگر چھٹی نہیں ملی۔" اس نے فرماں بردار بیویوں کی طرح کا انداز اپنایا۔

"ہاں۔ لیکن اسے کچھ دن تو میرے ساتھ رہنا چاہیے۔ ایسے اپنے گھر سے دھکا دیا ہے جیسے مجھے یا میرے بچوں کو چھوت کی بیماری ہو..... ہر چیز ریڈی رکھی ہوئی تھی۔ تم تیار' تمہارا بیگ تیار' ڈرائیور اور گاڑی تیار' یہاں تک کہ کھانا بھی پہلے سے میز پر سجایا ہوا تھا' حد ہوتی ہے۔" موحد کی بہن تھیں انہیں بولنے سے کون روک سکتا تھا' وہ چپ کر کے سنے گئی۔

گھر گیا تھا گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو پھر سے بہت کچھ یاد آ گیا۔



وہ دونوں کالج سے باہر نکلیں تو عنایہ کسی کو ڈھونڈنے لگی پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف چل پڑی۔ وہ جو اپنے دھیان میں تھی۔ سامنے ہی ایک بندے کو گاڑی سے نکلتے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"السلام علیکم!" بہت ہی خوش مزاجی سے سلام کیا گیا۔

"اوہ تو آپ ہیں۔" عنایہ کی شکل دیکھ کر سارا ماجرا سمجھ میں آ گیا۔

"میرا خیال ہے سلام کے جواب میں وعلیکم السلام کہا جاتا ہے۔" موحد نے جتایا تو اس نے مجبوراً سلامتی بھیجی۔

"چلیں پھر؟" اب وہ عنایہ سے مخاطب تھا' مریم کو اندازہ ہوا کہ عنایہ اور موحد کے درمیان سارا پروگرام طے تھا۔ عنایہ نے جان بوجھ کر اسے نہیں بتایا تھا۔

"کہاں؟" مریم نے حیرت سے عنایہ کو دیکھا۔

"پیر سوہاوہ" عنایہ نے اس کے کان میں گھستے ہوئے کہا۔

"تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" مریم نے آنکھیں دکھائیں۔ اس نے اب غور کیا تھا کہ عنایہ خوب ٹپ ٹاپ تھی۔

"اوہو! چھوڑو نا اب بس۔" عنایہ نے گھورا، موحد جو گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔

عنایہ مزے سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ گاڑی مارگلہ کی پہاڑیوں کی طرف رواں تھی اور گاڑی کے ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی۔

"پریشانی تو ٹھیک ہے مگر عنایہ کا حوصلہ ہے اتنی لمبی اور لایعنی گفتگو سننے اور برداشت کرنے کا۔" مریم نے سکون سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر موحد ذوالفقار کا پوسٹ مارٹم کیا۔ اسے سخت کوفت ہو رہی تھی۔

وہ دونوں آپس میں مسلسل باتیں کر رہے تھے۔ مریم کو اپنا آپ کباب میں ہڈی لگ رہا تھا۔ پیر سوہاوہ کے خوفناک موڑ بندے کے منہ سے خود بخود کلمہ نکلوا دیتے تھے۔ اس نے بند آنکھوں سے توبہ استغفار شروع کر دی، عنایہ کا بھی تقریباً" یہی حال تھا مگر موحد مزے سے ایک ہاتھ سے ڈرائیو کر رہا تھا، اب اس نے سی ڈی پلیئر آن کر دیا۔

کبھی ہم ـــــ خوب صورت تھے

نیو نور کی آواز گاڑی میں مٹھاس گھولنے لگی۔

"پلیز یہ گانا تو بند کریں۔" مریم نے ایک دم کہا تو موحد نے حیرت سے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اسی دم دوبارہ چلائی۔

"اف خدایا! آپ تو سامنے دیکھیں۔ کوئی گاڑی آ گئی تو۔" مریم نے خوفزدہ ہو کر سامنے دیکھا تو موحد نے منہ بنا کر رخ دوبارہ سامنے کر لیا۔

"آپ بلاوجہ ڈر رہی ہیں۔ بس پانچ چھ موڑ ہیں ایسے۔" موحد نے سی ڈی پلیئر بند نہیں کیا تھا۔

"ابھی پانچ چھ موڑ اور ہیں؟" عنایہ کی آنکھیں پھٹیں۔

"جی ـــ ویسے ابھی تو دن ہے، اصل مزا تو رات کو آنا ہے۔ نیکسٹ ٹائم رات کو آئیں گے۔"

"نہیں ہمیں نہیں آنا یہاں رات کو۔" دونوں ہی یک زبان ہو کر چلائیں۔

"اچھا آپ لوگ چپ ہو جائیں ورنہ یہاں پر گاڑی ریورس بھی ہو جاتی ہے۔" موحد نے انہیں مزید ڈرایا۔

"کیا؟" وہ دونوں پھر چلائیں۔

"پلیز آہستہ ـــ مجھے ٹینشن نہ دیں۔ دو دفعہ پہلے بھی گاڑی ریورس ہو چکی ہے۔" موحد نے مصنوعی خوف سے کہا اور سامنے بیک ویو مرر میں دیکھا ـــ وہاں دو آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔

"آپ ہمیں ڈرا رہے ہیں، شرم آنی چاہیے آپ کو اور بند کریں یہ فضول گانا۔" مریم نے سارا لحاظ بر طرف رکھا تو عنایہ نے بھی اپنی بند آنکھیں کھولیں۔

"ڈرے ہوئے کو کیا ڈرانا اور دوسری بات مس مریم! یہ ایک کلاسیکل پوئم ہے، فضول گانا نہیں۔ عنایہ! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تمہاری دوست اتنی بدذوق ہے یا پھر یہ گانا ـــ ان کو اپنے ماضی میں لے جاتا ہے۔" موحد نے بیک وقت مریم اور عنایہ دونوں کو نپٹایا۔

"کیا مطلب؟" اسی وقت ایک اور خطرناک موڑ آ گیا اور وہ چپ ہو گئی۔

"کچھ نہیں۔ آپ اپنا ورد جاری رکھیں۔" موحد نے اس کے تیور دیکھ کر بات گول کر دی۔ اس ریسٹورنٹ کا کھانا واقعی مزے کا تھا۔ مریم بھی ہل ٹاپ پر کھڑی اسلام آباد شہر کے مناظر دیکھنے لگی۔ سرسبز، پرسکون اور خاموش، جو بھی تھا ـــ اس شہر نے اسے سلمان ہمدانی کے غم کو کم کرنے میں کافی مدد دی تھی ـــ ایک خاموش سی تھپکی۔



"تم نے موحد سے میرے متعلق کیا بات کی ہے؟" گھر آتے ہی مریم نے عنایہ کو پکڑ لیا۔

"کچھ نہیں۔" عنایہ گڑبڑا گئی۔

"جھوٹ مت بولو تمہاری شکل سے لگ رہا ہے کہ تم نے اسے میرے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے۔ ابھی تمہیں اس سے ملے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور تم اپنی سہیلی کی باتیں اور وہ بھی ماضی ـــ اس سے شیئر کر چکی ہو۔" عنایہ نے شرمندگی سے سر جھکا لیا جو اس

بات کا ثبوت تھا کہ مریم کا اندازہ صحیح تھا۔ مریم بے وقوف نہیں تھی۔ موحد ہوٹل میں اس سے بالکل ایسے بات کر رہا تھا جیسے اس کے غم میں برابر کا شریک ہو۔

"بات مت کرو مجھ سے عنایہ!" مریم نے دکھی ہو کر اسے دیکھا اور اندر چلی گئی۔



رانی آپی کی کمپنی میں ہفتہ گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا اس نے اچھی بہن بھی ہونے کے ناتے انہیں خوب گھمایا پھرایا۔ رانی آپی کی ہر ہر جگہ سے کوئی نہ کوئی یاد وابستہ تھی جسے بتائے بغیر ان کو سکون نہیں آتا تھا۔ یادیں تو اس کی بھی بہت تھیں مگر کسی کو بتانے کے قابل کہاں تھیں، سو وہ خاموشی سے بس سنے جاتی۔

رات کو وہ اپنے کمرے میں سونے کے لیے جا رہی تھی کہ باہر سے آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ اس کی چھٹی حس جاگی۔ اس نے دروازہ ہلکا سا کھول کر لاؤنج میں جھانکا اور تصدیق ہو گئی۔

دونوں بہن بھائی گلے مل رہے تھے۔ آبش اور تابش بھی ماموں کی ٹانگوں سے لپٹے کھڑے تھے۔ اس کے سر درد میں ایک دم سے اضافہ ہو گیا، آپی کو سونے کا بتا آئی تھی سو اب سو جانے میں ہی عافیت جانی، رات جلدی سونے کی وجہ سے صبح اس کی آنکھ بھی جلد ہی کھل گئی۔ اس نے احتیاطاً" کمرے سے ملحقہ اسٹڈی میں جھانکا تو وہ بے خبر سو رہا تھا۔ وہ آہستگی سے دروازہ بند کر کے کچن میں آ گئی۔ ابھی سب سو رہے تھے وہ چائے بنا کر لاؤنج میں آ گئی۔

"پتا نہیں کتنے دن کے لیے آیا ہے۔" اس نے کوفت سے سوچا۔

"صرف تین دن کے لیے آیا ہوں۔ اتنے برے منہ مت بناؤ۔" وہ بوتل کے جن کی طرح اس کے پاس کھڑا کہہ رہا تھا۔

"نگہت!" موحد نے ملازمہ کو آواز دی۔

"وہ بھی نہیں آئی۔ کیا چاہیے۔" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں جب آئے گی تو کہنا ناشتا بنا دے۔"

اپنے گھر میں وہ بہت پرسکون نظر آ رہا تھا۔ باہر نکل کر اس نے لان کا جائزہ لیا۔ دو چار انگڑائیاں لیں اور واپس کمرے میں چلا گیا۔ ناشتے کے بعد دونوں بہن بھائی گپیں لڑانے لگے اور وہ کچن میں آ گئی۔



"پھپھو! آپ کا شہر بہت ہی اچھا ہے بالکل کسی ہمدرد دوست کی طرح ہر غم کو سمیٹ لینے والا۔" مریم پھپھو کے بازو سے لگی کہہ رہی تھی۔ اس کا زیادہ وقت پھپھو کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ وہ ایک بہترین مزاج شناس اور سامع تھیں۔ مریم کو ان سے باتیں کرنا بہت پسند تھا۔ ویسے بھی عنایہ کی آج کل اور ہی مصروفیات تھیں وہ کبھی کالج سے ہی موحد کے ساتھ چلی جاتی گھر ہوتی تو سارا دن میسج چل رہے ہوتے، نہ دن کا ہوش تھا نہ رات کا۔ یقیناً" پھپھو کی نظروں سے بھی یہ چھپا نہ تھا مگر وہ کچھ کہتی نہیں تھیں۔

"السلام علیکم آمنہ خالہ!" موحد کی آواز لاؤنج میں بلند ہوئی۔

"وعلیکم السلام.... کہاں غائب تھے اتنے دنوں سے پہلے تو اتنے دن نہیں لگاتے تھے۔" پھپھو نے اس کے جھکے کندھے پر پیار کرتے ہوئے شکوہ کیا۔

"بس تھوڑا مصروف تھا۔" موحد نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ بچیاں بھی کیا کہتی ہوں گی۔ جب سے آئی ہیں گھر میں گھسی بیٹھی ہیں۔ میں بوڑھی جان ان کو کہاں گھما سکتی ہوں۔ تم ہی کہیں گھما پھرا لاؤ۔" پھپھو نے معصومیت سے موحد کی طرف دیکھا تو اس نے "بچیوں" کو دیکھا۔

"خالہ! میں تو پھرانے کے لیے بھی تیار ہوں اور گھمانے کے لیے بھی۔" موحد نے گھمانے پر خصوصی زور دیا۔ "آپ ان "بچیوں" سے پوچھ لیں یہ کہاں جانا چاہتی ہیں۔" اب اس نے بچیوں پہ زور دیا۔

"پھپھو! آپ ان کو زحمت نہ دیں۔ ڈرائیور گاڑی

بھی ہے۔ ہم خود ہی گھوم پھر سکتے ہیں۔" مریم نے فوراً جواب دیا اور اٹھ کر جانے لگی تو پھپھو نے ٹوکا۔

"ارے تم کہاں جا رہی ہو؟"

"چائے بنانے۔" مریم نے مختصراً کہا اور نکل گئی۔

"آپ پلیز مریم کی باتوں کو مائنڈ نہ کیجئے گا۔ تھوڑی اپ سیٹ ہے۔" عنایہ نے مریم کے رویے کی صفائی دی۔

"بہت پیاری اور بااخلاق بچی ہے، شاید تمہارے ساتھ تکلف برت رہی ہے۔"

"آپ لوگ خواہ مخواہ صفائیاں دے رہے ہیں۔ مجھے تو ایسا نہیں لگا کہ اس نے کوئی بداخلاقی دکھائی ہے بلکہ وہ تو میرے لیے چائے بنانے گئی ہے۔" موحد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر جب وہ چائے لے کر آئی تو پہلا گھونٹ پیتے ہی اس نے دل سے تعریف کی۔

"چائے تو آپ واقعی مزے کی بناتی ہیں۔"

"تھینکس۔" مریم نے اپنا رخ پھپھو کی طرف کر لیا جو موحد سے اپنی عینک ٹھیک کروا رہی تھیں۔ وہ پوری دلجمعی سے یہ کام کر رہا تھا۔ عنایہ کو کوفت ہونے لگی مریم اٹھ کر باہر گئی تو عنایہ بھی پیچھے آ گئی۔

"تم کیوں موحد کے ساتھ مس بی ہیو کر رہی ہو، کیا سوچتا ہو گا وہ۔" عنایہ نے کچن میں جا کر مریم کو پکڑا۔

"میں نے کیا مس بی ہیو کرنا ہے۔ اس کے اپنے اندر اخلاق نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ انتہائی چالاک انسان ہے، وہ جو مرضی سوچے سمجھے مجھے پروا نہیں۔" مریم کی آواز تھوڑی اونچی ہوئی۔

"اگر وہ تھوڑا سا تمہیں تنگ کر لیتا ہے تو صرف اس لیے ناکہ تم اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد سے باہر نکلو اور تم خفا ہو جاتی ہو۔" عنایہ نے ہلکی آواز میں موحد کی طرف داری کی۔

"اوہ۔۔۔ تو تم دونوں مل کر مجھے خوش کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ عنایہ! برائے مہربانی مجھے اس گھٹیا شخص کے سامنے اتنا ذلیل مت کرواؤ۔ وہ بہت تیز بندہ ہے۔ بالکل تمہارے قابل نہیں ہے۔" مریم پھٹ پڑی، اسی وقت موحد کمرے سے نکلا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ عنایہ وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔

"اب خوش ہو جاؤ۔ یقیناً اس نے سب سن لیا ہے۔" عنایہ رونے والی ہو گئی۔

"اگر اس نے سن بھی لیا ہے تو تمہارا کیا جاتا ہے، جو کہا ہے میں نے کہا ہے تم تو اس کی سائیڈ ہی لے رہی تھیں۔" مریم نے بالآخر اصل بات کہہ ہی دی جو اسے کھٹک رہی تھی اور وہ نہیں کہنا چاہتی تھی۔

"کیا مطلب؟" عنایہ چونکی۔

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو، یہ شخص تمہارے ساتھ ٹائم پاس کر رہا ہے، تمہارے جذبوں سے کھیل رہا ہے۔" مریم نے عنایہ کو سمجھایا۔

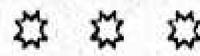
"میرے جذبوں کا تو شاید ابھی اسے پتا بھی نہیں ہے ہم تو بس ویسے ہی ملتے ہیں۔" عنایہ نے آہستگی سے کہا۔

"کیا۔۔۔ تم نے ابھی اسے بتایا ہی نہیں ہے؟" مریم حیران تھی۔

"وہ موقع ہی نہیں دیتا۔" عنایہ نے بے بسی سے کہا۔

"ہاں اس میں تو کوئی شک نہیں۔" مریم نے طنز کیا مگر عنایہ ان سنی کر گئی۔

"لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ یقیناً میری فیلنگز کو جانتا ہو گا، تب ہی تو جب بلاؤں، آ جاتا ہے۔" عنایہ نے یقین سے کہا تو مریم بھی مطمئن ہو گئی۔



عنایہ کا فون کافی دیر سے بج رہا تھا وہ شاید باتھ روم میں تھی۔ پھپھو کے خیال سے اس نے فون اٹھا لیا۔ دوسری طرف موحد تھا۔ وہ جی بھر کر بدمزا ہوئی۔

"کیسے ہیں آپ؟" مریم نے مروت نبھائی۔

"بس کچھ دشمنوں کی بددعائیں پہنچ گئی ہیں مجھ تک۔ ملیریا ہو گیا ہے۔" موحد کی نقاہت بھری آواز ابھری۔

"اچھا؟ اوہ میرا مطلب ہے کہ اوہو۔ کیسی طبیعت

ہے پھر آپ کی؟" مریم نے جلدی سے بات سنبھالی۔
"جی میں بالکل سمجھ گیا ہوں آپ کا مطلب۔ ویسے بھی بقول آپ کے انتہائی چالاک شاطر اور عیار ہوں پلیز خالہ کو بتا دیجیے گا خدا حافظ۔" دوسری طرف سے فون بند ہو گیا میں نے تو صرف چالاک کہا تھا۔ پکا صحافی ہے۔ ایک کی دو لگانے میں ماہر۔"
"کیا؟ اسے ملیریا ہے اور تم اب بتا رہی ہو مجھے۔ چلو ابھی میرے ساتھ۔" عنایہ فوراً" ہی پریشان ہو گئی۔
"مجھے نہیں جانا تم پھپھو کو لے جاؤ۔" مریم نے کمبل اوڑھتے ہوئے کہا۔
"پاگل ہوئی ہو پھپھو کہیں گی تمہیں کیا پریشانی ہے اور اکیلی میں کیسے چلی جاؤں 'ابھی میں اتنی ماڈرن نہیں ہوئی۔"
"شکر ہے اتنی عقل تو ہے تم میں 'مگر میں نہیں جا رہی 'میری مانو تو تم بھی مت جاؤ۔ یہ کوئی جان لیوا مرض نہیں ہے 'کچھ نہیں ہو گا اسے۔" مریم نے جماہی لی مگر عنایہ نے اس کے اوپر سے کمبل کھینچ لیا۔
"ایک اکیلا بیمار بندہ بے چارہ فون کر کے اپنی بیماری کی اطلاع کیوں دے رہا ہے۔ اسی لیے نا کہ اسے ہماری ضرورت ہے۔" عنایہ کی جذباتی بلیک میلنگ کا خاطر خواہ اثر ہوا۔
تھوڑی دیر بعد ہی دونوں ٹیکسی سے اتر کر ایف ٹین کے ایک بنگلے کے سامنے کھڑی تھیں۔ دونوں چوکیدار کو تعارف کروا کر اندر آگئیں۔ لاؤنج کا دروازہ کھلا تو وہ سامنے ہی اونی پھندنے والی ٹوپی پہنے کمبل میں گھسا کوئی انگلش موی دیکھ رہا تھا۔ سامنے ہی پاپ کارن کا پیالہ رکھا تھا۔ ان دونوں نے سلام کیا تو وہ یکدم سیدھا ہوا۔
"وعلیکم السلام۔"
"آمنہ خالہ نہیں آئیں آپ کے ساتھ؟" اس کے اگلے سوال نے دونوں کو ہی شرمندہ کر دیا تھا۔
"اصل میں مریم نے مجھے بتایا کہ آپ بیمار ہیں تو میں اتنی پریشان ہوئی کہ پھپھو کو بتانے کا خیال ہی نہیں آیا۔ میں نے سوچا آپ اکیلے ہوں گے اس لیے فوراً"

ہی مریم کو لے کر آگئی۔" عنایہ نے جلدی سے بات سنبھالی ساتھ ہی مریم کو کہنی ماری۔
"چلو کوئی تو پریشان ہوا ورنہ بعض لوگ تو میری بیماری کا سن کر خوشی سے اچھل ہی پڑے تھے۔" موحد نے ترچھی نظروں سے مریم کو دیکھا۔
"جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" مریم نے جھٹ تردید کی۔
"ارے میں نے آپ کی بات تو نہیں کی۔" موحد نے حیران ہونے کی اداکاری کی۔ بیماری میں بھی زبان کو چین نہیں ہے۔ مریم جل گئی۔
"میں آپ کے لیے سوپ بنا کر لاتی ہوں 'کچن کس طرف ہے؟" عنایہ کو خیال آیا۔
"نہیں نہیں 'تھینک یو۔ ملازمہ ہے کچن میں۔ آپ بیٹھیں۔" موحد نے روکا 'پھر تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ دونوں آگئیں۔ یہ الگ بات کہ پورے راستے عنایہ کو مریم کی ڈانٹ سننی پڑی عنایہ خود بھی شرمندہ تھی پھپھو کو نہ بتانے پر 'پھر اگلے دن عنایہ اور پھپھو اس کی عیادت کو گئے۔ پھپھو خوب سارا کھانا پکا کر لے گئیں اس کے لیے۔



"تمہیں کیا ہوا ہے؟" مریم واش روم سے نکلی تو عنایہ تکیے پر اوندھی گری سسکیاں لے رہی تھی 'اس کے دو تین بار پوچھنے پر بھی جواب نہ آیا تو اسے سخت تشویش ہوئی۔
"پلیز بتاؤ تو سہی 'ورنہ میں پھپھو کو بلا کر لاتی ہوں۔"
"نہیں کسی کو مت بلاؤ 'بس مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" عنایہ ایک دم سیدھی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔
"کیا ہوا ہے۔ موحد نے کچھ کہا ہے؟" مریم نے اندازہ لگایا تو عنایہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"وہ کہتا ہے اسے مجھ میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔" مریم ایک دم خاموش ہو گئی یہ خدشہ اسے

موحد سے ملتے ہی لاحق ہو گیا تھا۔
"میں نے اسے اپنی فیلنگ بتائی تو وہ کہنے لگا کہ اس نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔"
"نہیں سوچا تو یوں تمہیں لیے لیے کیوں پھرتا رہا ہے۔" مریم غصے سے پھنکاری۔
"وہ کہتا ہے میں تو رشتہ داری نبھا رہا تھا۔" عنایہ نے تکلیف سے ہونٹ کاٹا۔
"بکواس کرتا ہے۔ سب سمجھ رہا ہو گا وہ۔ جان بوجھ کر انجان بن رہا ہے۔" مریم کو اس سے شدید نفرت محسوس ہوئی عنایہ بس روئے جا رہی تھی، اچانک بولی۔
"وہ کسی اور کو پسند کرتا ہے۔" مریم چونکی۔
"کس کو؟"
"عفاف پیرزادہ۔" عنایہ نے پھر رونا شروع کر دیا۔
"اوہ.... " مریم کو یاد آیا.... ان دونوں نے کسی چینل پر اکٹھے کام کیا تھا پھر وہ ڈراموں کی طرف چلی گئی۔ "اچھا تم دل چھوٹا نہ کرو دیکھتے ہیں۔" مریم نے اسے ساتھ لگا کر تسلی دی، مگر وہ جانتی تھی کہ اتنی آسانی سے سکون کہاں ملتا ہے۔



دو دن ہی گزرے تھے کہ وہ پھپھو کے گھر آیا بیٹھا تھا۔ مریم کو اس سے اتنی ڈھٹائی کی توقع نہ تھی مگر حیرت اسے اس عنایہ پر ہوئی جو اس کے آنے پر بے اختیار خوش ہوئی تھی پھر اچانک ہی ان کا باہر جانے کا پروگرام بن گیا۔ مریم اپنے کمرے میں تھی جب عنایہ نے اس سے بھی چلنے کو کہا تو وہ برس پڑی۔
"کچھ نہیں ہوا یار! ہمارے درمیان ایک غلط فہمی ہو گئی تھی وہ دور ہو گئی۔" عنایہ نے آرام سے کہا۔
"اور وہ عفاف؟" مریم نے حیرانی سے عنایا کو دیکھا۔
"اوہو وہ معاملہ کب کا ختم ہو چکا ہے تم ابھی چلو تو واپسی پر بتاؤں گی۔" عنایہ نے اس کا بازو پکڑا تو اس نے چھڑا لیا۔
"تم خود ہی جاؤ اس بہروپیے کے ساتھ، مجھے نہیں جانا۔" مریم نے چڑ کر کہا۔ اسے لگا عنایہ پھر بے وقوف بن رہی ہے موحد کے ہاتھوں۔
"پھپھو کیا سوچیں گی۔" عنایہ بولی۔
"ان کو چھوڑو وہ کیا اتنے دنوں سے کچھ دیکھ نہیں رہیں۔ تمہارا سوگ اور اب یوں کھلکھلانا۔" مریم نے جتایا۔
"ٹھیک ہے میں جا رہی ہوں، جس کو جو سمجھنا ہے سمجھے،" عنایہ پیر پٹختی نکل گئی تو وہ افسوس سے سر ہلاتی پھپھو کے پاس آ گئی۔
"تم نہیں گئیں بیٹا؟" پھپھو نے محبت سے اسے پاس بٹھا لیا۔
"بس دل نہیں چاہ رہا تھا۔" مریم نے کہا۔
"چلی جاتیں، عنایہ ذرا جذباتی سی بچی ہے تم ساتھ ہوتی ہو تو مجھے حوصلہ رہتا ہے۔" پھپھو نے مونگ پھلی چھیلتے چھیلتے کہا تو وہ انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ پھپھو یقیناً اتنی بے خبر نہیں تھیں۔
"تم بتاؤ کیا کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔" مریم کو لگا وہ ایک دم بات بدل گئی ہیں۔ واپسی پر عنایہ بہت ہی خوش تھی مگر موحد کچھ سنجیدہ سا لگا۔ پھپھو کو خدا حافظ کہہ کر جلد ہی چلا گیا۔



"مجھے آج واپس جانا ہے شام کو ضروری کام ہے۔" موحد نے اٹھتے ساتھ ہی واش روم جاتے ہوئے اطلاع دی۔
"تو میں کیا کروں جاؤ اور میں کیا جانتی نہیں ہوں تمہاری آج کل کی مصروفیات۔"
"تمہیں صرف اس لیے بتا رہا ہوں تاکہ تم اچھی بیویوں کی طرح رانی آپی کو میری مجبوری سمجھا سکو۔ مجھے پتا ہے وہ ناراض ہوں گی۔" اس نے اچانک ہی واش روم سے سر نکال کر اس کے خیالات کا جواب دیا تو وہ سانس بھر کر رہ گئی۔
"تم خود کیوں نہیں بتا دیتے۔" اس نے تنگ کر

کہا۔

"جانے نہیں دیں گی ہاں۔ بعد میں تو تم سنبھال لوگی اور ویسے بھی یہ تو طے ہے نا کہ جو کچھ میرے اور تمہارے درمیان ہے اس میں فیملی کبھی انوالو نہیں ہو گی۔" موحد نے بات کے آخر میں ہاتھ اٹھا کر وارننگ دی تو وہ سب ہو گئی۔

★ ★ ★

"تم ابھی تک مجھ سے خفا ہو؟" عنایہ باہر لان میں اس کے پاس آ بیٹھی۔

"تم کچھ نہیں رہی ہو نا عنایہ! میں نہیں چاہتی کہ تمہیں تکلیف پہنچے۔" مریم نے تو چھیلتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ موحد خود بھی نارسائی کا دکھ اٹھائے پھر رہا ہے۔" عنایہ نے افسردگی سے سر ہلایا۔

"پھر تو اب وہ تم سے ہمدردیاں سمیٹ رہا ہے۔" مریم بھڑک اٹھی۔

"تمہیں آخر اس سے کیا پرخاش ہے۔۔۔ دنیا اس بندے کے گن گاتی ہے، اخباروں میں اس کی سچائی کے ڈنکے بج رہے ہیں اور تم نہ جانے کیوں۔۔۔؟"

عنایہ نے افسوس سے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"اس ملک میں ڈنکے بجوانا کون سا مشکل کام ہے۔ جو جتنا بڑا جھوٹا اتنے بڑے ڈنکے۔۔۔ عنایہ! میری دلی خواہش ہے کہ جو تم کہہ رہی ہو وہی سچ ہو اور میں جو سمجھ رہی ہوں وہ سراسر جھوٹ، مگر تم بس اپنے آپ کو زیادہ انوالو نہ کرو۔ میں نہیں چاہتی جس اذیت اور دکھ سے میں گزری ہوں تم بھی گزرو۔" مریم کی آنکھوں میں نمی تھی جسے اس نے جلدی سے ہاتھ کی پشت سے صاف کیا تو عنایہ نے اسے گلے لگا لیا۔

پھپھو اندر آئیں تو اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

"ضرور سناؤ بیٹا تم لوگوں کی پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟" پھپھو نے مسکرا کر پوچھا۔

"آپ کے سوال سے یاد آیا کہ ہم تو یہاں پڑھنے آئے ہیں۔" مریم نے گیلی گیلی آنکھوں سے معنی خیز انداز میں عنایہ کو دیکھا تو عنایہ نے بھی اسے گھورا پھر

عنایہ تو باہر چلی گئی اور پھپھو اسٹرابیریز کے تھال اٹھائے مریم کے پاس بیٹھ گئیں۔ وہ ہر موسمی پھل کا جام بناتی تھیں۔

"آپ نے بھی اچھی مصروفیات رکھی ہوئی ہیں۔" مریم نے توصیفی انداز میں کہا۔

"بس یہ نت نئے آئیڈیاز موحد کے ہوتے ہیں۔"

"اف یہاں تو سب کے حواسوں پر وہی چھایا ہوا ہے۔" مریم بور ہو گئی، مگر ان کی باتوں پر سر ہلاتی رہی۔

"آپ کے بیٹے باہر سیٹل ہو گئے آپ کا دل تو بہت دکھا ہوگا۔" مریم نے موضوع بدلا۔

"ہاں بیٹا! اس وقت تو بہت دکھا تھا مگر وہ اپنی زندگیوں میں خوش ہیں تو مجھے اور کیا چاہیے، مجھے وہاں بلانے پر اصرار کرتے ہیں۔" آمنہ پھپھو ساتھ ساتھ اسٹرابیریز الگ کر رہی تھیں۔

"تو آپ کو چلے جانا چاہیے نا یہاں اکیلے رہنے سے بہتر ہے کہ اپنی اولاد کے پاس ہوں۔ ان کے بچوں کے ساتھ ٹائم گزاریں۔" مریم نے بھی ان کی مدد کرتے ہوئے کہا۔

"چلی جاؤں گی، یہاں پر بھی کچھ کام ہیں میرے کرنے کے۔" وہ مسکرائیں تو مریم بھی مسکرا دی۔



"دیکھا تم نے میرے بھائی کو۔۔۔ یہ ہمیشہ ایسے ہی کرتا ہے، نکل گیا نا مجھے بغیر بتائے۔" رالی آپی موحد کے یوں اچانک چلے جانے سے اداس بیٹھی تھیں۔

"اتنا بھی نہیں ہے کہ بہن آئی ہے اتنی دور سے اور کون ہے میرا میکے کے نام پر، مگر مجال ہے کہ میرے لیے چھٹی لے لے۔۔۔ کام بہت اہم ہے اس کے لیے، بہن کا کوئی خیال نہیں۔"

وہ سر جھکائے سنے جا رہی تھی۔ دل تو اس کا بھی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی رالی آپی کے ساتھ مل کر اس کی برائی شروع کر دے، مگر ایک بار پہلے ایسی غلطی کر چکی تھی۔ بجائے اس کا ساتھ دینے کے جھٹ رالی آپی نے پینترا بدل لیا اور اپنے بھائی کی تعریفیں شروع کر دیں۔ اس

لیے اس نے دوبارہ ایسی غلطی نہ کی۔

''چھوڑیں رابی آپی! میں تو ہوں نا۔ آپ کے پاس' کیا میری کوئی اہمیت نہیں؟''

''کیوں نہیں ہے۔ بھائی سے اچھی تو تم نکلیں' جو اپنی جاب سے میری خاطر چھٹی لے کر یہاں بیٹھی ہو ایک وہ ہے کہ......'' رابی آپی اس کی شکر گزار ہو کر پھر پٹڑی سے اتر گئیں کافی دیر بعد جا کر ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔



وہ کچن سے نمکو کا جار لیے نکلی تھی کہ سامنے صوفے پر آمنہ پھپھو کو بیٹھے دیکھ کر اس کے ہاتھوں سے جار پھسل گیا۔

''مریم بیٹا! کیسی ہو؟'' آمنہ پھپھو خوشی اور محبت سے سرخ چہرے کے ساتھ اٹھ کر اس کی طرف بڑھیں۔ نیچے ماربل کی ٹائلز پر نمکو کے دانے بکھر گئے تھے۔ نگہت نے تیزی سے سمیٹنا شروع کر دیے۔ مریم بھی ہوش میں آئی اور نظریں جھکائی اور چرائی آمنہ پھپھو کی طرف بڑھی۔ انہوں نے فوراً" ہی اسے خود سے لپٹا لیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اسلام آباد آکر آمنہ پھپھو سے چھپ سکتی ہے تو یہ غلط ثابت ہوا۔ ان کو دیکھ کر نہیں لگتا تھا کہ مریم کو موحد ذوالفقار کی بیوی کی حیثیت سے دیکھ کر انہیں کوئی حیرت ہوئی ہے۔ ان کے حیران نہ ہونے پر مریم کو حیرت ہوئی۔

''کیسی ہو بیٹا! آمنہ پھپھو محبت اور اپنائیت کے ساتھ اس کو لیے صوفے کی طرف بڑھیں تو وہ خیالوں سے چونک گئی۔

''ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں؟'' مریم نے نظریں اٹھاتے گراتے پوچھا۔

''الحمد للہ۔ میں تو بہت بے تاب تھی تم سے ملنے کو۔ تم رابی کے ساتھ بھی نہیں آئیں اور موحد بھی کبھی تمہیں لے کر نہیں آیا۔'' آمنہ پھپھو نے ہلکا سا شکوہ کیا۔

''موحد نے میرے متعلق بتا دیا ہے انہیں اے بھلا کیا شرم۔'' مریم کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

''جی بس وہ..... میں آنا چاہ رہی تھی۔'' مریم سے جواب نہ دیا گیا۔

''چلو چھوڑو..... تم سناؤ کیسی گزر رہی ہے زندگی۔ موحد خیال تو رکھتا ہے نا' تم خوش ہو نا اس کے ساتھ۔'' آمنہ خالہ سگی ماؤں جیسی شفقت اور پیار سے سوال کیے جا رہی تھیں۔ مریم جس چیز کو اپنے دل میں گڑا محسوس کر رہی تھی' آمنہ پھپھو کے چہرے لہجے اور رویے میں اس کا شائبہ تک نہ تھا۔ اسے آج بھی آمنہ پھپھو سے ویسی ہی اپنائیت کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔

''آپ کیسی ہیں؟ میں نے سنا تھا آپ امریکہ چلی گئی تھیں۔'' اس نے جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

''ہاں میرا چھوٹا بیٹا زبردستی لے گیا تھا۔ اس کی بیوی بیمار تھی' اس وجہ سے تمہاری شادی میں شریک نہ ہو سکی' ورنہ کیا ایسا ممکن تھا کہ میں تم لوگوں کی شادی مس کرتی۔'' آمنہ پھپھو بے خبری میں اس کے دل پر کچوکے لگا بیٹھیں۔ وہ بس ہلکے سے مسکرا دی۔ پھر رابی آپی آگئیں تو خاندان کی باتیں ہونے لگیں۔ وہ چائے وغیرہ دیکھنے کچن میں چلی گئی۔



''بات مت کرو مجھ سے' کل مجھے چلے جانا ہے اور تم آج رات کو پہنچ رہے ہو۔'' رابی آپی موحد کے کندھے سے لگی شکوے کر رہی تھیں۔

''آپی! آپ جانتی ہیں مزدور بندہ ہوں' آپ کے میاں کی طرح بزنس مین تو ہوں نہیں' جو کبھی چھٹیاں گزارنے فرانس جاتے ہیں تو کبھی اٹلی۔'' موحد نے لہجے میں مظلومیت بھری مگر رابی آپی بالکل بھی متاثر نہ ہوئیں۔

''ہاں! تمہارے جیسے مزدور ہوں نا تو پھر دنیا سے لیبرڈے کا ہی خاتمہ ہو جائے۔ زوہیر تو تمہیں دیکھ کر رشک کرتے ہیں ماشاء اللہ اتنا نام ہے تمہارا اور پیسے کی

بھلا تمہیں کیا کمی ہے؟" رالی آپی نے پیار سے موحد کے دونوں گال نوچے تو آبش اور تابش ہنسنے لگے۔

"اچھا؟" موحد حیران ہوا۔

"تو اور کیا؟ میں خود کراچی میں اگر کسی جگہ پر تمہارا ذکر کر بیٹھوں کہ ایم ذی کی بہن ہوں تو لڑکیاں یوں مجھ پر جھپٹتی ہیں کہ ــــ" مریم جو پاس ہی بیٹھی تھی پہلو بدل کر رہ گئی۔ "رالی آپی! کچھ خدا کا خوف کریں یہ کس قسم کی لڑکیاں ہیں جو جھپٹ پڑتی ہیں۔" موحد جان بوجھ کر رالی آپی کو اپنی تعریفوں پر اکسا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ مریم کے تاثرات سے محظوظ بھی ہو رہا تھا۔

"آپی! یہ تو آپ کہہ رہی ہیں ورنہ کچھ لوگ تو مجھے لفافہ صحافی سمجھتے ہیں۔" موحد نے کہا۔

"منہ نوچ لے ان لوگوں کا جو تم پر ایسا گھٹیا الزام لگاتے ہیں۔" رالی آپی جذباتی ہو گئیں۔

"خدارا آپی! دشمنوں کو بھی بددعا نہیں دینی چاہیے، اللہ میرے دشمن کا منہ متھا سلامت رکھے۔" موحد نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اوپر دیکھ کر دعا کی، جبکہ مریم، رالی آپی کی بددعا پر جھرجھری لے کر رہ گئی۔

اگلے دن رالی آپی کو ایئرپورٹ چھوڑ کر دونوں بائی روڈ لاہور روانہ ہو گئے۔

"آپی بتا رہی تھیں کہ آمنہ خالہ آئی تھیں تم سے ملنے؟" موحد نے اچانک ہی سوال کیا۔

"ہاں آئی تھیں۔" مریم نے مختصر جواب دیا۔

"کیا بات ہوئی ان سے؟" موحد نے لہجے کو سرسری بنایا۔

"کچھ خاص نہیں۔" مریم نے پھر اختصار سے کام لیا۔

"پھر بھی کچھ تو کہا ہوگا انہوں نے۔" موحد نے پھر پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں بس ادھر ادھر کی باتیں ہوئی تھیں۔" مریم نے بے زاری سے کہا۔

"واقعی کوئی بات نہیں ہوئی؟" موحد بولا۔

"نہیں۔" مریم نے جواب دے کر منہ دوسری طرف ہی کر لیا۔

"کتنی دیر میں پہنچیں گے؟" مریم نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" موحد نے جھنجھلا کر کہا تو مریم کو عجیب سا سکون ملا۔

گھر آتے ہی زندگی دوبارہ روٹین پر آ گئی۔ اگلے دن سے اس نے آفس جوائن کر لیا، اس کی ایک دو کولیگز نے اسے موحد اور عفاف کے حوالے سے خبردار کیا تو وہ چونک گئی۔ اسے موحد سے اسی پستی کی امید تھی۔

شام کو وہ چائے پی رہی تھی کہ ڈور بیل بجی، اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ہی عفاف کھڑی تھی۔

"ہیلو!" عفاف نے خوش اخلاقی سے کہا۔

"جی فرمائیں۔" چاہتے ہوئے بھی مریم اخلاق نہ نبھا سکی۔

"میں نے سوچا موحد صبح سے فون نہیں اٹھا رہا تو چلو جا کر اس کی بیگم سے ہی مل آؤں۔" عفاف نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا، مریم دروازے میں تن کر کھڑی تھی۔

"مل لیا اب؟" مریم نے کہا اور دھاڑ سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ تصور میں بھی عفاف کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کا خیال تھا وہ موحد کو جا کر ضرور بتائے گی۔

اگلے دو دن وہ موحد کی جانب سے کسی ردعمل کا انتظار کرتی رہی، مگر موحد نے کچھ ظاہر نہیں کیا۔ یا تو عفاف نے اسے کچھ بتایا نہیں تھا۔ یا پھر وہ کمال کا اداکار تھا۔

رات کو وہ کچن کی لائٹ آن کرنے لگی تو ایک دم دروازہ ہلنے کی آواز آئی۔ اس کی جان نکل گئی "کون؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"کالا دیو۔" اس کے کان کے پاس انتہائی خوفناک سرگوشی ہوئی۔ ساتھ ہی اس کے کندھے سے اوپر ایک ہاتھ بڑھا، بٹن دبا اور کچن روشن ہو گیا۔ اس کی حلق تک پہنچی چیخ نکلنے سے پہلے ہی موحد کی شکل دیکھ کر دب گئی۔ اس نے شکر کا سانس لیا۔

"ہٹو میرے رستے سے۔" مریم نے اسے ہٹانا چاہا تو موحد ہٹنے کے بجائے اور پھیل کر کھڑا ہو گیا۔

"نہیں ہٹتا۔" موحد نے ضد سے کہا۔

"میں کہہ رہی ہوں رستہ دو۔" مریم نے تحمل سے دوبارہ کہا۔

"تم تو کہتی تھیں کہ تمہیں کالے دیو کو قابو کرنا آتا ہے۔" موحد نے جھک کر کہا تو وہ پیچھے ہٹی۔

"تو میں نے کالے دیو کی بات کی تھی' تمہاری نہیں۔" مریم صاف مکر گئی۔

"میرے علاوہ کون ہو سکتا ہے جسے تم اتنے خوب صورت ناموں سے بلاتی ہو۔" موحد کی تیوری پر بل پڑے۔

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" مریم نے بھی تاؤ دلایا۔

"نہیں یہ حق صرف میرا ہے۔" موحد نے تنبیہہ کی۔

"میں جسے جیسے نام سے بلاؤں' تم کون ہوتے مجھ سے پوچھنے والے؟" مریم نے اسے ایک اہم شق یاد دلانے کی کوشش کی۔

"تم میری بیوی ہو..... میرے ساتھ اس گھر میں رہتی ہو اگر کوئی ایسا ویسا کام کرو گی تو..... لوگ تمہیں ایم ذی کی بیوی کی حیثیت سے جانتے ہیں اور میں بالکل برداشت نہیں کروں گا۔"

"اگر لوگ مجھے تمہاری بیوی کی حیثیت سے جانتے ہیں تو تمہیں بھی میرے شوہر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ تمہیں یہ حق کس نے دیا ہے کہ تم جس کے ساتھ مرضی گھومو پھرو اور کوئی بھی گھٹیا لڑکی منہ اٹھا کے تمہارے گھر مجھ سے ملنے آجائے۔" مریم کے اندر کل سے جو کچھ پک رہا تھا فوراً" باہر آیا جس پر موحد کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے ہو گئے۔ وہ یہی اگلوانا چاہتا تھا۔

"تو تمہیں اس بات کا غصہ ہے؟" موحد نے پاس پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ایک فضول عورت منہ اٹھا کر میرے گھر آجائے تو میں غصہ بھی نہ کروں؟"

"تو تم نے بھی تو اپنا ری ایکشن دے دیا تھا۔" یعنی موحد سب جانتا تھا۔

"تو نہ کرتی اسے اندر بلا لیتی؟" مریم حیران تھی۔

"یہ میں نے کب کہا؟" موحد نے اٹھ کر فریج سے بوتل نکالی۔

"وہ اگر یہاں تک پہنچی ہے تو صرف اور صرف کسی کی حوصلہ افزائی پر۔" مریم نے گلاس اٹھا کر پانی نکالا اور پینے لگی۔

"تم کیا سارا دن میرے ساتھ ہوتی ہو جو یوں حتمی رائے دے رہی ہو۔" موحد نے اس کے ہاتھ سے بوتل کھینچی۔

"میں کیا تمہیں جانتی نہیں ہوں موحد ذوالفقار!" مریم نے چبا کر کہا۔

"تمہارا دعوا غلط بھی ہو سکتا ہے۔" موحد کے تاثرات نہ سمجھ آنے والے تھے۔

"کم از کم تمہارے بارے میں میرا کوئی دعوا غلط نہیں ہو سکتا۔ تمہیں تمہاری فیملی بھی اتنا نہیں جانتی ہو گی' جتنا میں جانتی ہوں۔" مریم نے آنکھیں دکھائیں تو موحد غور سے اس کا غصہ دیکھنے لگا۔

"محبت سے زیادہ گہرا رشتہ نفرت کا ہوتا ہے۔" مریم بولی۔

"دنیا کا سب سے بودا رشتہ نفرت کا ہوتا ہے' محبت اندھی ہو نہ ہو مگر نفرت ضرور اندھا کر دیتی ہے۔" موحد نے بوتل اسے دوبارہ دی اور کچن سے نکل گیا۔



مریم' آمنہ پھپھو کے ساتھ کچن میں تھی' جب عنایہ عجلت میں اندر داخل ہوئی اور اشارے سے مریم کو لے کر باہر لان میں آگئی۔

"کیا مسئلہ ہے۔" مریم جھلائی۔

"مریم پلیز ہیلپ می۔" عنایہ کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"اب کیا ہوا ہے؟" مریم بھی پریشان ہوئی۔

"وہ دو دن سے میری کال نہیں سن رہا۔ نہ ہی کسی میسج کا جواب دے رہا ہے۔" عنایہ روہانسی ہو گئی۔

"اف..... تو مجھ سے کیا چاہتی ہو؟ کہیں بزی ہو گا۔ تم رو تو نہیں۔"

"پلیز مریم! تم اسے کال کرو کہ وہ ایک دفعہ میری بات سن لے۔" عنایہ بولی تو وہ گھبرا گئی۔

"عنایہ! دفع کرو اس کو وہ تم سے شادی نہیں کرنے والا۔"

"تم کیسے کہہ سکتی ہو۔" عنایہ بے چارگی سے بولی۔

"وہ مرد ہے اور مرد جب کسی سے شادی کرنا چاہے تو کر ہی لیتا ہے اور جب نہ چاہے تو جو مرضی ترکیبیں آزمالو' وہ نہیں کرے گا۔" مریم نے قطعی انداز میں کہا۔

"ہر مرد سلمان ہمدانی نہیں ہوتا مریم! تم ہر کسی کو اسی ترازو میں تولتی ہو۔" عنایہ تھکن زدہ انداز میں گھاس پر بیٹھ گئی۔

"ہر مرد شادی کے معاملے میں ایک جیسا ہی ہوتا ہے' مرد صرف اسی سے شادی کرتا ہے جو اس کے بنائے پیمانے پر فٹ آتی ہے۔" مریم بھی اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ کیا تم سلمان کے اور میں موحد کے دل میں نہیں ہیں؟" عنایہ نے شکایتاً کہا۔

"یہ تو صرف وہی بتا سکتے ہیں مگر تم پریشان نہ ہو۔ مجھے اس کا نمبر دو۔" مریم کو عنایہ پر ترس بھی آرہا تھا اور وہ اسے جلد از جلد خوابوں سے باہر بھی نکالنا چاہتی تھی۔

"میں مریم بات کر رہی ہوں۔" موحد کے ہیلو کہنے پر اس نے فوراً کہا۔

"اوہ کیسی ہیں آپ۔ خیریت ہے؟" موحد حیران ہوا۔

"میں تو سمجھی آپ بہت مصروف ہیں' اسی لیے عنایہ کو رسپانس نہیں دے رہے۔" مریم نے طنزاً کہا۔

"اوہ تو آپ کو عنایہ نے کہا ہے مجھ سے بات کرنے کو۔ ایم آئی رائٹ؟" موحد فوراً بات کی تہہ تک پہنچا۔ "دیکھیں مریم! آپ اپنی سہیلی کو سمجھائیں بجائے کال کرکے مجھ پر پریشر ڈالنے کے۔" موحد نے اس کے کہنے سے پہلے ہی جواب دے دیا۔

"اوہ۔۔۔ تو اب آپ سائیڈ پر بیٹھ کر تماشا دیکھیں گے۔ لڑکی کو پیچھے لگایا' اس کے جذبات سے کھیلا' اسے سبز باغ دکھائے اور جب دل بھر گیا تو اب اس کی بات بھی نہ سنیں۔" مریم آگ بگولہ ہو گئی۔

"وہ کہتی ہے کہ میں اس سے شادی کرلوں۔ وہ انتہائی ضدی اور ایکسٹریمسٹ لڑکی ہے۔ میرے اور اس کے درمیان کچھ بھی کامن نہیں ہے۔"

موحد بہت تحمل سے بات کر رہا تھا مگر اس کی بات نے مریم کو آگ لگادی۔

"اچھا۔۔۔ تو اتنے عرصے بعد آپ کو پتا چلا کہ آپ کے اور اس کے درمیان کچھ بھی کامن نہیں ہے۔ اتنا عرصہ اسے ساتھ لیے لیے گھومتے رہے' باتیں کرتے رہے اور اب پتا چلا کہ۔۔۔" مریم کی آواز پھٹ گئی۔

"آپ اسے سمجھائیں وہ ٹھیک ہو جائے گی۔" موحد نے اپنی بات دہرائی۔

"تم۔۔۔ ایک نمبر کے گھٹیا' مکار اور فلرٹ انسان ہو۔ مجھے پہلے دن ہی تمہاری فطرت کا پتا چل گیا تھا۔ تم جیسے لوگ صحافت کے نام پر دھبہ ہیں۔" دوسری طرف سے فون بند ہو چکا تھا۔ وہ مڑی تو عنایہ سفید رنگت لیے پیچھے کھڑی تھی۔



آج اسے عنایہ بہت یاد آرہی تھی۔ بھولی تو وہ اسے کبھی بھی نہ تھی مگر کبھی کبھی انسان کچھ حقیقتوں کو فراموش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر انسان کو سب حقیقتوں کا سامنا کرنا آجائے تو پھر شاید وہ ولی ہو جائے۔

رات کو عفاف والے معاملے میں موحد پھر اپنی ازلی ڈھٹائی لیے ہوئے تھا۔ اسی بات نے اسے عنایہ کی یاد دلا دی تھی۔ ماضی کے بہت سے اوراق الٹ پلٹ رہے تھے۔ کوئی صفحہ کھل جاتا تو کبھی کوئی منظر کوئی عکس اس کی آنکھوں میں ٹھہر جاتا تھا۔

وہ اذیت ناک دن کہ جب عنایہ پوری پوری رات اس کے ساتھ والے بستر پر تکیہ بھگوتی تھی۔ اس کی سسکیاں آمنہ پھپھو کے گھر کے کمرے سے باہر نہیں

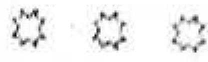
جاتی تھیں تو اس کی بھیگی اور سوجی ہوئی سرخ آنکھیں بالآخر آمنہ پھپھو کو ان تک لے آئیں۔ آمنہ پھپھو نے جس طرح اسے ساتھ لگا کر پیار سے سمجھایا تھا، اس کا مان بڑھایا تھا ویسے مریم بھی نہیں کر سکی تھی۔ آمنہ پھپھو نے ایک ہی دفعہ میں اسے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ عنایہ ان لوگوں میں سے تھی جو ہر بات کہہ دیا کرتے ہیں۔ وہ شاید خوش قسمت ہوتے ہیں کہ ان کے محسوسات سے ہر کوئی آگاہ ہو جاتا ہے اور پھر غم گسار بھی مل جاتے ہیں۔ عنایہ نے زندگی میں ہمیشہ اپنی منوائی تھی یہ پہلی ٹھوکر تھی۔ اس کی زندگی کی پہلی نہ تھی جو ہاں میں نہ بدل سکی تھی۔ اس نے بھی اپنی بات کا رد کیا جانا کہاں دیکھا تھا، وہ جذباتی اور شدت پسند اس کی سہیلی اب ایک بچے کی ماں تھی مگر مریم میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ اس سے رابطہ رکھ پاتی۔

ماضی کے بہت سے صفحات پلٹے۔۔۔

موحد ذوالفقار کسی چینل کی آفر پر کراچی چلا گیا تھا۔ وہ اور عنایہ واپس لاہور آ گئے۔ کبھی کبھی منظر نامے سے ہٹ جانا بھی بہت بڑی نعمت ہوتا ہے۔ مریم عنایہ کی دلجوئی کرتی رہتی تھی۔ عنایہ بھی کافی حد تک سنبھل چکی تھی ویسے بھی جب ہمیں کسی چیز کے نہ ملنے کا یقین ہو جائے تو صبر آ ہی جاتا ہے، پھر اچانک ہی عنایہ کا بہت اچھا پروپوزل آ گیا اور عنایہ بال بچوں جیسے اس کیے میاں کے ساتھ امریکہ سدھار گئی۔ مریم کی اکثر آمنہ پھپھو سے فون پر بات ہو جاتی تھی۔ اسے بھی ایک کمپنی میں بہت اچھی جاب مل گئی تھی۔ شادی کے نام پر فی الحال وہ کوئی ٹینشن لینے کو تیار نہ تھی۔ سلمان ہمدانی نے صرف اس کی انا اور عزت نفس کو زخمی نہیں کیا تھا بلکہ اس کا مرد ذات سے اعتبار بھی ختم کر دیا تھا۔ اس کے نزدیک مرد کو جب بھی کوئی بہتر موقع ملتا ہے تو وہ اپنی زبان اپنے وعدے سب کچھ بھول جاتا ہے۔

کہاں وہ شادی کا ذکر سننے سے بے زار تھی اور کہاں جب شادی کی تو اس سے کہ جس کے بارے میں اس کی رائے سلمان ہمدانی سے بھی زیادہ خراب تھی۔

سلمان نے تو شاید صرف مریم کو دھوکا دیا تھا مگر موحد ذوالفقار کے جرائم کی فہرست بہت لمبی تھی۔ نیم تاریک کمرے میں لیٹی وہ اس منظر میں جا پھنسی کہ جس گھڑی قسمت نے یہ فیصلہ مسلط کر دیا۔



"مریم آپی! مجھے ماما اور بابا نے بھیجا ہے اور انہوں نے خیر سے آپ کو سمجھانے کا فریضہ مجھ ناچیز کو سونپا ہے۔"

"فہد پلیز۔۔۔ مجھے فی الحال شادی نہیں کرنی۔ میں ماسٹرز میں ایڈمیشن لے رہی ہوں۔" اس نے غصے سے کہا۔

"آپ نام تو سن لیں، پھر فیصلہ سنائیے گا۔" فہد نے سسپنس پھیلایا۔

"کیوں کیا برطانیہ کے وزیراعظم کا پروپوزل آیا ہے۔"

"مجھ سے پوچھیں تو اس سے بھی زبردست بندہ ہے۔" فہد چہکا۔۔۔ "موحد ذوالفقار ایم زی۔۔۔ آج کا سچ کا میزبان۔" فہد نے ڈرامائی انداز میں دھماکا کیا۔

عنایہ کی شادی کو دو سال ہو چکے تھے مگر یہ اتنی پرانی بات بھی نہیں تھی کہ اس سے وابستہ لوگ اسے بھول جاتے۔

"تمہارا دماغ درست ہے، جاؤ جا کر پہلے ماما سے نام کنفرم کرو۔" مریم کھڑے ہو کر بولی۔

"لو کم آن آپی! میں کوئی بچہ نہیں ہوں ان کی بڑی بہن آئی تھیں رشتہ لے کر اور میں آپ کو اس کا نمبر ہرگز نہیں دوں گا۔ اگر آپ نے انکار کرنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔"

گزشتہ کچھ عرصے سے جب ماما بابا کا دباؤ اس پر بڑھنے لگا تو مریم فہد سے اس لڑکے کا نمبر نکلوا لیتی تھی اور خود ہی فون کر کے انکار کرنے کا کہہ دیتی۔ ابھی تک یہ ترکیب بہت کامیابی سے چل رہی تھی۔ فہد اس کے ساتھ شریک تھا مگر اس دفعہ وہ تعاون کرنے پر تیار نہیں تھا اور اس دفعہ اسے کسی کے تعاون کی ضرورت بھی

نہیں تھی۔ اس بات سے موحد بھی ناواقف یقیناً" نہیں ہوگا۔ وہ جیسے ہی اسے دیکھے گا خود ہی انکار کردے گا۔ فہد چلا گیا تو وہ اس کو کال کرنے کا سوچنے لگی۔

ماما کی کال اسے ماضی سے حال میں لے آئی۔ وہ اسے فہد کی شادی کے متعلق بتارہی تھیں، وہ چپ کر کے سنتی رہی۔

۔۔۔ شکر ہے پوشیدہ امراض کا الزام نہیں لگا دیا تم نے۔" مریم جاچکی تھی مگر موحد کی آواز کمرے تک اس کا پیچھا کرتی رہی۔ موحد سے بحث کرکے اس کا سر درد سے پھٹا جارہا تھا کوئی ایک مسئلہ کہاں تھا اسے پھر سے سب یاد آنے لگا۔ وہ دن جب وہ فہد کی بات سن کر اس کے آفس پہنچ گئی تھی۔۔۔





وہ اپنے آفس میں مصروف تھی جب کسی انجان نمبر سے اسے کال آئی، کوئی شخص اسے دھمکا رہا تھا۔ کچھ عجیب وغریب سی باتوں اور دھمکیوں کے بعد فون بند ہو گیا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

شام کو موحد آفس سے آیا تو اس نے فی الحال ذکر نہ کیا۔ وہ چینل سرچنگ کر رہا تھا پھر اس نے عفاف پیرزادہ کا حالیہ چلتا ڈراما لگا دیا اور ساتھ ساتھ گنگنانے لگا۔ مریم نے چائے اس کے سامنے رکھی۔ یہ واحد مہربانی تھی جو کچھ عرصے سے اس نے اس پر کرنی شروع کردی تھی۔

"اگر تم نے بیٹھنا ہے تو میں چینل بدل دیتا ہوں۔" انداز سراسر چڑانے والا تھا۔

"نہیں تم شوق سے دیکھو۔" مریم واپس مڑی۔

"تم جیسے صحافی ہی فحاشی دیکھ سکتے ہیں۔" وہ بڑبڑائی تو موحد کا قہقہہ ابل پڑا۔

"کیا خوب صورت قافیہ ملایا ہے واہ کیا کہنے۔۔۔ لفافہ صحافی ایسے ہی تو ہوتے ہیں۔" موحد نے مریم کا رکھا ایک اور نام دہرایا۔ "بالکل صحیح کہا لفافہ صحافی اور لفافہ فحاشی۔۔۔ بہترین کمبی نیشن ہے۔" وہ پھر ہنسا۔

"اچھا سچ سچ بتاؤ! بچپن میں تم بھی اپنی سیکرٹ باتیں کرنے کے لیے پوشیدہ لفظوں میں بات کرتی تھیں۔" موحد نے نیا شوشا چھوڑا۔

"جی نہیں میری تمہاری طرح کچھ پوشیدہ سرگرمیاں نہیں تھیں۔" اس نے جل کر کہا تو موحد کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

"پوشیدہ حرکتیں، پوشیدہ باتیں، پوشیدہ سرگرمیاں

موحد نے اسے یوں اتنے عرصے بعد دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی بہن کہاں اور کون سی لڑکیاں دیکھتی پھر رہی ہے، وہ بالکل نہیں جانتا۔ دونوں ہی اس اتفاق پہ حیران تھے۔

"بہرحال مجھے تم سے صرف ایک فیور چاہیے۔ تم انکار کردو۔" مریم نے پیپرویٹ کو تھماتے ہوئے اپنے مطلب کی بات کی۔

"اور اگر نہ کروں تو۔۔۔؟" موحد نے موبائل پر کوئی میسج لکھتے ہوئے نظریں ترچھی کرکے اسے دیکھا۔

"میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ کیوں۔۔۔ کیونکہ میں تم سے ہر بری چیز کی امید کرسکتی ہوں۔" مریم نے جھٹکے سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "مگر یاد رکھنا! میں اس صورت میں تمہاری زندگی عذاب بنادوں گی۔" مریم نے دھمکی دی تو وہ ہنسا۔

"بتانے کی ضرورت نہیں، اس بات کا مجھے یقین ہے۔" موحد مزے سے بیٹھا تھا۔

"تو پھر انکار کیوں نہیں کردیتے۔" مریم فوراً" بولی۔

"تم خود کردو۔" موحد نے کہا۔

"اگر میرے اختیار میں ہوتا تو تمہارے پاس کیوں آتی۔" مریم نے مجبوری بتائی۔

"تو سمجھ لو میری بھی ایسی ہی مجبوری ہے، دو دن پہلے میری بہن نے مجھ سے حلف لیا ہے کہ اب وہ جو بھی لڑکی پسند کریں گی، مجھے شادی کرنا پڑے گی۔" موحد نے کندھے اچکائے۔

"تو تمہارے لیے حلف توڑنا کون سا گناہ ہے۔۔۔ یہ

تو بہت عام سی بات ہے۔" مریم نے تیزی سے کہا۔

"یوں سمجھ لو کہ میں مومن ہو گیا ہوں اب۔ ویسے تم فکر مت کرو' میری بہن کی نظر اتنی کمزور نہیں ہے۔ وہ تمہیں کبھی بھی پسند نہیں کریں گی۔" موحد نے اس کی تسلی کرائی۔

"میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتی۔" مریم نے اس کی بات کا بالکل بھی برا نہیں مانا۔

"ویسے تم کوئی اتنے پسماندہ گھر کی مجبور سی لڑکی تو نہیں ہو کہ کوئی تمہیں زبردستی شادی پر مجبور کرے۔" موحد کو حیرت ہوئی۔

"مگر ماں باپ کسی بھی کلاس سے ہوں' اولاد کو ایموشنل بلیک میل کرنا خوب جانتے ہیں۔ میں نے بھی انہیں کچھ عرصہ پہلے یہ یقین دلایا تھا کہ میں اب انکار نہیں کروں گی۔۔۔ جو بھی انکار کرتا تھا لڑکا کرتا تھا۔" اس نے اپنی کارگزاری بتا کر "لڑکے" کو دیکھا مگر "لڑکا" نظر انداز کر گیا۔

"سوری۔۔۔ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا مگر مجھے پوری امید ہے کہ میری آپی میرے لیے تم سے بہتر لڑکی ڈھونڈ لیں گی۔" موحد نے اسے حوصلہ دیا تو وہ بھی پرامید سی لوٹ آئی۔

پھر وہ موحد کی بہن سے ملی تو ان کی گرم جوشی' اپنائیت پر بوکھلا کر رہ گئی۔ اس کے والدین بھی خوش اور مطمئن لگ رہے تھے۔ اگلے دن وہ پھر موحد کے سامنے تھی۔

"تم اپنی آپی کو سمجھاتے کیوں نہیں۔ وہ کیوں مجھ پر صدقے جا رہی ہیں۔ انہیں سمجھاؤ میں اچھی لڑکی نہیں ہوں۔" مریم نے اسے طریقہ بتایا۔

"اس میں سمجھانے والی کیا بات ہے' وہ تو نظر آ رہا ہے مگر وہ مجھ سے ڈسکس کریں گی تو کچھ کہوں گا نا۔" موحد کا پرسکون انداز اسے آگ لگا گیا۔

"میرا خیال ہے مجھے خود ہی سب کرنا ہو گا۔ تم سے کسی بھی بھلائی کی امید رکھنا فضول ہے۔ دماغ خراب ہو گیا تھا میرا جو میں تم سے مدد لینے آ گئی۔" مریم غصے سے بولتی دروازے کی طرف بڑھی تو موحد اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"اچھا سنو! ایک آئیڈیا ہے میرے پاس۔" مریم کو لگا کسی نے اسے کنویں میں گرنے سے بچا لیا ہے۔ وہ تیزی سے واپس آئی۔

"بیٹھو اور سکون سے میری بات سنو۔" موحد نے ڈرامائی انداز اختیار کیا۔ وہ بیٹھ گئی۔

"کیوں نہ ہم ایک ڈیل کر لیں۔" موحد بولا۔

"ڈیل؟" مریم چونکی۔

"دیکھو! نہ تم شادی کرنا چاہتی ہو اور نہ میں' لیکن ہم دونوں پر ہی فیملی پریشر ہے اور اس پریشر میں کہیں نہ کہیں شادی کرنی پڑ ہی جائے گی ہمیں۔۔۔ تم میرے ماضی سے واقف ہو اور میں تمہارے ماضی سے' یہ سب کوئی دوسرا تو برداشت کرے گا نہیں۔"

موحد نے بات روک کر اس کے تاثرات دیکھے' جو نا سمجھی سے اسے سن رہی تھی۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ ہم ایک ڈیل سائن کر لیتے ہیں۔ دنیا کی نظر میں یہ ایک شادی ہو گی مگر تم اپنی مرضی کی زندگی گزارنا اور میں اپنی مرضی کی۔۔۔ ٹرم اینڈ کنڈیشن بھی طے کر لیتے ہیں۔ نہ میں تمہیں ڈسٹرب کروں گا اور۔۔۔"

"گھٹیا انسان!" مریم نے سامنے پڑی فائل اس کے منہ پر دے ماری۔ "مائی فٹ" کہتے ہوئے وہ آفس سے نکل گئی۔

وہ پورے راستے غصے سے کھولتی رہی۔ اس نے سوچ لیا کہ گھر جاتے ہی وہ ماما سے بات کرے گی۔ مگر گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ فہد بھی نہ جانے کہاں تھا موحد کی فضول گوئی اسے ابھی تک سلگا رہی تھی۔ وہ لاؤنج میں بیٹھی سب کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ رات گئے سب کی واپسی ہوئی۔ وہ چونکی سب کے انداز میں کچھ غیر معمولی پن تھا۔ ماما نے آتے ہی اسے پیار کیا۔ بابا نے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ ملازم نے مٹھائی کا ٹوکرا لا کر اندر رکھا۔

"میری بیٹی ماشاء اللہ بہت ہی خوش قسمت ہے۔" ماما بولیں۔

"آپ لوگ کہاں سے آرہے ہیں؟" انسولی کا شدید احساس تھا۔

"تمہاری بات پکی کر کے بلکہ رابعہ کو تو آتی جلدی ہے کہ شادی کی ڈیٹ بھی فکس کر دی ہے۔ ہم بھی دیر نہیں کرنا چاہتے۔ بس ہو گیا۔" بابا تفصیل سنا رہے تھے اور اسے لگ رہا تھا کہ کوئی اس کے جسم سے جان نکال رہا ہے۔

"آپ نے کسی سے پتا بھی کر لیا ہے اس کے بارے میں۔ وہ عتابیہ تک۔" مریم روہانسی ہو گئی مگر فیضان صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ہاں بھئی عتابیہ کے والد سے ہی مشورہ کر کے میں نے اس رشتے کو فائنل کیا ہے۔" وہ ہکا بکا سب کا منہ دیکھتی رہ گئی۔ فیضان صاحب یونہی فیصلہ کر لیتے تھے فوراً" اور قطعی۔ فیضان صاحب اسے ساتھ لگائے اپنے ہونے والے داماد کی جملہ خصوصیات بتا رہے تھے۔ سامنے کھڑا فہد اس کی حالت دیکھ کر مسکرائے جا رہا تھا۔ کمرے میں آکر وہ بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کرے۔

رات کے تین بجے کا وقت ہو گا۔ جب اس نے موحد کا سیل نمبر ڈائل کیا اس کی نیند میں ڈوبی آواز ابھری۔ "ہیلو!"

"مجھے مصیبت میں پھنسا کر تم مزے سے سو رہے ہو؟" مریم پھنکاری۔

"کون ہے بھئی یہ کون سا وقت ہے تنگ کرنے کا۔" ادھر سے جواب آیا۔

"میں کہہ رہی ہوں انکار کرو ابھی اور اسی وقت۔۔۔ میں نہیں جانتی۔" مریم نے اس کی بات ان سنی کر کے کہا۔

"دیکھیں! آپ ضرور میری فین ہوں گی مگر یہ وقت شریف لوگوں کے سونے کا ہوتا ہے صبح کال کر لیجیے گا۔" دوسری طرف سے بالکل ہی الٹ جواب آیا۔

"اپنے کان صاف کرو۔" وہ چیخی۔

"آٹو گراف کے لیے میرے آفس آجائیے گا۔ اللہ حافظ۔" موحد نے کہہ کر کھٹ سے فون بند کر دیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ جا کر اس کا منہ نوچ لے۔

صبح وہ اس کے آفس پہنچ گئی۔ موحد نے اسے دیکھ کر کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ جیسے وہ اس کا منتظر تھا۔

"تم ایک انتہائی فضول انسان ہو۔" مریم بلا تمہید بولی۔

"میں گھٹیا، چالاک، عیار، مکار، فلرٹ، کمینہ، دغاباز سب کچھ ہوں مگر اتنی غیرت ہے مجھ میں کہ رات کے تین بجے کسی غیر لڑکی سے فون پر بات نہ کروں۔" مریم کا دماغ گھوم گیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم جانتے تھے کہ میں کال کر رہی تھی۔" مریم کا غصہ بڑھ گیا۔

"ظاہر ہے میں نے ہی تمہیں صبح آفس آنے کا کہا تھا۔ یہی طے ہوا تھا نا۔" مریم سانس بھر کر رہ گئی۔ وہ موحد ذوالفقار کے دماغ تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

"ہاں اب بتاؤ۔۔۔ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" موحد نے معصومیت کے ریکارڈ توڑے۔

"شرم آنی چاہیے تمہیں۔ میری دوست کیا سوچے گی میرے بارے میں۔" مریم نے دکھ سے بے حال ہو کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تو مجھے کیوں الزام دے رہی ہو۔۔۔ میں کوئی مرا نہیں جا رہا تم سے شادی کرنے کو اور زندگی تو میری جہنم بنے گی۔ تم مفت میں رعب ڈال رہی ہو۔" موحد نے اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تو یقیناً" بنے گی۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔" مریم نے دھمکایا۔

تمہارا ابھی میں وہ حشر کروں گا کہ تم یاد کرو گی۔۔۔ سوچ لو۔" موحد نے اس کو تاؤ دلایا۔

"ٹھیک ہے سوچ لیا۔" مریم بھڑک کر کہتی باہر نکل گئی۔

پھر جیسے جیسے شادی کے دن قریب آرہے تھے اسے ہول اٹھ رہے تھے۔ ان دنوں کوئی بھی ہمدرد اس کے پاس نہ تھا۔ آمنہ پھپھو بھی امریکہ چلی گئی تھیں۔ اب اسے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ وہ موحد کی ڈیل کو ہی قبول کر

لیتی اور اپنی مرضی کی شرائط پر شادی کرتی۔ موحد نے تو ایک دفعہ بھی اس سے رابطہ نہ کیا تھا۔ اس نے ڈھیٹ بن کر خود ہی دوبارہ فون کیا۔

"جلدی بولو..... میں بزی ہوں۔" موحد نے انتہائی رکھائی سے کہا تو اسے سخت بے عزتی محسوس ہوئی۔

"تم نے کسی ڈیل کا ذکر کیا تھا۔" مریم آہستگی سے بولی۔

"کون سی ڈیل؟" موحد انجان بنا۔

"وہی اپنی اپنی مرضی کی زندگی گزارنے والی۔" مریم نے دانت کچکچائے۔

"اوہ! وہ ڈیل..... وہ آفر تو محدود مدت کے لیے تھی اب ایکسپائر ہو چکی ہے۔" وہ ساتھ ساتھ چند لوگوں کو ہدایات بھی دے رہا تھا۔ اس کے پروگرام کی ریکارڈنگ شروع ہو رہی تھی شاید۔

"مجھے وہ ڈیل قبول ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"اچھا..... " موحد نے سوچنے والے انداز میں کہا۔ "چلو ٹھیک ہے تم بھی کیا یاد کرو گی۔ ابھی تو میں فون بند کر رہا ہوں شادی والے دن اکٹھے بیٹھ کر وہ بھی سائن کر لیں گے..... تنہائی میں۔"

انداز دل جلانے والا تھا۔ موحد نے فون بند کیا تو اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس جھوٹے شخص کا کیا اعتبار' کب اپنی ڈیل سے ہی مکر جائے مگر آج شادی کے آٹھ ماہ تک وہ ڈیل دونوں فریقین کی معاونت اور استقامت سے صحیح چل رہی تھی۔ وہ سوچتے سوچتے نیند کی وادی میں چلی گئی۔



آج پھر وہ آفس میں تھی۔ جب اسے دوبارہ کسی ہی کال آئی۔ اس نے فون کرنے والے شخص کی خوب بے عزتی کی اور غصے سے کال کاٹ دی۔ گھر آئی تو موحد ایپرن باندھے چولہے کے سامنے کھڑا کچھ پکا رہا تھا۔ وہ حیرت سے دیکھ کر کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد کھانا بن چکا تھا کیونکہ موحد کی آواز کمرے تک آ رہی تھی۔

"ارے واہ موحد صاحب! کیا ذائقہ ہے آپ کے ہاتھ میں کمال کی چکن کڑاہی بنائی ہے۔" وہ کچن میں آئی تو موحد ایپرن باندھے ہی ڈبل روٹی کے ساتھ کڑاہی کھا رہا تھا اور ساتھ ساتھ اپنی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ اس نے تاسف سے اس "خود پسند" بندے کو دیکھا اور اپنے لیے کھانا نکالنے لگی۔

"کہاں جا رہی ہو' یہیں کھڑے ہو کر پہلے تعریف کرو پھر جاؤ۔" موحد نے پیچھے سے ہانک لگائی۔

"صرف کھانے کی کروں یا تمہاری پیشہ ورانہ صلاحیتوں کی بھی۔" مریم نے مڑتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"فی الحال صرف کھانے کی کرو' اپنی تعریف تو میں ہر وقت سنتا ہی رہتا ہوں تم سے۔" موحد نے اور سالن نکالتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا کھانا بنا لیتے ہو اور بے وقوف تو اس سے بھی اچھا بنا لیتے ہو مگر یاد رکھنا! میں ان لوگوں میں شامل نہیں ہوں۔" مریم نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھا تو وہ پلٹا۔

"تمہاری خوش فہمی ہے۔" موحد طنزیہ ہنسا تو مریم الٹ پڑی۔

"اچھا تم سمجھتے ہو کہ تمہارا دوست آوازیں بدل کر مجھے فون پر دھمکائے گا اور میں ڈر جاؤں گی اور دل ہی دل میں تمہاری عظمت کے گن گاؤں گی کہ واہ کیا سچا صحافی ہے۔ نڈر اور بے باک..... " مریم نے اپنا غصہ نکال ہی لیا اور کہہ کر رکی نہیں۔ موحد جو ابھی اس کی بات میں الجھا ہوا تھا۔ ایک دم کھانا چھوڑ کر اس کے پیچھے لپکا۔

"کیا کہا تم نے؟ کس نے فون کیا ہے تمہیں؟" موحد اس کا رستہ روک کر پوچھ رہا تھا۔

"کافی اچھے اداکار ہو مگر میں بالکل متاثر نہیں ہوئی تمہاری ایکٹنگ سے۔" مریم نے اس کے پاس سے نکلنا چاہا مگر وہ خطرناک تیور لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں جو کہہ رہا ہوں مجھے صرف اس کا جواب دو۔"

مریم نے پہلی دفعہ موحد کو سنجیدہ دیکھا تھا۔ وہ کچھ دیر اس کے تاثرات پر غور کرتی رہی پھر سر جھٹک کر جانے لگی تو موحد نے اس کا بازو پکڑ کر روکا۔

"تمہارا خیال ہے کہ میں تم پر اپنی سچائی کی دھاک بٹھانا چاہتا ہوں؟"

"چھوڑو میرا بازو۔"

مریم نے تنفر سے کہا اور اندر چلی گئی۔ موحد نے بھی اس کو جانے دیا۔ اس سے کوئی بھی بات کرنا فضول تھا۔ سامنے صوفے پر مریم کا بیگ پڑا تھا اس نے تیزی سے مریم کا سیل فون نکال کر کال لوگ چیک کیا اور چند نمبرز نوٹ کر کے علی کو کال کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

صبح موحد نے اس کے کمرے میں آکر اپنا موبائل اس کو تھمایا۔ وہ جو آفس جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی، حیرت سے موبائل کو دیکھنے لگی۔ دوسری طرف آمنہ پھپھو تھیں۔ اتنی صبح صبح ان کی کال پر وہ پریشان ہو گئی۔ وہ اس کو بلا رہی تھیں کچھ بیمار سی تھیں اور ان کے بقول موحد نے اسے وہاں بھیجنے کا وعدہ کر لیا ہے۔

اسے اندر ہی اندر غصہ تو آیا مگر چپ رہی۔ وہ خود آمنہ پھپھو کے لیے اداس تھی مگر وہ جاب کرتی تھی۔ روز روز چھٹی لینا مذاق نہیں تھا۔

آمنہ پھپھو کے سامنے ہامی بھر کر اس نے آفس کال کی تاکہ چھٹی کی بات کر سکے تو پتا چلا کہ اسے کل ہی ٹرمینیٹ کر دیا گیا ہے بغیر کسی نوٹس کے۔ وہ وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایک ہی دن میں اس نے ایسا کیا کر دیا ہے۔ وہ تو پروموشن کا انتظار کر رہی تھی۔ سامنے ہی موحد بیٹھا فلائٹ کی ٹائمنگ کنفرم کر رہا تھا۔ نہ جانے اس نے ٹکٹ کب بک کر لیا تھا وہ افسردہ اور دکھی بیٹھی تھی۔ موحد فون بند کر کے متوجہ ہوا۔

"اپنی پیکنگ کر لو ہو سکتا ہے تمہیں کچھ دن لگ جائیں۔ آفس سے چھٹی تو لے لی ہے نا؟" موحد نے پوچھا تو وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ کس منہ سے بتاتی کہ اسے خراب کارکردگی کی بنا پر فارغ کر دیا گیا ہے۔ وہ آمنہ پھپھو کو بھول اپنی جاب کو رونے لگی تھی۔ ابھی تو وہ موحد سے یوں اس سے پوچھے بغیر وعدہ کر لینے پر لڑنا چاہ رہی تھی مگر اب اپنی جاب کے ختم ہونے کا سن کر اسے یہاں سے جانا ہی غنیمت لگا۔ یہاں رہتی تو موحد کو پتا لگ ہی جاتا اور اس کی کتنی سبکی ہوتی۔

ایئرپورٹ پر آمنہ پھپھو خود اسے لینے آئی تھیں، وہ انہیں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بہت بیمار ہوں گی مگر وہ ٹھیک تھیں۔ اس کے پوچھنے پر ٹال گئیں۔

ان کے گھر آکر مریم پھر یادوں کے نرغے میں آگئی۔ جب وہ اور عنایہ پہلی بار یہاں آئے تھے۔ اگر یہ سب اس طرح نہ ہوا ہوتا تو وہ یاد کر کے خوش ہوتی مگر اب تو وہ نہ ہنس سکتی تھی اور نہ رو سکتی تھی۔ ان سب جھمیلوں میں سلمان ہمدانی تو کب کا اس کے دل و دماغ سے محو ہو چکا تھا۔

شام کو چائے پیتے ہوئے آمنہ پھپھو نے اچانک پوچھا۔

"مریم بیٹا! تم نے عنایہ سے رابطہ کیوں ختم کر دیا ہے؟" وہ خاموش ہو گئی۔

"کس منہ سے سامنا کروں پھپھو؟" وہ سر جھکا کر بولی۔

"ارے ایسے کیوں سوچتی ہو۔ یہ تو قسمت کے فیصلے ہیں بیٹا! اور سب سے بڑھ کر دلوں کے رشتے۔" آمنہ پھپھو نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔

"یہ تو میں جانتی ہوں کہ یہ قسمت کا فیصلہ تھا مگر ضروری نہیں کہ ہر کوئی اس کو قسمت سمجھ کر قبول بھی کر لے اور نہ ہی ہر رشتہ دل کا ہوتا ہے پھپھو!"

"لیکن تمہارا اور موحد کا رشتہ تو دل کا ہے نا؟ اچھا یہ بتاؤ کہ تم مجھے ابھی تک پھپھو کیوں کہتی ہو؟ موحد کے حوالے سے تو میں تمہاری خالہ ہوں اب، دوستی کا رشتہ شوہر کے رشتے سے بڑھ کر تو نہیں ہوتا۔" پھپھو نے سمجھایا۔

"میرے لیے جو رشتہ زیادہ اہم ہے، میں اسی

حوالے سے آپ کو بلاتی ہوں۔" مریم نے ایک جملے میں ساری داستان سمیٹی تو پھپھو اسے دیکھتی رہ گئیں مگر کہا کچھ نہیں۔ مریم کے جانے کے بعد انہوں نے موحد کا نمبر ملایا۔

"یہ تمہارے اور مریم کے درمیان کیا چل رہا ہے؟" بلا توقف سوال کیا۔

"مریم نے کچھ کہا ہے؟" موحد نے الٹا سوال کیا۔

"میں تم سے پوچھ رہی ہوں موحد؟"

"خالہ! میں ایکسپلین نہیں کر سکتا۔ آپ اسی سے پوچھ لیں۔" موحد عجلت میں بولا فون رکھ دیا تو وہ مزید پریشان ہو گئیں، کہیں کچھ بہت غلط ہو رہا تھا۔

اگلے دن مریم لاؤنج میں بیٹھی تھی جب پھپھو ملازمہ کے ساتھ بہت سی اسٹرابیریز کے شاپر لیے آئیں اسے پھر سے بہت کچھ یاد آنے لگا اس نے ذہن کو جھٹکا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی "آؤ مریم! اسٹرابیریز کھائیں۔" انہوں نے اسے بلایا۔

"بیٹا! تمہاری اور موحد کی لڑائی ہوئی ہے؟" پھپھو نے بات شروع کی۔

"نہیں تو۔" مریم نے مختصراً" کہا اسے ڈیل یاد آگئی تھی کہ جس کی ایک شق تھی کہ فیملی کو کچھ نہیں بتانا۔

"اچھا۔۔۔ پھر موحد نے صبح چار بجے فون کر کے مجھے کیوں کہا کہ میں تمہیں آج ہی اپنے پاس آنے کا کہوں؟" پھپھو حیرت سے بولیں۔

"موحد نے آپ کو فون کیا تھا۔" مریم حیران رہ گئی۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"یقیناً" اس نے عفاف پیرزادہ کو گھر بلانا ہو گا اور میں اس کے راستے کی رکاوٹ ہوں گی۔ مریم کو ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

"آپ تو جانتی ہیں پھپھو! صحافیوں کے لیے رات دن کا فرق نہیں ہوتا اور شاید اسے بھی پتا ہو کہ آپ چار بجے جاگ رہی ہوتی ہیں۔" مریم نے اپنے احساسات چھپائے۔

کچھ یادیں آنکھوں میں رکے گدلے پانی کی طرح ہوتی ہیں جو نہ آنکھ کو آسانی سے چھوڑتی ہیں، نہ آنکھ سے بہہ پاتی ہیں، نہ آنکھوں کو پورا اٹھنے دیتی ہیں اور نہ ہی سامنے کا منظر واضح ہونے دیتی ہیں۔ اب سلمان ہمدانی کی یادیں تنگ نہیں کرتی تھیں۔ اب عنایہ اور موحد سے وابستہ یادیں تھیں بس، جو آنکھ کے گدلے پانی کی طرح ہر منظر پر چھا گئی تھیں۔

آمنہ خالہ مرکز تک گئی تھیں وہ کچن میں کھڑی چائے بنانے لگی جب اچانک اسے عجیب سا احساس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے کھڑا ہے۔ وہ ایک دم مڑی اور اندازے کی درستی پر حیران ہو گئی۔

"کیسی ہو؟" موحد کھڑا اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ خود بہت تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔

"ایک سیکنڈ۔۔۔ تم میرے لیے کوئی نیا نام سوچ رہی ہو گی، مثلاً" شیطان، چھلاوہ، لمبی عمر کی دعا تو یقیناً" نہیں دو گی۔" وہ اس کے گمان سے آگے کی چیز تھا۔

"میں ہر وقت تمہارے بارے میں نہیں سوچتی رہتی۔ مجھے دنیا میں اور بھی بہت سے کام ہیں۔" مریم نے فوراً" سنبھل کر جواب دیا۔

"مطلب ہر وقت نہیں، کبھی کبھی تو سوچتی ہو؟" موحد کی ٹون اور جون بدلی بدلی سی تھی۔

"ہاں، کبھی کبھی شیطانی خیالات آ ہی جاتے ہیں۔ مگر تم اتنا گر سکتے ہو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔" مریم فوراً" بولی تو موحد چونکا۔

"لاحول ولا۔۔۔ اب کیا کر دیا میں نے۔"

"تم نے مجھے بہانے سے یہاں بھجوایا تاکہ اس چڑیل عفاف کو گھر لا سکو۔" مریم دکھ سے بولی تو موحد کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

"تم اپنے چھوٹے سے دماغ پر اتنا زور کیوں دیتی ہو، اتنا مت سوچا کرو تمہاری صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔" موحد نے سیدھا جواب نہیں دیا تھا اسے دکھ ہوا۔ کیا تھا اگر وہ اس الزام کی تردید کر دیتا۔

"میں صرف ایک دن کے لیے آیا ہوں۔ میرے ساتھ چلو۔" موحد نے کچن سے نکلتے ہوئے کہا تو وہ حیران رہ گئی۔

"تو کس نے کہا تھا آؤ۔" اس نے چڑ کر جواب دیا مگر

پھر کمرے سے بیگ لینے چلی گئی۔ جب باہر آئی تو پھپھو آچکی تھیں اور موحد کے کان کھینچ رہی تھیں۔

"تم دونوں کو دیکھ کر ذرا نہیں لگتا کہ نئی نئی شادی ہوئی ہے۔" موحد اور مریم نے فوراً" ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر موحد بولا۔

"اب نئی نئی کہاں رہی ہے۔ آٹھ ماہ ہو چکے ہیں اب تو۔"

"ہاں تو سال بھی نہیں ہوا ابھی تو اور جب تک بچہ نہ ہو میاں بیوی نئے ہی رہتے ہیں۔" مریم اٹھنے لگی تو موحد نے ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھالیا۔

"تم کہاں چلی ہو؟ اب تمہارے ساس سسر تو ہیں نہیں۔ میں ہی بڑی ہوں۔ یہ باتیں تو سننی ہی پڑیں گی۔" پھپھو شرارت کے موڈ میں تھیں۔ موحد اس کے تاثرات دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔

"ویسے یہ بات رانی نے بھی نوٹ کی ہے وہ بھی یہی کہہ رہی تھی۔" پھپھو نے کہا تو وہ دونوں دوبارہ چونکے۔

"کیا کہہ رہی تھیں؟"

"یہی کہ تم دونوں میں میاں بیوی والا التفات نظر نہیں آتا۔" موحد ہنسا۔

"اوہو خالہ! اتنی مشکل اردو مت بولیں، آپ جانتی ہیں کہ میں سب کے سامنے اپنے جذبات کے اظہار کا قائل نہیں ہوں۔" موحد نے شاید پہلی بار کسی بات کی صفائی پیش کی۔

"ہاں ہاں میں جانتی ہوں تم بہت پرائیویٹ بندے ہو۔" خالہ نے ہاتھ اٹھا کر اس کی تائید کی۔

"شکر ہے آپ نے پوشیدہ نہیں کہا۔" وہ ہلکا سا بڑبڑایا تو مریم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ کافی آچکی تھی موحد نے جلدی سے اپنا کپ اٹھالیا۔

"مریم! تم بھی لونا..... باہر اتنی ٹھنڈ ہو رہی ہے۔" آج لگتا تھا پھپھو نے موحد کی زبان ادھار رکھی ہے۔

"نہیں پھپھو! مجھے سوٹ نہیں کرتی، میری ہارٹ بیٹ تیز ہو جاتی ہے۔" مریم نے وجہ بتائی تو موحد چونکا۔

"ارے واہ! ہم سے اچھی تو پھر یہ کافی ہے، جس سے آپ کی ہارٹ بیٹ تیز ہو جاتی ہے۔" موحد نے آگے جھک کر رومانٹک سے انداز میں کہا تو مریم نے گھبرا کر پھپھو کی طرف دیکھا جو کھل کر ہنس رہی تھیں۔

"موحد! اب تم مجھے دکھانے کے لیے رومانٹک ہو رہے ہو۔" پھپھو بولیں۔

"کچھ زیادہ ہو گیا ہے؟" موحد سیدھا ہوتے ہوئے خالہ سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں تھوڑا سا۔" خالہ آج بہت خوش لگ رہی تھیں موحد کو دیکھ کر۔



رات کو نگہت نے کھانے میں تیرتا ہوا چکن بنایا تھا موحد کا موڈ ٹیبل پر بیٹھتے ہی آف ہو چکا تھا۔ مریم جانتی تھی کہ موحد اچھے کھانے کے لیے کافی حساس ہے اس کے بے زار تاثرات دیکھ کر وہ اٹھی اور ڈونگا اٹھا کر کچن میں آگئی پھر جلدی سے فرائیڈ رائس بنا کر ٹیبل پر لائی۔

"سنا ہے مرد کے دل کا راستہ معدے سے بھی گزرتا ہے۔ کہیں تم اس ٹیڑھے میڑھے رستے پر تو نہیں چل پڑیں۔" موحد نے اسے چھیڑا۔

"میں صراط مستقیم کی قائل ہوں۔ ادھر ادھر نہیں بھٹکتی، ویسے لگتا ہے عفاف نے دوبارہ جھنڈی دکھادی ہے۔ جو یوں الٹی سیدھی ہانک رہے ہو۔" موحد جو پانی پی رہا تھا، بمشکل ہنسی روک کر بولا۔

"بس کیا کروں آج کل بالکل ہی فارغ ہوں۔ اسی لیے تو بھاگا بھاگا یہاں آیا ہوں۔" موحد نے چہرے پر مظلومیت طاری کی "ویسے بھی تم سوچتی ہو گی کہ ساری دنیا کی لڑکیوں سے فلرٹ کیا ہے ایک تم سے نہیں کیا۔ میں تمہارا دل نہیں توڑنا چاہتا۔" موحد نے پھر پینترا بدلا۔

"شکریہ..... انہی کے پاس جاؤ جو تم پر مرتی ہیں، تمہارا اعتبار کرتی ہیں۔" مریم نے ہاتھ صاف کیے اور کھڑی ہو گئی۔

"چلو میں تم پر مر جاتا ہوں شاید تم اعتبار کر لو۔" موحد بھی کھڑا ہو گیا۔

"مر کر بھی نہیں۔" مریم نے زور دے کر کہا۔

"بھئی مجھے مر کر ہی اپنا اعتبار دلانا پڑے گا۔" موحد نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ سامنے سے ہٹ گئی موحد کی باتیں اور انداز ہر چیز بدلی بدلی سی تھی۔ اس نے حیرت سے سر جھٹکا اور جا کر سو گئی۔

صبح وہ جاتے ہوئے اسے دوبارہ خالہ کے پاس چھوڑ گیا۔

"اوکے خالہ! میری امانت کی حفاظت کیجیے گا۔ اللہ حافظ۔" خالہ سے پیار لیتے ہوئے اس نے مریم کے پھولے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا تو خالہ مسکرا دیں۔

وہ چلا گیا' اسے لگا کہ موحد کو نہیں جانا چاہیے تھا یا پھر اسے بھی لے جاتا۔ نہ جانے کیوں مگر آج نہ جاتا اور اس کیوں کا جواب اگلے دو گھنٹے کے بعد مل گیا۔

☆ ☆ ☆

"مشہور نیوز اینکر موحد ذوالفقار پر قاتلانہ حملہ ..... براستہ موٹروے اسلام آباد سے لاہور جاتے ہوئے ..... وہ خود ہی کار ڈرائیو کر رہے تھے ..... مشہور جرنلسٹ ایم زی۔ آج کا سچ کے ہر دلعزیز ہوسٹ اپنی گاڑی پر اپنے آبائی شہر اسلام آباد سے لاہور جا رہے تھے....."

مختلف چینل چیخ چیخ کر اپنی اپنی بول رہے تھے وہ آنکھیں پھاڑے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی ٹی وی اسکرین کو گھور رہی تھی۔ اس کا سیل مسلسل بج رہا تھا مگر اس کو ہوش نہ تھا۔ سب چینل ایک ہی خبر بار بار دہرا رہے تھے کوئی یہ نہیں بتا رہا تھا کہ اس کا کیا حال ہے۔ وہ زندہ بھی ہے یا.....؟ اس کا ذہن بالکل خالی ہو گیا تھا پھر اچانک خبروں کا زاویہ بدلا۔

"سننے میں آیا ہے کہ ان کو کافی دنوں سے نامعلوم نمبرز سے دھمکی آمیز فون آ رہے تھے۔ ناظرین! ہم آپ کو بتاتے چلیں کہ موحد ذوالفقار کسی بہت ہی بااثر اور بارسوخ شخصیت کے اثاثوں سے متعلق ایک بہت بڑا اسکینڈل منظر عام پر لانے والے تھے۔ ذرائع کا کہنا ہے کہ آج یا کل رات کے پروگرام میں یہ اسکینڈل منظر عام پر آنا تھا....."

نہ جانے کیوں اس کے صبر کا امتحان لیا جا رہا تھا اس کی زندگی کے متعلق کوئی بھی بات کیوں نہیں کر رہا تھا۔ اگر وہ نہیں رہا تو بھی..... ایک دفعہ ایک ہی دم کوئی یہ سچ کہہ کیوں نہیں دیتا۔ کوئی بتا کیوں نہیں دیتا کہ وہ ہر وقت بولتی آنکھیں بند ہو گئی ہیں..... خالہ نے کسی کی فون کال اٹینڈ کی تھی اور اب وہ چادر اوڑھے اسے چلنے کو کہہ رہی تھیں مگر کہاں؟ کیا ڈیڈ باڈی دیکھنے؟ اس نے ہراساں نظروں سے پھپھو کی آنکھوں میں دیکھا اور میکانکی انداز میں اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ نہ اس نے کچھ پوچھا نہ انہوں نے بتایا۔ اسی وقت اگلی بریکنگ نیوز آ گئی۔

"جی ناظرین! ہم بتاتے چلیں کہ موحد ذوالفقار کو دو گولیاں لگی ہیں اور ان کی حالت انتہائی تشویش ناک بتائی جا رہی ہے۔ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں ہیں ایمبولینس کے ذریعے ان کو پولی کلینک پہنچایا جا رہا ہے..... یہ دیکھیے ناظرین یہ تازہ ترین فوٹیج اس گاڑی کی..... جس کو ایم زی خود چلا رہے تھے..... اس کی شکل بھی نہیں پہچانی جا رہی.....یوں لگتا ہے کہ حملہ آوروں نے گولیوں کی بارش کر دی تھی۔"

اسے ٹی وی کی طرف دیکھنا دوبھر ہو گیا۔ سامنے قیامت کے مناظر چل رہے تھے کاش کہ میڈیا والے اس کیفیت کو سمجھ پاتے موحد ذوالفقار کی پسندیدہ سلور ٹویوٹا جو نہ جانے کتنے سالوں سے اس کے پاس تھی وہ چھلنی ہو گئی تھی۔ اس کے حواس مختل ہو چکے تھے۔ پھپھو نے اس کو سہارا دیا وہ خود بھی بہت نڈھال تھیں۔

آئی سی یو کے شیشے سے اس نے اندر جھانکا تو وہ ہر دم بولتا شخص آنکھیں موندے پٹیوں میں جکڑا نظر آیا۔

"لگتا ہے تمہیں اعتبار دلانے کے لیے مجھے مرنا

www.paksociety.com

پڑے گا۔" کل رات ہی تو اس نے کہا تھا۔
"لمبی عمر کی دعا تو تم نہ دو گی۔"
"میری امانت کی حفاظت کیجیئے گا خالہ!" جاتے جاتے ایک پیغام' ایک وعدہ' ایک تسلی؟
ڈاکٹرز نے اگلے دو دن اہم قرار دیے تھے۔ علی اور رابی آپی بھی پہنچ چکے تھے ہر کوئی غمزدہ تھا۔ علی نہ جانے کب اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔
"میں کب سے موحد کو سمجھا رہا تھا کہ تھوڑا محتاط ہو کر بولو۔۔۔۔ مگر وہ کسی کی سنتا کب ہے۔" وہ رو پڑا۔
اسے بھی بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔ اس کے والدین فہد کے پاس انگلینڈ میں تھے۔ وہ بھی دن رات فون پر ہی بیٹھے تھے۔ دو دن کے بعد ڈاکٹرز نے اس کی حالت خطرے سے باہر قرار دی مگر ابھی بھی اگلے چند دن اہم قرار دیے گئے وہ ہوش میں نہیں تھا۔ مسلسل دوائیوں کے زیر اثر گہری غنودگی میں تھا سب تھوڑے تھوڑے وقفے سے اس کے پاس بیٹھ کر آ جاتے۔ وہ بھی چلی جاتی۔ اس کے چہرے کو غور سے دیکھتی رہتی۔ اتنی خاموشی اتنی گہری خاموشی اس کے دل کو دہلا دیتی۔
"مجھے تو شک ہے کہ تم سوتے ہوئے بھی بولتے ہو۔" اس نے کہا تھا مگر اس نے کبھی بد دعا تو نہ دی تھی کبھی بھی اس کے خاموش ہو جانے کی دعا تو نہیں مانگی تھی۔ اس سے زیادہ دیر یہ خاموشی برداشت نہ ہوتی تو اٹھ کر گھر آجاتی۔ وہ آمنہ خالہ کے گھر آ گئی۔ آمنہ پھپھو کب پھپھو سے خالہ ہوئیں اسے پتا ہی نہ چلا' وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ جب رابی آپی اس کے پاس آ بیٹھیں۔
"جانتی ہو مریم! موحد شروع سے ہی ایسا تھا۔ میں اسے کہتی تھی کہ اگر تمہیں کوئی کچھ غلط سمجھتا ہے تو تم اس کا اندازہ ٹھیک کیوں نہیں کر دیتے مگر وہ کہتا تھا۔ آئی ہیٹ ایکس پلینیشن اسے اپنی صفائیاں دینے سے چڑ تھی۔ وہ کہتا تھا جو میرے اپنے ہیں وہ مجھ سے کبھی بدگمان نہیں ہو سکتے اور باقی سب جو مرضی سمجھیں یہ ان کا مسئلہ ہے میرا نہیں۔" اس کا دل زور سے دھڑکا۔
اتنی بدگمانی' انتہا کی بدگمانی جو پہلی ملاقات سے اس نے پال رکھی تھی۔
"پتا ہے موحد شادی کے لیے بالکل نہیں مانتا تھا مگر جب آمنہ خالہ نے تمہارا نام لیا اور مجھے تمہارے گھر جانے کا کہا تو اس نے ایک دفعہ بھی کوئی رکاوٹ کھڑی نہ کی۔ موحد نے شاید تمہیں آمنہ خالہ کے گھر دیکھا تھا جب تک تم نے ہاں نہیں کی' وہ بہت بے چین رہا مگر میرے پوچھنے پر بس ہنس دیتا تھا۔ اتنی آسانی سے اپنے دل تک رسائی نہیں دیتا کسی کو' تم تو اب اس کو مجھ سے زیادہ جانتی ہو گی۔ ادھر ادھر کی بولتا رہے گا اور اصل بات گول مول کر جائے گا۔ ایسا ہی ہے میرا بھائی ۔۔۔۔ مگر صرف ذاتی زندگی میں' اپنے شعبے میں دو ٹوک اور کھرا' مجھے بے انتہا فخر ہے کہ میرے بھائی نے سچ کے لیے گولی کھائی ہے۔"
رابی آپی بات کرتے کرتے آبدیدہ ہو گئیں مریم نے انہیں ساتھ لگا لیا۔



"جس دن آپ کو وہ فون آیا۔ اسی دن میں نے موحد سے کہا کہ کچھ دنوں کے لیے کہیں چلا جا یا خاموش ہو جا مگر اسے صرف آپ کی فکر تھی۔ آپ کو ایمرجنسی میں یہاں بھیج کر وہ تھوڑا پرسکون ہوا تھا مگر مجھے اسی بات کا ڈر تھا۔ میرے سمجھانے پر ہر دفعہ اس کا ایک ہی جواب ہوتا کہ مجھے رونے والا کون ہو گا۔ بس اپنے گھر میں خوش' ماں باپ ہیں نہیں۔" علی اس کے ساتھ کھڑا بول رہا تھا۔ مریم کو دکھ ہوا اس نے مریم کا نام نہیں لیا تھا۔
"یہ تو صرف چند لوگ ہیں جو اندر آجاتے ہیں۔ آپ ہاسپٹل کے باہر رکھے پھولوں کا اندازہ نہیں کر سکتیں اور وہ کہتا ہے کون ہے مجھے رونے والا؟" علی رونے لگا تو وہ گھبرا کر اندر چلی آئی۔
"محبت اندھی ہو نہ ہو مگر نفرت ضرور اندھا کر دیتی ہے۔" ایک سرسراتی سی سرگوشی ابھری تو اس کا ضبط بھی ٹوٹ گیا۔
موحد نے آنکھیں کھول لی ہیں اس کے اندر

ڈھیروں سکون اتر گیا۔

اگلے دن وہ بلپٹس کھانا بھجوا کر آمنہ خالہ کے پاس آبیٹھی۔

"آمنہ خالہ! رانی آپی بتا رہی تھیں کہ آپ نے انہیں میرے گھر جانے کا کہا تھا؟" مریم نے کھوجتی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"تمہیں نہیں پتا؟ میرا تو خیال تھا اب تم جان گئی ہو گی۔" آمنہ خالہ حیران ہوئیں۔

"میں کیسے جانتی' آپ نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔" مریم حیرت زدہ تھی۔

"تو کیا موحد نے بھی ذکر نہیں کیا؟" آمنہ خالہ بے یقین تھیں۔

"موحد بھی جانتا تھا؟" اب حیران ہونے کی باری مریم کی تھی۔

"یعنی میرا شک درست نکلا۔۔۔ تم لوگ ابھی تک ویسی ہی زندگی گزار رہے ہو میں تو سمجھتی تھی کہ موحد نے شادی کے بعد تمہیں بتا دیا ہو گا۔" آمنہ خالہ سراسیمہ تھیں اور وہ عجیب تذبذب میں تھی۔

"موحد بالکل اکیلا تھا۔ میرا خیال تھا موحد کو اب شادی کر لینی چاہیے۔ پھر اس کی زندگی میں عفاف آگئی موحد کی زندگی میں شاید تنہائی اور تشنگی اتنی زیادہ ہو چکی تھی کہ اس نے فوراً اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ ان دنوں اس کی ہر بات عفاف سے شروع ہو کر عفاف پر ہی ختم ہوتی تھی۔ وہ لڑکی بھی اس سے شادی کے وعدے کرتی رہی۔ موحد نے تو میرے ساتھ جا کر شادی کی شاپنگ بھی کر لی۔ حالانکہ مجھے وہ لڑکی کچھ خاص پسند نہیں آئی تھی۔ پھر اچانک عفاف کو ماڈلنگ کی آفر آگئی موحد نے اسے منع کر دیا مگر وہ نہ رکی اور شادی کے انتظامات پر لات مار کر چلی گئی موحد ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا مگر جلد ہی سنبھل گیا پھر وہ اپنے پیشے کا ہو کر رہ گیا وہ اکثر کہتا اسے شادی نہیں کرنی مگر میں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ پھر اس نے اتنا کہا کہ اگر آپ کو کوئی لڑکی اس لحاظ سے اچھی لگی تو مجھے دکھا دیجیے گا۔ میں خود دیکھوں گا پرکھوں گا پھر بھی ضروری نہیں کہ اس سے شادی بھی کر لوں بس اتنا وعدہ کرتا ہوں کہ غور ضرور کروں گا۔" پھر اچانک تم اور عنایہ آگئیں۔ میں نے بغیر کسی انتظار کے موحد کو فون کر دیا۔ اس نے بھی آنے کی حامی بھر لی اور پھر پہلی دفعہ اس نے تمہیں میرے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا۔ تمہارے ساتھ عنایہ بھی تھی۔

موحد کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ میرے دل میں سکون سا اتر آیا اور پھر جب تم اندر آئیں تو اس نے تمہیں چھیڑنے کو مذاق کیا۔ پہلی ملاقات میں کسی لڑکی کے ساتھ یوں فری ہو جانا اس کی عادت نہیں تھی ایسا وہ ہر لڑکی کے ساتھ نہیں کرتا تھا۔ میں اس کے دل کی بات سمجھ گئی۔"

مریم حیران پریشان سب کچھ سن رہی تھی۔

"میں نے بے صبری سے اسے فون کر کے رائے لینا چاہی تو وہ ہنس کر ٹال گیا۔ میں اس کی ہنسی اس کا گریز سب جان گئی تھی۔ تم پہلی نظر میں ہی اسے پسند آ چکی تھیں اب وہ صرف اپنی انا کو بڑھاوا دے رہا تھا وہ انا جسے عفاف پیرزادہ کچل گئی تھی۔ اس سارے معاملے میں مجھ سے ایک غلطی ہو گئی اور شاید موحد سے بھی' موحد نے مجھے عنایہ کے جذبات سے بے خبر رکھا ہو سکتا ہے میرا دھیان بھی اس طرف نہ جا سکا۔" آمنہ خالہ نے رک کر اس کے چہرے کو غور سے دیکھا جو کبھی کوئی رنگ بدل رہا تھا اور کبھی کوئی۔ عنایہ اور وہ پھپھو کو بے خبر اور معصوم سا بزرگ سمجھتی رہیں اور وہ ان کی حرکات و سکنات پر مکمل نظر رکھے ہوئے تھیں۔ آمنہ خالہ پھر گویا ہوئیں۔

"میں نے موحد کو ڈانٹا کہ اس نے پہلے کیوں نہ بتایا وہ کہنے لگا کہ وہ عنایہ کے جذبات کو ایک فین کے جذبات سمجھتا رہا میں بہت پریشان ہو گئی میں نے اس پر زور دیا کہ وہ آئے اور عنایہ کی دلجوئی کرے۔ اگلے دن وہ میرے کہنے پر آیا تھا۔ آنے سے پہلے ہی اس نے عنایہ سے فون پر بات کر لی کہ وہ پھر سے پہلی والی عنایہ بن گئی' میں جانتی ہوں تمہارے دل میں موحد کے لیے بدگمانی تھی جو بعد میں بقول موحد' عنایہ کا دل توڑنے کی

نفرت میں بدل گئی تم موحد کو اس سب کا قصوروار سمجھتی رہیں مگر اس بے چارے کا کچھ خاص قصور نہ تھا۔ یہ تو تم بھی جانتی تھیں کہ عنایہ خود اس کو فون کرتی تھی۔ اسے آنے پر اصرار کرتی تھی وہ مرد تھا اور رشتے دار بھی۔۔۔ کیا کرتا اور پھر میں بھی اسے مجبور کرتی رہی۔" آمنہ خالہ رکیں اور گہرا سانس لیا۔

"پھر تم سب لوگ چلے گئے۔۔۔ سب کا سفر درمیان میں ہی رہ گیا، موحد کراچی اور تم لوگ اپنے اپنے گھر۔۔۔ پھر عنایہ کی شادی میں تم سے ملاقات ہوئی تو پھر سے مجھے موحد یاد آ گیا۔ جب بھی میں نے شادی کا ذکر کیا اس کی آنکھوں میں تمہارا عکس دیکھا مجھے نہیں لگتا عفاف اس کے دل میں تھی اس بات کا اندازہ مجھے بھی تب ہوا جب اس نے تمہیں اپنے دوست کے آفس میں جاب کرتے دیکھا اگر عنایہ کا مسئلہ نہ ہوتا تو یہ سب کچھ بہت آسان اور سیدھا ہوتا مگر عنایہ کی شادی ہو جانے کے بعد بھی تمہارا اس کے لیے مان جانا ناممکن نظر آتا تھا۔ آخر کوئی بھی لڑکی اپنی سہیلی کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہے۔ یہ بات میں بھی سمجھتی تھی اور تم بھی مگر موحد سمجھنے سمجھانے سے آگے نکل چکا تھا۔ کتنے دن وہ مجھے فون کر کر کے کان کھاتا رہا کہ میں تمہارا رشتہ لینے جاؤں یا پھر رابی کو بھیجوں۔ مجھے لگا کہ اس تمام عرصے میں وہ تم سے بالکل بھی بے خبر نہیں رہا۔ پھر میں نے رابعہ کو تمہارے متعلق بتایا مگر اس دوران مجھے امریکہ جانا پڑ گیا۔" آمنہ خالہ چپ ہو گئیں۔ آگے بتانے کو کچھ نہ تھا۔ سب واضح تھا۔

موحد ذوالفقار باتوں کا کھلاڑی جانتا تھا، کس کو کس طرح شیشے میں اتارنا ہے۔ وہ جانتا تھا دوستی کے رشتے میں دراڑ ڈالے بغیر محبت کا رشتہ نہیں بن پائے گا سو اس نے نفرت اور بدگمانی کا رشتہ قائم رہنے دیا۔ وہ جانتا تھا یہاں محبت کے بجائے نفرت استعمال کرنی ہے بعد میں کبھی بھی نفرت کو محبت سے ضرب دے لے گا اور حاصل جواب محبت آ جائے گا، اس کے سارے حساب کتاب پورے تھے۔

مریم حیران تھی وہ کیوں اتنی بدگمان تھی اس سے۔

وہ تو ہر کسی کے لیے اچھا سوچنے والی تھی۔ اس نے پہلے دن سے سوچ لیا تھا کہ جو سلمان نے اس کے ساتھ کیا ہے، وہی موحد عنایہ کے ساتھ کرے گا اور اپنا سارا غصہ اور نفرت سلمان سے موحد کی طرف منتقل کر بیٹھی۔

"میں نے موحد سے اس ڈیل کی تفصیلات نہیں پوچھی تھیں مگر جو بھی تھا اس نے کہا تھا کہ یہ سب وقتی ہو گا اور۔۔۔ وہ شادی کے بعد ساری حقیقت بتا دے گا۔۔۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ تم دونوں اتنی انا اور ناک والے ہو۔ کیا کوئی یوں بھی نکاح جیسے مقدس رشتے کا مذاق اڑاتا ہے۔" اب آمنہ خالہ کے لہجے میں خفگی تھی۔

"میں مان ہی نہیں سکتی کہ موحد جیسے شخص کے ساتھ کوئی رہے اور اسے موحد سے محبت نہ ہو سکے۔" آمنہ خالہ نے شکایتی لہجے میں مریم کو دیکھا تو وہ نظریں چرا گئی۔ ابھی کچھ ہی دن تو ہوئے تھے جب اس نے اپنے دل پہ غور کرنا شروع کیا تھا۔ اس کی آہٹوں کو پہچاننا اور پھر حیران رہ جانا۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں خالہ! موحد کے ساتھ رہنے والوں کو اس سے محبت نہ ہو ایسا ممکن نہیں ہے۔" مریم اٹھ کر اندر چلی گئی۔



"مریم یہ تم ہو نا یار؟" اسپیکر سے عنایہ کی آواز آئی۔

"عنایہ تم؟" وہ اس سے آگے نہ بول سکی۔

"کیسے ہیں موحد صاحب؟ ہم سب لوگ بہت اپ سیٹ ہیں ان کے لیے۔"

"شکر ہے اب بہتر ہیں پہلے سے" مریم جھجک کر بولی۔

"چلو شکر ہے اللہ کا۔۔۔ میں تو تم سے ناراض تھی کہ شادی کے بعد سے غائب ہو گئی ہو۔ نہ سوشل میڈیا پر نظر آتی ہو اور نہ ہی کوئی فون وغیرہ۔ وہ تو آمنہ پھپھو نے فون پر بتایا کہ تم نہ جانے کن فضول باتوں کو

دل سے لگائے بیٹھی ہو۔ کم آن یار! دو بیٹے ہیں میرے اور بہت خوش ہوں میں۔ پلیز تم اپنے گھر میں خوش رہو اور یقین کرو یہ صرف ایک فین کی محبت تھی اس سے زیادہ نہیں۔"

مریم ہونقوں سے صرف سن رہی تھی۔ پہلے موحد کی سنتی تھی اب وہ نہیں بول رہا تھا تو سب اس کے لیے بول رہے تھے۔



وہ خود کھانا لے کر آئی۔ موحد نے اسے دیکھتے ہی پاس کھڑی نرس سے کہا۔

"سسٹر! میری مسز کو یہ پٹیاں چیک کروا دیں کہ اصلی ہیں یا نقلی۔" نرس کا منہ اور آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

"موحد صاحب! آپ بول سکتے ہیں۔ پھر آپ کل سے چپ کیوں تھے؟" نرس حیرت اور خوشی سے بولی۔

"کسی کا انتظار کر رہا تھا۔" موحد نے اس کو دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے مصنوعی غصے سے گھورا۔

"یا اللہ خیر! ہائے..... کاش میں نے بھی ایک اچھے وقتوں میں ڈائری لکھ لی ہوتی اور کسی وقت تمہارے آس پاس رکھ کر بھول جاتا۔ کم از کم تم میرے جذبات سے تو آگاہ ہو جاتیں۔" موحد نے آہ بھری تو مریم مسکرا دی۔

"ڈائری تو نہیں مگر تم نے بہت سے لوگ ضرور تیار کر رکھے تھے، جو آ آ کر مجھے تمہاری عظمتوں کے قصے سناتے رہے۔" مریم نے جوس کا پیکٹ کھولتے ہوئے بتایا تو موحد اطمینان سے مسکرایا۔ بدگمانی کے بادل یقیناً چھٹ چکے تھے۔

"میرے ساتھ رہ کر کافی تیز ہو گئی ہو۔" موحد نے مریم کے مطمئن چہرے کو دیکھ کر چھیڑا۔

"ہاں مگر تم سے زیادہ نہیں۔" مریم بولی۔

"یہ طنز ہے یا تعریف؟" موحد نے بہت پہلے کا سوال دہرایا۔

"تمہیں کیسا لگتا ہے؟" مریم نے بھی ویسا ہی جواب دیا۔

"مجھے چھوڑو....." موحد کی بات مریم نے درمیان سے اچک لی۔

"تم چاہے جتنی مرضی لمبی لمبی چھوڑو مگر میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔" مریم نے اسے سہارا دے کر بٹھایا۔

"اظہار محبت کے ساتھ بھی میری ایک خامی گنوا ہی دی تم نے، بہت شکریہ۔"

"میں سوچ رہی ہوں کہ وہ جو ڈیل کے کاغذات ہیں ان کو....." مریم نے جان کر بات ادھوری چھوڑی۔

"وہ تو کب کا جلا چکا ہوں میں۔" موحد آرام سے بولا۔

"ہیں.... کب؟" مریم چلائی۔

"شادی کے اگلے ہی روز۔"

موحد نے کہا اور ساتھ ہی بچاؤ کے لیے تکیہ آگے کر دیا تو مریم جو اسے گھور رہی تھی، تکیے پر گھونسا مار کر رہ گئی۔



سائرہ رضا

ادھوری داستان

دونوں سمدھنیں جو دیورانی جٹھانی بھی تھیں، بڑے سے آنگن کے اس کونے میں چارپائی ڈالے بیٹھی تھیں۔ جہاں سے وہ سامنے والے کمرے پر نظر بھی رکھ سکیں اور ابھرتی ہوئی سسکیوں اور کراہوں سے سماعتوں کو بچا سکیں۔

درد زہ سے تڑپتی نجمہ کے پاس ماں یوں نہ کھڑی تھی کہ بیٹی کو اس حالت میں دیکھنا دل بند کردینے کے مترادف تھا اور ساس کی تو تصور ہی سے گھگھی بندھی جاتی تھی۔ ایک ایک پل صدی کی طرح گزرتا تھا۔

حالانکہ یہ نجمہ کا پہلا بچہ نہیں تھا پانچواں بچہ۔۔۔ دونوں کلام الٰہی کا ورد کررہی تھیں۔ ایک نے تسبیح پکڑ رکھی تھی۔ دوسری نے یٰسین جب دائی اور کام والی ملازمہ کے اندر باہر کے چکر میں تیزی آتی تو ان کے ہونٹوں کی جنبش بھی رفتار پکڑ لیتی۔

تسبیح مکمل ہونے پر ساس نے اسے چوما اور مٹھی بند کرتے ہوئے ٹھنڈی سانس لی تب نجمہ کی ماں نے یٰسین سے نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"کچھ نہیں ہوا۔" ساس نے بولنا شروع کیا۔ "بس وہی خیال آگیا تھا کہ یہ دنیا کے پاس ڈھیر پڑا ہے نسخوں، وظیفوں، طریقوں کا۔۔۔ ایسے کرو تو بیٹا ہوگا۔۔۔ ویسے کرو تو بیٹا ہوگا۔ اسی فرمائش کے نام پر یہ بڑے بڑوں نے اپنے دکانیں چمکا رکھی ہیں۔ کیا تعویذ تو کیا ٹوٹکے۔۔۔ پر کسی کے پاس بیٹی پیدا ہو جانے کی دعا بھی نہیں اور وہ ابھی نہیں۔۔۔ بات کرو تو دنیا ایسے دیکھتی ہے جیسے ہم کوئی پاگل ہوں۔"

"اللہ پر بھروسا رکھیں بھابھی۔۔۔ وہ سب کی سنتا ہے۔" انہوں نے یٰسین کو چوم کر آنکھوں سے لگایا۔

"لوگ کہتے ہیں ناشکری ہوں میں۔۔۔ خود تین بیٹے پیدا کیے۔ آگے بہو نے چار۔۔۔ تو ایسے ہی ناٹک کرتی ہوں بیٹی کی طلب دکھا کر۔۔۔ اب کسی کو کیا کہوں، لالچ کرتی ہوں۔ بیٹی کی تربیت کرنے سے جنت پکی ملتی ہے۔"

"بیٹی کی پرورش سے تو جنت پکی ہے ہی۔۔۔ نبی کی پیروی بھی جنت کا ٹکٹ ہوتی ہے بھابھی۔۔۔!" انہوں نے رسان سے نکلنے کی بات بتائی۔

"تم تو کہو گی۔ دو دو بیٹیوں کی ماں جو ہو۔ تمہارے ٹکٹ تو کٹے ہوئے ہیں ہی۔" بھابھی نے جلے کٹے لہجے میں کہا تو نجمہ کی ماں ہنس پڑیں۔ تب ہی تمتماتے چہرے کے ساتھ دائی اور ملازمہ برآمدے میں جلوہ افروز ہوئیں۔

"مبارک ہو بھابھی بیگم۔۔۔ مبارک ہو نجمہ کی ماں۔۔۔ بیٹی ہوئی ہے۔"

"ارے میرے مالک۔۔۔!" بھابھی بیگم کھڑی ہوئیں مگر ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ تخت پر گرنے کے سے انداز میں دوبارہ بیٹھ گئیں۔

"سچ کہتی ہو ناں؟" نجمہ کی ماں نے پوچھا۔

"بالکل سچ آپا جی۔۔۔ بالکل سچ۔" ملازمہ کی خوشی کا بھی کیا عالم تھا۔ اسے اندازہ تھا او هر بیٹی پیدا ہونے پر اسے منہ مانگے تحائف دیے جائیں گے۔ دیورانی جٹھانی ایک دوسرے سے لپٹی مبارک باد دے رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

ننھی ثریا کے لاڈ پیار کے ساتھ تربیت کا بیڑا بھی سارے گھر نے اٹھالیا۔ ہر شخص بساط بھر حصہ ڈالتا۔ چاروں بھائیوں کی سوچ تھی وہ گلی ڈنڈا، پٹھو گرم، اونچ بچ، رسی کودنے جیسے کام بس سال کے اندر اندر سیکھ لے۔ بھائی اس دن کے بھی شدت سے منتظر تھے، جب وہ دوستوں کی بہنوں کی طرح شکار کیے گئے چڑوں کا گوشت بھون کر دینے کے قابل ہو جاتی۔

نجمہ بیگم کو صرف اسے تیار شیار رکھنے کا حکم تھا۔ باقی نانی اور دادی نے بغیر کہے کام تقسیم کرلیے تھے۔ دادی کی ساری توجہ دینی تعلیم و تربیت پر تھی جبکہ نانی سلیقہ شعاری کے حوالے سے نواسی کو طاق دیکھنا چاہتی تھیں۔

سلائی، کڑھائی سارے ہی ٹانکے آنے چاہئیں اور بھون بھون کے سارے پکوان بنانے میں تو ثریا کا کوئی ثانی ہو ہی نہ۔

جب ثریا ذرا بڑی ہوئی، تب سب اسے اپنی اپنی پسند کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے تگ و دو میں لگ گئے۔ ایسے میں ابا میاں نے اپنا خواب بتا کر سب کو حیران کر دیا۔ وہ بیٹی کو اسکول داخل کروانے جائیں گے اور بھائیوں کو ہدایت کی کہ اسے ہاتھ پکڑ کر لکھنے کی مشق کروانا شروع کردیں۔

سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ گھر سے لڑکوں کا اسکول ہی کتنا دور تھا، لڑکیوں کا تو سنا ہے کہ بہت ہی دور ہے۔ مانو شہر کا کونا۔۔۔ دوسرا حصہ۔ سات سال کی چھوٹی سی بچی وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ توبہ توبہ۔

اور تمام امور میں مہارت دینے کے لیے دادی، نانی سر دھڑ کی بازی لگا تو رہی ہیں ناں۔۔۔ دینی تعلیم ضروری ہے وہ ماشاء اللہ قرآن پاک شروع کیا چاہتی ہے کتنی ہی دعائیں اور حدیثیں منہ زبانی یاد ہو گئی ہیں۔

اور نعت تو اس لحن اور سوز سے پڑھتی ہے کہ دل جھوم جھوم اٹھتا ہے اور آنکھ نم ہو جاتی ہے۔

اور سب سے بڑھ کر سورۂ رحمن ترجمہ کے ساتھ یاد ہے۔ دادی تو رٹو طوطے کی طرح شروع ہی ہو گئیں۔ کہیں جا کر نانی کو موقع ملا۔

"ہاں ہاں ماشاء اللہ۔۔۔ چھری پکڑنے کا طریقہ بھی آگیا ہے۔ آلو کا چھلکا ایسے اتارتی ہے، جیسے کاغذ کی پرت ہو۔ آٹا گوندھنے کی ضد کر رہی تھی۔ میں نے خود سے ہی روک دیا۔ لسی بنانی تو آ ہی گئی ہے۔ ہاتھ میں اتنا سلیقہ ہے کہ مانو صدیوں کا تجربہ ہو۔ کام کرتے وقت مجال ہے جو لباس پر چھینٹا سا بھی پڑ جائے۔ بٹن ٹانکنا تو آیا ہی تھا۔ ترپائی کا گر بھی سیکھ لیا ہے، اس دن تم بھی تو کہہ رہے تھے کہ! اماں یقین نہیں آرہا، میری قمیص پر بٹن ثریا نے لگائے ہیں۔"

نانی کو تو اسکول والی بات سرے سے ہی غلط لگی تھی۔ سارے جواز سے پرے ان کی آنکھوں کا نور۔۔۔ کتنا بھی جھوٹ بولیں۔۔۔ کوئی سات آٹھ گھنٹے نظروں سے اوجھل رہے گا۔۔۔ ہائے ہائے اف۔

ثریا کی ماں خاموش تھی۔ وہ ماں اور ساس کی طرف دار تو تھی مگر بات شوہر نامدار کی بھی درست لگتی تھی۔

"اماں اور چچی اماں۔۔۔" وہ رسانیت سے گویا ہوئے۔ "آپ کی کوئی بھی بات غلط نہیں مگر اب تقسیم سے پہلے کی دنیا نہیں ہے یہ 1962ء ہے 1962ء۔۔۔ زندگی گزارنے کے نئے اصول و قواعد طے کیے جا رہے ہیں۔ اب لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی تعلیم بھی ضروری ہے۔"

"ہم پرانے زمانے کے لوگ، آج مرے کل دوسرا دن۔۔۔! اس نے تو وہی آگے کا زمانہ جینا ہو گا ناں۔ ایسے ہی ان پڑھ رہ گئی تو زمانے کے ساتھ کیسے چلے گی۔ کل کو کسی مقام پر پہنچے گی ناں تو ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں دے گی دعائیں۔"

"اوئی!" دادی اور نانی کو کرنٹ لگا۔

"اے تو کیا نوکری کرے گی کلکٹر لگے گی؟" نجمہ نے بھی بری طرح چونک کر سرتاج کو دیکھا۔

"بالکل! نوکری بھی کرنا چاہے تو کرے۔۔۔ اور کلکٹر بھی لگ سکتی ہے۔ کلکٹر کو کیا سرخاب کے پر لگے

ہوتے ہیں؟"

ابا نے کسی قدر شوخی سے کہا اور ساتھ ہی دور رسّی کودتی ثریا کو دیکھا۔ دو بھائی رسی کے سِرے پکڑے ہوئے گھماتے تھے اور ثریا تھی کہ کود کود کر تھکتی تھی مگر جنون کم نہ ہوتا تھا۔ جب چھوٹے دو نے بازو شل ہو جانے کی دہائی دی 'تب بڑے دو نے دست بستہ اپنی خدمات پیش کر دیں کہ بہنا کا دل نہ ٹوٹے۔

"اے تم نے تو دنیا سے انوکھی بات ہی کر دی۔" دادی نے انگلی ناک پر جما کر کہا۔ نانی کچھ نہ بولیں کہ خود ہی بیٹے سے نبٹے کہ ہم کچھ بولے تو شکایت ہوگی۔

"آج انوکھی لگتی ہے 'بیس سال بعد نہیں لگے گی۔" ابا میاں نے کہا۔

"آپ خود ہی تو کہتی ہیں وہ اتنی ذہین ہے 'قابل ہے تو ایسی بچی کا تو حق ہے کہ اسے سب کچھ دیا جائے اور سب سے بڑھ کر میں بیٹے بیٹی کو ایک ہی طرح سے پالنا چاہتا ہوں۔ میری بیٹی ان پڑھ کیوں کہلائے 'خوامخواہ ہی۔"



ثریا کا اسکول جانا شروع ہو گیا۔ ابا دفتر جاتے ہوئے سائیکل پر چھوڑتے واپسی پر تانگا۔۔۔ پہلے دن گھر بھر میں ایمرجنسی لگ گئی۔ ثریا کے ناشتے دان کی تیاری۔۔۔ اور اس پر ثریا کی تیاری۔۔۔

کالے بند بوٹ۔۔۔ سفید شلوار دوپٹے کے بیچ ہلکی نیلی قمیص۔۔۔

خوب تیل ڈال کر اتنی کس کے چوٹیاں گوندھی گئیں کہ آنکھیں "چینی" ہو گئیں اور اس پر سرمہ کا تڑکا۔۔۔ یہ بڑے بڑے ڈورے۔

پھر سفید دوپٹے کو نماز کی طرح سے اوڑھا دیا۔

اچھی پیاری صورت ثریا کو کیا سے کیا کر دیا توبہ۔۔۔ بھوت جیسا مانو۔

دوپہر کو واپسی پر ثریا انسان صورت تھی۔

ٹیچر نے بال ڈھیلے کروائے اور تیل نہ لگانے کی ہدایت کی یا کم از کم اتنا نہیں۔ منہ دھلا دھلا کر آنکھوں کی سیاہی کم کرنے کی کوشش میں چہرہ بھی رگڑنا پڑا۔ سب سے اہم کام دوپٹے کو وی کی طرح تہہ لگا کر شانوں پر ڈال دیا۔

گھر کی سرکردہ خواتین کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ثریا تو ایک ہی دن میں کیا سے کیا ہو گئی۔

بہت پڑھی لکھی تو لگ ہی رہی تھی۔ بے حد خوش تھی۔ رات گئے تک کتابیں کھولے بیٹھی رہی۔ دادی نانی سے کہانیاں سننے کا شوق تھا مگر انہیں وہ والی باتیں بالکل نہیں پتا تھیں 'جو کتابوں میں لکھی ہوتی ہیں۔



پیاری ثریا نے جب دادی 'نانی کو مایوس نہیں کیا تھا تو ابا میاں کو کیسے کرتی۔ ذہانت خداداد تھی پھر شوق اور جستجو۔۔۔ تھوڑے ہی عرصے میں جیسے ڈنکے بجنے لگے۔

صورت شکل خدا کی دین۔۔۔ اکلوتا ہونا ایک اضافی خوبی۔۔۔ پھر سلیقے طریقے اور پڑھائی کی لیاقت نے شخصیت کو چار چاند لگا دیے۔ ثریا سے سب خوش رہتے۔ اس کی مثالیں دی جاتیں۔ ثریا ہی کی دیکھا دیکھی خاندان اور آس پڑوس کی بھی کتنی ہی لڑکیوں نے اسکول کا منہ دیکھا۔ وہ کسی کے کہے بنا ایک لیڈر بن گئی۔

دادی کی توجہ دینی تعلیم کی طرف تھی۔ سو وہاں بھی کوئی کمی نہ رہی۔

نانی اسے مراۃ العروس کی اصغری سے بھی کچھ بڑھ کر بنانا چاہتی تھیں۔

ماں امور خانہ داری میں طاق ہونے کے لیے ساتھ لگائے رکھتیں۔

ابا میاں تو شاندار رزلٹ دیکھ کر خوش رہتے ہی تھے۔

اتنی خوبیوں کا مجموعہ۔۔۔ ثریا میں ایک خامی بھی تھی۔ جو بظاہر بے ضرر تھی مگر اکثر بے ضرر نظر آنے والی چیزیں ہی ضرر رساں ہوتی ہیں۔

اسے آج کا کام کل پر ٹالنے کی عادت تھی۔ یا دوسرے الفاظ میں کام جب کرتی جب ناک تک آجاتا

اور چونکہ بلا کی بااعتماد تھی اور خود پر بھروسا بھی 'سو عادت پختہ ہوتی چلی گئی۔

نانی سمجھاتیں۔ ماں بھی نصیحتیں کرلیتیں۔ دادی کی چلی گئی مثال تو بچے بچے کو ازبر ہو چکی تھی۔

"دروازے کھڑی بارات ـــ چھیدو لڑکی کی ناک۔"

ثریا زور سے ہنس پڑتی۔ دادی کو ہنستی ہوئی بڑی پیاری لگتی۔ اللہ کرے سدا ایسے ہی کھلکھلاتی رہے مگر اوپری غصے سے پوچھتیں۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات بٹیا ـــ؟"

"کچھ نہیں دادی جان! میں بس یہ سوچ رہی ہوں کہ بارات دروازے پر کھڑی ہے۔ استقبال کو کوئی نہیں۔ دولہا میاں حیرت سے دائیں بائیں دیکھ رہے ہیں 'غلط گھر تو نہیں آ گئے۔ یہ نہیں خبر ـــ گھر تو درست ہے مگر سارے کے سارے اندر زنانے میں ناک چھیدنے گئے ہیں۔"

بات ختم کرتے کرتے ثریا ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئی۔

تینوں خواتین بھی مسکرائیں مگر نانی جان نے تادیب ضروری سمجھی۔

"اے بچی! لڑکیوں کے ہنسنے کی آواز گھر سے باہر نہیں جانی چاہیے۔"

"چلیں جی۔ کل کو آپ کہہ دیں گی۔ لڑکیوں کو ہنسی بھی نہیں آنی چاہیے۔"

"بالکل آنا چاہیے۔ اللہ رب العزت سب کی بیٹیوں کو ہنستا مسکراتا شاد آباد رکھے مگر ہر چیز کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔"

"اب جب پتا ہے کہ عصر کا وقت بہت تنگ ہوتا ہے تو اذان کی آواز کان پڑتے ہی نماز کو کیوں نہ اٹھیں ـــ بعد میں دیوار کی دھوپ کو گرتے دیکھ کر بھاگی ہو۔ اتنی تیزی کے وضو میں کیا تراوٹ اور کاملیت ـــ پھر نماز کیسی رہی ہو گی۔ وہ اب تم جانو یا اوپر والا ـــ"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ دادی جان!" مجھلے بھائی نے سامنے والی چھت سے سر اٹھا کر نیچے ان سب کو دیکھا۔ وہ پڑھ رہے تھے اور سب آوازیں کان پڑ رہی تھیں' اوپر میں ہی تھا ـــ دیکھ رہا تھا نماز کو ـــ یہ ٹکروں پر ٹکریں ـــ یہ ٹکروں پر ٹکریں ـــ ساتھ ساتھ دیوار سے اترتی دھوپ پر بھی نظر وار رہی تھی۔ جلدی جلدی دعا مانگی 'منہ پر ہاتھ پھیرا اور یہ جا وہ جا۔"

بھائی جان نے ساری حقیقت بتا ڈالی۔ ثریا جھینپ گئی۔ واقعی اس کی نظریں دھوپ پر تھیں۔ وقت بالکل خاتمے پر تھا۔

"آپ کو شرم نہیں آتی کسی کی نماز دیکھتے ہوئے؟"

"اچھا ـــ نماز بھی کسی کی ہوتی ہے؟"

"بالکل ہوتی ہے۔" اس نے زور دے کر کہا۔ "ہر کسی کی اپنی نماز ہوتی ہے۔"

"تو پھر اپنی نماز کو مشکل میں کیوں ڈالا؟" بھائی جان نے لاجواب کر دیا۔

ثریا دوبارہ شرمسار ہو گئی کہ تینوں خواتین کے ساتھ وہ بھی قائل ہو گئی تھی۔

"اچھا آئندہ نہیں کروں گی۔"

"ہمارے ساتھ ہی کھڑی ہو جایا کرو۔" نانی جان اور دادی جان نے آسان حل پیش کیا۔

"خالی یہی ایک مسئلہ تھوڑی ہے؟" امی جان کے حساب سے مزید باز پرس ابھی ضروری تھی۔

"جب اسے پتا ہے کہ اس کے ابا میاں شام کو آتے ہی اس کے ہاتھ کی چائے پیتے ہیں تو بھئی دھیمی آنچ پر پہلے سے چائے کا پانی چڑھا دے مگر نہیں ـــ سلام دعا کرے گی۔ ہاتھ سے بیگ لے گی۔ جوتا رکھے گی۔ کپڑے دینے کے بعد جب وہ منہ ہاتھ دھو کر تسلی سے بیٹھ کر چائے مانگیں گے۔ اس کو تب یاد آئے گا کہ چائے تو رکھی ہی نہیں ـــ پھر سر پر پیر رکھ کے بھاگے گی۔"

"تو لے بھی تو آتی ہوں پل پلک جھپکتے ـــ کبھی ابا میاں نے یہ تو نہ کہا مجھ کو دیر ہو گئی۔ اذان کی آواز سے پہلے ہی کھڑے ہو جاتے ہیں۔" اس نے بڑے ضبط

سے ماں کو سنا تھا' اب تیزی سے صفائی دی۔ "کبھی شکایت تو نہ کی۔"

"تو اس کا کیا مطلب ... پہلے سے تیاری کر کے رکھنی چاہیے ناں یہی عادتیں رہیں تو پختہ ہو جاتی ہیں ... چائے بلک جھپکتے میں بن سکتی ہے۔ کیا پائے بنانے کے لیے بھی چٹکی بجا کر جاؤ گی ... کہ جی بس ابھی لائی۔"

ماں کو سخت شکایتیں تھیں اس سے' ثریا نے بے حد برا منہ بنا کر دادی نانی کو دیکھا کہ دیکھیے آپ کی پوتی کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

"اب کیا کیا کہیں ... کہ دوسرا سنے اور بس دانتوں تلے انگلیاں داب لے۔" نانی جان بولیں۔ "چھ ماہ سے سن رکھا تھا۔ اسکول میں مینا بازار لگے گا۔ ہڑبونگ مچا کر ریشمی کپڑا منگوایا۔ چھاپہ لگوانے کے لیے کوئی ڈیزائن ناک پر نہ چڑھا۔ پھر بنوانے بھیجا۔ اس کو خود کو تو صرف دوپٹے پر کروشیہ کی بیل ٹانکنی تھی۔ اب مینا بازار جانے والی رات جب کپڑے نکالے ہیں تو ایک جانب سے پلو خالی اور دوسری طرف سے ماتھا پٹی پر بھی کروشیا کی بیل ندارد۔ آدھی بنی تھی۔ دھاگا کروشیہ ساتھ ہی تہہ لگا کر رکھا تھا۔ ساری رات جاگ کر پھر بیل پوری کی۔"

نانی جان کا لہجہ قلق سے بھرپور تھا۔

"تو پورا تو کر لیا تھا ناں ... سب سے خوب صورت لباس تھا میرا سب لڑکیوں میں۔" اس دن کی یاد نے اس کے لبوں پر مسکان بکھیر دی۔

"اور وہ جو انگلیاں فگار ہوئیں جلد بازی میں۔" نانی کو شہادت کی پور پر کروشیہ کے سوئے کی چوٹیں یاد تھیں' اب بھی ذکر سے ہی دل چر سا گیا۔

"انگلیاں فگار ہوئیں جلد بازی میں ... واہ!" واہ بڑے بھیا ابھی ہی اندر داخل ہوئے تھے۔ "کیا مصرعہ کہا آپ نے نانی جان! اب دوسرا بھی سنائیے۔" بڑے بھیا نے گویا جھوم کر داد دی۔

"مصرعہ ... دوسرا ... کون مصرعہ ... اور دوسرا تو یہاں کوئی بھی نہیں؟"

نانی جان نے اپنے دائیں بائیں تیزی سے کسی دوسرے کو کھوجا تو سب زور سے ہنس پڑے۔ ثریا کی کلاس بھی اختتام کو پہنچی۔



کہتے ہیں' فطرت بدلی نہیں جا سکتی۔ عادت تبدیل ہو جاتی ہے مگر بعض عادتیں جو پختہ ہو جائیں وہ فطرت سے بھی زیادہ مستحکم اور قطعی بن جاتی ہیں۔

کام کو ٹالنا یا عین وقت پر بھاگم بھاگ کر لینا اس کی شخصیت کا حصہ بن گیا جیسے ... اور اتنا اہم اس لیے نہیں رہا کہ کام ہو ہی جاتا تھا۔ وہ کبھی پچھتائی بھی نہیں

ماں' نانی' دادی اور دیگر اہل خانہ کے کام کاج تو وہ کسی نہ کسی طرح وقت پر نبٹا دیتی مگر اپنے ذاتی کاموں کے لیے ڈھیلی رہتی۔

نوٹس بنانے کے لیے ٹیچر ایک ہفتے کا وقت دیتیں۔ یہ سارا ہفتہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی کلاس میں۔ لڑکیاں لائبریری میں کتابیں چھانٹ رہی ہیں۔ آپس میں ڈسکشن کر رہی ہیں۔ اسے شامل کرنے کی کوشش کرتیں تو یہ شانے اچکا دیتی۔ "ابھی تو میں نے دیکھا ہی نہیں تو کیا ڈسکس کروں؟"

"ارے تو اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں اور تم نے ابھی تک کھول کر بھی نہیں دیکھا۔"

"ہو جائے گا بھئی ... کیا آفت ہے!" وہ لاپروائی سے کہتی۔

اور پھر واقعی ہو جاتا۔ وہ نوٹس دینے والی آخری رات میں رات گئے تک' جب اہل خانہ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہوتے گردوپیش سے بے خبر قلم چلاتی۔ ورق پلٹتی۔ اور صبح سب سے بہترین اسائنمنٹ اس کا ہوتا۔ تب ایک شان بے نیازی سے سر اٹھائے وہ چلتی۔

اسے کرنے والے سب کاموں کا پتا ہوتا تھا مگر وہی کہ ... ابھی تو بہت وقت ہے' کہہ کر مزے سے گھومتی کہ "کر لیں گے۔ ہو جائے گا۔ مسئلہ ہی کیا ہے۔ کیا کوئی پیچھے لگا ہے؟"

ادھر بڑی دادی جب تک زندہ رہیں' اسے ساتھ لگائے رکھتیں۔

بڑی پیار سے اور کبھی حاکمیہ انداز میں کچھ ڈانٹ ڈپٹ کر اپنے سامنے کام کرواتیں۔ دادی نے یہ کیا کہ نماز کے لیے کھڑی ہوتیں تو تب تک تکبیر نہ کہتیں' جب تک ثریا گرتی پڑتی برابر نہ آجاتی۔ دادی کا تو یہ طریقہ تھا کہ نماز کا وقت ہونے والا ہوتا تو وضو کر کے دوپٹا جما کر بیٹھ کر اذان کی آواز کا انتظار کرنے لگتیں۔ اذان مکمل ہوتی تو دعا مانگ کر جائے نماز پر کھڑی ہو جاتیں۔

"ارے تو کیا کوئی چابک لے کر پیچھے کھڑا ہے کہ فوراً۔" "وہ احتجاج کرتی۔

"بالکل کھڑا ہے۔۔۔ مگر بس بات یہ ہے کہ چابک دکھائی نہیں دیتا۔"

دادی کا جسم اللہ کے خوف سے لرزہ براندام ہو جاتا۔ یہ بھی ڈر جاتی۔

رمضان کے مہینے میں جو پانچ سات روزے چھوٹ جاتے انہیں رکھنے میں اتنی دیر لگاتی کہ اگلا رمضان سر پر آکھڑا ہوتا۔ تب بھی آج کل کے چکر۔۔۔

نانی دادی کو جب خبر ہوئی تب مانو ثریا کی شامت آ گئی۔

اس پر تین رمضان کے روزے بقایا تھے۔ خوب سخت سست سنایا۔

"اب اکیلے اٹھ کر کیسے سحری بناتی۔ اکیلے روزے کیسے رکھتی۔"

دادی جان نے حل نکالا۔ نفلی روزے وہ رکھا ہی کرتی تھیں۔ موسم اچھا دیکھ کر اسے بھی ساتھ لگالیا۔ تین چار لوگ مل گئے تو موڈ سا بن گیا۔

اور چونکہ ثریا محبتوں کے زیر اثر تھی اور دعاؤں کے۔ محنت اور ذہانت کی خوبی اللہ کی ودیعت کردہ تھی۔ سو وہ کامیابیاں سمیٹتے سمیٹتے اس مقام سے بھی آگے بڑھی جو کبھی دادی کے خدشے کی صورت اور ابا میاں کے خواب میں جاگا تھا۔

بنتے بنتے وہ محکمہ تعلیم کی بہت بڑی افسر بن گئی۔

شوہر بھی افسر لگا تھا۔ اور اسے بھی اتنا آگے جانا تھا کہ بڑا افسر بن جائے۔ ایک دم بڑا افسر۔۔۔ گھر بھر کی لاڈو رانی عملی زندگی میں داخل ہوئی تو ساری لاپروائیاں چھوٹی پڑیں۔ اس دوڑ میں کام کو آگے نہیں ٹالا جاتا تھا۔ بلکہ وقت سے بہت پہلے ختم کرنا پڑتا تھا ورنہ آپ پیچھے رہ سکتے ہیں۔



54ء میں پیدا ہونے والی ثریا نے جب بچپن کے دن گزارے تو سن 64ء کا تھا۔ دس سال مزید گزرے تو 74ء کے آغاز میں جوانی بھی جوبن پر تھی مگر پھر معاشرے اور معاشرتی تقاضوں میں اتنا فرق اور جدت نہیں آئی تھی' جتنی آج کے دور میں ہے۔

اقدار و روایات کا پاس تھا۔ شرم لحاظ۔۔۔ پردہ' جھجک۔۔۔ قناعت سادگی گھر کے اندر یہی چلن تھا۔

مگر ایک نیا کلچر۔۔۔ ڈرائنگ روم کلچر۔۔۔ کچھ دکھاوے کا عنصر۔۔۔ غرور اور بے نیازی کی ادائیں اونچے طبقے میں پروان چڑھ رہی تھیں۔ متوسط طبقہ ان چیزوں سے نابلد تھا اور روایات کا پاس دار بھی۔۔۔ جبکہ ثریا اور شوہر نامدار اس نئے کلچر کو سراہ رہے تھے اور اس میں داخل ہونے کی تگ و دو میں جت گئے۔ انہیں متوسط طبقے کی درجہ بندی سے نکل کر اعلیٰ طبقے کا فرد کہلوانا تھا۔

80ء کی دہائی کے آغاز تک دونوں سر دھڑ کی بازی لگا کر ریس میں جت گئے۔ مقابلہ ہر میدان میں تھا۔ لباس' خوراک' رہائش' اسکول' سہولیات اور طرز زندگی۔۔۔

بڑے سے ناشتہ دان کے ہمراہ تانگے پر سرکاری اسکول جانے والی ثریا کے پانچ بچے ایک نئے نئے بنے انگلش میڈیم اسکول میں جانے لگے۔

مہمان داری بھرے دسترخوانوں سے ہٹ کر ریفریشمنٹ میں بدل گئی۔

سرکاری رہائش تھی تو محمود و ایاز ایک صف میں کھڑے تھے، جیسے کی مثال ہو گئی مگر زندگی بھر ایسے ہی تو نہیں رہنا تھا ناں۔۔۔ کراچی میں نئی نئی ہاؤسنگ اسکیمیں متعارف کروائی جا رہی تھیں۔ ناظم آباد، گلشن، ڈیفنس اور کلفٹن اپارٹمنٹ کلچر۔

ایک اچھے علاقے کی رہائش بھی آپ کے معاشرتی رتبے کو بلند یا کمتر ظاہر کرتی ہے۔ سو زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے بلکہ آنے والے وقت میں خود کو درست ڈھالنے کے لیے ضروری تھا کہ پہلے سے پیش بندیاں کرلی جائیں۔

وہ ہر نئی چیز کو اپنانے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھے اور جسمانی مشقت جس کا حل تھا۔ مسابقت کی اس دوڑ میں بہت کچھ پیچھے چھوڑنا پڑا طوعاً" و کرہاً" بعض دفعہ خوش دلی سے بھی کہ اچھی شے کی تگ و دو میں بہت کچھ فراموش کرنا ہی پڑتا ہے۔

زندگی خواہشوں کا چابک بن گئی تھی اور یہ گھوڑے ۔۔۔ چابک پڑتی تھی ذرا جو دھیمے ہوتے۔ پھرسے گرتے پڑتے ناہموار سانسوں کے ساتھ بھاگے جاتے بھاگے جاتے، بھاگے جاتے۔۔۔ یہاں تک کہ وہ سب بلکہ اس سے بڑھ کر بھی پایا جو کبھی سوچا کرتے تھے۔

مگر اس دوران کیا کیا چھوڑنا پڑ گیا۔۔۔ یا چھوٹ گیا بلکہ چھوٹ جاتا ہے۔ جب ہم دنیا کی مادیت کے پیچھے بھاگتے ہیں تو رشتوں ناتوں کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

جب ہم صرف دنیا کو ذمہ داری سمجھ لیتے ہیں تب۔۔۔ اپنی بے وقعتی پر دین اور آخرت خود بخود اپنے حق سے دستبردار ہو کر پیچھے رہ جاتے ہیں۔ راستہ چھوڑ دیتے ہیں۔ منہ سے کچھ نہیں کہتے بس سوچ لیتے ہیں۔ اب ایک بار یعنی آخری بار ہی بات ہوگی۔



2014ء ریٹائرمنٹ کا سال۔۔۔ جب سرکاری سطح پر اعلان کر دیا جاتا ہے کہ اب آپ کی مزید خدمات کی ضرورت نہیں یا آپ ساٹھ سال کے ہو گئے ہیں اور اس قابل رہے ہی نہیں یا یہ بھی کہ بہت کرلی آپ نے خدمت محنت اب شکریے کے ساتھ آپ آرام کیجیے۔

ریٹائرمنٹ کی تشریح جو دل چاہے ان معنوں میں کر لیجیے مگر حقیقت یہی ہوتی ہے کہ اب آرام سے بیٹھ جائیے۔

اور ہر ریٹائر ہو جانے والے شخص کی کیفیات دوسرے سے جدا ہوتی ہیں۔

سب کی اپنی خواہشات، ضروریات اور وجوہات۔ مگر ان سب سے پرے ثریا کے لیے ریٹائرمنٹ سراسر طمانیت تھی۔ پوش علاقے کے شاندار سے گھر میں فراغت کی چمکیلی صبح۔۔۔ ہر حوالے سے فراغت اور سکون بخش دن کا آغاز۔۔۔ دو بیٹیوں کو بیاہ چکی تھی۔ ایک بیٹا لندن میں ملازم تھا تو دوسرا وہاں پڑھنے چلا گیا۔ سب سے چھوٹی بیٹی کسی بڑے چینل کی بیورو چیف تھی۔ باوقار، نفیس، ذہین ثریا کو سارے بچے ہی قابل لگتے، پیارے لگتے مگر چھوٹی کی تو بات ہی کیا تھی۔

لندن میں زیر تعلیم بیٹے نے صاف صاف کہا تھا۔
"میری فکر نہ کریں، مجھے تو کسی گوری ہی سے شادی کرنا ہے۔"

بڑے بیٹے کے لیے بھائی کی بیٹی لی تھی۔ وہ وہاں جا کر گوریوں سے بڑھ کر گوری ہو چکی تھی۔

چھوٹے بیٹے کے اعلان نے نہ تو حیران کیا نہ دل توڑا۔ گویا ماڈرن ماں تھی۔ جب زندگی اس نے گزاری ہے تو۔۔۔ بات ہی ختم۔

ریٹائرمنٹ کے بعد کرنے والے کاموں کی ایک لسٹ تو ہاتھ میں تھی۔ گنتی کے چند کام۔۔۔

چھوٹی بڑے عہدے پر تھی۔ آئے دن چینل پر کسی نہ کسی سیاست دان سے لڑا لگا کر بیٹھی ہوتی۔ بڑے بڑے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا۔ کیا سیاست دان، جاگیردار، صنعتکار، فنکار۔

"تمہارا رشتہ کرنے میں تو ہمیں بڑی مشکل ہوگی ثمن! جس طرح کے لوگوں میں تمہارا اٹھنا بیٹھنا ہے۔

جو تمہارا حلقہ احباب اور مقام ہے۔ کنوئیں میں بانس ڈالنے پڑیں گے گویا۔"

ثریا کے لہجے میں بیٹی کے لیے ستائش ہی ستائش تھی۔ شوہر صاحب نے زور زور سے سر ہلایا۔ وہ بھی اکثر اس پہلو پر سوچتے تھے۔ بیوی سے ذکر نہ ہو سکا۔ وہی بے پناہ مصروفیت۔ آج بات نکلی تو تائیداً" سر ہلایا۔

ثمن نے دونوں کو بغور دیکھا۔

"اوہ پلیز! آپ لوگ اس فکر سے تو دور ہی رہیں۔ آپ لوگ ڈھونڈیں گے تو مجھے کیا خبر ہو گی کہ موصوف کون ہیں' کیسے ہیں۔ ہمارا مینٹل لیول میچ ہو گا کہ نہیں اور سب سے بڑھ کر مجھے اس شخص سے شادی کرنی ہے۔ جو میری فیلڈ کی نزاکتوں کو رئیلائز کرے گا۔ انڈر اسٹینڈ کرے گا اور سیکنڈ مجھے ارینج میرج تو کرنی ہی نہیں ہے۔ سمجھ گئے ناں آپ لوگ' میں کیا کہنا چاہ رہی ہوں۔"

بیٹی کے ارفع خیالات پر دونوں نے جی جان سے اثبات میں سر ہلایا۔ بالکل سمجھ گئے بیٹی نے ارینج میرج تو کرنی ہی نہیں ہے۔ مطلب لو میرج کرنی ہے ناں چلو جی جان چھوٹی۔

ایک کام جو بڑی تسلی سے کرنے کا سوچا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد چھوٹی کے لیے رشتہ اور شادی۔۔۔ اس سے بھی بری الذمہ ہوئے۔

تو اب پیچھے کیا بچا۔ ثریا گرما گرم چائے کا کپ تھامے سوچ رہی تھی۔ پوری زندگی ایک فلم کی طرح سامنے دیوار پر گویا چلا دی گئی تھی۔ ایک کے بعد ایک منظر۔۔۔ ماں باپ' دادی نانی' بھائی' بچپن۔۔۔ چہرے پر مسکان سی بجی تھی۔

دیوار گیر قد آدم آئینے میں وہ خود کو کرسی پر بیٹھا دیکھ رہی تھی۔

کوئی عمر چوری نہیں۔۔۔ وہ ساٹھ برس کی ہو گئی تھی مگر سچ بات ہے لگ نہیں رہی تھی' بیتلی نہیں' موٹی بالکل نہیں۔ رنگے ہوئے بال جدید اسٹائل کے ساتھ چہرے کی تازگی و چمک۔

شوہر صاحب تین برس پہلے ریٹائر ہوئے تھے۔ وہ اسی نئی لائف میں سیٹ ہو چکے تھے۔ حج تو ریٹائر ہوتے ہی کر آئے تھے۔ ثریا کو بھی ساتھ چلنے کو کہا' پر ثریا نے منع کر دیا۔

"آپ ہو آئیے۔ میری ریٹائرمنٹ ہو جائے تو دوبارہ چلے چلیں گے۔"

شوہر صاحب کو یہ بات بھی بھلی لگی۔

اور ابھی رات ہی تو وہ کہہ رہے تھے حج فارم بھروا دوں؟ تب ثریا نے اثبات میں سر ہلایا مگر ساتھ ہی یہ بھی سوچا۔

"تین سال پہلے تو بقر عید نومبر کے مہینے میں پڑ رہی تھی۔ اچھا ہوتا اسی وقت چلی جاتی۔ اب اس بار ستمبر اکتوبر میں جانا پڑے گا اور کیا قیامت کا گرم موسم جھیلنا ہو گا۔"

شوہر صاحب بلڈ پریشر اور شوگر کے مریض۔۔۔ اپنا حج تو وہ کر چکے تھے۔ لیکن اگر ساتھ نہ جاتے تو ثریا کا حج کیسے ہوتا؟ بیٹوں کی ترجیحات میں حج کا نمبر تو نجانے کون سا تھا اور تھا بھی کہ۔۔۔ نہیں!

"ارے وہی کام ٹالنے والی میری عادت۔۔۔" اپنے ماتھے پر ہلکا سا ہاتھ مار کے خود کو لاڈلی سی سرزنش کرتے ہوئے وہ ڈائری نکال لی۔ جس میں ان فرائض کی ایک فہرست تھی اور جو ریٹائرمنٹ کے بعد کے لیے ٹھہرا دیے تھے۔

اول نمبر پر نمازیں تھیں۔ نانی دادی کی سخت تربیت کے باعث نماز زندگی کا لازمی حصہ رہی مگر کڑکتی دوپہروں کو آفس سے واپس آ کر جب بیڈ پر گرتی تو غنودگی میں جاتے جاتے ہلکی سی جھرجھری لیتی' کانی آنکھ سے گھڑی دیکھتی۔ بس پانچ منٹ اور۔۔۔ پھر اٹھتی ہوں۔ پھر جب پانچ منٹ پورے ہوتے تب آنکھ کھلتی تو پتا لگتا ظہر کا وقت عصر کو بھی ساتھ لے اڑا ہے۔ کبھی لپک جھپک قضا کے لیے کھڑی ہو جاتی اور کبھی کل ملا کے پڑھ لوں گی۔ سوچ کر گھر اور بچوں کو سنبھالنے لگ

پڑتی۔

نمازوں کی تعداد کا حساب تو نہیں تھا مگر روزے یاد تھے۔ پانچ میں سے چار بچے رمضان میں تولد ہوئے تھے۔ تیس روزوں کا ریکا ناغہ۔۔۔۔

پھر دوسرے ناغوں کی گنتی کی تو تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ آنکھوں کے آگے تارے سے ناچ اٹھے۔ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

یہ کیسے رکھے جائیں گے؟ سوچا۔۔۔۔ کچھ رکھ لوں اور کچھ کا فدیہ دے دوں لیکن پتا نہیں فدیہ کا کیا حکم ہے؟ دادی جان ہوتیں تو رٹو طوطے کی طرح بتا دیتیں حوالوں سے مثالوں سے۔۔۔۔

اور اگر کل سے روزے شروع کر بھی دوں تو کتنی گرمی ہے اور آگے رمضان بھی شروع ہونے والا ہے۔

اور وہ جو سوچ رکھا تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد خود قرآن پاک پڑھ کر ابا میاں، نانی جان دادی جان اور بڑے بھائی جان کو بخشے گی

"تو وہ کام بھی باقی ہے۔"

"اے بچو! بھلے سے قبر پکی نہ کروانا، بھلے مٹی میں مٹی ہو کر بے نام و نشان رہ جائیں مگر پڑھ پڑھ کر ہمارے نام سے بخشتے ضرور رہنا۔"

کبھی کبھی دادی اور نانی پر موت کا خوف طاری ہوتا تو بس مغفرت کی دعا کی منت کر ڈالتیں۔۔۔۔ مگر مصروفیت کے اس عالم میں ثریا کو وقت ہی نہ ملا۔

نماز پڑھنا تو ایک عادت تھی۔ لاپروائی سے۔ جو چھوٹی اسے پڑھنا اتنا مشکل نہیں لگ رہا تھا۔ مگر روزے۔۔۔۔ ہاں یاد آیا، بڑا بیٹا کہہ رہا تھا کہ سال چھ ماہ اگر ماں باپ اس کے پاس آ کر رہ جائیں۔۔۔۔ تو کیا خیال ہے پھر روزے وہیں جا کر نہ رکھے جائیں۔ سرد موسم۔۔۔۔ چھوٹے دن۔ تو یہ تو پھر ہانو حج کے بعد ہی ممکن ہو گا۔

لیکن یہ ہے کہ آج کل میں آٹھ روزوں کا ایک سیٹ تو رکھ ہی لوں۔ گھر کے اندر تو موسم اچھا ہی ہوتا ہے۔ ٹھنڈے کمرے۔ اے سی اور باہر جانا بھی نہیں ہو گا مگر ابھی وائٹ واش کی بات بھی ہو رہی تھی۔

دونوں بیٹیاں اس بار چھٹیاں رمضان اور عید منانے کے لیے میکے آنا چاہتی تھیں۔ ان کی آمد کی تیاری منجھلی بٹی ہاؤس وائف تھی۔ سو میاں کی چھٹیوں پہ چلتی تھی۔ بڑی ورکنگ وومن اپنے حساب کتاب سے نکلتی۔ ماں کی فراغت کی خوشی میں بڑے اہتمام سے یکجا ہونے کا وقت طے کیا تھا۔ دونوں بہت پرجوش تھیں۔ پکنک، شاپنگ، ملنا ملانا تفریح کے بہت سے منصوبے۔۔۔۔ ماں باپ کے ساتھ تسلی سے مزے سے گپ شپ۔

"وائٹ واش اس ویک کے اینڈ میں شروع کروا لیتی ہوں۔ ساتھ ساتھ دیگر تیاریاں بھی۔۔۔۔ رمضان سے پہلے کے دس دنوں میں روزے رکھ لوں گی پچھلے برس کے۔۔۔۔ جب بخار نے آن گھیرا تھا۔"

ثریا پروگرام ترتیب دے کر مطمئن ہو گئی۔ فرصت کے ان لمحوں کا انوکھا فسوں دل و جان کو معطر کر رہا تھا۔ یونہی خود بخود سارے گھر میں ٹہلنے لگی۔ ہر چیز سے یادیں جڑی تھیں۔ محنت، کوشش، خواہش اور تکمیل۔۔۔۔ دیوار پہ لگی پوری فیملی ممبرز کی مختلف مواقع کھنچی تصاویر کے پاس رک کر یادوں کے در کھٹکھٹانے میں بڑا مزا آ رہا تھا۔

ہر دروازے کے پیچھے ایک داستان۔۔۔۔

کتنی مزے کی بات تھی۔ جو چاہا وہ پا لیا۔۔۔۔ کوئی قلق نہیں۔ کوئی تمنا ادھوری نہیں۔ طمانیت سی طمانیت۔

کچن سے مسالا بھننے کی خوشبو آ رہی تھی۔ ماسی پوری دل جمعی سے ہانڈی تیار کر رہی تھی۔ شیشے کی دیوار سے لان کی ہریالی دکھائی دیتی تھی۔ مالی قینچی پکڑے مشغول تھا۔ ٹی وی کی آواز بند تھی مگر مہمانوں کے لتے لیتی تھیں کی فصاحت و بلاغت سمجھ میں آ رہی تھی۔

زندگی بھر صبح جلدی جانے کے خیال سے گاڑی کو دوڑایا تھا۔ آج کسی بھی چنتا کے بغیر خراماں خراماں جانے میں بڑا مزا آ رہا تھا۔ کتنا سکون تھا آج انہیں کوئی جلدی نہیں تھی۔

مگر۔۔۔۔

ڈیوہیکل ٹرک کو نجانے کہاں پہنچنے کی عجلت تھی۔

اس کی پہلی ٹھوکر سے کار روڈ پر یوں اچھلتی گئی۔ جیسے پیر کی ٹھوکر سے سگریٹ کی خالی ڈبی کہیں بہت دور جا گرتی ہے اور اس پر کسی کا پیر پڑ جاتا ہے۔ ٹھس۔

چڑمڑ۔

ثریا کو تو بچپن ہی سے آج کا کام کل پر ٹال دینے کی عادت تھی۔ عادت پختہ اور ضرر رساں اس لیے نہیں لگی کہ۔۔۔۔ کبھی کوئی نقصان اٹھایا ہی نہیں۔ بھلے سے بہت دیر سے، بھلے سے عین وقت پر بھاگم بھاگ۔۔۔۔ لیکن وہ مکمل کام کے ساتھ سب کے برابر جا کر کھڑی ہو ہی جایا کرتی تھی اور اسی خود اعتمادی اور بے نیازی نے آج کا دن دکھایا۔

اسے یقین تھا وہ روکے ہوئے، ٹالے ہوئے کام لشتم پشتم کر لیا کرتی ہے۔ کسی نے سوال نہ اٹھایا کہ کیسے کیا۔ بس وہ پیش کر دیتی تھی۔ مکمل بے عیب۔

اور ثریا کو چھوڑ دیں، وہ تو عادی تھی یا اس کی فطرت تھی۔ ہم میں سے بہت سے لوگ جوانی کو محض دنیا حاصل کرنے کی جدوجہد میں گزار دیتے ہیں کہ جوانی کی جدوجہد محفوظ مستقبل کی ضمانت ہوتی ہے۔ ایک خود مختار بڑھاپا۔ جب آپ دنیا کے سامنے اپنے بچوں کے سامنے سرخرو ہوتے ہیں۔

ہم میں سے کئی لوگ۔۔۔۔ میں بھی اور آپ بھی۔۔۔۔ خواہشوں، خوابوں کے چابک کے وار سہتے اندھا دھند بھاگ رہے ہیں کہ یہی وقت ہے، جو کرنا ہے کر لو۔ بعد میں تو فقط پچھتاوا ہو گا۔

ہم نے بھی عبادتیں، ذکر، نمازیں اور روزے بڑھاپے کے لیے ٹال رکھے ہیں جب کرنے کو کچھ نہیں ہو گا۔

ہم میں سے ہر ایک کے الگ الگ پلان ہیں۔ جن پر ہم نے فراغت کے دنوں میں عمل کرنا ہو گا۔ باغبانی کا شوق ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد۔۔۔۔

کتب بینی کا شوق۔ وہی ریٹائرمنٹ کے بعد، کتابیں لے لے کر سالوں سے ڈھیر لگا رکھا ہے۔ کسی کو پہاڑوں کی سیر کو جانا ہے۔ (کیا تب قویٰ مضبوط رہیں گے؟)

"کچی بستی والے فلاحی اسکول میں اگر ایک گھنٹے کا پیریڈ آپ بھی لے لیں۔" اس درخواست کو قبول تو کر لیا مگر مسکراتے ہوئے بتا دیا۔

"ایک پیریڈ کیوں ہم بھرپور ساتھ دیں گے بس ذرا فراغت میسر آجائے تو۔۔۔۔"

کچھ خبر ہے، اسکول تو وہیں کا وہیں رہے گا کہ دنیا چلتی رہتی ہے استاد بھی مل جائیں گے۔ یہ سوچیے کہ کیا آپ اس وقت رہیں گے؟

اور کچھ لوگ رشتے داروں اور دوستوں سے ملنے کو بھی فراغت ملنے پر چھوڑ دیتے ہیں۔ بہت بچپن میں قرآن پاک پڑھنا سیکھا تھا پھر مسلسل دہرانے کی ضرورت ہی نہ مل سکی۔ کسی محلے دار کے سوئم میں جب ہاتھ میں سیپارہ تھما دیا گیا۔ تب بہت جھجکتے ہوئے کن انکھیوں سے دائیں بائیں سب کو دیکھنے کے بعد جب ورق کھولا تب پتا لگا ہر تیسرے لفظ پر اٹکنا پڑ رہا ہے اور روانی تو دور کی بات انگلی چل ہی نہیں رہی۔

تب خود سے جی بھر کے شرمندہ ہوتے ہوئے تصحیح کرنے کا عہد کر لیتے ہیں مگر کب۔۔۔۔ فراغت کے بعد نا۔۔۔۔ اب وقت ہی کتنا رہ گیا ہے۔ کر لیں گے۔ ہو جائے گا۔ اس نوجوانی مستانی سے۔ جدوجہد کا وقت کا ہے۔ سرتوڑ کوشش۔۔۔۔ منٹ منٹ قیمتی ہے۔

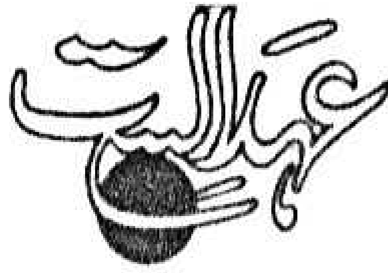
ثریا کے پاس صحت بھی تھی۔ مالی استحکام بھی۔۔۔۔ دیر سے ہی سہی مگر وہ اپنے کام پورے کر لیا کرتی تھی۔ اس نے بڑا شاندار ٹائم ٹیبل سیٹ کیا تھا۔ لیکن! اس کا طے کردہ وقت اللہ کے مقرر کردہ وقت سے ٹکرا گیا اور جب اللہ گھنٹی بجا دیں تب سب کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔ وقت رک جاتا ہے۔

کتنے ہی باب ادھورے رہ جاتے ہیں مگر اوراق ختم ہو جاتے ہیں۔ کہانی تھم جاتی ہے۔

ہمارا قصہ بھی تمام ہوا۔ داستان ادھوری رہ گئی۔ سوال صرف یہ رہ گیا۔ کہیں آپ بھی ثریا تو نہیں۔۔۔۔ یا

یا۔۔۔۔ شاید میں۔۔۔۔؟

تنزیلہ ریاض



نور محمد برطانیہ میں رہائش پذیر ہے اور لوٹن کی جامع مسجد میں موذن ہے۔ پیسے والا اور خوب دل والا ہے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا ہے۔ جس کا ایک کمرہ ایک عربی طالب علم اپنے دوست کے ساتھ شیئر کرتا ہے جبکہ دوسرے کمرے میں اس کے ساتھ ایرانی زین العابدین رہتا ہے۔ اسے اپنے ایرانی ہونے پر فخر ہے۔ وہ برطانیہ میں اسٹڈی ویزے پر جاب کرتا ہے۔ سخت محنتی ہے مگر پاکستان میں موجود بارہ افراد کے کنبے کی کفالت خوش اسلوبی سے نہیں کر پا رہا۔ مسجد میں پاکستان سے آئے کسی مہمان کی آمد کی اطلاع پر نور محمد بہت گھبراتا ہے۔

عمر شہروز کا کزن ہے، جو اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ وہ لوگ تین چار سال میں پاکستان آتے رہتے ہیں۔ عمر اکثر اکیلا بھی پاکستان آجاتا ہے۔ وہ کافی منہ پھٹ ہے۔ اسے شہروز کی دوست امائمہ اچھی لگتی ہے۔ شہروز کی کوششوں سے ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر زارا شہروز کی سادہ مزاج منگیتر ہے۔ ان کی منگنی بڑوں کے فیصلے کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان محبت ہے لیکن شہروز کے کھلنڈرے انداز کی بنا پر زارا کو اس کی محبت یقین نہیں ہے۔

اس کے والد نے اسے گھر پر پڑھایا ہے اور اب وہ اسے بڑی کلاس میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ سر شعیب انہیں منع کرتے ہیں کہ ا... کا بچہ بہت چھوٹا ہے۔ اسے چھوٹی کلاس میں ہی داخل کروائیں مگر وہ مصر رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بچے پر بہت محنت کی ہے۔ وہ بڑی کلاس میں داخلے کا مستحق ہے۔ سر شعیب اسے بچے پر ظلم سمجھتے ہیں مگر اس کے باپ کے اصرار پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ بچہ بڑی کلاس اور بڑے بچوں میں ایڈجسٹ نہیں ہو پاتا۔ اسکالرشپ حاصل کرنے والے اس بچے سے حیرت انگیز طور پر ٹیچرز اور فیلوز میں سے بیشتر ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے باپ کی طرف سے غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر سخت مخالفت ہے۔

وہ خواب میں ڈر جاتا ہے۔

پانچویں قسط

73ء کا زمانہ تھا اور روپ نگر کا علاقہ۔



میرے شعور کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ بیتا راؤ میری دوست مجھ سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتی ہے۔ تم ماس مچھی کھانے والے ہو۔ میں انڈیا میں اپنے گرینڈ پیرنٹس (دادا اور دادی) کے ساتھ آیا تھا۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ ہم برطانیہ کے رہنے والے تھے۔ گرینڈ پا یہاں کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں آئے تھے۔ گرینی نے یہاں کوچنگ سینٹر کھول لیا تھا۔ بیتا راؤ ہمارے ہاں پڑھنے آتی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ماس مچھی کھانے والے کسی کے دوست نہیں بن سکتے۔ وہ وفادار نہیں ہوسکتے۔ میں نے گرینڈ پا کو بتایا تو انہوں نے مجھے سمجھایا 'قدرت نے ہمیں بہت محبت سے تخلیق کیا ہے اور ہماری فطرت میں صرف محبت رکھی ہے۔ انسان کا اپنی ذات سے اخلاص ہی اس کی سب سے بڑی وفاداری ہے۔'

عمر کے منع کرنے پر زارا نے شہروز کو فون کرکے بلایا تھا۔ شہروز نے آکر عمر سے بات کی تو دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔

اس کی کلاس میں سلیمان حیدر سے دوستی ہو جاتی ہے۔ سلیمان حیدر بہت اچھا اور زندہ دل لڑکا ہے۔ سلیمان کے کہنے پر پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل میں بھی دلچسپی لینے لگتا۔ وہ اپنے گھر جا کر ای سے بیٹ کی فرمائش کرتا ہے تو اس کے والد یہ سن لیتے ہیں' وہ اس کی بری طرح پٹائی کر دیتے ہیں۔ ماں بے بسی سے دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ پھر اس کے والد اسکول جا کر منع کر دیتے ہیں کہ سلیمان حیدر کے ساتھ نہ بٹھایا جائے۔ سلیمان حیدر اس سے ناراض ہو جاتا ہے اور اسے ابنارمل کہتا ہے۔ جس سے اس کو بہت دکھ ہوتا ہے۔

امائمہ کی والدہ شہروز کو فون کرتی ہیں۔

کلاس میں سلیمان حیدر پہلی پوزیشن لیتا ہے۔ پانچ نمبروں کے فرق سے اس کی سیکنڈ پوزیشن آتی ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے والد غصے سے پاگل ہو جاتے ہیں اور کمرہ بند کرکے اسے بری طرح مارتے ہیں۔ وہ وعدہ کرتا ہے کہ آئندہ رنگوں کو' پینٹنگ کو ہاتھ نہیں لگائے گا' صرف پڑھائی کرے گا۔

اس کے والد شہر کے سب سے خراب کالج میں اس کا ایڈمیشن کراتے ہیں۔ تاکہ کالج میں اس کی غیر حاضری پر کوئی کچھ نہ کہہ سکے اور اس سے کہتے ہیں کہ وہ گھر بیٹھ کر پڑھائی کرے۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ نہ ہو۔ اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔

شہروز کے سمجھانے پر عمر کو عقل آجاتی ہے اور وہ اپنے والد کو فون کرتا ہے۔ جس کے بعد عمر کے والد امائمہ کے والد کو فون کرکے کہتے ہیں کہ بچوں کا نکاح کر دیا جائے۔ دونوں کے والدین کی رضامندی سے عمر اور امائمہ کا نکاح ہو جاتا ہے۔ نکاح کے چند دن بعد عمر لندن چلا جاتا ہے۔

نکاح کے بعد عمر اور امائمہ دونوں رابطے میں رہتے ہیں۔ نکاح کے تین سال بعد امائمہ عمر کے اصرار پر تن تنہا لندن پہنچ جاتی ہے۔ لندن پہنچنے پر عمر اور اس کے والدین امائمہ کا خوشی خوشی استقبال کرتے ہیں۔

امائمہ عمر کے ساتھ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں آجاتی ہے جبکہ عمر کے والدین اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ امائمہ عمر کے ساتھ اتنے چھوٹے فلیٹ میں رہنے سے گھبراتی ہے اور عمر سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے عمر کے والدین کے گھر رہنے کو کہتی ہے جسے عمر یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ وہ اپنے والدین پر مزید بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔

اس شخص کے شدید اصرار پر نور محمد اس سے ملنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے دوستی کی فرمائش کرتا ہے۔ نور محمد انکار کر دیتا ہے لیکن وہ نور محمد کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ وہ نور محمد کی قرات کی تعریف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے نماز پڑھنا نور محمد سے سیکھا ہے۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ اسے نور محمد کے پاس کسی نے بھیجا ہے۔ نور محمد کے پوچھنے پر کہتا ہے۔ خضر الٰہی نے بھیجا ہے۔

سدپ گھر سے واپس برطانیہ آنے پر گرینڈ پا کا انتقال ہو جاتا ہے اور گرینی مسز ارک میں دلچسپی لینے لگتی ہیں' وہ مجھ سے کہتی ہیں کہ میں اپنی ممی سے رابطہ کروں۔ وہ مجھے ممی کے ساتھ بھجوانا چاہتی ہیں۔ میرے انکار کے باوجود وہ ممی کو بلوا لیتی ہیں اور مجھے ان کے ساتھ روانہ کر دیتی ہیں۔

میری کالج میں طلحہ اور راشد سے واقفیت ہو جاتی ہے۔

"چھپ چھپ چھپ" پانی کی بوچھاڑ اڑی تھی۔ اس کی ناک ہی نہیں آنکھوں اور کانوں میں بھی پانی اپنا وجود منواتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس کے حواس معطل ہو رہے تھے۔ اسے لگا وہ ڈوب رہا ہے۔ منہ اور ناک میں گدلے پانی کا ذائقہ اور خوشبو ایک ساتھ گھسے تھے۔ اس کے اردگرد آوازیں تھیں مگر پھر بھی اسے صرف اپنے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی۔

"پانی سے ڈرتے ہو" کسی نے بتایا تھا یا شاید پوچھا تھا پھر اس کا ہاتھ تھام لیا گیا۔

"پانی تو زندگی ہے 'زندگی سے ڈرتے ہو"

اسے سیدھا کھڑے ہونے میں مدد دی گئی۔ وہ سیدھا کھڑا ہو گیا تھا اور اسے احساس ہوا تھا کہ پانی بمشکل اس کے کندھوں تک آ رہا تھا لیکن اس کے قدموں تلے نرم نرم چکنی مٹی تھی جو پھسلتی جاتی تھی۔ نرم مٹی سے اس مٹی کے باوے کا وجود برداشت نہیں ہو تا تھا۔ اس نے سر مجید کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اس کی آنکھیں اب ٹھیک سے دیکھ سکتی تھیں۔ پانی کے اوپر کی دنیا کتنی طاقت ور تھی۔ وہ احساس دلاتی تھی کہ زندگی ابھی قائم و دائم ہے چلتی پھرتی ہے۔ وہ زندہ تھا۔ اسے زندگی کے اس احساس سے توانائی ملی تھی۔ زندگی صرف توانائی کا احساس نہیں دلاتی اس کے ساتھ مزید کئی اور چیزیں خود بخود آجاتی ہیں۔ اسے شرمندگی ہوئی۔ اسے اس درجہ خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ بڑی سبکی والی بات تھی۔

"میں ڈوب رہا تھا سر۔" اس نے جھینپ مٹانے کی کوشش کرتے ہوئے سر مجید کی شکل دیکھی۔

"تم نہیں ڈوب رہے تھے ... صرف تمہارا دل ڈوب رہا تھا احمق۔" انہوں نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑوانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا مگر اس نے انہیں کامیاب نہیں ہونے دیا تھا۔

"اپنے دل کو کبھی خوف کے حوالے نہیں کرنا چاہیے ورنہ یہ آپ کا خدا بن جاتا ہے۔ میرا ماننا ہے "خوف" بھی شرک کی ایک قسم ہے۔"

وہ اسے جھڑک رہے تھے۔ وہ مزید شرمندہ ہوا مگر اس نے ان کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ یہ پانی میں اترنے کا اس کا پہلا تجربہ تھا۔ اسے تیرنا نہیں آتا تھا۔ اکیڈمی کی بجلی فیل ہو گئی تھی۔ گرمی بھی ختم نہیں ہوئی تھی لیکن نئی ٹرم کی ابتدا تھی۔ سب لڑکے پڑھائی کے معاملے میں لاپروا سے ہو رہے تھے۔ سو سب نے پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔

سر مجید اور سر امتیاز سب کو گھیر گھار کر پکنک منانے لے آئے تھے۔ موسم میں بے پناہ حبس تھا۔ ہوا کسی مجسمے کے سانس کی طرح ساکن تھی۔ نہر کا پانی اسی لیے ماں کی ممتا کی طرح مہربان محسوس ہوتا تھا۔ اسے یہاں آنا بہت اچھا لگا۔ سب ہی ہاؤ ہو مچانے میں مگن ہو گئے تھے کیسا عجیب گنگناتا ہوا سکون تھا' وہاں کہ دل چاہتا تھا وہیں کے ہو کر رہ جاؤ' اسی لیے سب ہی لڑکے بے قابو ہو کر اس کی آغوش میں پناہ لینے دوڑ پڑے تھے۔

وہ شاید اکیلا ہی تھا جو چھوٹے معصوم بچوں کی طرح ایک جانب کھڑا رہا تھا۔ دل میں خواہش تو تھی کہ پانی کے ایسے لمس کو محسوس کرے مگر خوف بھی تھا کہ کپڑے گیلے نہیں ہونے چاہئیں ورنہ ابو ناراض ہوں گے کہ وہ کیوں سب کے ساتھ نہر پر چلا گیا۔ وہ اسی سوچ میں ڈوبا منہمک کھڑا تھا جب سر امتیاز کے اشارے پر سر مجید نے اس کا ہاتھ تھام کر یک دم ہی پانی میں چھلانگ لگا دی تھی۔

وہ اس کا ہاتھ تھامے اس کا خوف دور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پانی میں چکنی مٹی ہی نہیں تھی بلکہ پتھر بھی تھے جو پاؤں میں چبھتے تھے تو گدگدی ہوتی تھی۔

"بزدل مت بنو' بزدل مرد برا ہی نہیں لگتا بے شرم بھی لگتا ہے۔ بزدلی مرد کو مقابلہ کرنے سے پہلے ہی پچھاڑ دیتی ہے اور اس سے زیادہ شرمناک بات کیا ہو سکتی ہے کہ مرد ایسی چیز سے مار کھا جائے جو اللہ نے اس کی فطرت میں رکھی ہی نہیں ہے۔ اللہ نے کچھ چیزیں مرد کے لیے نہیں بنائی ہیں۔ بزدلی ان ہی چیزوں میں

سے ایک ہے۔ اسے بہادر مرد اچھے لگتے ہیں۔ وہ پسند کرتا ہے کہ مرد اس کے علاوہ صرف اپنے آپ سے خوف زدہ ہو' صرف اپنے آپ سے شرم کھائے۔۔۔ جانتے ہو کیوں۔۔۔ اس لیے کہ جو مرد دوسرے انسانوں سے شرمانے سے پہلے خود سے شرمالے تو پھر وہ نڈر ہو جاتا ہے پھر اسے اللہ کے علاوہ کسی کا خوف نہیں ستاتا۔"

وہ اس کا ہاتھ تھام کر دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے۔

"بے خوفی مرد کے لیے سب سے بڑا ہتھیار ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی لگام ہے جو سرکش گھوڑے جیسے پانی کو بھی انسان کا مطیع بنا دیتی ہے۔ پانی انسان کو بڑے سبق پڑھاتا ہے۔"

وہ اسے آج ایک نیا سبق پڑھا رہے تھے اور ساتھ ساتھ آگے چلنے میں بھی مدد دے رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے وہ زیادہ گہرائی والے حصے میں جائے۔ اسے پہلی بار اس کھیل میں مزا آیا تھا۔

"تم ڈوبو گے نہیں میرے دوست! ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے اور تمہیں تو پورا جھاڑ مل گیا ہے" یہ جنید نے کہا تھا۔ اس کا اشارہ سر مجید کی طرف تھا۔ وہ کہنے کے ساتھ ہی ناک کو دائیں ہاتھ کی انگلی سے دباتا ہوا پانی میں گھس گیا تھا۔ سر مجید سے سب ہی لڑکے کافی بے تکلف تھے۔ سر نے جنید کی جانب دیکھا بھی نہیں تھا۔

"پانی میں پہلی بار اترو اور یہ سوچ کر اترو کہ اس کو تسخیر کرنا ہے تو پھر اس کو نظر انداز مت کرو۔ یہ وہ پہلا اصول ہے جو پانی کو زیر کرنے میں آپ کے کام آتا ہے۔ آپ کی ساری توجہ پانی پر ہونی چاہیے۔ پانی کو اہمیت دو۔ اس کی عزت میں کمی نہ کرو کیونکہ یہ آپ کا ہی جزو ہے۔ مٹی میں اللہ پاک نے پانی ملایا تو انسان وجود میں آیا۔"

وہ بہت آہستگی سے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا رہے تھے۔ اس کا دل لمحہ بھر کے لیے پھر غیر معمولی رفتار سے دھڑکا۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے کچھ قرآنی آیات کا ورد کیا تھا۔ وہ اللہ کو یاد کر رہا تھا۔ نہر کے پانی میں طغیانی نہیں تھی اور اتنی گہرائی بھی نہیں تھی مگر اس کا دل سر کی اتنی باتیں سن کر بھی بہادری کے درجے پر فائز نہیں ہوا تھا۔

"سر! آج بس آپ اس بھیڑ کو ہی لیکچر دیتے رہیں گے یا ہمیں بھی کوئی توجہ دیں گے۔" جنید ایک بار پھر سطح آب پر ظاہر ہوا تھا۔

سر مجید نے ابھی بھی اس کی جانب دیکھا تھا نہ اس کی بات کا جواب دیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ پانی گہرا ہونے لگا تھا۔ کندھوں سے منتقل ہوتی نمی گردن تک پہنچی تھی پھر وہ اسے اپنے کانوں تک محسوس کرنے لگا تھا۔

"اپنے آپ کو پانی کے حوالے کر دو۔۔۔ یہ دیکھو ایسے۔" سر مجید نے یکدم پینترا بدلا تھا۔ وہ ذرا سا اوپر ہوئے تھے اور خود کو پانی کے سینے پر رکھ دیا تھا پھر انہوں نے بازو پھیلا کر انہیں چپوؤں کی طرح چلانا شروع کیا تھا۔ وہ بات کرتے کرتے تیرنا شروع ہو گئے تھے۔ اس نے انہیں اپنے گرد "دائرہ" بناتے دیکھا۔

"پانی پر قابض ہونے کے لیے اس کو اپنا آپ پیش کرنا پڑتا ہے' اپنا آپ اس کو سونپنا پڑتا ہے۔۔۔ ایسا کرنے والوں کو پانی اچھالتا نہیں بلکہ سنبھال لیتا ہے۔"

وہ اس کے عقب میں تھے۔ ان کی بات کو سننے کے لیے وہ بہت احتیاط سے ان کی جانب مڑا تھا۔ مٹی پھر اس کے قدموں کے نیچے سے سرکی تھی وہ پھر پانی کے شکنجے میں پھنسنے لگا تھا۔ اس کی دھڑکن ایک دم تیز ہوئی تھی۔ دل جیسے کسی نے زور سے دبا ڈالا تھا۔ وہ ڈوب رہا تھا۔ پہلی دفعہ کا تجربہ دوسری دفعہ سے زیادہ خوفناک تھا۔

"میں نے کہا نا خود کو پانی کے حوالے کر دو۔۔۔ یہ پانی بہت بے ضرر ہے۔ اس کی نرمی کو محسوس کرو' اس کی رضا کا خیال رکھو۔" سر مجید فوراً" اس کے قریب آئے تھے لیکن انہوں نے اس کو سہارا نہیں دیا تھا۔

وہ اپنے ڈوبتے حواسوں پر بمشکل قابو پانے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس کی ہمت اتنی ہی تھی بس اسے

بھر سر کی باتیں بھولنے لگی تھیں۔

"اپنے اعصاب کو پرسکون ہونے دو۔۔۔ پانی میں ممتا والی خصوصیات ہوتی ہیں۔ یہ انسان کو اپنی بانہوں میں لے کر لوری سنا سکتا ہے لیکن ان کو جن میں پانی کی فطرت سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔" وہ مسلسل بول رہے تھے۔ انہوں نے پھر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اسے حوصلہ ملا لیکن لمحہ بھر کا کھیل تھا انہوں نے پھر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"سر! پلیز پلیز۔۔۔ میرا ہاتھ مت چھوڑیں" اس نے التجا کی تھی۔

"شٹ اپ۔۔۔ چیونٹی بھی پانی میں گر جائے تو ہاتھ پاؤں ہلانا سیکھ جاتی ہے۔۔۔ تم اس سے بھی گئے گزرے ہو گیا۔۔۔ ڈرپوک۔۔۔ مرو گے نہیں تم۔۔۔ اور اگر یہاں لکھی ہے تمہاری تو بچو گے نہیں تم۔۔۔ موت کا وقت اور جگہ مقرر ہوتی ہے۔ اسے ٹالا یا روکا نہیں جا سکتا۔ یہاں آنی ہوئی تو یہیں آکر رہے گی۔ میں اس سے درخواست نہیں کر سکوں گا کہ بی بی آج بچہ راضی نہیں ہے 'کل پرسوں آجانا'" وہ اسے جھڑک کر بولے تھے۔

اس نے شرمندہ ہوتے ہوئے اپنی ہمت مجتمع کی تھی۔ وہ سر کے ساتھ ساتھ گھومنے لگا تھا۔ اس کا دل لرز رہا تھا مگر وہ اس کی جانب سے لاپروا ہونے لگے۔ وہ چیونٹی سے تھوڑا سا زیادہ بہادر تو تھا۔ وہ سر کے سامنے مزید شرمندہ ہونا نہیں چاہتا تھا۔

"شاباش۔۔۔ بالکل ٹھیک۔۔۔ پانی کو شریکا مت سمجھو۔۔۔ اس کے ساتھ دو بدو مت ہو۔" ان کی ہدایات جاری تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے پانی کے سحر میں مبتلا ہو رہا تھا۔ اس نے سینہ تان کر چند قدم بھرے تھے۔ وہ بازوؤں کو پھیلانا سیکھ رہا تھا پھر اس نے یک دم اپنا آپ پانی کے حوالے کر دیا تھا اس کے پنجے گیلی مٹی سے اوپر اٹھ رہے تھے۔

"پانی کی فطرت میں بظاہر عاجزی ہے یہ آپ کے ساتھ دو بدو مقابلہ نہیں کرتا لیکن آپ کو ایک بار اس کے سامنے اپنی "میں" مارنی پڑتی ہے خود کو اس کے سپرد کرنا پڑتا ہے 'اپنے آپ کو اس کے حوالے کرنا پڑتا ہے' اس کے سینے پر عاجزی سے قدم دھرنا پڑتا ہے کہ یہ لے لو اگر انسان سے بڑا سورما سمجھتا ہے خود کو تو مجھے کر لے تسخیر' مجھے اپنے بس میں کر سکتا ہے تو کر لے۔۔۔ پانی کو بس اس بات سے غرض ہوتی ہے کہ انسان میری عزت کرنا جانتا ہے یا نہیں۔ اسے میری حرمت کا پاس ہے یا نہیں کہ اللہ نے مٹی میں مجھے ملایا تو اسے بنایا۔ وہ انسان کی اس ادا سے مسرور ہو جاتا ہے۔ انسان کی خود سپردگی اسے پاگل کر دیتی ہے پھر وہ مطمئن ہو جاتا ہے اور خود کو انسان کے حوالے کر دیتا ہے۔"

سر مجید کی باتوں نے اس کو اپنے سحر میں جکڑ لیا وہ واقعی پانی کے مہربان لمس کو پورے ارتکاز کے ساتھ محسوس کرنے لگا۔ اسے پہلی بار ڈر نہیں لگا اس نے بہت آہستگی سے اپنے پاؤں گدلی مٹی سے بالکل علیحدہ کیے' پھر اپنے بازو وا کر کے وہ پانی سے ہم آغوش ہونے لگا یہ مشکل نہیں' بہت مسحور کن تھا۔ اس نے پانی کو اپنی سب سے قیمتی چیز دے دی تھی۔ اس نے پانی کو اپنا آپ دے دیا تھا۔

پانی نے اسے کیا دیا تھا۔

پانی نے اسے عاجزی کا وہ سبق پڑھانا شروع کیا کہ جس کو سیکھنے کے لیے انسان کو اس دنیا میں بھیجا گیا۔ ایک ایسی چیز جو خدا کے پاس نہیں اور وہ انسان سے اس کی تمنا کرتا ہے۔۔۔ عاجزی۔

پانی آپ کو عاجزی نہیں سکھاتا۔۔۔ وہ سکھاتا ہے کہ عاجز ہو جانے میں دراصل کیسی کشش ہے کیا مزا ہے۔ پانی آپ کو سکھاتا ہے کہ سربسجودگی میں کس قدر آسودگی ہے۔



وہ اوائل اکتوبر کی ایک خوب صورت شام تھی۔ شام بھی کیا تھی' سبک سبک چلتی' دھیرے دھیرے ڈھلتی رات بن رہی تھی۔ آٹھ بج رہے تھے لیکن ابھی بھی مکمل تاریکی نہیں چھائی تھی۔ یہ اہل لندن کے لیے قدرت کا ایک خاص تحفہ ہے۔ یہاں سورج کم کم

درشن دیتا ہے۔ سردیوں میں بالخصوص آسمان بادلوں کی اتنی مضبوط چادر اوڑھ لیتا ہے کہ سورج جیسا سورما بھی اس میں شگاف نہیں ڈال سکتا اور اس کا بدلہ سورج یوں لیتا ہے کہ جب ظاہر ہو جاتا ہے تو آسانی سے اپنے اثرات غائب نہیں ہونے دیتا۔ جس طرح ایک نیک آدمی کے مرنے کے بعد بھی اس سے فیض حاصل کیا جاسکتا ہے بالکل اسی طرح لندن میں رات ہو جانے کے بعد بھی سورج کی روشنی باقی رہتی ہے۔ تاریکی کو اپنا راج پاٹ قائم کرنے میں کافی وقت لگ جاتا ہے۔

وہ بھی اکتوبر کی ایک شام تھی سو خوب صورت تھی۔ معمول کے مطابق آسمان پر پیلے، نیلے اور سرمئی رنگوں کا امتزاج بکھرا تھا۔ سردی بھی اوقات میں تھی اور گرمی بھی، موسم بے حد معتدل تھا جو طبیعت کو بھلا لگ رہا تھا۔

امائمہ کو چھ ماہ گزارنے کے بعد یہ احساس ہو گیا تھا کہ لندن کی فطرت میں آوارگی ہے۔ شہریت، مذہب، قومیت کی تخصیص کے بعد سب لوگ تفریح پر جانا پسند کرتے تھے اسی حساب سے یہاں آؤٹنگ اٹریکشنز تھیں جیسے میوزیم، پارکس، بلے لینڈز، آرٹ گیلریز، تھیٹرز غرض دیکھنے کے لیے اتنا کچھ تھا کہ وہ حیران ہو جاتی اور دلچسپ بات یہ تھی کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود لوگ ان چیزوں سے اکتا جاتے تھے اور پھر ایک اور چیز جو ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالیتی تھی۔ سپر مارکیٹس، سپر اسٹورز، شاپنگ مالز، بیوٹی کلینکس اور فیشن ہاؤسز کی یہاں بھرمار تھی۔

سیاحوں کے لیے یہ جگہ کسی ونڈر لینڈ سے کم نہیں مگر سیاحوں کی یہ جنت بے حد مہنگی تھی۔ سو وہ لوگ جن کا تعلق ترقی پذیر قوموں سے تھا وہ یہاں رہتے تھے تو بچت کے کئی درمیانی راستے بھی انہوں نے ڈھونڈ نکالے تھے۔ وہ لوگ شاپنگ مالز میں جاتے، گھومتے اور بغیر شاپنگ کے واپس آجاتے تھے کیونکہ ایسی جگہوں پر شاپنگ کرنا صرف ارب پتی عرب شیوخ کا حق تھا۔ امائمہ کو اب سمجھ میں آیا تھا کہ عربوں کو دراصل "عربوں" لکھنا اور پڑھنا چاہیے۔ اس نے دیکھا کم لیکن سنا بہت تھا کہ عرب شیخ ایک پرفیوم کی ننھی سی شیشی خریدنے پر سینکڑوں پاؤنڈ بہت آرام سے خرچ کر دیتے ہیں۔ اربوں کی پراپرٹی عربوں کے لیے بہت عام سی بات تھی۔ کئی عرب شیوخ کی یہاں ذاتی پراپرٹی تھی۔ مہنگے مہنگے اسٹورز پر عربوں کا رش اور عربوں ہی کا روپیہ نظر آتا تھا۔

ماس کمیونیکیشن میں اس نے پرنٹ میڈیا میں اسپیشلائزیشن کیا تھا۔ اسے ان چیزوں میں بہت دلچسپی محسوس ہوتی تھی۔ عمر کو اس طرح کی چیزوں میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ امائمہ کی خاطر ایسی کتابیں اور میگزینز ڈھونڈ کرلا تا رہتا تھا جن میں یہاں کے معاشرتی مسائل اور سماجی زندگی کے متعلق تفصیلات ہوتی تھیں۔ اس نے امائمہ کو پبلک لائبریری کا روٹ بھی سمجھا دیا تھا لیکن وہ اکیلی کہیں آتے جاتے کتراتی تھی ابھی، جبکہ عمر اسے آتے جاتے روٹس کے متعلق سمجھاتا رہتا جس میں وہ قطعی دلچسپی نہیں لیتی۔ عمر چاہتا تھا کہ وہ اتنی خود مختار ہو کہ کہیں بھی جانا چاہے تو آجا سکے لیکن چھ ماہ گزر جانے کے بعد بھی امائمہ ابھی تک اتنی سوشل نہیں ہو پائی تھی کہ اطمینان سے ممی کے گھر کے علاوہ کہیں جانے میں دلچسپی لیتی۔ وہ ہمیشہ عمر کے ساتھ جانے میں خوش رہتی حالانکہ ان کی دلچسپیاں اور شوق مختلف تھے عمر فلم تھیٹر کا دلدادہ تھا۔ اس کی دلچسپی آرٹ میں تھی۔ اسے جب وقت ملتا وہ پنسل لے کر بیٹھ جاتا اسے اسکیچنگ میں مزا آتا تھا۔ اس نے امائمہ کو بطور خاص چند اچھی آرٹ گیلریز بھی دکھائیں لیکن وہ اخبار یا کتاب پڑھنے میں دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ اخبار میں اسے صرف کھیل کے صفحے میں دلچسپی ہوتی یا وہ ان اشتہارات کو شوق سے پڑھتا جن میں نئے نئے ڈرامہ اور تھیٹر کی پبلسٹی ہوتی تھی۔

ان دونوں کی ذہنی ہم آہنگی ایسی تھی کہ ایک دوسرے کی خاطر وہ ایک دوسرے کی دلچسپیوں میں دلچسپی لے ہی لیا کرتے تھے لیکن ہرے بھرے خوب صورت وسیع و عریض پارکس میں چہل قدمی کرنا ان

دونوں کو ہی مرغوب تھا۔ گھنٹوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے وہ لمبے لمبے راستوں پر بغیر بھٹکے اور اکتائے چل لیتے تھے۔ دوسوا ایکڑ یا اس سے بھی زیادہ رقبے پر پھیلے لندن شہر کے پارکس دنیا جہاں کی دلچسپیاں لئے ہوئے تھے۔ ان دلچسپیوں میں عمر اور امائمہ کو سب سے زیادہ پسند ان پارکس میں بنے انتہائی خوب صورت اور حیران کن راستوں یعنی واک اویز پر ٹہلنا تھا۔

رچمنڈ پارک میں وہ پہلے بھی آچکے تھے اور اب بھی امائمہ کی فرمائش پر عمر اسے یہاں لایا تھا۔ رچمنڈ کے علاقے کی خوب صورتی یہ بھی ہے کہ اس کے دو طرف دریائے ٹیمز لگتا ہے۔ دریائے ٹیمز سے چھوٹے چھوٹے تالاب ٹائپ نہریں ان گزرگاہوں سے گزرتیں جن پر پل بنے تھے۔ یہ چھوٹے چھوٹے پل بے حد قابل ستائش تھے۔ امائمہ اور عمر بھی اس وقت جب سورج کی روشنی مورچوں سے بھاگ رہی تھی ایک پل پر سے دھیرے دھیرے گزر رہے تھے۔ وہ دونوں نسبتاً کم رش تلاش کرتے اس طرف آئے تھے اور پھر ایک جگہ رک کر نیچے جھانکنے لگے۔

"میں نے تمہارے ساتھ ہمیشہ ایسی زندگی گزارنے کا خواب دیکھا تھا۔"

عمر نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ موسم اور ماحول دونوں ہی طبیعت کو بشاش کرنے میں سازگار ثابت ہوتے ہیں اور اگر من چاہا ساتھی ساتھ ہو تو دل جھوم جھوم کر پورے وجود پہ خوشگوار اثرات مرتب کر دیتا ہے۔ پانی گدلا تھا مگر اس وقت وہ بھی بھلا لگ رہا تھا۔

"تم ہمیشہ سے میرے خواب دیکھ رہے ہو کیا؟" امائمہ نے مسکراتے ہوئے اسے چڑانا چاہا۔

"آف کورس مائی ڈیر۔۔۔ میرا اور تمہارا تعلق ہمارے پیدا ہونے سے بھی پہلے سے ہے۔ سنا ہے جوڑے آسمانوں پہ بنتے ہیں اور ہمارے پیدا ہونے سے بھی پہلے آسمانوں پر ہماری روحیں ایک دوسرے کے ساتھ ہوتی ہیں۔"

"میرا دل کہہ رہا ہے کہ مجھے تمہارے اس سن انیس سو ایک کے ڈائیلاگ پر یقین کر لینا چاہیے۔" اس کی جانب دیکھتے ہوئے امائمہ ابھی بھی شرارت کے موڈ میں تھی۔

"اوئے۔۔۔" وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے اس کی جانب مڑا پھر لہجے پہ زور دیتے ہوئے بولا۔

"یہ ڈائیلاگ نہیں ہے۔۔۔ میرے دل کی آواز ہے ظالم لڑکی۔"

"اچھا۔۔۔ تمہارے دل کی آواز میرے بارے میں اور کیا کہتی ہے۔" ہنسی چھپاتے ہوئے وہ پوچھ رہی تھی حالانکہ عمر اس کے بارے میں اپنے احساسات کبھی نہیں چھپاتا تھا۔ وہ کافی ایکسپریسو انسان تھا لیکن امائمہ کا دل چاہتا تھا کہ وہ بار بار اس کے منہ سے سنے۔ یہ صرف انسانی فطرت کا معاملہ نہیں ہے محبت کو بھی دہرائے جانا پسند ہے۔

"کیا سننا چاہتی ہو؟" وہ مزید اس کے قریب کھسکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"وہی جو تمہارے دل کی آواز ہے۔" امائمہ کے چہرے پر میٹھی سی مسکراہٹ بہہ رہی تھی۔

"اچھا؟" عمر نے سابقہ انداز میں کہا پھر رخ موڑ کر سیدھا ہوا۔ اب وہ اس انداز میں کھڑا تھا کہ امائمہ تو نیچے جھانک رہی تھی مگر عمر سیدھا کھڑا تھا۔

"تو سنو پھر میرے دل کی آواز" امائمہ نے اچانک بے حد قریب سے اس کی آواز سنی تھی۔

"دھک دھک۔۔۔ دھک دھک۔۔۔ دھک دھک۔" وہ اس کے کان میں پہلے سرگوشی کے سے انداز میں بولا تھا پھر آہستہ آہستہ اس کی آواز بلند ہوتی گئی اور آخر میں اس کی آواز کافی بلند ہو گئی تھی۔ امائمہ نے پہلے ناک سکیڑی پھر مصنوعی انداز میں اسے گھورا۔ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کے منہ سے ہنسی کا فوارہ پھوٹا تھا۔ عمر نے اس کا ساتھ دیا۔

"تم شاید کچھ اور سننا چاہ رہی تھیں؟" ہنسی روک کر اس نے پوچھا۔

"جی نہیں۔۔۔ یہی کافی ہے۔" امائمہ کی ہنسی رکی نہیں تھی۔

"نہیں سیریسلی۔۔۔ اگر ایسی بات ہے تو تم مجھے بتا

سکتی ہو۔" وہ چڑانے سے باز نہیں آیا تھا۔ امائمہ نے نفی میں گردن ہلائی۔ منہ سے کچھ نہیں بولی مگر چہرے پر اندرونی خوشی کی سنہری سنہری کرنیں تھیں۔ عمر بھی مسکراتے ہوئے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے اپنا سر اس کے سر سے ٹکرایا۔

"یہی خواب دیکھا کرتا تھا میں کہ تم ہمیشہ ایسے ہی میرے ساتھ ہنستی مسکراتی رہو۔۔۔ خوش رہو۔۔۔ میرے لیے یہ بہت معنی رکھتا ہے کہ تم خوش ہو۔۔۔ میرے ساتھ خوش ہو۔ تمہارے چہرے کی یہ مسکراہٹ مجھے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ پیاری ہے۔"

امائمہ نے خود کو ہوا میں اڑتا محسوس کیا۔ عمر کی یہی محبت تھی جو اسے ہلکا پھلکا کردیتی تھی اور پھر کہنے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں بچتا تھا۔ اب بھی وہ گنگ رہ گئی۔ لیکن اس کا دل' اس کا رواں رواں اس محبت پر رب کا شکر گزار ہو رہا تھا۔

"اب خاموش ہی رہنا ہے کیا؟" عمر نے اس کا ہاتھ تھام کر قدم آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔

"نہیں۔۔۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر اس لمحے میں تمہیں آئی لو یو کہوں تو تمہیں بہت گھسا پٹا لگے گا۔۔۔ ہے نا؟"

شرارتی سی مسکراہٹ امائمہ کے لبوں پر مستقل ڈیرہ ڈالے ہوئے تھی۔ وہ واپسی کے لیے چل رہے تھے لیکن رفتار دونوں کی آہستہ تھی۔

"جی نہیں۔۔۔ بالکل نہیں لگے گا۔" عمر نے ہونٹ بھینچ کر انکار کیا۔

"اس کا مطلب کہہ دوں؟" وہ ہنسی روک کر پوچھ رہی تھی۔

"آف کورس۔" عمر کے لہجے میں قطعیت اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"آر یو شیور؟" اس نے ایک مرتبہ پھر پوچھا۔

"اوہو۔۔۔ کہنا ہے تو کہہ دو۔۔۔ نہیں کہنا تو مت کہو۔۔۔ ایک آئی لو یو کہنے میں جتنی دیر تم لگا رہی ہو نا' اتنی دیر میں یہاں طلاق بھی ہو جایا کرتی ہے۔۔۔ توبہ کیسی ست لڑکی ہے۔" وہ ناک چڑھا کر بولا تھا۔

"میری سستی پر توبہ کرنے کے بجائے یہاں کے لوگوں کی تیزی پر افسوس کرو' ہمارے مشرق میں ایسا نہیں ہوتا۔" وہ بھی اسی کے انداز میں بولی تھی۔

"اس کا مطلب ہمارے مشرق کی لڑکیاں آئی لو یو کہنے میں اتنی ہی دیر لگاتی ہیں۔۔۔ اور وہ بھی اپنے شوہروں کو۔"

"ہاں نا۔۔۔ حیا بھی کوئی چیز ہے۔۔۔ یہ کوئی بات ہے کہ بلاوجہ ان سینس باتیں کرتے رہو۔"

"یہ کہو۔۔۔ امائمہ کی نظر میں ان سینس کیا ہے؟" وہ ہنستے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے کوئی بڑا کسی بچے کی احمقانہ بات پر ہنس رہا ہو۔

"یہی تو بات ہے جو تم مغرب والے کبھی نہیں سمجھو گے۔" وہ اترا کر بولی تھی اور عمر نے کندھے بھی اچکائے تھے۔

"ارے توبہ! معاف کرو بی بی! آپ ناسمجھ ہی رہنے دو۔" عمر نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ لیکن امائمہ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اسی دوران ان کے آگے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چہل قدمی کرتا جوڑا رک گیا تھا۔ ان دونوں کی آواز کچھ زیادہ ہی بلند ہو گئی تھی تب ہی وہ لوگ مڑ کر دیکھنے لگے۔ وہ دونوں مقامی تھے۔ لڑکی اسکرٹ میں ملبوس تھی جس کی لمبائی کافی کم تھی لیکن یہ معمول کی بات تھی۔ لڑکی کی آنکھوں میں شناسائی کی رمق تھی۔ امائمہ نے عمر کا چہرہ دیکھا۔ وہ بھی اس جوڑے کو مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ وہ لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔

"ہیلو مارتھا!" عمر نے خود ہی انہیں مخاطب کرنے میں پہل کی۔ وہ لڑکی آگے بڑھی تھی اور پرتپاک انداز میں اس سے ملنے لگی۔ عمر نے بھی اسے گلے لگایا اور اس کا ہاتھ تھام کر باتیں کرنے لگا۔۔۔ اس کے ساتھ کھڑا لڑکا بھی مسکراتے ہوئے ان دونوں کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں چند منٹ آپس میں ہی باتیں کرتے رہے جس سے امائمہ کو یہ سمجھ آیا کہ وہ دونوں کلاس فیلوز رہے تھے۔ ہنس ہنس کر ایک دوسرے سے باتیں کرنے کے بعد انہیں اپنے پیچھے کھڑی امائمہ کا خیال آیا تھا۔

"شی از مائی وائف مار تھا۔" عمر نے امائمہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا تھا۔ مار تھا عمر کا ہاتھ چھوڑ کر امائمہ کی طرف چلی آئی پھر وہ اسی انداز میں اس سے ملی جیسے عمر سے ملی تھی۔

"ہی از مائی ہزبینڈ۔" اپنے ساتھ کھڑے لڑکے کا تعارف کروانے کا بھی خیال بالآخر اسے آگیا تھا۔ یہاں تک ساری صورت حال ٹھیک تھی۔ اصل مسئلہ تب ہوا جب وہ لڑکا بھی آگے بڑھا اور بیوی کی طرح امائمہ کو گلے لگا کر اور گال چوم کر شادی کی مبارک باد دینے لگا۔

"تم بہت خوش قسمت ہو مسٹر عمر کہ تمہیں اتنی خوب صورت وائف ملی ہے۔ ایک لمحے کے لیے تو اس کو دیکھ کر میری دھڑکنیں رک گئی تھیں۔ ایشین لڑکیاں بہت دل موہ لینے والی ہوتی ہیں۔"

وہ دل کھول کر تعریف کر رہا تھا۔ امائمہ کا جیسے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ شخص اس سے اس طرح سے ملے گا۔

"میری قسمت پر تو مجھے کبھی شبہ نہیں رہا۔" عمر اس تعریف پر پھول کر کپا ہو گیا تھا۔ اس کی باچھیں چر سی گئی تھیں۔ امائمہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ یہاں سے بھاگ جائے۔

"مجھے گھر جانا ہے عمر!" امائمہ نے اکتا کر کہا۔ عمر نے ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر پھیلی بیزاری کو دیکھا پھر اس نے ان دونوں سے معذرت کر لی۔

واپسی کے سفر میں عمر کو محسوس ہو گیا تھا کہ اس کا موڈ کچھ آف ہے لیکن وہ اس کی وجہ نہیں جانتا تھا۔

"اچھا۔۔۔ وہ تم کیا کچھ آئی لو یو جیسا بولنے کی بات کر رہی تھیں۔" صرف اس کا موڈ خوشگوار کرنے کے لیے عمر نے دوبارہ بات وہیں سے شروع کرنا چاہی تھی۔

"دفع کرو بے کار کی باتوں کو۔" امائمہ نے بھنا کر کہا تھا اور اس سے دو قدم آگے چلنا شروع کر دیا تھا۔

"مجھے بالکل سمجھ نہیں آرہا کہ ایسا کیا ہوا ہے جس نے تمہارا موڈ اتنا آف کر دیا ہے۔" عمر نے بہت اکتا کر بالآخر پوچھ لیا۔ وہ جب سے پارک سے واپس آئے تھے۔ ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ عجیب کشیدگی کا ماحول تھا۔ امائمہ کے دل کا حال اس کے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔ وہ کافی خفا لگ رہی تھی جبکہ عمر کو قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ ایسا کیا ہوا ہے کہ جس نے امائمہ کا مزاج برہم کر دیا ہے۔ عمر نے چند ایک مرتبہ اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ہونٹ سیے چپ چاپ بیڈ پر لیٹی رہی۔ عمر کو اکتاہٹ ہونے لگی۔

"میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں امائمہ! اتنی ال مینرڈ لگتی تو نہیں ہو تم۔۔۔ میں توقع کرتا ہوں کہ میں تم سے کچھ پوچھوں تو تم کم سے کم جواب تو دو۔"

وہ اونچی آواز میں بولا تھا۔ امائمہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تلخی کے رنگ بے حد نمایاں تھے۔

"تمہارے جیسے شخص کو اگر ویل مینرڈ کہتے ہیں تو میں ال مینرڈ ہی ٹھیک ہوں۔ تم مجھے اپنے جیسا بنانے کی کوشش مت کرو۔"

اس کے منہ سے الفاظ نہیں شعلے نکلے تھے۔ عمر اس کی بات سن کر ساکت رہ گیا' چند لمحوں کے لیے تو اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ امائمہ اس قدر غصے میں کیوں ہے لیکن اس کے انداز دیکھ کر وہ بھی غصے میں آگیا تھا۔

"میں تمہیں اپنے جیسا بنانے کی کوشش نہیں کر رہا۔۔۔ میں اس بات کو پسند ہی نہیں کرتا تو میں ایسی اسٹوپڈ کوشش کروں گا ہی کیوں۔"

وہ بہت اونچی آواز میں نہیں بولا تھا لیکن اس کی آنکھیں اور اس کا انداز اس کے دل کی حالت کی چغلی کھا رہے تھے۔ امائمہ ایک بار پھر خاموش ہو کر مراقبے میں چلی گئی۔ عمر چند لمحے اس کی شکل دیکھتا رہا۔ اس کا غصہ بڑھ رہا تھا اور ساتھ ہی بالحال برداشت بھی۔

"امائمہ! تم مجھے بتاتیں کیوں نہیں ہو کہ آخر ہوا کیا ہے۔۔۔؟ گھنٹہ بھر پہلے تک تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھیں تم۔" وہ بہت ضبط سے کام لے کر تحمل سے پوچھنے لگا۔

"کیا ہوا ہے؟۔۔۔ کیا ہوا ہے عمر؟۔۔۔ یہ تم خود سے پوچھو نا۔۔۔ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟" امائمہ نے سلگتے ہوئے لہجے میں جواب دیا تھا۔

"ڈیم اٹ۔۔۔ تم کچھ بتاؤ گی تو پتا چلے گا نا۔۔۔ تم صاف صاف بات کیوں نہیں کرتیں؟" وہ غرایا تھا۔ امائمہ نے جھلستی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تمہیں پتا ہے عمر! تمہارا اصل پرابلم کیا ہے۔۔۔ یہی کہ تمہیں خود سے کبھی کسی چیز کا احساس نہیں ہوتا۔ تمہیں ہر بات بتانی پڑتی ہے' سمجھانی پڑتی ہے۔۔۔ حالانکہ۔۔۔ تمہیں پتا ہونا چاہیے۔۔۔ کوئی اور مرد ہوتا تو آگ بگولا ہو جاتا مگر تم۔۔۔" وہ رکی تھی۔

"۔۔۔ تم منہ اٹھا کر دیکھتے رہے۔۔۔ تمہارے سامنے کوئی تمہاری بیوی کو گلے لگا کر' چوم کر چلا گیا اور تمہاری پیشانی پر لکیر تک نہیں آئی۔۔۔ مجھے اپنے آپ سے گھن آ رہی ہے اور تم ہو کہ بس کھڑے مسکراتے رہے' نہ صرف مسکراتے رہے بلکہ چائے کافی کی دعوتیں دینے لگے۔ اور اب تم مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ مجھے غصہ کس بات کا ہے۔"

وہ چبا چبا کر بولی۔ اس دوران عمر نا سمجھی کے عالم میں اسے دیکھتا رہا۔ جب اس کی بات مکمل ہوئی تو وہ حیران لگ رہا تھا۔

"واٹ ربش۔۔۔ اتنی سی بات پر تم اتنا مس بی ہیو کر رہی ہو مجھ سے۔۔۔ حالانکہ اس ساری اسٹوپڈ چیز کا ذمہ دار بھی میں نہیں ہوں۔۔۔ وہ الو کا پٹھا تم سے جس طرح ملا' جس طرح گریٹ کیا وہ اس کا طریقہ تھا' اس کے مینرز تھے۔۔۔" امائمہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"وہ اس کے مینرز نہیں تھے۔۔۔ تمہارے تھے۔ تم نے پہلے اس کی بیوی کو اس طرح گریٹ کیا تھا۔ تمہیں احساس ہونا چاہیے تھا کہ اگر تم کسی کی بیوی کے ساتھ ایسا بی ہیو کرو گے تو آف کورس وہ بھی تمہاری بیوی کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرے گا۔"

"کیسی احمقانہ باتیں کر رہی ہو تم۔۔۔ وہ مجھے کیوں فالو کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ تمہارا لاہور نہیں ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی تقلید میں پاگل ہو جائیں۔ یہاں سب کے اپنے انداز ہیں۔ سب کو پتا ہے کہ اس نے دوسرے شخص سے کس طرح ملنا ہے۔ تمہیں کھا تو نہیں گیا وہ جو تم اتنی ہائپر ہو رہی ہو۔۔۔ وہ تمہیں ریسپکٹ کر رہا تھا۔۔۔ اتنی سی بات نہیں سمجھ میں آتی تمہاری۔" امائمہ کو اس کی بات سن کر بے حد افسوس ہوا۔

"اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ مجھے ریسپکٹ نہیں کر رہا تھا۔ ایک مسلمان عورت کو اس طرح گریٹ کرنے کا مطلب اس کی ڈس ریسپکٹ کرنا ہے۔ یہ اس کی انسلٹ ہے اور مجھے یہ سب سن کر بہت افسوس ہوا ہے عمر۔۔۔ تم' تم۔"

اس سے بولا ہی نہیں گیا تھا۔ عمر نے بغور اس کی جانب دیکھا۔ اسے احساس تو تھا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہی ہے لیکن اسے یہ اندازہ بھی تھا کہ امائمہ بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہی۔ اس سارے قصے میں قصور وار وہ تو نہیں تھا۔

"میری بات سنو امائمہ!۔۔۔ اب تو یہ ہو چکا۔۔۔ اب تو کچھ نہیں ہو سکتا نا۔" اس نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ امائمہ غرائی۔

"کیوں نہیں ہو سکتا کچھ۔۔۔ تم اسے ایک بار بتا سکتے ہو کہ اس نے کیا غلطی کی ہے اور تم خود کو تو یہ سکھا سکتے ہو کہ کسی غیر عورت سے ملنے کے کیا آداب ہوتے ہیں۔۔۔ اور اس اسٹوپڈ کو بھی کہ ایک مسلمان عورت کو کس طرح بات کرتے ہیں۔"

"واٹ ربش۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے مجھے اسے یہ سب بتانا چاہیے کہ اس کی وجہ سے میری بیوی رات کے اس پہر بلاوجہ مجھے ایک اسٹوپڈ ایشو کے لیے ٹیز کر رہی ہے۔ جھگڑ رہی ہے مجھ سے۔۔۔ اونہہ مسلمان عورت۔۔۔ جیسے پورے لندن میں تم اکیلی مسلمان عورت ہو۔" وہ حقارت بھرے لہجے میں بولا۔ امائمہ کا مزید پارہ چڑھ گیا۔

"کیا کہا تم نے۔۔۔ دوبارہ سے کہنا۔۔۔ یعنی۔۔۔ مائی گاڈ تم' تم۔" وہ مٹھیاں بھینچ کر بیڈ سے اتری اور تن فن کرتی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"تم۔۔۔ تم عمر احسان۔۔۔ تم مسلمان ہی نہیں ہو

...... سچ تو یہ ہے کہ تم مسلمان ہی نہیں ہو۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

"ہاں میں مسلمان ہی نہیں ہوں..... ایک تم مسلمان ہو..... خالص' پکی اور کھری..... ایسا کرو' تم ماتھے پر ایک ٹیگ لگوا لو جس پر بڑا بڑا کر کے لکھا ہو کہ تم ایک مسلمان عورت ہو اور باقی سب لوگ تم سے دس قدم کا فاصلہ رکھ کر چلیں یا جہاں تم نظر آجاؤ' وہاں سے راستہ بدل لیں۔ اس کے علاوہ تو کوئی اور طریقہ نہیں ہے لوگوں پر یہ جتانے کا کہ محترمہ امائمہ ہی بس مسلمان ہیں اور باقی لوگ مردود فرعون کی اولاد ہیں۔"

وہ دونوں بہت غصے میں آچکے تھے۔ کوئی ایک فریق بھی چپ ہونے کو تیار نہیں تھا۔

"مجھے کسی ٹیگ کی ضرورت نہیں ہے..... سمجھے تم..... میں ایسی چیزوں کے بغیر بھی بہت اچھی ہوں..... میری فکر کرنے کے بجائے تم اپنی فکر کرو۔" وہ غرا کر بولی تھی۔

"اتنی ہی اچھی ہو تو تم ہی کچھ کر لیتیں..... اس وقت کھڑی تو تم بھی منہ دیکھتی رہیں..... اگر اتنا برا لگا تھا تو تم نے کیوں اس ایڈیٹ کو اسی وقت نہیں ٹوک دیا..... اتنا برا لگا تھا تو اس کا منہ توڑ دیتیں کم از کم مجھے تو اس وقت اپنا دماغ نہ خرچ کرنا پڑ رہا ہوتا۔"

عمر کا انداز بھی اس کے جیسا ہی تھا۔ ان کے منہ سے لفظ نہیں گویا پٹرول ابل رہا تھا جو لگی ہوئی آگ کو مزید بھڑکا دیتا تھا۔

"واہ..... بہت خوب..... مطلب اس کو میں روکتی تو تم جو میرے محرم بن کر اس وقت میرے ساتھ تھے؟ تم کس لیے میرے ساتھ تھے؟ اور' اور..... وہ تمہارا دوست تھا اتنی بات تمہیں سمجھ نہیں آتی عمر دی گریٹ کہ اس کو روکنا تمہارا کام تھا۔" اس نے لڑاکا عورتوں کی طرح ایک بار پھر ماتھے پر ہاتھ مارا تھا۔

"میں اس کا پرسنل ایڈوائزر نہیں ہوں جو اسے لوگوں سے ملنے کے طریقے سکھاؤں یا مشورے دوں۔ اسے کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے یہ اس کا پرسنل میٹر ہے اور مجھے تو اس کے کسی طریقے پر کوئی اعتراض نہیں ہوا نا..... اعتراض تھا تم کو تو تمہیں ہی اس کو ٹوک دینا چاہیے تھا۔"

"وہ اگر نیکسٹ ٹائم مجھ سے اس طرح ملے گا تو میں اس کو ٹوکوں گی نہیں..... اس کے منہ پر تھپڑ ماروں گی کہ وہ ہی نہیں تم بھی یاد رکھو گے۔" امائمہ انگلی سے اسے تنبیہہ کرتے ہوئے بولی تھی۔

"یہ دیکھو....." عمر نے زچ ہو کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

"یہ تمہارا اور اس کا معاملہ ہے..... میری جان چھوڑ دو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

عمر کے اس جملے نے امائمہ کے تن بدن میں آگ لگا دی۔

"عمر..... یو آر سِک..... سِک' سِک' سِک۔" وہ بھنا کر بولی پھر بیڈ پہ پڑا تکیہ اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

"یس آئی ایم..... آئی ایم سک اینڈ آئی ایم پراوڈ آف مائی سیلف..... سمجھیں..... دفع ہو جاؤ۔"

عمر نے اسے باہر نکلتے دیکھ کر با آواز بلند کہا تھا۔ وہ کافی دیر تک کمرے میں غصے سے چکر کاٹتا رہا پھر وہ بیڈ پر چت لیٹ گیا۔ غصے سے اس کا خون کھول رہا تھا۔

دوسری طرف امائمہ بھی نیچے آکر کشنز پر آڑی ترچھی گر گئی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ہر چیز کو تہس نہس کر دے۔

یہ ان کی ازدواجی زندگی کا پہلا جھگڑا تھا۔



"میں آپ کے بغیر رہنا سیکھ چکا ہوں گرینی..... مجھے نہیں پتا کہ آپ میرے بغیر رہنا سیکھ چکی تھیں یا نہیں لیکن میری دعا ہے کہ آپ جہاں رہیں خوش رہیں۔"

ہاتھ میں پکڑا سفید واحد پھول میں نے گرینی کی قبر پر رکھ دیا۔ ہوا میں خنکی ہی نہیں نمی بھی تھی۔ فضا میں پھولوں' سبزے اور آنسوؤں کی مہک گھلی ملی تھی لیکن یہ میرے آنسو نہیں تھے۔ میری آنکھوں کے گوشے خشک تھے لیکن میرا دل رو رہا تھا۔ جب آنکھیں اور دل

دل کر روئیں تو دکھ ہوتا ہے لیکن جب دل روئے اور آنکھیں اس کا ساتھ نہ دیں تو بہت زیادہ دکھ ہوتا ہے۔

میں بھی بہت زیادہ دکھی تھی۔ گرینی ہر معاملے میں عجلت پسند واقع ہوئی تھیں۔ اپنی موت کے ساتھ بھی انہوں نے تمام تر معاملات بڑی جلدی جلدی طے کر لیے تھے۔ میں ویک فیلڈ واپس آیا تو وہ بستر پر ملی تھیں۔ ان کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی چند دن بعد ہی وہ اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئی تھیں۔ کوہو ان کی بیماری کے بارے میں جانتی تھی لیکن اس نے مجھے نہیں بتایا تھا۔ جب گرینی بالکل بستر سے لگ گئی تھیں تو وہ مجھے لے کر آئی تھی اور میں ہمیشہ کی طرح بس دیکھتا رہ گیا تھا۔ ابھی تو میں کوئی اچھا سا جملہ ہی ذہن میں ترتیب نہیں دے پایا تھا جو میں گرینی سے کہہ کر ان کے سامنے اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا۔ ان سے جھگڑنے کی۔ انہیں طعنے دینے کی تمام تر آرزوئیں تو انہیں بستر پر دیکھ کر ہی دم توڑ گئی تھیں اور اگر کوئی کسر باقی تھی تو وہ ان کی موت نے رہنے نہیں دی تھی۔ اب وہ اپنی قبر میں سکون سے سو رہی تھیں۔ میں کب تک خود کو بے سکون رکھتا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کوہو اور مسٹر ایرک بھی میرے ہمراہ تھے مجھے دیکھ کر وہ بھی کھڑے ہو گئے۔ میں نے گہری سانس بھری اور اپنے سن گلاسز آنکھوں پر رکھ لیے۔

اب تک جو کچھ ہو چکا تھا وہ میں نے نہیں کیا تھا اور مزید جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی میں نے نہیں کرنا تھا۔ میں نے وہ سبق سیکھ لیا تھا جو مسٹر ایمرسن مجھے سکھانا چاہ رہے تھے۔ میں واقعی قدرت کو زیر نہیں کر سکتا تھا تو پھر اس پر کڑھنے کا فائدہ کیا تھا۔ ہم سب واپسی کے لیے قدم بڑھا چکے تھے۔ کوہو اور مسٹر ایرک گرینی کی یادیں دہرا رہے تھے جبکہ میں بالکل خاموش تھا کبھی کبھی خاموش رہنے میں زیادہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ یہی ہو رہا تھا۔

"میگی ہمیشہ تمہارے بارے میں فکر مند رہتی تھی۔۔۔ وہ تمہیں زندگی میں کامیاب دیکھنا چاہتی تھی اس لیے اس نے تمہیں کرسٹین کے پاس بھجوا دیا تھا تاکہ تم وہاں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کرو۔۔۔ مجھے امید ہے کہ کرسٹین تمہارے لیے اچھی ماں ثابت ہو رہی ہو گی۔"

مسٹر ایرک کہہ رہے تھے۔ کوہو ان کے سامنے بیٹھی تھی اور میں ان کی بائیں جانب تھا۔ مجھے ان کے موقف سے اتفاق نہیں تھا اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ کوہو کے چہرے پر پھر بھی ایسا کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بظاہر لاتعلق بیٹھی تھی۔ ممکنہ طور پر کل اسے واپس چلے جانا تھا۔ ہم ڈنر کے بعد کافی پی رہے تھے جب مسٹر ایرک نے یہ بات شروع کی۔

"آپ میرے بارے میں غلط اندازہ لگا رہے ہیں مسٹر ایرک! میں اتنی اچھی نہیں ہوں۔ بلی کبھی میرے ساتھ خوش اور مطمئن نہیں رہا۔"

کوہو نے صاف گوئی سے کہا۔ میں نے اس کی تردید کی نہ ہی تائید، میری نگاہیں ہال کے گلاس ڈور پر تھیں۔ تاریک رات نے برف کی سفید چادر اوڑھنے کی تیاری کر رکھی تھی۔ ریڈیو پر بھی برف باری کی پیش گوئی کی جا رہی تھی اسی لیے میرا اندازہ تھا کہ کوہو جلد از جلد واپس جانے کا سوچ رہی ہو گی۔

"بلی ابھی بچہ ہے کرسٹین۔۔۔ اتنا عرصہ وہ میگی کی نگرانی میں رہا ہے' اسے تمہارا عادی ہونے میں وقت درکار ہے۔۔۔ مجھے امید ہے یہ جلد تمہاری معیت میں رہنا سیکھ لے گا۔۔۔ اور خوش اور مطمئن رہنا بھی۔"

مسٹر ایرک نے کافی کا گھونٹ بھرا۔ وہ پہلے سے کچھ فربہ ہو گئے تھے۔

"اتنا تردد کرنے کی ضرورت کیا ہے مسٹر ایرک۔۔۔ بلی اب یہاں ہی رہے گا اس فارم ہاؤس میں پہلے کی طرح۔ وہ ویسے بھی اپنے اسکول سے مطمئن نہیں ہے۔ کیوں بلی! تم کیا کہتے ہو۔"

کوہو نے اپنی رائے دی۔ مسٹر ایرک کافی کا مگ لبوں تک لے جا رہے تھے یک دم رک گئے۔

"اوہ کم آن کرسٹین۔۔۔ غیر ضروری باتیں مت کرو۔۔۔ یہ میگی کی آخری خواہش تھی کہ بلی لندن میں

رہے۔۔۔ یہ اس کی آئندہ زندگی کے لیے سود مند ثابت ہوگا۔"

وہ میری جانب دیکھنے لگے تھے۔ میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ میری نگاہیں مینٹل پیس پر پڑے ٹائم پیس پر تھیں۔ یہ ایک بڑا خوب صورت سا ٹائم پیس تھا جو گرینڈ پا نے اٹلی سے خریدا تھا۔ اس میں بظاہر اٹلس نظر آتا تھا جیسے اٹلس نے پوری دنیا کو اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہو لیکن دراصل یہ ایک بچہ تھا جو فٹ بال کو ہاتھوں اور کندھوں کے ذریعے اوپر کو اچھال رہا تھا۔ یہ فٹ بال ہاتھ لگانے سے چمک اٹھتا تھا اور اس پر وقت نمایاں ہونے لگتا تھا۔

ابھی اس پر دس بجے کا وقت تھا جبکہ میرے ساتھ موجود دونوں نفوس کے چہروں پر سوانو کا سپاٹ وقت ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ دونوں کھل کر اپنی رائے کا اظہار کر بھی رہے تھے اور نہیں بھی کر رہے تھے۔ میرا خود کو فی الحال لاتعلق رکھنا ہی ضروری تھا اور بہتر بھی۔

"یہ میگی کی آخری خواہش تھی بلی۔۔۔ مجھے امید ہے، تم اس پر غور کرو گے۔" مسٹر اریک نے مجھے گفتگو میں گھسیٹنا چاہا۔ میں نے اٹلس والے ٹائم پیس پر سے نظریں ہٹائیں۔ کوہو نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اسے عادت ہی پڑ گئی تھی میری سخت گیر کزن کی اداکاری کرنے کی۔

"آپ خود ہی کہہ رہے ہیں کہ وہ ابھی بچہ ہے۔۔۔ بچے ایسے معاملات کی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔۔۔ میں بحیثیت اس کی ماں یہ بہتر فیصلہ کر سکتی ہوں کہ یہ کہاں رہے گا۔۔۔ اور میرا فیصلہ ہے کہ یہ یہیں رہ کر اپنی پڑھائی مکمل کرے گا۔۔۔ بہتر مسٹر اریک۔"

اس کا انداز بالکل دوٹوک تھا۔ مسٹر اریک نے مگ تپائی پر رکھ دیا۔

"مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔۔۔ میں بلی کا نگران بھی ہوں۔ میگی کا شوہر ہونے کے ناتے میری ذمہ داری ہے کہ میں بلی کے معاملات دیکھوں۔۔۔ اس لیے۔"

"بلی میرا بیٹا ہے۔۔۔ قانونی اور اخلاقی طور پر اسے آپ جیسے کسی معاون یا نگران کی ضرورت نہیں ہے۔"

کوہو نے تڑپ کر ان کی بات کاٹ دی جبکہ مسٹر اریک اس سے بھی زیادہ تڑپے تھے۔

"کرسٹین! یہ تمہاری ذات پر سجتا نہیں ہے کہ تم قانونی اور اخلاقی باتیں کرو۔ تم کیا ہو، کیسی ہو میں بخوبی جانتا ہوں۔۔۔ یہ تم ہی ہو جس کی وجہ سے میگی کبھی مطمئن نہیں رہی۔"

"میری ذات کے بارے میں بات کرنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھئے۔۔۔ دراصل یہ آپ ہیں جن کی پریشانی آنٹی میگی کو موت کے منہ میں لے گئی۔ آپ کی وجہ سے وہ کبھی مطمئن نہیں رہی تھیں۔ وہ آپ کے ساتھ شادی کے فیصلے پر پچھتانے لگی تھیں۔ انہیں آپ کی سازش سمجھ میں آگئی تھی۔ آپ جونک بن کر ان کی ہستی سے چمٹ گئے تھے۔۔۔ وہ آپ تھے مسٹر اریک جس نے آنٹی میگی کو بیمار کر ڈالا تھا۔"

کوہو ہانپنے لگی تھی۔ ماحول بالکل بدل گیا تھا۔ میں ان دونوں کی گفتگو میں دلچسپی لینے پر مجبور ہونے لگا تھا۔

"بکواس بند کرو کتیا۔۔۔ تمہیں کسی سے بات کرنے کی تمیز ہی نہیں ہے۔ میگی ٹھیک کہتی تھی کہ باپ نے اپنے لیے دنیا کی خود غرض ترین عورت کا انتخاب کیا تھا۔۔۔ کاش قدرت بلی کے لیے تمہاری جیسی ماں کا انتخاب نہ کرتی۔ مجھ پر الزام لگا رہی ہو تاکہ بلی کو مجھ سے متنفر کر سکو۔۔۔ تم اسے یہ کیوں نہیں بتاتیں کہ تم اسے اپنے ساتھ رکھنے کا اچھا خاصا معاوضہ میگی سے وصول کیا کرتی تھیں۔ یہ بھی تو بتاؤ نا کہ دراصل جونک تم تھیں جو دولت کی ہوس میں اپنی اولاد کو ماں کا پیار نہیں دے سکیں۔۔۔ تمہاری خود غرضی نے کبھی تمہیں اپنی ذات کے علاوہ کچھ سوچنے ہی نہیں دیا۔۔۔ اونہہ۔۔۔ اپنے شوہر کو بھی تم کھا گئی تھیں اور اب بیٹے کو کھانے کی تیاری میں ہو۔"

مسٹر اریک نے فرش پر تھوکتے ہوئے گالی دی تھی۔ کوہو اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ دونوں

ہال میں میری موجودگی کو بھلا چکے تھے۔

"اس دولت پر میرا حق ہے۔۔۔ یہ میرے شوہر اور میرے بیٹے کی دولت ہے۔ میں نے اس کے باوجود کبھی کسی چیز پر حق نہیں جتایا۔۔۔ میں محنت کرتی ہوں اور اپنا پیٹ پالتی ہوں۔۔۔ آنٹی میگی مجھے بلی کے لیے جو رقم دیتی تھیں' وہ بلی ہی کی دولت میں سے تھی' اسی کے لیے' اسی کی ذات پر خرچ ہوتی تھی۔۔۔ آپ بتائیے آپ اتنے بڑے فارم ہاؤس کے مالک بننے کے خواب کیوں دیکھنے لگے تھے۔ اپنی خود غرضی' سفاکی اور عیاری کا بھی تو ذکر کیجئے۔۔۔ آپ نے کتنی ہوشیاری سے آنٹی میگی کو انکل جیک کی موت کے بعد قابو کیا۔۔۔ پہلے انہیں ان کے بڑھاپے کا احساس دلانا شروع کیا۔۔۔ ان کی بیماری کو ان پر حاوی کر دیا۔۔۔ وہ جب خود کو لاچار محسوس کرنے لگیں تو خود کو ان کا سب سے بڑا ہمدرد ثابت کرنے میں جت گئے۔ آپ نے انہیں احساس دلایا کہ بلی ان کے بڑھاپے پر بوجھ ہے۔ آپ نے دادی اور پوتے کو علیحدہ کیا اور پھر آنٹی میگی سے شادی رچالی۔ آپ نے کیوں یہ سب کیا۔۔۔؟ مان لیجئے مسٹر ایرک۔۔۔ دولت کی وجہ سے۔۔۔ آپ بھی فرشتہ نہیں ہیں۔۔۔ معصوم بننے کی اداکاری اور اپنے آپ کو سراہنا بند کیجئے پھر اس کے بعد اپنا اور میرا تقابل کیجئے۔۔۔ یقین کیجئے۔ آپ ہی فاتح ہوں گے۔۔۔ خود غرضی کا ٹیگ ہی نہیں ٹائٹل بھی آپ کو ہی ملے گا۔"

وہ غرا رہی تھی۔ مسٹر ایرک کچھ دبے ہوئے محسوس ہوئے مگر ابھی شاید ان کے ترکش میں کچھ تیر باقی تھے۔ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھے۔ میں بے حد حیرانی سے ان کی باتیں سن رہا تھا لیکن چپ تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مار پیٹ نہ شروع کر دیں۔

"اتنا کافی ہے کرسٹین۔۔۔ کافی بول چکی ہو تم۔۔۔ میں بھی تمہاری طرح اس طرح کی گھٹیا ذہنیت کا مظاہرہ کر سکتا ہوں لیکن میں کم ظرف نہیں ہوں۔۔۔ بہتر ہے تم میری بات مان لو۔۔۔ اس میں تمہارا فائدہ ہے۔ میں میگی کی خواہش کے مطابق بلی کی دیکھ بھال میں معاونت کا ذمہ دار ہوں۔۔۔ اور میں اپنی ذمہ داری پوری طرح نبھاؤں گا۔"

"میں آپ کو آپ کی ذمہ داری کے متعلق کوئی نصیحت کروں گی نہ اپنی ذمہ داری کے متعلق آپ کی کوئی نصیحت سنوں گی۔۔۔ بلی یہیں رہ کر پڑھے گا یہ میرا اور میرے بیٹے کا مشترکہ فیصلہ ہے۔"

مسٹر ایرک نے تحمل کا مظاہرہ کیا تھا اس لیے کوہو کو بھی اپنی آواز ست کرنی پڑی۔ وہ دونوں میری جانب بہت کم دیکھ رہے تھے۔ میرا کافی والا مگ خالی ہو چکا تھا۔ میں نے اسے میز پر رکھ دیا۔

"وہ یہاں اکیلا کیسے رہے گا۔۔۔ اتنا بڑا فارم ہاؤس ہے اور بلی ابھی بچہ۔۔۔ میری مخالفت اور ضد میں آکر احمقانہ فیصلے مت کرو۔" مسٹر ایرک اب یقیناً "ناصحانہ" انداز اپنا رہے تھے۔

"آپ کو کس نے کہا وہ اکیلا رہے گا۔۔۔ میں اس کے ساتھ رہوں گی۔۔۔"

کوہو کے فیصلے نے مجھے چونکایا۔ مسٹر ایرک بھی اس کا چہرہ تکنے لگے۔

"تمہارا مطلب ہے کہ تم اپنی ملازمت' اپنی سماجی زندگی' اپنی سرگرمیوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے یہاں اس دور افتادہ فارم ہاؤس میں رہو گی۔۔۔ رہ لو گی؟"

وہ استہزائیہ انداز میں کہہ رہے تھے۔ کوہو نے فلمی ویمپ کے جیسا اونچا مصنوعی قہقہہ لگایا۔

"آپ بھی تو اپنی سرگرمیاں ترک کر کے بوڑھی مارگریٹ جیک گرانٹ کے لیے یہاں آگئے تھے نا۔۔۔ آپ بھی یہاں رہ رہے ہیں نا۔۔۔ میں بھی رہ لوں گی۔۔۔ میری فکر میں ہلکان مت ہوں۔"

مسٹر ایرک چند لمحے خاموشی سے کھڑے رہے شاید کچھ سوچنے لگے تھے۔ میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا ان کے درمیان کوئی کام نہیں تھا۔

"کرسٹین! میرا خیال ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑنے کے بجائے اس بچے سے پوچھ لینا چاہیے کہ اس کا کیا فیصلہ ہے۔۔۔ بتاؤ بلی۔۔۔ تم کیا چاہتے ہو؟"

مسٹر ایرک کو شاید یک دم احساس ہوا تھا کہ میں بھی موجود ہوں۔ کوہو نے میری جانب دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ میں کبھی اس کے اس گھر میں جا کر نہیں رہنا چاہوں گا۔ جبکہ مسٹر ایرک کو گمان تھا کہ شاید میں اپنی ماں کے ساتھ رہنے کو ترجیح دوں گا۔ میں نے گہری سانس بھری۔ اب یہ بہت سی گرہیں کھل گئی تھیں۔ ان دونوں کو مجھ سے مطلب نہیں تھا بلکہ اس دولت سے تھا جو گرینڈپا نے میرے لیے چھوڑی تھی۔ کوہو میری ماں تھی اور گرینی نے مسٹر ایرک کو اپنے بعد میرا نگران مقرر کر دیا تھا۔ میں نے ایک اور گہری سانس بھری اور اپنے ڈھیلے ڈھالے کارڈیگن کی جیب میں ہاتھ ڈال لیے۔

"کیا یہ اہمیت رکھتا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں؟"

کیا میں اپنے لیے کوئی فیصلہ کرنے کے لیے آزاد بھی تھا کہ نہیں؟

کیا اس وقت کیا گیا میرا کوئی بھی اہم فیصلہ میری آئندہ زندگی میں معاون ثابت ہو سکتا تھا۔

وہ دونوں میری جانب ہی دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنے پاؤں کو دیکھا۔ سمت کا تعین ہمیشہ دماغ کرتا ہے لیکن ہمیں اس سمت کی جانب لے کر ہمیشہ ہمارے پاؤں جاتے ہیں۔

"تم بتاؤ ۔۔۔ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" کوہو میری خاموشی سے اکتائی۔ میں نے اپنے کارڈیگن کے ہڈ کو سر پر رکھا تھا۔

"سونمنگ ۔۔۔" میں نے پرعزم لہجے میں کہا تھا۔ میں نے تقدیر کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ میں کیا کرنا چاہتا تھا۔ میں نے انہیں بتا دیا تھا اور وہ کیا کر سکتے تھے۔ یہ انہوں نے چند دن بعد بتایا۔ ایک ہفتہ بعد مسٹر ایرک اور کوہو نے شادی کر لی تھی۔



"یہاں رہتا ہوں میں" نور محمد نے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا تھا۔ وہاں ملگجا سا اندھیرا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی سیڑھیوں میں لگے بلب کی روشنی بلا اجازت اندر داخل ہوئی تھی اور پھر نور محمد اور احمد نے بھی یہی کیا تھا۔ کمرے کی ابتر حالت اس ذرا سی روشنی میں اور بھی زیادہ ابتر محسوس ہو رہی تھی۔ نور محمد کو شرمندگی ہوئی۔

"آپ یہاں اکیلے رہتے ہیں" احمد نے پوچھا تھا۔ ان کی درمیانی رفاقت نے بڑی تیزی سے آگے کا سفر طے کیا تھا احمد کی شخصیت میں ایک اسرار تھا جو نور محمد کو اپنی جانب کھینچتا تھا۔

نور محمد کی کسی اجنبی علاقائی شخص کے ساتھ انسیت اس کے اردگرد رہنے والوں کے لیے ایک بڑا ہی انوکھا واقعہ تھی۔ وہ نہ صرف حیران تھے بلکہ کچھ لوگ متجسس بھی تھے کہ یہ اجنبی جسے یہاں آئے زیادہ دن بھی نہیں ہوئے تھے آخر ایسی کون سی خصوصیات کا حامل تھا کہ نور محمد اس کے اتنے قریب آ گیا تھا اگرچہ احمد معروف نے اپنے رویے سے سب کے دل جیت لیے تھے۔ وہ عمدہ خوشبو، نفیس گفتگو اعلیٰ لباس اور اچھے اطوار کے باعث بہت جلد واقعی سب میں معروف ہو گیا تھا۔ سب اسے پسند کرتے تھے۔ اس لیے اس دوستی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔

نور محمد اور احمد معروف ظاہری حلیے میں ہی نہیں عادتاً بھی ایک دوسرے سے متضاد تھے ان کا اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا بول چال سب ہی مختلف تھے مگر وہ ایک دوسرے کے ساتھ ایسے گھل مل گئے تھے کہ دن رات کی طرح لازم و ملزوم لگنے لگے تھے۔

احمد معروف بہت مشفق شخص تھا۔ اس نے نور محمد کو بصد اصرار اپنے حلقہ یاراں میں شامل کیا تھا لیکن نور محمد اس دوستی سے خود بھی کافی خوش اور مطمئن تھا۔ اسی لیے وہ اسے اپنا ٹھکانہ دکھانے لے آیا تھا۔ اس کے روم میٹس ابھی موجود نہیں تھے لیکن ان کی نشانیاں سب جگہ بکھری ہوئی تھیں۔ وہ سب لوگ عجیب تھے۔ اپنا کام ساتھ ساتھ سمیٹنے کے بجائے سب ویک اینڈ کے منتظر رہتے۔ اسی لیے نور محمد ان سے بعض اوقات بہت اکتا بھی جاتا تھا لیکن وہ منہ سے کسی

سے کوئی شکوہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ اعتراضات کرنے کے بجائے خاموش رہنا پسند کرتا تھا اسے نجانے کیوں ہر جائز کام میں بھی جھجک محسوس ہوتی تھی۔

وہ اکثر اپنے روم میٹس کے کپڑے اٹھا کر لانڈری میں رکھ دیتا' ان کے لحافوں اور بستروں کو درست کر دیا کرتا۔ ان کے جھوٹے برتن کچن میں رکھ دیا کرتا تھا۔ جس روز وہ یہ کام نہ کرتا اس روز کمرے کی حالت اسی طرح ابتر رہتی تھی جس طرح آج ہو رہی تھی....

ابھی بھی کمرے میں رات کو پی گئی کافی کے مگ اور کھائے گئے ابلے انڈوں کے چھلکے دروازے کے عین سامنے موجود تھے۔ صبح کو ڈیوٹی یونیفارم پہننے کی غرض سے اتارے گئے پاجامے بنیانیں بھی بستروں پر پڑی تھیں۔ نور محمد کو دل ہی دل میں بے پناہ شرمندگی ہوئی۔ احمد اس کی بہت عزت کرتا تھا اور یہ عزت اسے حد سے زیادہ محتاط بنا دیتی تھی۔ وہ اس حد درجہ عزت سے خوف زدہ رہنے لگا تھا اور حیرانی والی بات یہ تھی کہ اسے اس کا احساس بھی نہیں تھا۔

ایک کمزور اور وضع دار انسان کے لیے عزت کی فلاسفی بڑی الجھا دینے والی ہوتی ہے۔

خوامخواہ کی عزت سے زیادہ بے عزت کر دینے والی چیز دنیا میں کوئی نہیں ہوتی۔ اس کے چھن جانے کا خوف اور اس کو قائم و دائم رکھنے کے جتن بعض اوقات انسان کے کندھوں کو بوجھ کے سوا کچھ نہیں دیتے۔ نور محمد کے کندھے بھی فی الوقت جھکے جھکے سے نظر آنے لگے۔ دوسروں کا کچرا سمیٹنا اس کی ذمہ داری نہیں تھی لیکن وہ اس کام کو ذمہ داری کی طرح ہی سر انجام دینے لگا۔

"نہیں.... ایک دو لوگ اور بھی ہیں۔"

اس نے کمرے کی لائٹ آن کر کے جلدی جلدی لحاف سمیٹنے شروع کیے تھے اور ساتھ ہی پوچھے گئے سوال کا جواب بھی دیا تھا۔ احمد نے سر اٹھا کر چھت کی جانب دیکھا تھا۔ وہ بہت نیچی چھت والا تنگ سا کمرہ تھا۔ گھٹن کا احساس ہر چیز پہ حاوی تھا۔ اسے یہ جگہ پسند نہیں آ رہی تھی۔ نور محمد نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔

"آپ پریشان مت ہوں یہ جگہ بہت اچھی ہے۔ میرے ساتھ رہنے والے سب لوگ بھی بہت اچھے ہیں۔ آپ ایک دو دن میں سب کے ساتھ گھل مل جائیں گے اور پھر یہ جگہ مسجد سے بے حد قریب ہے تو آنے جانے میں بھی آسانی رہے گی۔"

اس نے نور محمد سے کہا تھا کہ اس کے پاس رہنے کی جگہ نہیں ہے اور جس جگہ وہ رہتا ہے وہ مسجد سے کافی دور ہے اس لیے اگر کوئی نزدیک میں جگہ مل جائے تو وہ بڑا ممنون ہو گا۔ نور محمد نے اسے اپنے ساتھ رہنے کی پیشکش کی تھی جسے احمد نے قبول کر لیا تھا۔

"یہاں بہت گھٹن ہے' کھڑکی بھی نہیں ہے کوئی" احمد نے اس کا ساتھ دینے کے لیے ایک لحاف اٹھایا تھا۔

"موسم ہی اتنا اچھا ہوتا ہے کہ ہوا کے لیے بھی کھڑکی کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

نور محمد نے اس کی جانب دیکھے بنا کہا تھا۔ آنکھوں کو کم ہی استعمال کر رہا تھا وہ۔

بلی کو دیکھ کر کبوتر موت سے بچنے کے لیے آنکھوں سے جو کام لیا کرتا ہے وضع دار شخص وہی کام شرمندگی سے بچنے کے لیے لیتا ہے۔

"کھڑکیاں صرف ہوا کی آمد و رفت کا ذریعہ ہی نہیں ہوتیں" احمد شاید اس کے انداز کو سمجھ گیا تھا اس لیے اس نے بھی اس کی جانب دیکھے بنا تہہ لگانے کے لیے ایک اور لحاف اٹھایا تھا۔

"روشنی دھوپ.... زندگی.... کھڑکیوں سے اور بھی بہت کچھ ملتا ہے۔" اس نے لحاف کو تہہ لگانی شروع کی تھی۔

"کھڑکیاں دروازے بہت ضروری ہوتے ہیں۔ انسان کی تنہائی کو بانٹنے میں یہ بڑے معاون ثابت ہوتے ہیں ورنہ انسان اکیلا ہی رہ جائے' جبکہ انسان اکیلا رہنے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا اسے سب کے ساتھ رہنا ہوتا ہے اس دنیا میں اور دنیا ہمیشہ کھڑکیوں

دروازوں کے دوسری جانب سے شروع ہوتی ہے یہ اونچی لمبی دیواریں تو انسان نے اپنی حفاظت کے لیے بنائی ہوئی ہیں۔ ان کے پار دیکھنے کے لیے ان کے اندر سے راستے بنانے پڑتے ہیں۔ دیواروں کے پار جھانکنے کے لیے انسان نے جو راستہ بنایا ہے، جو آلہ ایجاد کیا ہے کھڑکی اسی آلے کا نام ہے۔ یہاں سے دنیا محسوس ہوتی ہے نظر آتی ہے۔ اپنا پتا دیتی ہے" احمد نے سادہ سے انداز میں کہا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ تبلیغی جیسی باتیں گلاب جامن کے انداز میں کر جایا کرتا تھا۔

"دنیا..... دنیا کی ضرورت کسے ہے؟" نور محمد نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا تھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری نہیں تھی لیکن صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ اسے کہیں نہ کہیں چھپا رہا ہے۔ وہ اس کی جانب پشت کر کے اپنے پلنگ کے نیچے سے کچھ گھسیٹنے لگا تھا۔

"کیوں..... دنیا کی ضرورت نہیں ہے آپ کو" احمد کے لہجے میں حیرت تھی۔

"نہیں..... مجھے اس دنیا سے کوئی غرض ہے نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔" اس نے پلنگ کے نیچے سے ایک فولڈ کیا ہوا میٹرس نکالا تھا۔

"کیوں؟" احمد لحاف بستر پر رکھ کر اس کی جانب آگیا تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسا تھا کہ نور محمد بھی حیران ہوا۔ وہ اتنا متجسس کیوں ہو رہا تھا۔ نور محمد نے سوچا تھا پھر اسے احمد کی لاعلمی پر تاسف ہوا۔

"مومن کو دنیا سے کوئی غرض نہیں ہوتی..... مومن کو دنیا کی طلب نہیں ہوتی۔" نور محمد نے ملامت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"کیوں؟" وہ ایک بار پھر پوچھ رہا تھا۔ اسی انداز میں کہ نور محمد زچ ہوا۔

"جسے اللہ کا دین کافی ہو۔ اسے دنیا کی ضرورت کیا ہے" اس نے زور دے کر سمجھانے والا انداز اپنایا تھا۔

"اللہ کا دین..... تو کیا دنیا اللہ کی نہیں ہے؟" احمد معروف کے اس سوال نے نور محمد کو ساکت کر دیا تھا۔ وہ لاجواب ہو کر چپ سا ہو گیا۔ کیا احمد معروف اس کے عقائد، اس کے تصورات کی بلند و بالا مضبوط عمارت کو متزلزل کرنے کے لیے آیا تھا۔

میرا تو خیال ہے یہ "دین" انسان کا ہے۔ جو اللہ نے اسے دان کر دیا ہے اور "دنیا" اللہ کی ہے۔ جو اس نے ایک دن واپس لے لینی ہے یہ اللہ سبحان تعالیٰ کی "امانت" ہے۔ جو ایک نہ ایک دن آپ کو واپس کرنی ہوتی ہے۔ اللہ پاک انسان سے اس کا دین واپس نہیں لیں گے۔ ہر مسلمان کی یہ حسرت اور خواہش ہوتی ہے کہ مرتے دم اسے اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرتے ہوئے جان فانی اس کے سپرد کرنے کا موقع ملے اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ آخری وقت تک جو چیز ساتھ لے جا سکتا ہے وہ "دین" ہے "دین" کا اقرار ہے جبکہ دنیا اور اس کی ہر چیز کو وہ یہیں چھوڑ جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہوا نا کہ یہ دنیا اللہ پاک واپس لے لیتے ہیں تو وہ چیز جو اللہ آپ سے واپس لے گا وہ آپ کے پاس مرتے دم تک "امانت" ہے..... آپ کیسے اللہ کی "امانت" سے منکر ہو سکتے ہیں۔"

نور محمد اپنے ہی بچھائے ہوئے میٹرس پر دھم سے گرا تھا۔ احمد معروف نے اس کے سامنے سوچ کا ایک نیا دروازہ کھول ڈالا تھا۔

"مجھے اسلام کی سب سے اچھی بات ہی یہ لگتی ہے کہ اس میں "دنیا" کا انکار نہیں ہے کوئی انسان دنیا سے منکر ہو کر مومن نہیں ہو سکتا۔ یہ نہ کہیں دین میں سکھایا گیا نہ قرآن میں بتایا گیا اور نہ ہی نبی آخر الزماں ﷺ نے ایسا کیا جب ہمارے نبی تارک الدنیا نہیں تھے تو ہم کیسے ہو سکتے ہیں..... ہم کیسے ہو جائیں تارک الدنیا؟"

احمد معروف نے سوال کیا تھا۔ نور محمد کے سینے سے دبی دبی سانس خارج ہوئی، اس کے سامنے بیٹھا شخص غلط تو کہہ نہیں رہا تھا۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" وہ نا سمجھی کے عالم میں سب کچھ سمجھتے بوجھتے ہوئے بھی سوال کر رہا تھا۔

"میں تو صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اس دنیا کو حقارت کی نظر سے مت دیکھیں..... یہ مومن کا مقام نہیں ہے..... یہ خیانت ہے۔ میرے رب نے "دنیا" کو

بہت محبت سے تخلیق کیا ہے اسے محبت نہیں دے سکتے' مت دیں اس کی عزت تو کریں۔۔۔ یہ بھی اللہ سے منسوب ہے اور جو چیزیں اللہ سے منسوب ہوتی ہیں ان کی عزت کی جاتی ہے۔ انہیں نفرت سے دیکھنا' کمتر سمجھنا حقیر گردانا انسان کو جچتا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ وہ مت کریں جو ابلیس نے آپ کے ساتھ کیا تھا۔" نور محمد چپ کا چپ رہ گیا تھا۔ جو اس سے سیکھنے آیا تھا' وہ اسے سکھا رہا تھا۔



"تم ہی ہو نا جس نے بورڈ میں تیسری پوزیشن لی ہے؟"

ایک لمبے قد اور فربہی وجود کی مالک لڑکی اس کے سامنے کھڑی پوچھ رہی تھی۔ بلاشبہ یہ حوالہ بہت قابل فخر تھا لیکن پھر بھی اس نے کسی قدر جھجک کر سر ہلایا۔ یہ عاجزی نہیں بلکہ اپنی ذات پر عدم اعتمادی تھی جو اسے اپنی خوبیوں پر ٹھیک سے خوش بھی نہیں ہونے دیتی تھی۔ اس کے سامنے کھڑی لڑکی کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

"کانگریٹس۔۔۔ میں صبا ہوں۔۔۔ اسی اکیڈمی میں پڑھتی ہوں۔۔۔ شاید تم نے میرا نام سنا ہو۔۔۔ میری بورڈ میں گیارہویں پوزیشن بنی ہے۔" وہ خود ہی اپنے متعلق بتا رہی تھی جبکہ اس نے ایک بار پھر ہونقوں کی طرح سر ہلایا۔

"میٹرک میں ففتھ پوزیشن تھی میری۔۔۔ اس بار میں توقع کر رہی تھی کہ پہلی تین پوزیشنز میں سے کوئی ایک ضرور آئے گی۔ میرے پیپرز بہت اچھے ہوئے تھے مگر لاہور بورڈ میں بہت دھاندلی ہوتی ہے۔ یہاں محنت کرنے کے باوجود آپ پر امید نہیں ہوتے کہ آپ کتنے مارکس اسکور کرپاؤ گے۔۔۔ گوجرانوالہ بورڈ میں ایسا نہیں ہوتا۔۔۔ میں نے وہاں سے میٹرک کیا ہے نا۔۔۔ سر افتخار کہہ رہے تھے ری چیکنگ کرواؤ۔۔۔ دراصل مجھ سے زیادہ میرے ٹیچرز شاکڈ ہیں' پر پھر بھی میں نے ری چیکنگ نہیں کروائی۔۔۔ میں مطمئن ہوں۔۔۔ پارٹ ٹو میں ان شاء اللہ میں پوزیشن ری گین کرلوں گی۔۔۔ ری چیکنگ کا کوئی فائدہ تو ہوتا نہیں ہے۔۔۔ پہلے دھاندلی سے پیپر چیکنگ میں پچاس پچاس نمبروں کی گڑبڑ کرتے ہیں پھر ری چیکنگ میں پانچ سے دس مارکس بڑھا کر احسان عظیم کر دیتے ہیں اس کے علاوہ جو بار بار بورڈ آفس کے چکر لگانے پڑتے ہیں وہ الگ بندے کو عاجز کر دیتے ہیں۔۔۔ خیر میں اب خوش ہوں جس دن رزلٹ اناؤنس ہوا اس دن تو میرا رونا ہی بند نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے اس لیے زیادہ رونا آ رہا تھا کہ میں نے گوجرانوالہ سے ہی انٹر کیوں نہ کرلیا وہاں کم از کم اتنی دھاندلی نہیں ہوتی۔۔۔ مجھے بس شوق ہو گیا تھا کہ لاہور سے ہی ایف ایس سی کروں گی۔۔۔ اپنے کالج میں تو خیر میں نے ہی ٹاپ کیا ہے۔۔۔ میں کوئین میری سے ہوں۔۔۔ تم کس کالج سے ہو؟"

بالآخر اسے اپنی گفتگو میں وقفہ دینے کا خیال آ گیا تھا۔ صبا نورین نامی وہ لڑکی اتنی روانی اور اتنی تیزی سے گفتگو کر رہی تھی مگر اسے سانس نہیں چڑھا تھا جبکہ وہ جو فقط سن رہا تھا ہانپنے لگا تھا۔

"میں۔۔۔؟" اس نے پوچھنا مناسب سمجھا پھر دھیمی سی آواز میں اپنے کالج کا نام بتا دیا۔

"ہیں۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ تو ڈبہ کالج مشہور ہے۔۔۔ مطلب وہاں کوئی پڑھائی وڑھائی نہیں ہوتی اور تمہارا میرٹ تو ایف سی جی سی تک کا تھا پھر۔۔۔؟" صبا نے حیران ہوتے ہوئے سوال کیا تھا پھر اس کو بولنے کا موقع دیے بغیر کہنے لگی۔

"ویسے ایک بات ہے' خود پڑھائی کے لیے سیریس ہونا چاہیے کالج کی خیر ہے۔۔۔ اب تم نے اسی کالج میں پڑھ کر پوزیشن لی ہے۔۔۔ اچھا یہ بتاؤ' تم نوٹس کس کے استعمال کرتے ہو۔۔۔ میرا مطلب اسی اکیڈمی کے ٹیچرز جو دیتے ہیں' وہ استعمال کرتے ہو یا کسی اور اکیڈمی سے لیتے ہو؟"

اس کا لہجہ اور آواز ایک دم سے رازدارانہ سی ہو گئی تھی۔

"میں اپنے نوٹس خود بناتا ہوں۔" اس نے آہستہ

آواز میں بتایا تھا۔ یہ اس کے لیے واقعی قابل فخر بات تھی کیونکہ وہ بہترین ہوتے تھے۔ صبا نورین کے چہرے پر متجسس مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ شاید یہی راز جاننے کے لیے آئی تھی۔

"مجھے پہلے ہی پتا تھا... میں بھی اپنے نوٹس خود بناتی ہوں... یہاں کے نوٹس تو ایویں ہی ہوتے ہیں مجھے یہ اکیڈمی اتنی پسند نہیں... دراصل میرے گھر کے قریب ہے نا... اس لیے... انٹری ٹیسٹ کی تیاری میں یہاں سے نہیں کروں گی... اچھا تم مجھے اپنے نوٹس دکھاؤ گے... بائیولوجی کے... چیپٹر نائن کے... ابھی نہیں ہیں تو کوئی بات نہیں... کل لے آنا... ابھی تو ویسے بھی سر آنے والے ہیں... ٹھیک... کل لے آنا یاد سے۔"

کتابوں کو ایک بازو سے دوسرے بازو پر منتقل کرتے ہوئے وہ اسی روانی و تیزی سے بولی مگر لہجے میں ایک کھوج تھی جو یقیناً "ان نوٹس کے لیے تھی جن کے باعث اس کے سامنے کھڑا لڑکا بورڈ میں تیسری پوزیشن لینے میں کامیاب ہوا تھا۔ صبا نورین نے تاکیدی انداز میں انگلی اٹھا کر کہا تھا پھر ہاتھ سے بائے کا اشارہ کر کے آگے بڑھ گئی۔ اسی وقت طلحہ اور راشد ایک ساتھ اکیڈمی میں داخل ہوئے تھے۔ ان دونوں نے ہی صبا کو اس کے پاس کھڑے اور پھر "بائے" کا اشارہ کر کے آگے بڑھتے دیکھا۔ طلحہ کی آنکھوں میں شرارت چمکی 'اسے چڑانے کے لیے اس نے وسلنگ شروع کر دی اسی لمحہ صبا نے مڑ کر دیکھا پھر طلحہ کو وسلنگ کرتا پا کر سخت نگاہوں سے گھورا۔ اس لڑکی کا انداز اتنا پُراعتماد تھا کہ طلحہ خائف ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"بڑی موجیں ہو رہی ہیں۔" اس کے قریب آ کر طلحہ نے آنکھیں مٹکائیں اس نے پہلے بھی صبا نورین کو دیکھ رکھا تھا۔

"تم لوگوں کا انتظار کر رہا تھا... اتنی دیر...؟" وہ ان دونوں کے ساتھ چلتے ہوئے اس حصے کی طرف آنے لگا جہاں لڑکوں نے اپنی موٹر سائیکلیں اور سائیکلیں وغیرہ پارک کی ہوئی تھیں۔ یہ حصہ مرکزی داخلی دروازے اور اکیڈمی کے ریسپشن سے ذرا ہٹ کر تھا۔

"دیر کہاں ہوئی یار... جلدی کہو... ہم نہ آتے کچھ دیر اور تو تمہیں بات کرنے کا بہانہ ملا رہتا... اب ہماری وجہ سے..."

طلحہ نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی تھی اور آنکھیں گھمانے لگا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ بے حد برا لگتا تھا مگر اسے احساس نہیں تھا۔ راشد نے ایسی باتوں میں حصہ لینا کافی کم کر دیا تھا۔ رزلٹ اور پھر انٹری ٹیسٹ کا ہوا اب اس پر زیادہ سوار رہنے لگا تھا۔

"وہ صبا نورین تھی... مبارک باد دے رہی تھی... اس نے اپنے کالج میں ٹاپ کیا ہے مگر بورڈ میں گیارہویں پوزیشن بنی ہے اس کی... یہی سب بتا رہی تھی۔"

اس کے دماغ میں غلاظت نہیں تھی اس لیے عام سے انداز میں اس نے کہا تھا۔ ویسے بھی اس لڑکی کے پراعتماد انداز نے اسے متاثر کیا تھا۔ وہ ذہین تھا لیکن اسے ذہانت اتنی پسند نہیں تھی۔ اسے پراعتمادی پسند تھی کیونکہ وہ اس چیز کی شدید کمی کا شکار تھا۔

"بس یہی بتایا اس نے... اور کچھ نہیں؟" طلحہ واقعی ایک ڈھیٹ لڑکا تھا۔ کبھی کبھی وہ چالاک عورتوں کی طرح آنکھیں مٹکا مٹکا کر اس طرح بات کرتا کہ سامنے کھڑا شخص اپنے آپ کو بدھو سمجھنے لگتا اور وہ تو واقعی بدھو تھا۔

"نہیں۔ اور بھی بتا رہی تھی... وہ گوجرانوالہ سے آئی ہے... مجھ سے بائیولوجی کے نوٹس مانگ رہی تھی۔"

اس کا انداز ابھی بھی سادہ تھا مگر دل ہی دل میں وہ زچ ہو چکا تھا۔

"تم نے بھی کچھ مانگ لینا تھا... مثلاً "فون نمبر... یا گھر کا ایڈریس وغیرہ۔"

"اوئے خبیث انسان... تجھے کوئی اور بات آتی ہے کہ نہیں... ہر وقت یہی فضولیات۔" راشد کچھ چڑ کر بولا۔ فزکس کی کلاس پہلے ہونا تھی اس لیے اس نے ہاتھ میں فزکس کے نوٹس پکڑے ہوئے تھے اور

کچھ رہنے کی کوشش میں ان دونوں کی گفتگو حائل ہو رہی تھی۔ اسی لیے اس نے طلحہ کو ٹوکا تھا۔

"میں تمہیں تو کچھ نہیں کہہ رہا۔۔۔ تم لگاؤ رٹے ۔۔۔ حالانکہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔"

طلحہ کا انداز پڑھائی کے معاملے میں آج کل ناک سے مکھی اڑانے کے برابر رہ گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے لیے یہ سب چیزیں ثانوی اہمیت کی حامل بھی نہیں رہیں تب ہی راشد اس پر زیادہ غصہ کرنے لگا تھا۔

"کیوں فرق نہیں پڑے گا۔۔۔ ابھی اینٹری ٹیسٹ کا سہارا تو ہے نا۔۔۔ میرے سیونٹی پرسنٹ آئے ہیں ۔۔۔ پارٹ ٹو میں اگر ایٹی فائیو آجاتے ہیں تو باقی کی کمی اینٹری ٹیسٹ میں پوری ہو جائے گی۔۔۔ ان شاء اللہ ۔۔۔ تم میرا دل جلانے کے بجائے اپنی فکر کرو۔" کلاس روم کی طرف جاتے ہوئے رک کر راشد نے اسے جواب دیا جس پر طلحہ نے پھر قہقہہ لگایا۔ عجیب مذاق اڑانے والا انداز تھا۔

"میری فکر میرے والد محترم کریں۔۔۔ ان کی اتنی اپروچ تو ہے نا۔۔۔ ذاتی قابلیت سے زیادہ ایسی چیزیں کام آتی ہیں۔" طلحہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر راشد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اپروچ صرف پریکٹیکل میں کام آتی ہے جہاں آپ ٹیچرز کے تھرو پریکٹیکل لینے کے لیے آنے والے پروفیسر سے سفارش کر سکتے ہیں یا لیب اٹینڈینٹ کی مٹھی گرم کر کے چٹنگ کر سکتے ہیں۔۔۔ پریکٹیکل کے صرف پچیس مارکس ہوتے ہیں باقی کے پچھتر مارکس لینے کے لیے تو پڑھنا پڑتا ہے نا۔"

طلحہ اور راشد اسے نظرانداز کرتے ہوئے اب آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ اس نے سکھ کا سانس لیا کہ اس پر سے تو توجہ ہٹی ان دونوں کی۔

"کوئی پڑھنا وڑھنا نہیں پڑتا۔۔۔ ہم لوگ پڑھ بھی لیں تب بھی سیونٹی فائیو یا زیادہ سے زیادہ ایٹی پرسنٹ حاصل کر پاتے ہیں۔۔۔ پوزیشن تو حاصل کرتے ہیں پروفیسرز کے بچے ٹیچرز کے بچے۔۔۔ ظاہر ہے ان کی اپروچ اتنی پاورفل ہوتی ہے کہ ان کے بچوں کو باقاعدہ نقلیں کروائی جاتی ہیں ان کی مرضی کے نگران متعین کیے جاتے ہیں حتیٰ کہ ان کی جوابی کاپیوں کی مارکنگ بھی ان کے سامنے ہوتی ہے اور اب جو یہ انٹری ٹیسٹ کا شوشا چھوڑ دیا ہے اس سے بھی ان ہی لوگوں کا فائدہ ہو گا۔۔۔ جب ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے تو بلاوجہ ان کتابوں میں سر کھپانے کا فائدہ۔"

طلحہ کی اپنی دلیل تھی۔ اس نے انسٹھ فیصد مارکس لیے تھے۔ وہ امتحان میں کامیاب ہوا تھا لیکن میڈیکل کے میرٹ کے حساب سے وہ بہت پیچھے تھا مگر اسے کوئی بے اطمینانی نہیں تھی۔ وہ اب کلاس روم میں داخل ہو چکے تھے۔

"لازمی نہیں کہ پوزیشن ٹیچرز یا پروفیسرز کے بچے ہی حاصل کریں۔۔۔ اس بار جس لڑکی نے فرسٹ پوزیشن حاصل کی ہے، وہ ایک امام مسجد کی بیٹی ہے اور پھر۔۔۔" راشد بات کرتے رکا تھا اور پھر اس نے اس کی جانب دیکھا تھا۔

"اب اس کی بات مت کرو۔۔۔ یہ تو سائیں لوگ ہیں۔۔۔ ایسے لوگوں پر اللہ کا خاص کرم ہوتا ہے۔۔۔ اب یہی دیکھ لو کہ ہمیں تمہیں آج تک کسی لڑکی نے مخاطب نہیں کیا اور اس کے پاس آکر لڑکیاں نوٹس مانگ کر لے جاتی ہیں بلکہ کالج کا نام بھی بتا جاتی ہیں۔"

طلحہ کی ذہنی رو ہمیشہ بھٹکی رہتی تھی۔ اچھا بھلا سنجیدہ باتیں کرتا وہ ایک بار پھر اس موضوع کی طرف پلٹ آیا تھا۔

"طلحہ! چپ کر جاؤ اب۔" اس نے اسے ٹوکا تھا کیونکہ وہ کلاس روم میں داخل ہو چکے تھے وہاں کافی لڑکے موجود تھے اور ایک بات یہاں پتا چل جاتی تو پھر سب تک پہنچ جاتی تھی۔

"ارے یار ہو جاتا ہوں چپ۔۔۔ نہیں بتاتا کسی کو کہ تمہاری ایک گرل فرینڈ بھی ہے۔" طلحہ باآواز بلند بولا تھا کہ ان کی رو کے کئی لڑکے ان کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ ان سب کی نظریں خود پر محسوس کر کے رونے والا ہو گیا تھا۔

"یہ فزکس کے تمام چیپٹرز کے سولوڈ پرابلمز ہیں۔"

صبا نورین نے فوٹو اسٹیٹ کاغذوں کا ایک پلندہ اس کی طرف بڑھایا تھا۔ اس نے وہ پلندہ پکڑا مگر کھول کر نہیں دیکھا۔ اسے ان پرابلمز میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے ان پرابلمز کو خود حل کرتے ہوئے کبھی کوئی دقت نہیں ہوئی تھی اور باقی کلاس فیلوز کی طرح وہ کبھی کوئی گائیڈ بک بھی اس ضمن میں استعمال نہیں کرتا تھا تو پھر وہ صبا نورین کے ان نوٹس کا کیا کرتا۔ وہ یہ بات اس لڑکی سے کہنا چاہتا تھا مگر اپنی ازلی جھجک اور مروت کی وجہ سے وہ بس اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ جلد از جلد جانا چاہتا تھا کہ وہ لڑکی اپنے ان نوٹس کے بدلے میں اس سے کون سے نوٹس کا مطالبہ کرتی ہے۔

"تمہارے بائیولوجی کے نوٹس بس ٹھیک ہی ہیں۔ میں سمجھ رہی تھی کہ تمہارے نوٹس باقی لوگوں کے نوٹس سے کچھ مختلف ہوں گے ..... مگر۔" وہ لاپروائی بھرے لہجے میں کہتی لمحہ بھر کے لیے رکی۔ وہ اب تک اس سے تقریباً" سب ہی چیپٹرز کے نوٹس لے چکی تھی مگر ایک بار بھی اس کے منہ سے تشکر بھرا یا تعریفی جملہ سننے کو نہیں ملا تھا حالانکہ اس کے نوٹس کی تعریف اس کے ٹیچرز بھی کرتے تھے اور کچھ ٹیچرز تو اس کے نوٹس میں تھوڑی بہت ترمیم کرکے انہیں طلبہ کو "مختلف مگر موثر" بتا کر روپے بھی کما رہے تھے۔

"نوٹس بنانے کے لیے بھی ٹیکنیک چاہیے ہوتی ہے ورنہ تو لاتعداد کتابیں، گائیڈ بکس، ٹیچرز کے دیے ہوئے ہینڈ آؤٹس وغیرہ سب ہی کے پاس ہوتے ہیں ان ہی میں سے نقل کرکے لوگ اپنے نوٹس بناتے رہتے ہیں لیکن میں ایسا نہیں کرتی۔ میں نوٹس بناتے وقت اپنا مواد اپنے الفاظ استعمال کرتی ہوں۔"

وہ اسے شروع دن سے ہی اپنی محبت میں مبتلا محسوس ہوئی تھی۔

"میرے بائیولوجی کے نوٹس تمہارے نوٹس سے زیادہ اچھے ہیں۔ تمہیں چاہئیں تو میں کل لا دوں گی۔" اس کے لہجے میں عظیم سخاوت کی خوشبو جھلکنے لگی۔ اسی دوران طلحہ اور جنید اکیڈمی کے ریسپشن کی طرف آتے دکھائی دیے تھے۔ صبا اور وہ اسی سمت میں کھڑے بات کر رہے تھے۔ طلحہ کے چہرے پر وہی ذومعنویت تھی جس سے وہ خار کھاتا تھا جبکہ جنید جو انہی کا کلاس فیلو تھا اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ چمک رہی تھی۔

"نہیں..... شکریہ..... مجھے کوئی نوٹس نہیں چاہئیں ..... مجھے یہ بھی نہیں چاہئیں۔" اس نے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے فزکس کے نوٹس بھی اسے واپس کر دینے چاہے۔ وہ فوراً" وہاں سے چلے جانا چاہتا تھا۔

"اوہو..... گھر جا کر اطمینان سے دیکھنا..... کاپی کروانا چاہو تو کروا لینا پھر مجھے واپس کر دینا۔ میں آج کل بائیولوجی اور کیمسٹری پر زیادہ زور دے رہی ہوں اس لیے مجھے ان نوٹس کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھا تم کل کیمسٹری کے پہلے پانچ چیپٹرز کے نوٹس لے کر آنا۔ میں بھی لے کر آؤں گی۔ پھر ہم کمپیئر کرکے دیکھیں گے کہ....."

"ہاں ٹھیک ہے..... میں لے آؤں گا۔" اس نے صبا کی بات کاٹ کر کہا پھر مزید کچھ کہے سنے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اس پر جھنجلاہٹ اور گھبراہٹ اس قدر حاوی تھی کہ وہ مزید وہاں رکا ہی نہیں بلکہ عجلت میں اپنی سائیکل نکال کر بڑے گیٹ سے باہر نکل گیا حالانکہ ابھی اکیڈمی کا ٹائم ختم ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ آج کل چونکہ پڑھائی کا بوجھ ذرا کم تھا اس لیے لڑکے بہت جلد فارغ ہو کر کلاس روم میں یا باہر بیٹھ کر گپ شپ وغیرہ میں مصروف رہتے تھے۔

وہ لڑکے جو پڑھائی کے لیے سنجیدہ تھے اور وقت ضائع کرنے کے خلاف تھے وہ لیب میں جا کر فزکس کے پریکٹیکل کرنے لگتے تھے۔ کوئی کاکروچ یا مینڈک وغیرہ لیب میں مل جاتا تو ڈائی سیکشن کرنے والوں کا بھی ہجوم لگ جاتا۔ اسے مینڈک کی چیر پھاڑ کا اچھا تجربہ ہو چکا تھا اس لیے آج راشد اپنے گھر سے ایک مینڈک ڈھونڈ ڈھانڈ کر لایا تھا لیکن طلحہ کے رویے اور جنید کی مسکراہٹ نے اسے اتنا پریشان کر دیا کہ وہ وقت ختم ہونے سے پہلے ہی گھر کی جانب چل پڑا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ طلحہ کے کسی قسم کے ریمارکس جنید کو

مشکوک کریں۔ طلحہ اگر دوستوں میں منہ پھٹ مشہور تھا تو جنید پوری اکیڈمی میں منہ پھٹ مشہور تھا حالانکہ اکیڈمی کا ماحول اس قدر گھٹا ہوا نہیں تھا۔ لڑکے لڑکیوں کی کلاسز الگ ہونے کے باوجود ان کی آپس میں بات چیت پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ یہ اور بات کہ زیادہ تر لڑکیاں اوور ایج اور نکمے اسٹوڈنٹس سے زیادہ مخاطب ہونے کے بجائے ذہین لڑکوں سے بات کرنا پسند کرتی تھیں۔ صبا کو بھی اس میں اتنی ہی دلچسپی تھی کہ وہ اس کے نوٹس لینا چاہتی تھی لیکن طلحہ اس چیز کو ایک رنگین داستان قرار دینے پر تلا ہوا تھا۔

جنید کی مسکراہٹ سے ایک نئے خدشے میں مبتلا ہو کر اس نے سوچا تھا کہ وہ طلحہ سے بات کرے گا کہ وہ اس مذاق کو یہیں ختم کردے مگر اس کا موقع نہیں ملا تھا۔ مذاق مذاق میں بات بہت دور تک نکل گئی تھی اور اس کا اندازہ اسے چند روز بعد ہوا۔



ان دونوں کے درمیان ہونے والے اس پہلے جھگڑے نے ان کے تعلق کو ایک نیا موڑ دیا۔ اس سے پہلے وہ ایک دوسرے کی محبت میں گم ہر چیز سے لاپروا تھے لیکن اس سنگین نوعیت کے جھگڑے نے بالآخر انہیں حقیقت کی پہلی سیڑھی پہ لا کھڑا کیا تھا جس کے اختتام پر ان کے سامنے زندگی کا چہرہ مزید واضح ہو جاتا۔ اس سے پہلے وہ ایک دوسرے کے لیے فرشتہ تھے لیکن اس جھگڑے نے انہیں باور کروا دیا تھا کہ ان دونوں میں خوبیاں ہی نہیں خامیاں بھی ہیں۔ انہیں احساس ہوا تھا کہ محبت کی عینک لگا کر دیکھنے سے انسان فرشتہ نظر آتا ہے' اصل میں ہوتا نہیں ہے۔

وہ رات ان دونوں نے جلتے کڑھتے ہوئے گزاری۔ ایک دوسرے کے خلاف اس جھگڑے نے ان کے دل میں اتنی بیزاری پیدا کر دی تھی کہ وہ خود کو ہی کوستے رہے۔ عمر کو خود پر غصہ تھا کہ اس نے امائمہ جیسی بدتمیز لڑکی کا انتخاب لائف پارٹنر کے طور پر کیا ہی کیوں' جبکہ امائمہ دل ہی دل میں اپنی امی سے جھگڑتی رہی کہ انہوں نے عمر جیسا ضدی لڑکا اس کے لیے پسند کیا تھا۔ گزشتہ چھ ماہ میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر اور ہاتھوں میں ہاتھ دے کر کیے گئے وعدے اور دعوے یک دم ہی تاش سے بنے محل لگنے لگے تھے۔

عمر اس کے کمرے سے چلے جانے کے بعد کافی دیر تک مٹھیاں بھینچ بھینچ کر بڑبڑاتا رہا جبکہ وہ نچلے کمرے میں جا کر بڑبڑانے کے ساتھ آنسو بھی بہاتی رہی۔ آنکھوں میں نیند اتر آنے تک وہ خیالوں میں ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑا کرتے رہے' ایک دوسرے کو غلط کہتے رہے اور ایک دوسرے کے ساتھ بات نہ کرنے کا عہد کرتے رہے۔

اگلی صبح ان کے اس چھوٹے گھر کی ایک عجیب صبح تھی۔ ان دونوں پر ہی نہیں سارے ماحول پر بیزاری چھائی ہوئی تھی مگر اس چیز کو تسلیم کرنے کے لیے وہ دونوں ہی تیار نہیں تھے۔ امائمہ کی آنکھ کھلی تو عمر پہلے سے کچن میں موجود ناشتہ بنا رہا تھا۔ امائمہ نے کھٹ پٹ کی آوازوں سے اندازہ لگا کر مندی مندی آنکھوں سے اس کا مکمل جائزہ لیا تھا۔ وہ آفس جانے کے لیے بالکل تیار تھا۔

"اونہہ۔۔۔ کیسے ہیرو بن کر کھڑا ہے جیسے کوئی قلعہ فتح کر لیا ہو۔ میری کتنی انسلٹ کی محترم نے رات کو مگر چہرہ دیکھو کتنا فریش لگ رہا ہے۔ شرٹ بھی وہ ہی پہن لی ہے جس میں کچھ زیادہ ہی ہینڈسم لگتا ہے۔۔۔ مرد ہے نا' اس کو کیا احساس کسی کے دل کا۔۔۔ ایکسکیوز نہ کرے مگر بندہ شرمندہ تو نظر آئے۔"

امائمہ نے کڑھ کر سوچا اور خفگی سے منہ موڑ کر کروٹ بدل لی۔ عمر نے اس کو کروٹ بدلتے دیکھ لیا تھا اور اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کن اکھیوں سے اس کا جائزہ لے چکی ہے۔ وہ منہ کا زاویہ بگاڑ کر الیکٹرک کیٹل سے ابلتا ہوا پانی کپ میں انڈیلنے لگا۔

"اونہہ۔۔۔ مہارانی کے نخرے دیکھو' ابھی بھی بوتھا ایسا سجایا ہوا ہے جیسے ساری غلطی میری ہی ہے۔ رات بھر مزے سے سوتی رہی ہیں محترمہ اور ابھی بھی کروٹ

ایسے برلی ہے، جیسے میں نے انہیں بہت ڈسٹرب کر دیا ہو ...... کتنی بے حس عورت ہے ...... ایکسکیوز نہ کرے مگر شرمندہ تو نظر آئے۔"

ٹی بیگ کو ابلتے پانی میں ڈبکیاں دیتے ہوئے وہ ناک منہ پھلا کر سوچ رہا تھا۔ ناشتہ بنا کر وہ ٹرے اٹھائے دوبارہ کمرے میں چلا گیا تھا جبکہ امائمہ اس کی اس حرکت سے مزید جل بھن گئی تھی۔ اس کا بدلہ اس نے اس انداز میں لیا کہ عمر کے آفس جانے تک وہ اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں اور سوتی بنی رہی۔ عمر کے دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی وہ تن فن کرتی اٹھی اور باتھ روم میں گھس گئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے لیے چائے بنائی، ٹی وی لگا کر دیکھا، پرانے اخبار میگزین دیکھتی رہی مگر کچن میں دوبارہ جھانکنا پسند بھی نہیں کیا۔

وہ خود کو مصروف رکھتی رہی مگر ذہن بار بار عمر اور اس کے رویے کے متعلق سوچ کر کڑھنے پر مجبور کرتا رہا۔ جلنا کڑھنا اتنا برا عمل نہیں ہے جتنا اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ اندر کی بھڑاس کو باہر نکال کر انسان کو ہلکا پھلکا کر دیتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے پریشر ککر کے اوپر رکھی سیٹی ہٹا دو تو اس کے اندر کا پریشر بھاپ بن کر اڑ جاتا ہے بالکل اسی طرح جلنا کڑھنا بھی غصے کے لیے بھاپ کا کردار ادا کرتا ہے۔

سارا دن جلنے کڑھنے کے بعد امائمہ کا غصہ کافی کم ہو گیا تھا۔ دوسری جانب عمر آفس میں بھی امائمہ کے رویے پر ناراض رہا، منہ پھلائے، کولیگز، کسٹمرز اور کلائنٹس کو ڈیل کرتا رہا مگر دھیان لمحہ بھر کے لیے بھی امائمہ کی جانب سے نہیں ہٹا تھا۔ امائمہ کا خیال کرتے ہی اسے غصہ آنے لگتا اور پھر وہ جلنا، کلسنا شروع کر دیتا اور یوں ان دونوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی جلتے، کڑھتے، کلستے اپنا اپنا غصہ کافی کم کر لیا تھا۔

گھر واپس آ کر عمر نے اپنے آپ کو "پر سکون" رہنے کا مشورہ دیا تھا سو وہ غصے کا اظہار کرنے کے بجائے روٹین کی طرح فریش ہو کر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گیا تھا مگر اس نے امائمہ کو روزانہ کی طرح مخاطب نہیں کیا تھا۔ امائمہ بھی اپنے آپ کو "تحمل" کا مشورہ دے چکی تھی۔ اس نے بھی عمر کو بنا مخاطب کیے کہ جو اس کی روٹین تھی، کافی کا مگ ٹرے میں رکھ کر اس کے سامنے رکھا اور اپنا مگ لے کر کشن پر آ بیٹھی۔

پہلے چند گھونٹ تک وہ دونوں خاموش رہے، کن اکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، پھر ایک دوسرے کی چوری پکڑی اور منہ کے زاویے بگاڑ بگاڑ کر ایک دوسرے کو دیکھا اور سب سے آخر میں وہ دونوں خود کو مسکرانے سے روک نہیں سکے تھے۔

ثابت ہوا محبت میں لڑنے جھگڑنے کا عمل تخریبی نہیں تعمیری ہوتا ہے۔

"اگر تم چاہو تو مجھ سے ایکسکیوز کر سکتی ہو۔"

رات کو بیڈ پر لیٹے اس کے بالوں میں نرمی سے انگلیاں چلاتے ہوئے عمر نے شرارتی انداز میں کہا تھا۔ ان کے درمیان گزشتہ جھگڑے کے موضوع پہ ہونے والی یہ پہلی بات تھی۔ امائمہ اس کی بات کے رد عمل میں چند لمحے خاموش رہی۔ گزشتہ رات انہوں نے جھگڑ تو لیا تھا لیکن صبح سے لے کر اب تک کہیں نہ کہیں وہ دونوں ہی شرمندہ ہوتے رہے تھے لیکن جھگڑے کا ذمہ دار بننے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ اسی لیے عمر کے اس طرح کہنے سے امائمہ فوراً" کچھ نہیں بولی۔

"میں کر لیتی ہوں ...... لیکن۔" وہ کچھ الجھی ہوئی تھی اسی لیے درمیان میں رک گئی مگر پھر نجانے کیا سوچ کر بولی۔

"اوکے ...... آئی ایم سوری ...... میں ہائپر ہو گئی تھی۔" عمر کو ایکسکیوز کرنے میں اس کا پہل کرنے کا عمل بے حد بھایا۔ مرد مشرق کا ہو یا مغرب کا، عورت کی فرماں برداری، صلح جوئی اسے بھاتی ہی ہے۔ عمر نے اس کی طرف رخ موڑ لیا تھا۔ ان دونوں نے ایک ہی تکیے پر سر رکھا ہوا تھا۔

"می ٹو سوری یار ...... میں بھی ہائپر ہو گیا تھا ...... میں نے کافی مس بی ہیو کیا تم سے۔"

عمر کا لہجہ، امائمہ کے بالوں میں گھومنے والی اس کی انگلیوں سے بھی نرم تھا۔ یہ رات کا فسوں تھا نہ کمرے میں پھیلی نیلی خوابناک روشنی کا اثر کہ جس نے عمر کے

دل سے خفگی کے تمام اثرات مٹا ڈالے تھے۔ یہ صرف امامہ کی سمجھ داری تھی کہ اس نے رات کے اس پہر انا کے زعم میں آکر ایکسکیوز کرنے سے انکار نہیں کیا تھا۔ تب ہی عمر کا موڈ پہلے سے کہیں زیادہ خوش گوار ہو گیا۔

"گزشتہ چوبیس گھنٹے میری زندگی کے خراب ترین چوبیس گھنٹے تھے امامہ۔۔۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں کون سا وقت اپنی زندگی میں دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتا تو میں ان ہی چوبیس گھنٹوں کا نام لوں گا۔۔۔ میں زندگی میں دوبارہ کبھی جھگڑا نہیں چاہتا امامہ۔۔۔ تم سے تو کبھی بھی نہیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میں بھی تم سے دوبارہ جھگڑا کبھی نہیں کرنا چاہتی عمر! لیکن پلیز تم مجھے کبھی دوبارہ اپنے کسی فرینڈ سے مت ملوانا۔ اگر تمہارا کوئی فرینڈ مجھے دوبارہ کبھی اس طرح گریٹ کرنے کی کوشش کرے گا تو میں۔۔۔ میں پھر سے ہائپر ہو جاؤں گی۔ میں ایسی بدتمیزی دوبارہ برداشت نہیں کر سکتی۔" امامہ نے اپنی بات مکمل کر ہی لی تھی۔ وہ ماحول کو کشیدہ نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اس وقت عمر پر اپنا موقف واضح کرنا بھی ضروری تھا۔

"وہ میرا فرینڈ نہیں تھا۔۔۔ وہ میری فرینڈ کا ہزبینڈ تھا اور وہ اتنا برا نہیں ہے۔ میں اس سے زیادہ بار تو نہیں ملا لیکن جتنی بار بھی ملا ہوں، میں نے اس میں کوئی خرابی نہیں دیکھی۔ وہ بہت نائس ہے۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اسے تم سے اس انداز میں پیش نہیں آنا چاہیے تھا ورنہ وہ محتاط رہتا۔"

عمر نے اسے اپنے انداز میں اپنے دوست کی صفائی دی تھی۔ امامہ کا مزاج ایک دفعہ پھر برہم ہونے لگا تھا۔

"ہاں! بہت نائس تھا وہ۔۔۔ تعارف ہوتے ہی گلے ملنے کو دوڑ پڑا۔۔۔ اسٹوپڈ۔۔۔ اسے آج تک کسی نے یہ نہیں بتایا کہ مسلمان عورتیں ہاتھ نہیں ملاتیں مردوں سے کجا کہ انہیں گلے لگانا۔"

وہ ناک چڑھا کر بولی تھی۔ اس کے سامنے اس کا مسلمان شوہر تھا تب ہی وہ بار بار اسی بات کا حوالہ اتنے آرام سے دے پا رہی تھی۔ اس کی اپنی فیملی کا کوئی مرد ہوتا تو اسی بات کا بار بار حوالہ دینے پر جذباتی ہو جاتا مگر یہ عمر تھا وہ جذباتی نہیں ہوا تھا مگر زچ ہو گیا تھا۔

"کیا تم اس بات کو بھول نہیں سکتیں۔۔۔ تمہیں نہیں لگتا کہ ہم ایک بے کار بحث میں الجھ رہے ہیں۔۔۔ ایک بار پھر۔" عمر نے اکتا کر کہا تھا۔

"بے کار کی بحث۔۔۔؟ یہ بے کار کی بحث ہے عمر۔۔۔ مجھے تو ابھی بھی سوچ کر گھن آتی ہے کہ کیسے۔" وہ لمحہ بھر کو رکی پھر بولی۔

"عمر! اسے اتنا احساس تو ہونا چاہیے تھا کہ ایک مسلمان عورت۔۔۔"

"گڈ لارڈ۔۔۔ یار! تم اس بات کو ختم کرو اب۔۔۔ مسلمان عورت۔۔۔ مسلمان عورت۔۔۔ تم بار بار اس بات کو کیوں درمیان میں لے آتی ہو۔ یہ کوئی مذہبی معاملہ تو نہیں ہے نا اور مذہب کسی کے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوتا۔"

عمر اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ عمر نے اپنی اکتاہٹ کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

"یہ مذہبی معاملہ ہی تو ہے اور مذہب ماتھے پر ہی لکھا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے انداز و اطوار بتا دیتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔" امامہ نے اپنے لہجے کو دھیما رکھا تھا۔ ان کے درمیان یہ باتیں عام انداز میں ہو رہی تھیں۔ ماحول کو وہ دونوں ہی کشیدہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

"مائی ڈیئر امامہ عمر! میں آپ کو، اگر آپ چاہیں تو کچھ ایسے مسلمانوں سے ملواؤں گا کہ آپ نہ صرف حیران بلکہ پریشان ہو جائیں گی۔ مسلمان اب نام کے مسلمان رہ گئے ہیں محترمہ۔۔۔ وہ تمام الٹی سیدھی ایکٹوٹیز کے بعد بھی خود کو فخر سے مسلمان کہتے ہیں۔۔۔ آپ ایک وین ولسن کو دیکھ کر خفا ہیں میں آپ کو ایسے ایسے اللہ دتا اور غلام مصطفیٰ دکھاؤں گا کہ آپ اپنے کانوں کو ہاتھ لگائیں گی۔"

اس نے امامہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔ امامہ چند لمحے چپ چاپ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"خامیاں یا خوبیاں انسانوں میں ہوا کرتی ہیں

مذاہب میں نہیں۔ مذاہب سچے ہوتے ہیں' اچھے ہوتے ہیں۔ ان کو ماننے والے سچے ہوتے ہیں' اچھے ہوتے ہیں مگر مذاہب کسی شخص کی برائی یا اچھائی کے ضامن نہیں ہوتے۔ اسی طرح اسلام کا ہر ماننے والا واقعی ماننے والا ہے یا نہیں یہ تو کوئی نہیں بتا سکتا۔"

امائمہ بے حد نرم لہجے میں بات کر رہی تھی۔ گفتگو کا رخ کہیں سے کہیں چلا گیا تھا۔ عمر نے اس کی بات کو سن تو لیا تھا مگر جواباً" وہ سوچ میں پڑ گیا تھا پھر چند لمحے کچھ سوچنے کے بعد وہ بولا تھا۔

"میں زیادہ اچھا مسلمان نہیں ہوں.... مگر۔"

"اسلام میں ہر بات بہت کلیئر ہے۔ یہ سالن میں ڈالے جانے والا نمک مرچ یا چائے میں ڈالی جانے والی پتی نہیں ہے کہ اس کی تھوڑی یا زیادہ مقدار سے کسی قسم کی گریڈنگ کی جا سکے۔ مسلمان یا ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ اس میں کوئی درمیانی راستہ نہیں ہے۔ اسلام ہمیں کچھ طور طریقے بتاتا ہے' کچھ اصول وضع کرتا ہے اور زندگی گزارنے کے کچھ آئین یعنی "دین" دیتا ہے۔ اب طور طریقوں کو ماننے والا' ان اصولوں کو اپنانے والا اور اسلامی آئین یعنی دین کے رستے پر چلنے والا شخص ہی مسلمان کہلانے کا حق دار ہے۔

بات بہت سادہ ہے اور بہت پیچیدہ بھی ہے.... ہم اگر یہ کہیں کہ اللہ ایک ہے اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں اور اس کے بعد ہم یہ کہیں کہ ہم پانچ نمازیں پڑھے بغیر بھی مسلمان ہیں تو یہ غلط ہے۔ اسلامی مدار میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ ایسا دوغلا تضاد اللہ کو پسند نہیں۔ اس طرح سے کہنے کا مطلب ہے کہ آپ اللہ کے احکامات سے منکر ہیں۔ آپ اللہ کو مانیں اور اس کے احکام کو نہ مانیں اور پھر بھی آپ یہ کہیں کہ آپ مسلمان ہیں تو یہ غلط ہے۔ اسلام میں اللہ ہے' رسول ہے' قرآن ہے' سنت ہے اور حدیث ہے اس کے بعد کچھ نہیں ہے فقط نرمی ہے آسانی ہے' راحت ہے' سکون ہے۔ اللہ نے جن چیزوں کو لازم قرار دیا اور "فرض" ٹھہرا دیا' ہم کسی طور ان سے منکر نہیں ہو سکتے اور جب چیزوں کو اللہ کے رسول نے اپنا کر ہمیں رستہ دکھا دیا' اس کے خلاف جا کر ہم مسلمان کہلانے کے حق دار نہیں.... اس لیے تم مسلمان ہو' تم میں بہت سی ایسی اچھی عادتیں ہیں جن کو اپنانا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے لازم قرار دیا اس لیے تم مسلمان ہو لیکن تم عبادت گزار نہیں ہو کیونکہ تم نماز تو کبھی کبھار ہی پڑھتے ہو.... اس لیے اگلی دفعہ بات کرتے ہوئے تم خود کو "اچھا مسلمان" یا "کم اچھا مسلمان" مت کہنا بلکہ اچھا "عبادت گزار" یا "کم اچھا عبادت گزار" کہنا۔"

اپنی بات مکمل کر کے اس نے گہری طمانیت بھری سانس لی تھی۔ اسے خوشی تھی کہ عمر نے اس کی بات کو پوری طرح سنا تھا جبکہ عمر اس کے چہرے کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں مجھے اس طرح نہیں کہنا چاہیے تھا کہ میں مسلمان نہیں ہوں۔" عمر نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ اس کے انداز پر امائمہ ذرا سا مسکرائی۔ اسے احساس تھا' وہ غصے میں کافی برا بھلا کہہ گئی تھی اسے۔ اس نے عمر کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"تم نے کل ایک بہت غلط بات کہی تھی' تم مسٹر ولسن کو ڈیفینڈ کیوں کر رہے تھے' تمہیں اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

عمر نے بہت نرمی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے سے ہٹا لیا تھا۔

"اس کے باوجود.... اس کے باوجود امائمہ' تمہیں کیٹیگرائز کرنے کا حق نہیں ہے کہ میں مسلمان ہوں یا نہیں ہوں۔ کسی بھی انسان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسان سے اس کے مذہب کا ثبوت مانگے بعض اوقات تم مجھے بہت "ریجڈ" لگتی ہو۔ جیسے کہ تم نے کل برتاؤ کیا۔ میں حیران ہو گیا تھا۔ میں کل بھی کسی کو ڈیفینڈ نہیں کر رہا تھا۔ میں آج بھی بحث نہیں کر رہا ہوں۔ میں تمہیں ایک بات سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں اتنا کنزرویٹو' اتنا ریجڈ مت بنو۔ یہ سر ڈھکنا' اسکارف پہننا' بار بار دوسروں کو مسلمان نہ ہونے کا طعنہ دینا.... یہ غلط ہے۔"

عمر نے اس کے چہرے کے گرد نادیدہ دائرہ کھینچتے ہوئے لمحہ بھر کا توقف کیا۔

ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولتا ہوا عمر اس لمحے امائمہ کو بہت عجیب لگا۔ اس کے لیے عمر کا یہ روپ نیا نہیں عجیب بھی تھا۔ وہ سب کچھ بھول بھال کر ایک ہی نقطے پر اٹک گئی۔ اس نے عمر کو بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

"تمہیں میرے سر کور کرنے پر اعتراض ہے..... مطلب یہ تمہیں اچھا نہیں لگتا۔" وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بہت حیران ہو کر پوچھ رہی تھی۔ ایک اور جھگڑے والا ماحول بن رہا تھا۔

"مجھے اعتراض نہیں ہے لیکن..... ہاں۔ یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ تم اس کے بغیر زیادہ خوب صورت لگتی ہو۔" وہ اعتراف کر رہا تھا۔ امائمہ کا منہ بن گیا۔

"تم نے پہلے کبھی نہیں کہا..... یعنی کبھی روکا نہیں مجھے..... آج سے پہلے۔" اس کا لہجہ ایک بار پھر روکھا ہو گیا تھا۔

"اوہو..... میں کیوں روکوں گا تمہیں..... مجھے یہ اچھا نہیں لگتا' یہ میرا پرسنل معاملہ ہے اور تم اس کو پہنتی ہو' یہ تمہارا پرسنل معاملہ ہے۔ تمہیں اگر یہ پسند ہے تو تم کو اسے استعمال کرنے کا پورا حق ہے۔"

عمر کو اس کے چہرے سے اس کی خفگی کا اندازہ ہو رہا تھا اس لیے وہ قدرے اکتا کر بولا۔ وہ گفتگو کو ایک اور جھگڑے پر ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ امائمہ بھی یہ نہیں چاہتی تھی' اس نے ہونٹ بھینچ کر چہرے کے تاثرات کو نارمل کرنا چاہا۔

"تھینک یو سوچ..... یہ واقعی میرا پرسنل معاملہ ہے..... تمہارے کہنے پر میں اس ترک نہیں کر سکتی۔" کوشش کے باوجود وہ خود کو نارمل نہیں کر پائی تھی۔

"آف کورس..... میں بھی یہی کہہ رہا ہوں تمہیں ..... اور پلیز اب اس ٹاپک کو یہیں ختم کر دیں تو بہتر ہے۔"

امائمہ چند لمحے خاموش بیٹھی کچھ سوچتی رہی پھر اس کو یہی بہتر لگا کہ فی الوقت وہ بات کو طول نہ دے سو وہ چپ ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا تھا وہ کسی روز عمر کو سمجھا سکتی ہے مگر بعد میں وہ خود ہی بھول گئی تھی۔ عمر نے بھی دوبارہ کبھی اس کے لباس کے متعلق اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ ان دونوں کو ہی احساس ہو گیا تھا کہ یہ ایک ایسا موضوع ہے جو ان کے درمیان خفگی کا باعث بن سکتا ہے سو وہ اسے دوبارہ چھیڑنا ہی نہیں چاہتے تھے۔

☆ ☆ ☆

"تم کوئی صحت وحت بناؤ یار تمہاری باڈی بہت اسکنی ہے۔ جم جایا کرو' باڈی بلڈنگ کرو' ورک آؤٹ کرو ورنہ تمہارا اکپل بہت عجیب لگے گا کہاں وہ موٹو صبا نورین اور کہاں تم۔"

جنید کے اس مشورے پر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کیونکہ اس وقت طلحہ' راشد اور جنید کے علاوہ بھی کچھ لڑکے کلاس میں ان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ وہ سب ہی اسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ان کے چہرے پر جو مسکراہٹ تھی وہ اسے باور کروا رہی تھی کہ وہ جنید کے مشورے کے پس منظر سے بخوبی واقف ہیں مگر کیسے اور کیوں..... انہیں یہ سب کس نے بتایا تھا۔ اس نے یکدم طلحہ کی جانب دیکھا۔

"ہاں یار جنید اسے کوئی ٹوٹکا بتاؤ موٹے ہونے کا یہ بھی تمہاری طرح کوئی ڈولے شولے (مسلز) بنا لے۔" طلحہ بجائے شرمندہ ہونے کے جنید سے کہہ رہا تھا۔

"ایک موثر ٹوٹکا ہے روزانہ تھوڑا ورک آؤٹ کرو اور صبح نہار منہ ایک گلاس دودھ میں کچا انڈا پھینٹ کر ڈالو پھر آنکھیں بند کر کے غٹاغٹ پی جاؤ۔"

جنید نے ٹوٹکا بتانے میں تاخیر نہیں کی تھی۔ وہ ان سب میں سب سے مضبوط کاٹھی کا مالک تھا اور اپنی عمر سے کافی بڑا لگتا تھا۔

"آنکھیں بند کر کے پینا ضروری ہے کیا؟" سلیم نے دلچسپی سے پوچھا۔ وہ ان سب میں سب سے لمبا تھا

اور دبلا پتلا ہونے کے باعث عجیب سا لگتا تھا۔

"کچا انڈا پینا آسان نہیں ہوتا بیٹا۔۔۔ بہت ہیک آتی ہے اور کافی دیر تک متلی کی کیفیت رہتی ہے لیکن آہستہ آہستہ عادت ہو جاتی ہے اور پھر فائدہ کتنا ہوتا ہے۔ مردانہ باڈی بنانے کے لیے اتنی مشقت تو کرنی ہی پڑے گی۔" جنید اپنے مسلز کو نمایاں کرتے ہوئے مزید کہہ رہا تھا۔ اسے اپنے تومند جسم پر کچھ زیادہ ہی ناز تھا۔

"یخ ایسی مردانہ باڈی جس میں مرد کو الٹیاں ہی لگی رہیں۔" سلیم نے ناک چڑھایا تھا۔

"تمہیں بتا کون رہا ہے۔۔۔ میں تو اپنے اس چوزے کو بتا رہا ہوں جس نے بھینس جیسی لڑکی سے دوستی کی ہے۔" جنید نے دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"وہ میری دوست نہیں ہے۔" اس نے جنید کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ اسے اتنا غصہ آ رہا تھا کہ اس کا دل چاہا' وہ جنید کا منہ نوچ لے مگر اس کے اندر ہمت کی کمی تھی اور غصے کے باعث اس کی آواز اتنی آہستہ تھی کہ کسی نے دھیان ہی نہیں دیا کہ اس نے کیا کہا ہے۔

"کچا انڈا پینے اور الٹیاں کرنے سے بہتر ہے انسان گرل فرینڈ بدل لے۔۔۔ اکیڈمی میں اسمارٹ لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔"

رمیز پہلی دفعہ بولا تھا۔ سب ہنستے ہوئے تائیدی انداز میں اس کی جانب دیکھنے لگے اور یہی وہ لمحہ تھا جب نجانے کیسے اس میں اتنی ہمت آگئی کہ اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل جنید کو دے ماری جسے جنید نے مذاق سمجھ کر کیچ کر لیا تھا۔

"تم سب اپنی بکواس بند کرو۔۔۔ میں نے کہا نا ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ وہ میری گرل فرینڈ نہیں ہے۔"

وہ غرا کر بولا تھا تب ہی سب لڑکوں کو احساس ہوا تھا کہ وہ بُرا مان گیا ہے۔

"ہم بھی کن فضول باتوں میں پڑ گئے ہیں۔۔۔ چلو کل کے ٹیسٹ کے متعلق سر رضوان سے پوچھتے ہیں۔۔۔ نواں چیپٹر بہت لمبا ہے۔ آدھا کل کر لیں گے اور آدھا پرسوں۔۔۔ ٹھیک؟" راشد نے اس کا اندر بھانپ کر سب سے پہلے موضوع تبدیل کرنا چاہا تھا۔ وہ درپردہ اسے ٹھنڈا کرنا چاہ رہا تھا لیکن جنید نے اسے ایسا کرنے نہیں دیا تھا۔

"کر لیں گے کل کا ٹیسٹ ڈسکس۔۔۔ پہلے یہ بات ختم ہو جائے۔۔۔ ہاں بھئی تم بتاؤ ہم سے کیوں چھپا رہے ہو۔۔۔ ساری اکیڈمی کو پتا ہے کہ صبا تمہاری گرل فرینڈ ہے۔"

جنید ہٹ دھرمی سے بولا تھا جس سے وہ مزید تپ گیا۔ حالانکہ وہ بہت دھیمے مزاج کا لڑکا تھا' جو کسی کی بھی اونچی آواز اور سخت لہجے سے خائف ہو جاتا تھا مگر اس وقت اسے اتنا غصہ آ رہا تھا کہ وہ جنید جیسے بھاری تن و توش کے مالک لڑکے سے بھڑ گیا تھا۔

"میں نے کہا نا وہ میری گرل فرینڈ نہیں ہے۔۔۔ تم اپنی بکواس بند کیوں نہیں کرتے۔" وہ جنید کے بالمقابل کھڑا ہو گیا تھا۔

"نہیں کرتا بکواس بند۔۔۔ وہ تمہاری گرل فرینڈ ہے۔۔۔ وہ تمہاری گرل فرینڈ ہے۔۔۔ وہ تمہاری گرل فرینڈ ہے۔۔۔ کرلو جو کرنا ہے۔"

جنید پر اس کی منمناتی آواز کا خاک اثر ہونا تھا۔ الٹا وہ زیادہ بدتمیزی پر اتر آیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور جنید کو دھکا دے دیا۔ جنید نے عقب میں پڑے ڈیسک کا سہارا لیا اور ہاتھ میں پکڑی اسی کی فائل اس کے سر پر دے ماری۔ اس نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ساتھ ہی دو چار گھونسے بھی اس کے چہرے اور پیٹ میں مارے۔ وہی لڑکے جو ان کے ساتھ بیٹھے تھے ان کے درمیان ہونے والے اس جھگڑے سے ڈر کر ادھر ادھر ہو گئے تھے۔ راشد نے باہر نکلنے میں پہل کی جبکہ طلحہ اور رمیز' جنید کو روک رہے تھے۔ جنید کے بھاری ہاتھوں سے اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور اس میں سے خون بہنے لگا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ہلکی نیلی قمیص سرخ خون سے داغ دار ہو گئی۔

"زیادہ ہی شوخی میں آ گیا تھا' اس کو سبق سکھانا

ضروری تھا۔" جنید نے زمین پر تھوکتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔ وہ غصہ جو اس کے دماغ کو چڑھا تھا' وہ جنید کے چند گھونسوں نے لمحہ بھر میں اتار دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس غبارے کی طرح محسوس کر رہا تھا جس میں ہوا بھرتے ہی وہ پھٹ گیا ہو۔

"کیا ہو رہا ہے یہ سب؟" یکدم داخلی دروازے سے ایک سخت گیر آواز سنائی دی تھی۔ باہر نکلنے والوں لڑکوں میں سے کسی نے شکایت کرنے میں دیر نہیں کی تھی۔

پھٹے ہوئے غبارے کے منہ سے مزید خون بہنے لگا۔



میری زندگی کا پندرہواں سال.....

کوہو اور مسٹر ایرک عمروں اور مزاج کے تفاوت کے باوجود تقریباً" ایک ڈیڑھ سال سے خوش حال شادی شدہ زندگی گزار رہے تھے۔ ہمارے فارم ہاؤس پہ ان کا مکمل قبضہ تھا اور فارم ہاؤس میں جو کچھ تھا' مجھ سمیت سب ان کے اختیار میں تھا۔

وہ دونوں ایسے باہم شیر و شکر ہو گئے تھے کہ بعض اوقات میں ان کو دیکھ کر حیران ہوتا کہ یہ پہلے اپنے اصلی روپ میں تھے یا اب ان کا اصل روپ میرے سامنے آیا تھا۔ وہ دونوں خود غرض تھے لالچی' ہمن موجی اور فضول خرچ بھی تھے۔ میں نے دوبارہ کبھی انہیں ایک دوسرے کی مخالفت کرتے دیکھا نہ وہ کبھی میرے سامنے جھگڑے۔

کوہو خوب صورت تھی۔ ماڈلنگ اور اداکاری اس کا جنون تھا۔ اسے سوسائٹی فلنتھروپسٹ فلاحی بن کر رہنا اچھا لگتا تھا۔ وہ جی جان سے بڑی بڑی رقمیں خرچ کر کے اپنے اس جنون کو پورا کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئی تھی۔ وہ مہینے کے زیادہ دن گرینڈ پا کے لندن والے گھر میں گزارتی۔ اس کا حلقہ احباب پہلے سے بھی زیادہ وسیع ہو گیا تھا۔ اس کے سیکڑوں چاہنے والے تھے اور اس کے پرستاروں میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ اب

وہ ڈیزائنرز کپڑے پہنتی تھی۔ مہنگی چیزیں استعمال کرتی تھی جس سے اس کی شخصیت مزید دمکنے لگی تھی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ پراعتماد ہو گئی تھی لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ ابھی تک اسے کوئی قابل ذکر کام نہیں ملا تھا جس سے وہ پائے کی اداکار بن کر سامنے آ سکتی۔ اس نے مشہور جریدوں کے لیے ہزاروں پاؤنڈز خرچ کر کے بہترین شوٹس کروائے تھے۔ لیکن وہ منزل جس کی اسے تلاش تھی ابھی بہت دور تھی۔

مسٹر ایرک کوہو سے بھی دو ہاتھ آگے تھے۔ ان کا شوق بھی میرے گرینڈ پیرنٹس کی دولت کا محتاج تھا۔ وہ سوٹڈ بوٹڈ ہو کر منہ میں پائپ لے کر اپنے حلقہ احباب میں سب سے منفرد اور انٹلکچوئل نظر آنے کے شوقین تھے۔ انہیں کیسینو جانے' بڑی بڑی رقموں پر جوا کھیلنے اور پھر ہار جانے کا خبط تھا۔ وہ ڈربی میں گھوڑوں پر بھی لمبی رقمیں خرچ کرتے اور خوش رہتے۔ مجھے نہیں پتا کہ وہ کبھی جیتے بھی تھے یا نہیں' لیکن وہ اکثر ہارتے تھے۔ مجھ سے وہ دونوں ہی اپنے معاملات زیر بحث نہیں لاتے تھے لیکن میں اب بڑا ہو رہا تھا۔ ان کے رہن سہن اور شاہانہ طرز زندگی سے بہت سی باتیں مجھے خود بخود سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ قدرت نے مجھے ایسی زبردست قوت مشاہدہ عطا کی تھی کہ میں ایک نظر سے بہت سی باتیں ان سنے' ان کہے بنا جان لیتا تھا۔

میرے لیے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میرے گرینڈ پیرنٹس کے پاس اتنی وافر دولت تھی تو ہمارا طرز زندگی اتنا سادہ کیوں رہا تھا۔ ہمارے گھر کا ماحول' ہمارے درمیانے درجے کے دوست' عام رہن سہن..... کسی نے بھی کبھی مجھے احساس نہیں دلایا تھا کہ ہم کوئی ہائی پروفائل خاندان کا حصہ ہیں۔ گرینڈ پا اور گرینی کے دوست ملکوں ملکوں بکھرے تھے لیکن گرینی بھی کبھی خود کو شاہی فرد نہیں سمجھتی تھیں۔ مجھے ہمیشہ اپنا کام خود کرنے اور محنت سے کرنے کا درس دیا گیا۔ انہوں نے جہاں میری لاتعداد خواہشات پوری کی تھیں' وہیں بہت سی خواہشات پر صبر کرنے کی تلقین بھی کی تھی

جبکہ کوہو کے رنگ ڈھنگ کسی مہارانی سے کم نہیں تھے اور یہی حال مسٹر ایرک کا بھی تھا۔ وہ دو دونوں شاہی افراد سے بھی زیادہ شاہی طرز زندگی اپنا چکے تھے۔

ایک بات کا اعتراف میں ضرور کروں گا کہ ان کی قسمت میں کچھ نہ کچھ جادوئی عنصر ضرور تھا۔ ان دونوں کے ملنے سے ہماری دولت کو نمبر لگ گیا تھا اور وہ تیزی سے پھلنے پھولنے لگی تھی جبکہ میں جس کے پھلنے پھولنے کی عمر بھی ان کے سائے میں گہنا رہا تھا۔

ایک مشروم کی طرح جو درختوں کے سائے میں اگتی پھلتی پھولتی ہے اور پھر دھیرے دھیرے مرجھا جاتی ہے۔ اسی طرح ان کے سائے میں پل رہا تھا۔ میں بظاہر آزاد اپنی مرضی کی خود مختار زندگی گزار رہا تھا مگر میری ہر حرکت پر ان کی نظر رہتی تھی۔ وہ ہر بات کے متعلق سوال کرتے تھے اور ہر چیز پر ٹوکتے تھے۔ میں ان کی باتوں سے اکتاتا تھا لیکن میں یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ قانونی طور پر میں ان کا محتاج ہوں' اس لیے ان کی مرضی کے تابع رہنا مجبوری تھا۔

میری زندگی میں دلچسپی کا دائرہ اب میرا اسکول اور میری کتابیں تھیں۔ میں نے اپنا پرانا اسکول "کیو ای جی ایس" جوائن کرلیا تھا۔ میں اپنے ہم عمر دوستوں سے کچھ پیچھے رہ گیا تھا لیکن میرا پڑھائی کا جنون بہت تھا۔ گرینڈ پا کی ذاتی لائبریری اب میرے مصرف میں تھی۔ یہ لائبریری مسٹر ایمرسن کی لائبریری کی طرح شاندار تو نہیں تھی لیکن میرے شوق کی تسکین کا باعث بن رہی تھی۔ مجھے نت نئی چیزیں سیکھنے کا شوق تھا اور مطالعہ کا جنون.... میں زندگی کے چلن پہ راضی اور اس کے طریق پر مطمئن ہوگیا تھا۔

"یہ میری گرل فرینڈ کی دوست ہے۔" ایلی نور نے میری نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے آنکھ مار کر کہا تھا۔ میں واقعی اس سمت سے جیسے چپک کر رہ گیا تھا جہاں وہ دو لڑکیاں خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ میری نظروں کا مرکز براؤن رنگت والی لڑکی تھی اور یہ چیز ایلی نور نے بھانپ لی تھی۔ ہم دونوں دراصل اسی کی کزن کی برتھ ڈے پارٹی میں شریک تھے۔ ایلی نور کی فیملی سے ہمارے دیرینہ مراسم تھے۔ اس کے ڈیڈی اور انکلز گرینڈ پا کو انکل کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ہم ایک ہی علاقے میں رہتے تھے اور ہمارے اسکول بھی مشترک تھے۔ وہ "کیو ای جی ایس" میں بارہویں کلاس میں تھا جبکہ میں چونکہ ایک سال گنوا چکا تھا اس لیے عمر میں اس کے برابر ہونے کے باوجود اسکول میں اس کا جونیئر تھا۔ اس کی کزن رائیل سے بھی میری اچھی دوستی تھی لیکن اس پارٹی میں ایلی نور مجھے گھسیٹ کر لایا تھا۔ رائیل بھی ہمارے ہی اسکول میں تھی لیکن گرلز ونگ چونکہ ہمارے ونگ سے الگ تھا' اس لیے ہم اپنی کلاس فیلوز کو زیادہ جانتے نہیں تھے۔ ایلی نور کا خیال تھا' اس پارٹی میں ہمیں بہت سی ایسی کلاس فیلوز سے ملنے کا موقع ملے گا جو کبھی بہت پہلے جونیئر ونگ "مالبیری ہاؤس" میں ہمارے ساتھ لنچ شیئر کیا کرتی تھیں۔ وہ لڑکی جسے میں دیکھ رہا تھا اسے میں نے پہلے کبھی رائیل کے ساتھ "کیو ای جی ایس" کے مشترکہ ایونٹس میں نہیں دیکھا تھا۔ مگر وہ مجھے نجانے کیوں شناسا سی لگتی تھی۔ مجھے شک تھا کہ شاید وہ "مالبیری ہاؤس" میں ہمارے ساتھ پڑھا کرتی تھی۔ شاید اس کا چہرہ کسی اور چہرے کے ساتھ مشابہت رکھتا تھا' جو مجھے فی الحال نہیں یاد آرہا تھا۔

"اس کا نام کیا ہے ایلی نور.... یہ "مالبیری ہاؤس" میں تھی؟" میں نے اس سے پوچھا۔ اس نے اسنیکس والی ٹرے میری جانب بڑھائی۔ میں نے اس میں سے ایک پیزٹ اٹھالیا۔

"نہیں.... یہ رکزی کی کوئی نئی دوست ہے.... بڑی باکمال لڑکی ہے.... بہت اچھا ڈانس کرتی ہے۔"

وہ اپنے پیزٹ کو بڑے بڑے ٹکڑوں کی صورت منہ میں منتقل کر رہا تھا۔ وہ شکل صورت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا لیکن اس کی حرکتیں اور عادات بہت بے ڈھنگی تھیں۔

"اس کا نام تو بتاؤ؟" میں نے بھی ایک لقمہ لیا۔

"ٹیا.... لڑکی تو اچھی ہے لیکن بہت نخریلی ہے.... موڈ اچھا ہو تو اچھے طریقے سے بات کرتی ہے لیکن اگر

موڈ اچھا نہ ہو تو دیکھتی بھی نہیں ہے۔"

اس نے اپنا لقمہ چباتے چباتے مجھے بتایا تھا۔ میں نے سر ہلایا۔ مجھے ان سب باتوں سے سروکار نہیں تھا۔ میں تو کوئی ایسی بات پوچھنا چاہ رہا تھا جس سے اپنے دماغ میں چلتی کشمکش کو اس کی پہچان دے سکوں۔

"ٹیا..." میں نے دہرایا۔ میں نے یہ نام پہلی بار سنا تھا۔ اسی دوران دھن دی گئی اور آواز بھی بڑھا دی گئی۔ اب بہت تیز میوزک چلنے لگا تھا۔ سب لوگ ہال میں قریب ہونے لگے۔

"آؤ! میں تمہیں اس سے ملواتا ہوں۔" ایلی نور نے میرا ہاتھ گھسیٹا۔ ٹرے ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھی، تیز میوزک کی وجہ سے مجھے اس کی آواز سننے میں مشکل ہوئی تھی۔ وہ رکزی کے قریب چلا گیا جبکہ میں وہیں کھڑا رہا۔ میری کوئی گرل فرینڈ نہیں تھی۔ مجھے زندگی نے کبھی اتنی فرصت ہی نہیں دی تھی کہ میں کسی لڑکی کو متاثر کرنے کے گر سیکھ سکتا اور میری شخصیت ایسی تھی کہ کبھی کسی لڑکی نے مجھ سے دوستی میں پہل کی ہی نہیں تھی۔ سب لوگ جوڑوں کی شکل میں ناچنے لگے، پھر ہانپنے لگے۔ وہ لوگ جو زیادہ پرجوش تھے ابھی بھی سلسلہ برقرار رکھے ہوئے تھے۔ تھک جانے والے دائرے کی صورت میں پیچھے ہٹنے لگے جبکہ تین چار لوگ اس دائرے کے اندر ابھی بھی پرجوش تھے۔ انہی میں وہ لڑکی بھی تھی جس کا نام ایلی نور نے "ٹیا" بتایا تھا۔

وہ نیک لیس بلاؤز اور ٹائٹ اسکرٹ میں ملبوس تھی۔ اس کے پاؤں میں ہائی ہیل شوز تھے لیکن کوئی بھی چیز اس کی مہارت میں رکاوٹ پیدا نہیں کر رہی تھی۔ سب ہی لوگ تالیاں پیٹ پیٹ کر اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں بھی اتنا ہی اچھا ناچ سکتا اور اس کا ساتھ دے سکتا لیکن مجھ میں ایک جھجک سی تھی۔ میں تو تالیاں بھی نہیں بجا رہا تھا۔ میں تو صرف اپنا مشروب والا ہاتھ بلند کر کے اس توانائی والے ماحول کے ساتھ لمحہ بھر کے لیے مکس اپ ہونے کی کوشش کرتا اور پھر خود کو احمق محسوس کر کے ہاتھ نیچے کر لیتا۔ میری نظروں کا مرکز و محور وہی لڑکی تھی اور اسی دوران جب وہ اپنے کندھوں سے نیچے آتے سیاہ گھنگھریالے بالوں کو جھٹکا دے کر گھومی تو مجھے اس کے پرکشش چہرے میں وہ چہرہ یاد آگیا جسے میں کب سے یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تھاتھیا تھیا... تھیا تھیا... تھاتھیا..." میرے ارد گرد چٹیا میں گندھے بال اور گھنگھرو ایک دم واضح ہوئے تھے۔

"میتاراؤ..." مجھے یاد آگیا تھا۔

"میں نے تمہیں ایک نظر میں پہچان لیا تھا۔" ٹیا نے اپنے پرکشش چہرے سے بالوں کی لٹ کو ہٹایا۔ میں شرمندہ ہو کر مسکرایا اور کندھے اچکائے۔ وہ مزید مسکرائی۔

"تم ابھی تک ویسے ہی ہو جیسے پہلے تھے۔" اس نے منہ میں دبی ببل گم کو چبا کر پھیلایا جو ٹھک کر کے پھٹ گیا۔ اسٹرابری کی مہک میرے ارد گرد پھیل گئی۔ اس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک بھی اسٹرابری کے رنگ کی تھی... خوشنما... خوش کن...

"نہیں... اب کچھ بہتر ہو گیا ہوں۔" میں نے سابقہ کی طرح مسکراتے ہوئے جواب دیا، حالانکہ یہ غلط تھا۔ میں اس کے سامنے خود کو آج بھی احمق ہی محسوس کر رہا تھا جبکہ وہ تو وہ تھی ہی نہیں... سر سے لے کر پاؤں تک، مزاج سے لے کر عادات تک حتیٰ کہ اس نے نام بھی بدل لیا تھا۔ میری بات پر اس نے مختصر سا قہقہہ لگایا۔

"پہلے سے کیوٹ ہو گئے ہو۔" اس نے میرے چہرے کو انگلی سے چھوا۔ میں یک دم جیسے ہوا میں معلق ہو گیا۔

"شکریہ... تم بہت بدل گئی ہو۔" میں نے بے ساختہ کہا۔ مجھے تو سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں۔ مجھے امید ہی نہیں تھی کہ وہ مجھ سے اس طرح کھڑے ہو کر بات چیت کرے گی کجا کہ التفات سے بات کرنا۔ وہ ڈانس کے بعد بہت سی نگاہوں کا مرکز تھی۔

"ہاں..... میں پہلے سے زیادہ خوبصورت ہوگئی ہوں۔" اس نے بلاوجہ دانت نکالے۔ وہ میرے قریب ہوگئی تھی۔ اس کا تنفس تیز تھا اور رقص کے باعث اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے بہت اچھا پرفیوم لگا رکھا تھا۔

"کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟" میری خاموشی سے اس نے شاید یہ مفہوم لیا تھا۔

"نہیں... نہیں تو....." میں نے فوراً کہا۔

"تمہیں تو ٹھیک سے ایک لڑکی کی تعریف بھی نہیں کرنی آتی... احمق..." وہ میرے سامنے ہوئی تھی۔ اس نے اپنے بالوں کو ہاتھوں سے سمیٹ کر پونی کی شکل دی پھر کلائی پہ بندھا بینڈ اتار کر اونچا کر کے باندھ لیا۔ اس کی گردن شانے اور ہنسلی کی ہڈیاں مزید نمایاں ہونے لگیں۔ بالوں کی کچھ لٹیں گردن کے گرد محو رقص تھیں۔ پسینے کی چند بوندیں بھی گردن پر چمک رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ شوخ ہوئی۔

"مجھے غور سے دیکھو.... کیا میں بہت خوبصورت نہیں ہوں؟" گردن کو اکڑا کر اس نے زعم بھرے انداز میں دریافت کیا۔ میں تو چاروں شانے چت ہوگیا۔

"تم اگر خوبصورت نہیں ہو.... تو میں اندھا ہوں۔"

میں نے جملہ مکمل کیا اور اس نے قہقہہ۔



"ویک فیلڈ کے لوگ انتہائی خشک ہیں۔ میں یہاں آکر سخت پچھتا رہی ہوں۔" ٹیا نے میرے ساتھ چلتے ہوئے ناک چڑھا کر کہا۔ ایلی نور کی پارٹی کے بعد یہ ہماری دوسری ملاقات تھی جو بظاہر حادثاتی تھی لیکن میرا دل جانتا تھا کہ یہ معجزاتی تھی۔

میں لائبریری سے واپس آرہا تھا جب ایلی نور ملا اور باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ ٹیا اس کی بہن سے ملنے گھر آئی ہوئی ہے۔ میں اس سے جان چھڑوا کر آگے بڑھا تھا اور اپنا راستہ بدل کر اس کے گھر کی طرف ہو لیا تھا۔ میں تب تک اس کے گھر کے عقب میں کھڑا رہا تھا

جب تک میں نے ٹیا کو بیرونی داخلی دروازے سے باہر نکلتے نہ دیکھ لیا تھا اور جب وہ واپسی کے لیے بڑھی تو میں نے فوراً اس کو جالیا تھا لیکن اس نے ناپسندیدگی ظاہر کرنے میں لمحہ بھر نہ لگایا تھا۔

"تم ہندوستان سے کب آئیں؟" میں نے کھسیانا سا ہو کر یہ پوچھ لیا حالانکہ میں پوچھنا کچھ اور چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ چلنے سے عجیب سا سحر مجھ پر طاری تھا میں سوچ کچھ اور رہا تھا کہہ کچھ اور رہا تھا۔

"عرصہ ہوگیا... کافی سال گزر گئے.... ڈیڈی کا ٹرانسفر بہت پہلے ہوگیا تھا یہاں۔ جب تمہارے گرینڈ پا ابھی روپ نگر میں ہی ہوا کرتے تھے.... ہم اٹلی میں بھی رہے ہیں دو سال.... اب تو عرصہ ہوگیا یہاں یوکے میں ہیں۔ چھٹیوں میں ہی جا پاتے ہیں انڈیا۔"

اس کا انداز پہلے سے زیادہ اکتایا ہوا تھا۔ میں نے کن اکھیوں سے بغور اس کا جائزہ لیا۔ وہ اپنے حلیے، چال ڈھال اور انداز گفتگو میں کہیں سے بھی روپ نگر والی میتارا تو نہیں تھی۔ وہ صرف ٹیا تھی۔

"تم کئی سالوں سے یہاں ہو اور کئی سالوں سے ہی پچھتا رہی ہو۔"

میرے منہ سے ایک بار پھر بے معنی و بے مقصد جملہ پھسلا۔ میں شاید اپنے حس مزاح کا استعمال کر کے اسے ہنسانا چاہ رہا تھا۔ وہ مسکرائی تک نہیں تھی۔ مجھے بہت شرمندگی ہوئی۔

"اتنے سالوں سے ہم اس فضول ویک فیلڈ میں نہیں رہ رہے تھے۔ یہاں تو مجھے ڈیڈی کی وجہ سے آنا پڑا میں اور میرے بھائی کارڈف میں رہے تھے۔ میرے سب دوست وہاں ہیں۔ میرے بھائی بھی یہاں نہیں آئے۔ وہ وہیں ہیں۔ اسی لیے میں پچھتا رہی ہوں۔"

وہ سابقہ اکتائے ہوئے انداز میں بولی۔ اس لمحے مجھ پر ایک ادراک ہوا۔ مرد کے لیے یہ بہت بڑا طعنہ ہے کہ اس کی موجودگی میں کوئی عورت اکتاہٹ کا شکار ہو۔ عورت کی ایک مسکراہٹ کی خاطر وہ ڈگڈگی والا بندر یا سرکس کا ہاتھی گھوڑا بھی بننے کو تیار ہو جاتا ہے۔ میرا دل چاہا کہ میں بغل میں دبی کتابیں منہ میں دبے

ؤں اور گھٹنے کے بل بیٹھ کر یا ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر اس کوئی کرتب دکھا سکوں تاکہ وہ مسکرانے لگے اور تالیاں بجانے لگے۔ عورت کی قربت کس قدر دماغی خلل کا باعث بن سکتی ہے' ثیا عرف میتاراؤ کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے سوچا تھا اور خود کو کسی احمقانہ بات سے روکا تھا۔ ویسے قصور میرا بھی نہیں تھا۔ سترہ سال کا ہو جانے کے باوجود مجھے آج تک کسی لڑکی نے سمرائز نہیں کیا تھا۔ یہ اس کی شخصیت کی کشش تھی جو مجھ پر سحر طاری کر رہی تھی۔

"تمہیں ابھی زیادہ دوست نہیں ملے ہیں۔ اس لیے شاید تم اکتاہٹ کا شکار ہو رہی ہو.... جب تمہارے فرینڈز بن جائیں گے تب تمہاری ساری بے زاری دور ہو جائے گی.... ویک فیلڈ کے لوگ بہت ملنسار اور محبت کرنے والے ہیں۔"

میں اسے تسلی اور درپردہ دوستی کی پیشکش ایک ساتھ دے رہا تھا۔ اس نے بنا تاثر ظاہر کیے اپنی جینز کی پاکٹ میں سے ہاتھ ڈال کر ایک ببل گم برآمد کی۔ اس کا ایک ٹکڑا اس نے اپنے منہ میں ڈالا اور دوسرا میری جانب بڑھا دیا' جسے میں نے شکریہ کے ساتھ وصول کر لیا۔

"یہاں میرے دوست خاک بنیں گے.... یہاں کے لوگوں سے میرا مزاج ہی نہیں مل رہا.... غیر ضروری طور طریقے مجھے غیر فطری لگتے ہیں.... چھوٹی سی ببل گم بھی ایک لمبے اونچے شخص کو گردن جھکا کر شکریہ ادا کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ میں کسی سے ایسی دوستی نہیں کر سکتی کہ ہمہ وقت 'شکریہ' 'بہت اچھا' یا 'بہت خوب' کی عملی تفسیر بنی رہوں۔ تم لوگ انہیں مہذب طور طریقے کہتے ہو میں انہیں غیر ضروری تکلفات کہتی ہوں۔ یہ کیسی ملنساری اور محبت ہے۔"

ببل گم چباتے ہوئے وہ بہت اکتائے ہوئے انداز میں کہہ رہی تھی۔ میری ببل گم ابھی ہاتھ میں ہی تھی۔ میں نے جھینپتے ہوئے اس کا ریپر اتارا اور منہ میں ڈال لیا جبکہ ریپر کو فٹ پاتھ پر پڑے ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔

"یہ میں نے پھینک دیا اپنے شکریہ کو دشت بن میں... تم اس کو ملنساری اور محبت کہتی ہو؟" اس نے میری جانب دیکھا اور پہلی بار مسکرائی... صد شکر مسکرائی۔ میری مردانگی کو عجیب سی تسکین پہنچی۔ من پسند عورت کے چہرے پر مسکان لانا کسی معرکے سے کم نہیں ہوتا۔

"تم شاید یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم میرے ساتھ دوستی کرنا چاہتے ہو؟" اس نے راہ میں آنے والے پتھر کو ٹھوکر ماری تھی۔

"تم مجھے ابھی بھی اس قابل نہیں سمجھتیں...؟ میرا شکریہ دشت بن میں پڑا ہے۔"

میں نے مصنوعی حیرانی سے کہا اور پیچھے کی جانب اشارہ کیا جہاں دشت بن تھا۔ اس نے میری جانب دیکھا اور کھل کر مسکرائی۔

"یہ کتابیں دشت بن میں ڈال سکتے ہو؟" اس نے لائبریری کی کتابوں کی جانب اشارہ کیا جو میری بغل میں دبی تھیں۔ وہ چلتے چلتے رک گئی تھی، مجھے بھی مجبوراً رکنا پڑا۔ ہر مرد کی راہ کا پہلا پڑاؤ عورت ہی ہوتی ہے۔ میرے سامنے ٹیا نہیں تھی 'میرا پہلا پڑاؤ تھا۔

میں نے اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھا، جن میں کتابیں تھیں اور ان کتابوں میں میرا دل تھا جبکہ سامنے ایک عورت کھڑی تھی جس کی ہنسی کتابوں سے کہیں زیادہ دلفریب تھی۔ اس کے چہرے پر میرا امتحان لیتی ہوئی آزمائش تھی۔ ایسی مسکراہٹ ایسی چمک ایسی لپک کتابوں کے چہرے پر چمکتی کب دیکھی تھی میں نے۔ میری مزاحمت کمزور ہونے لگی تھی۔ میرا پہلا پڑاؤ میری پہلی دلدل 'میری پہلی عورت... فیصلہ ہو چکا تھا۔ میں پیچھے کی جانب بھاگا اور کتابیں بھی دشت بن میں ڈال دیں 'پھر میں نے ہاتھ جھاڑ کر اس کے سامنے پھیلائے تھے۔ اس نے قہقہہ لگایا۔ میں پرسکون ہو گیا۔

من پسند عورت کا قہقہہ 'قہقہہ نہیں ہوتا ڈگڈگی ہوتی ہے۔

"میرے ڈیڈی 'بھائی 'کزنز اور انکلز... سب کے سب بھیڑیے ہیں۔ یہ ہمیشہ تالیاں بجانے والے بنے رہنا چاہتے ہیں... انہیں چڑ ہوتی ہے اگر کوئی اور ان کے لیے تالیاں بجائے... مجھے اسٹیج پر ناچتا دیکھ کر ان سب کو ویسے ہی موت پڑ جاتی ہے... ان کے خاندانی رتبے کو ٹھیس پہنچتی ہے... اونہہ بھاڑ میں جائیں سب۔" ٹیا نے ہمیشہ کی طرح اپنے گھر والوں کا ذکر آتے ہی ناک چڑھا کر کہا تھا۔

"اس لیے انہوں نے تمہیں گھر سے نکال دیا؟" میں نے دل ہی دل میں اس کے گھر کے مردوں کی تنگ نظری پر تاسف محسوس کیا۔

"انہوں نے مجھے گھر سے نہیں نکالا... میں ہی انہیں چھوڑ کر یہاں آگئی ہوں... میں تمہاری طرح چھوٹا نابالغ بچہ نہیں ہوں... دودھ پینے والا... میں اپنے فیصلے خود کر سکتی ہوں۔"

وہ سابقہ انداز میں بولی تھی۔ اس کی نظریں میری کریم کافی کے کپ پر تھیں جبکہ وہ بلیک کافی پی رہی تھی۔ اب وہ بالکل پہلے والی ٹیا تاراؤ لگ رہی تھی جس کے ہر عضو سے خود پسندی چھلکا کرتی تھی مگر وہ پہلے کی نسبت زیادہ باتونی ہو گئی تھی اور اپنے بارے میں بولنے کے لیے تو ہمیشہ تیار ہو جاتی تھی بالخصوص شخصی آزادی کی بات آتی تو وہ اپنے آپ کو اس کا سب سے بڑا علمبردار ظاہر کرتی تھی اور اس نے بالآخر مجھے بتا دیا تھا کہ وہ اپنے ممی ڈیڈی سے ناراض ہو کر کارڈف سے ویک فیلڈ اپنی کسی سہیلی کے پاس آئی ہے اور اسی کے گھر میں پے انگ گیسٹ کے طور پر رہ رہی ہے۔ اس کے بقول اس کا خاندان اسے پابندیوں میں جکڑ کر رکھنا چاہتا ہے۔ اس کے خاندان کے بارے میں پہلے سے ہی میں گرینڈپا سے کافی کچھ سن چکا تھا۔

اس کا تعلق ہندوستان کے ایک اعلا تعلیم یافتہ سیاسی گھرانے سے تھا۔ اس کے بہت سے انکلز ہندوستانی سیاست کا اہم رکن تھے یا پھر تعلیم کے شعبے سے وابستہ تھے۔ ان کے یہاں یہی دو شعبے تھے 'جو رواج کی طرح ان کے رہن سہن کا حصہ بن چکے تھے لیکن تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اس کے خاندان میں

ذہنی پسماندگی پائی جاتی تھی جس کا اظہار ییتا کی باتوں سے ہو رہا تھا۔ وہ رقاصہ کے طور پر اپنا آپ منوانا چاہتی تھی۔ جس کی اجازت اس کے گھر والے اسے نہیں دیتے تھے۔ اس کا یہ خواب ایک بغاوت سے کم نہیں تھا۔ اس نے گھر والوں کی ضد میں پڑھائی بھی ادھوری چھوڑ دی تھی۔

”تمہاری ممی نے بھی تمہاری حمایت نہیں کی؟“ میں نے اس سے پوچھا تھا۔

”ممی تو ڈیڈی سے بھی زیادہ دقیانوسی اور اشتعال دلانے والی ہیں... وہ مجھے تمہارے ساتھ ان کپڑوں میں بیٹھا دیکھ لیں نا تو انہیں دوسری سانس مشینوں پر دلوانے کے لیے اسپتال لے جانا پڑے۔“

اس نے اپنی جانب اشارہ کر کے بات مکمل کی۔ وہ بغیر آستینوں والی شرٹ کے ساتھ اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ مجھے اس کی ممی کی سوچ پر بھی افسوس ہوا۔

”ہم لوگ دراصل اونچی جاتی کے ہندو ہیں۔ میرے خاندان کے لیے ذات پات اہمیت رکھتا ہے۔ وہ مجھے رقص کرنے کی اجازت اس لیے نہیں دیتے کہ ان کے نزدیک یہ ہمارا مقام نہیں کہ ہم ناچیں اور لوگ تالیاں بجائیں۔“

اس نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا تھا۔ میں نے سر ہلایا۔ ہم ایک پارک میں بیٹھے تھے۔ دھوپ کی حدت کچھ پھیکی سی تھی لیکن نیا کے چہرے پر مجھے بہت مٹھاس محسوس ہو رہی تھی حالانکہ وہ بہت اکتائے ہوئے لہجے میں بات کر رہی تھی لیکن مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا کہ وہ اپنے ذاتی معاملات پر مجھ سے اس طرح کھل کر بات کر رہی ہے۔ میں نے کافی کے ڈسپوزیبل کپ کو مضبوطی سے تھاما۔ وہ لاپروائی سے ٹانگیں ہلاتے ہوئے جھولا جھولتے بچوں کو دیکھ رہی تھی۔

”تمہیں رقص کرنا بہت پسند ہے نا۔“ میں نے بلاوجہ پوچھ لیا حالانکہ اس کا جواب مجھے پتا تھا۔

”پسند بہت چھوٹا لفظ ہے دوست... یہ میرا شوق ہے، میرا جنون، میری لگن۔“ یہ موضوع اس کی توانائی کو بحال کر دیتا تھا۔

”ڈیڈی یہ بات سمجھتے ہیں... وہ بہت مثبت سوچ کے مالک ہیں لیکن اپنی بات منوانے کے لیے خاندان بھر سے ٹکر لینے کی ان میں ہمت نہیں ہے۔ وہ مجھے رقص کرنے سے نہیں روکتے' سراہتے بھی ہیں مگر پبلک پلیس میں رقص کرنے کی اجازت نہیں دیتے... ان کے اپنے ہی عجیب و غریب سے تحفظات ہیں... بہر حال مجھے پروا نہیں...“ اس نے سر جھٹکا تھا۔

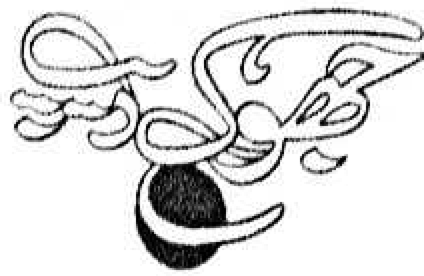
”میں کسی ایکس' وائی' زی کے کہنے پر اپنے شوق سے' اپنے جنون سے منہ نہیں موڑ سکتی... میں اپنی لگن سے' اپنے آپ سے غداری نہیں کر سکتی... میں غدار نہیں ہوں... میں نان ونیج نہیں کھاتی...“ وہ مگن انداز میں کہہ رہی تھی۔ میں چونک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ یہ نیا نہیں تھی۔ یہ تو وہی پرانی بیتا راؤ تھی۔

”میں نان ونیج کھاتا ہوں... مگر غدار نہیں ہوں۔“ میرا لہجہ سپاٹ تھا۔ دل جیسے لرزنے لگا تھا۔ وہ ابھی تک اپنے اسی پرانے ڈھکوسلے کو ساتھ لے کر چل رہی تھی۔

”تم تو رہنے ہی دو دوست! تمہیں کتاب سے محبت ہے نا' شوق سے کتاب پڑھتے ہو نا' اپنے شوق کو اپنی لگن تو بنا نہیں پائے' تم ایک لڑکی کے کہنے پر اپنے شوق کو' اپنی لگن کو کچرے میں پھینک دیا تم نے... مجھے دیکھو میرے جنون کی راہ میں جو بھی آیا میں نے پروا نہیں کی... اپنے ممی ڈیڈی کو بھی چھوڑ دیا مگر اپنی لگن سے منہ نہیں موڑا... میں نے کہا نا میں غدار نہیں ہوں۔“

(باقی آئندہ ان شاء اللہ)

ایمل رضا



آنکھوں کے آگے محبت کے نام کے کن پردے پڑ جائیں تو ہر راستہ محبوب کی چوکھٹ تک جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ کن پردے، بیلوں کو کولہو کے گرد گول گول گھمانے اور گھوڑوں کو سیدھا چلائے رکھنے پر کاربند ہیں۔

سفید موتیا کی دریافت کے وقت شاید میری آنکھوں کے گرد بھی یہی کن پردے پڑ چکے تھے اور ہر

ناولٹ



راستہ گھما پھرا کر مجھے اس کے در تک لے جا رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو اس دلیل کی حقیقت تسلیم کروانے سے ہچکچا تا رہا کہ بعض اوقات یہی کن پردے انسان کو اندھا بھی کر دیتے ہیں اور تب سیدھے راستے، بیچے سہارے اور ٹٹول ٹٹول کر انچ انچ آگے بڑھنے سے بھی انسان کسی ساکت لمحے جان بوجھ کر یا انجانے میں بالکل نئی پہلے سے مختلف غیر مرئی سمت جا مڑتا ہے۔ اس کے برعکس میں نے جب یہ بات زویا کو بتائی تو وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔

اس کے رخسار کشمیری سیبوں کی طرح سرخ ہو کر تن گئے اور انار کے ہموار دانوں جیسے دانتوں نے جیسے کسی جھرنے کو بہا دیا۔ لیکن ان سب کے باوجود اس کی ہنسی روز اول کی طرح زنگ آلود فوارے کی مانند ہی رہی۔ جہاں سے پہلے ہلکے ہلکے ننھے منے قطرے باہر کو ٹپکتے تھے پھر آہستہ آہستہ بڑی سست روی سے پانی فضا میں پروان چڑھتا تھا۔ جیسے ہر وقت موت اور پستی کے احساس سے لرزاں ہو..... ان پندرہ دنوں کی کوئی بیسویں ملاقات میں وہ پہلی بار ہنسی تھی اس طرح دل کھول کر ورنہ تو جب بھی ہنسی کے تبادلے کا وقت آتا وہ صرف پھیکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر دوبارہ اپنی ذات کے خول میں مقفل ہو جاتی۔

اسلام آباد کے بڑی بڑی پرسکون سڑکوں والے خاموش علاقے میں میرے ابا اور میرے چچا کا بیس مرلے کا مشترکہ گھر تھا۔ چند سال پہلے ملکی حالات سے تنگ آ کر میرے چچا نے جیسے اپنی زندگی کی ڈگر بدلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چچا نے ابا سے گھر میں سے اپنا حصہ الگ کر کے کرائے پر چڑھانے کی درخواست کی۔

میرے ابا جی بڑے صلح جُو مرنجان مرنج آدمی ہیں، انہوں نے بغیر کسی دلیل و حجت کے اپنے چھوٹے بھائی کی بات مانی اور گھر کا بٹوارہ کر دیا۔ چھت کے بیچوں بیچ دیوار ہو گئی.... علیحدہ پھاٹک لگوانے کے علاوہ مشترکہ باغ میں بھی اونچی دیوار کروا دی گئی، لیکن اس اونچی دیوار کے آگے اور باغ کی درمیانی انصاف پسندی سے کی گئی بانٹ کے آخری کنارے سفیدے کا ایک موٹے تنے والا اونچا چھتنار درخت تھا۔ درخت کی پُھننگ پر چیلوں کے دو جوڑوں کے دو گھونسلے تھے اور میرا ابا بڑا مرنجان مرنج۔

اس لیے دیوار درخت سے آگے جا کر اگلی دیوار سے ملنے کے بجائے درخت پر پہنچ کر ہی دم توڑ گئی۔ پھر امتداد زمانہ کے تحت یہ بالشت بھر کا خلا بارشوں اور آندھیوں کے باعث دن بدن بڑھتا ہی گیا اور چار سال بعد جب کرائے دار گھر خالی کر کے گئے تو یہ باقاعدہ راستہ بن چکا تھا۔

یہ آسانی میرے لیے تھی یا یوں کہہ لیں کہ اس آسانی کا سب سے زیادہ فائدہ میں نے ہی اٹھایا۔ اس سفید موتیے کی دریافت کے بعد اس خلا میں ایسی ابریشمی کمندوں کے ڈنٹھل اگ آئے، جن سے میں الجھتا، اچھلتا کودتا گرتا پڑتا شام و سحر اس راستے کو عبور کرنے لگا۔ کبھی چوروں کی طرح دبے پاؤں.... کبھی اعلانیہ، کبھی سکندر اعظم کو شکست دینے والے مہاراجہ پورس کی طرح فاتح بن کر.....

ایک سال گزر گیا اور چچا جی کا بے آباد مکان ویران ہوتے ہوتے کھنڈر بن گیا۔ نہ ہی دوبارہ کرائے پر چڑھ سکا اور نہ ہی بک سکا۔ روغن بارشیں اپنے ساتھ بہا لے گئیں.... باغ میں سنہری گھاس نے ڈیرے ڈال لیے.... اور نفاست سے دیواروں پر چڑھی بیلیں بدمست ہاتھی کی طرح جھولنے لگیں، غرض یہ کہ سارا مکان قلعہ روہتاس کی پرانی اینٹیکس کی تصویر کشی کرنے لگا۔ اس ساری صورت حال نے مکان کی قدر و قیمت کچھ مزید گرا دی۔ اوپر سے چچا کے آئے دن کے فون کہ فلاں پارٹی کیا کہہ رہی ہے.... کتنا دینے پر آمادہ ہیں.... کب تک بکے گا۔

لیکن کسی کو مکان پسند نہ آیا اور کسی کی پیشکش ابا جی کے دل کو نہ لگی اور بالآخر سال بعد جب چچا کی جڑیں کینیڈا میں مزید مضبوط ہو گئیں تو ایک دن انہوں نے اعلان کر دیا کہ جتنے بھی پیسے ملتے ہیں مکان بیچ دیا جائے.... کیونکہ انہیں وہاں اپنا کاروبار کرنے کے لیے پیسوں کی اشد ضرورت ہے.... ان ہی دنوں ابا جی نے چچا سے زویا کا ذکر کیا۔

تب مجھے اس بات کا بالکل اندازہ نہ تھا کہ زویا کا یہ ذکر میری زندگی میں ہمیشہ کے لیے موجود رہنے والا ہے۔

میں ان دنوں یونیورسٹی کے بعد فارغ البالی کے دن گزار رہا تھا اور میرا دل بلاوجہ اتنا مست رہتا تھا جیسے مور کو بارش میں رنگ رنگ کی مستیاں سوجھتی ہیں۔ بقول اماں جی میرے اندر کا بچہ ابھی تک بڑا ہی نہیں ہوا۔

مجھے لگا کہ ابا جی محترم کا اشارہ شاید میری ظاہری بدحالی کی طرف ہے۔ اس لیے ان دونوں باتوں کا عملی مقابلہ کرنے کے لیے میں جاگنگ مشین لے آیا.... چلو اور کچھ نہ سہی انسان صحت کے معاملے میں تو سنجیدہ محسوس ہو۔ اس دن جب میں اپنے کمرے میں قدآدم کھڑکی کے آگے جاگنگ مشین پر جاگنگ کرتے رفتار آہستہ آہستہ تیز کر رہا تھا عین اسی وقت اپنے باغ میں لگی موتیے کی بیرونی دیوار کے پار تک گئی بیل کے عقب میں سے میں نے اپنے باپ کو اور زویا کو برآمد ہوتے دیکھا۔

بعض باتیں الہامی ہوتی ہیں۔ اور ان کے واقع ہو جانے کا انسان کو یکایک یقین سا ہو جاتا ہے.... اور اسے دیکھتے ہی مجھے بھی یقین سا ہو گیا کہ چچا کے مکان پر یہی قابض ہو گی.... اور.... اور.... الہام کچھ ادھورا سا تھا اور.... پورا سا بھی۔

ان دنوں وہ رنگین کپڑے نہیں پہنا کرتی تھی بلکہ کسی فلمی بیوہ کی طرح سفیدے میں ہی گھومتی رہتی تھی.... ابھی میری محبت کے دیپوں نے اس کی زندگی

میں روشنی نہیں بھری تھی۔ لہٰذا اس دن بھی وہ سر سے پیر تک سفید لبادے میں ملبوس بے تحاشا کھلے ہوئے سفید موتیے کے پھولوں اور سفید بیرونی دیواروں کے ساتھ پکی ساجھے داری بناتی ہوئی سورج کی رو پہلی کرنوں کو بھی سفید کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ لمحے بھر میں منظر میں موجود ہر ہر چیز سفید کھدر کے غلافوں میں لپٹ کر اس مصرعہ بند کی تشریح کرنے لگی۔

ابا جی اپنے ہاتھوں کے اشاروں میں پورے گھر کے رقبے کو قید کرتے اسے بڑی دیر سے کچھ سمجھا رہے تھے اور وہ بنا بولے اور تاثرات دیئے صرف دیکھتے ہوئے کل دار گڑیا لگ رہی تھی۔ میری انگلی کے نیچے پلس کا بٹن تھا جو رفتار کو تیز کرتا جا رہا تھا اور میری ٹانگیں مشین پر برق رفتاری سے آگے پیچھے ہو رہی تھیں۔ بڑا پھاٹک کھول کر ابا جی اسے باغ دکھاتے باقی کی عمارت دکھانے لے گئے اور جب سفید منظر کی جھلک ایک دم پس پردہ چلی گئی تو میری ٹانگیں گھوڑے کی رفتار سے دوڑ لگاتے لگاتے میرے حال کے عالم وجود میں آئیں 'پلس کے بٹن کا خیال آیا تو دیر ہو چکی تھی اور میں جھٹکے سے زمین پر پہنچ گیا تب اس بھید کا اندازہ بھی نہ تھا کہ یہ پلس کا بٹن آنے والے دنوں میں ہم دونوں کے دل کی دھڑکن بھی اسی طرح تیز کرے گا۔ دراصل انسان صرف دو حالتوں میں ہی اوندھے منہ زمین پر گرتا ہے ایک تو شدت غم سے مغلوب ہو کر دوسرا اپنی ہی کسی غلطی سے ٹھوکر کھا کر۔

فارغ البالی کے دنوں میں اس سفید منظر کی دریافت نے میرے دل کے کونے کونے میں خوشی بھر دی اور مجھ سے اپنی غلطی کا سودا ہو گیا۔ جاگنگ مشین کی تیز رفتاری کام آ گئی اور میں سپرمین کی سی پھرتی کے ساتھ چچا کے گھر پہنچ گیا' ابا کو یہ یاد دلانے کہ چچا کہہ چکے ہیں کہ بس گھر جیسے تیسے بھی اونے پونے بیچ دو۔ گھر کے اندر کے خالی کمروں اور اونچی چھتوں کے باعث ابا کی آواز بازگشت کرتی ہوئی باہر آ رہی تھی۔

اور وہ سفید سارس کی مادہ.... بس دیکھتی.... ہنستی.... اور کوئی سوال و جواب نہ کرتی تھی۔

ایسے خاموش طبع سادہ لوگوں کو تو گھر مفت بھی دے دیا جائے تو کیا حرج ہے.... ایسے سادہ لوح لوگ آج کل ملتے ہی کہاں ہیں۔ چچا نے اتنا تو کما لیا ہوگا اب تک کینیڈا میں.... اس گھر کی رقم سے آخر کتنے اور ڈالر زبنا لیں گے.... اب تو انسان کمانے کا زمانہ ہے۔

"یہ اس گھر کا سب سے بڑا کمرا ہے۔" میں اندر پہنچا تو ابا جی کے ہاتھ مشرق و مغرب کی سمتوں میں پورے کھلے ہوئے تھے۔

"اور اسی کمرے کے عین.... بالکل عین پیچھے میرا کمرہ ہے۔" مشرق و مغرب میں میری آواز گونجی.... دونوں نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ابا جی بڑے صلح جو.... مسجد کے امام.... بیٹے پر ظلم کرنے والے.... محلے کی خاندان کی.... بازار میں گھومتی ہر ماں، بہن بیٹی کی عزت کی حفاظت کے پاسبان سپہ سالار.... رکھوالے.... میرا کان مروڑتے انہیں یہ خیال تک نہ آیا کہ یہ معاملہ گھر جانے تک بھی ملتوی کیا جا سکتا تھا۔

"تمہیں کس نے کہا تھا یہاں آنے کو؟"

اس بے عزتی کا تو مجھے کیا احساس ہوتا بس یہی دیکھتا رہا کہ وہ مجھے سر سے پیر تک دیکھ رہی ہے۔

"ابا جی.... وہ چچا کا فون آیا ہے.... آپ جائیں ان کو گھر میں دکھا دیتا ہوں۔"

"انہیں کہو بعد میں فون کرے.... اور تم گھر جاؤ۔"

"پہلی ہی ملاقات میں ایسی سبکی.... اللہ کرے یہ لڑکی گھر نہ خریدے۔"

لیکن پتا نہیں زویا کو گھر پسند آ گیا تھا.... اسے ٹھکانے کی تلاش تھی یا وہ جلد سے جلد کہیں بسیرا کر لینے کی خواہاں تھی کہ پہلے ہی دن مکان کا سودا ہو گیا۔ ابا جی کے سر سے بھی ایک نہ نظر۔ آنے والی ذمہ داری اتر گئی اور ماں جو چچا کے اس اجاڑ مکان میں کیڑے مکوڑے 'کھٹمل' چوہے پیدا ہو جانے کی وجہ سے ہر وقت بلاوجہ پریشان رہتیں.... تو ان کی پریشانی بھی کم ہوگئی۔

میں اس وقت چھت پر کھڑا مسواک کر رہا تھا اور وہ

باہر سڑک پر ٹرک میں لدا سامان مزدوروں سے نیچے اتروا رہی تھی۔ چھوٹے بڑے کارٹن ایک ایک کر کے سڑک سے مٹی سے اٹے باغ میں جمع ہو رہے تھے۔ اس کا دس بارہ سالہ چھوٹا اجلا اجلا سا بھائی کبھی کسی کارٹن پر بیٹھ کر کھیلنے لگتا تو کبھی ادھر ادھر گھوم پھر کر بڑے بوڑھوں کی طرح جائزہ لینے لگتا۔۔۔ اور کبھی وہ اپنے نئے گھر کے اندر غائب ہو جاتا۔

پتا نہیں مجھے یہ منظر دیکھتے دیکھتے کتنے جگ بیت گئے تھے۔۔۔ اور عورت پر تو کہیں سے بھی نگاہ پڑے اسے خبر ہو جاتی ہے کہ کوئی اسے تاک رہا ہے اور وہ بھی عورت تھی۔۔۔ خبر اسے بھی ہوئی۔۔۔ بڑی دیر تک وہ جیسے میرے ٹل جانے کا انتظار کرتی رہی۔۔۔ پھر قہر بھری نظروں سے اوپر میری طرف دیکھا اور اندر تک ٹھنڈا کر دینے والی امونیا گیس نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا اور میں اس بات کا فیصلہ بھی نہ کر سکا کہ یہ گیس زویا کے وجود سے نکلی تھی یا اس کا سلنڈر میرے دل میں ہی پھٹا تھا۔ کہا تھا نا الہام کچھ تو ہوا تھا۔۔۔ کچھ پورا۔۔۔ کچھ ادھورا سا۔۔۔

انسان فارغ ہو تو کوئی بھی نیا مشغلہ 'نیا عمل محبوب کی طرح ہی دل پسند بن جانے میں زیادہ وقت نہیں لگاتا۔۔۔ انھی مشغلوں میں بہت جلد سرایت کر جانے والے اس بات کا کھوج بھی نہیں لگاتے کہ وہ واپس مڑتے وقت عادی ہو چکے ہیں یا مطلوب۔۔۔

سامان جلد سے جلد اندر پہنچا دینے کی عجلت اور زندگی کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی پیاری تھکن اس کے چہرے پر اتنی دور سے بھی عیاں تھی۔ بڑی دیر تک میرے ہاتھ رکے رہے اور کیکر کی مسواک کے گیلے ریشے میرے داہنے مسوڑے پر پڑے رہنے کی وجہ سے مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہاں کسی نے کڑوے دھتورے کا لیپ کر دیا ہو۔

کچھ پڑوسیوں سے راہ و رسم بڑھانے کا خیال۔۔۔ کچھ کان مروڑے جانے کے واقعے کی دلی شرمندگی مٹانے کا احساس اور کچھ حسن بیاں دیکھنے کا ارادہ۔ مجھے نیچے لے گیا' جلدی جلدی کلی کی۔۔۔ اور اپنے باغ کے راستے ان کے باغ میں پہنچ گیا۔۔۔ بغیر دستک دیے۔۔۔ بنا پھاٹک کا استعمال کیے میں ان کے گھر موجود تھا۔۔۔ بندروں کی طرح اچانک ٹپک پڑنے والے میرے وجود کو اس نے دو سو میگا واٹ بجلی کا جھٹکا کھائے انسان کی طرح دیکھا۔ بعد کے آنے والے دنوں میں بھی حیرانی کے وقت اسے حیران ہونے کے لیے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس کا چہرہ قدرت کی طرف سے ہی جنگل بیابان کا مکمل عکاس تھا۔

اگلے ہی لمحے اس پر شناسائی یا صرف جان پہچان والی رگیں ابھر آئیں۔۔۔ مزدور جو ایک کے اوپر دوسرا کارٹن رکھ رہے تھے لمحے بھر کو رک سے گئے اور پھر مجھے بھی اپنی طرح کا ہی انسان پا کر پھر سے کام میں مست ہو گئے۔

"اب تو کان درد نہیں کر رہا ہو گا آپ کا۔۔۔؟" لہجے میں دھمکی کا عنصر نمایاں تھا۔ میں نے تو اس عنصر کو صاف نظر انداز کر دیا۔

"وہ دراصل ابا جی نے پوچھا ہے کہ اگر آپ کو باغ والے راستے پر اعتراض نہ ہو تو۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ اگر آپ کہیں تو ابا جی یہاں دیوار کروا دیتے ہیں۔"

اس دوران ہی اس نے میری پشت کے پار موجود باغ کے راستے کو دیکھا جو سوکھی مڑی تڑی بیلوں کی وجہ سے بری طرح اٹا پڑا تھا۔

"یہاں سے بڑی کار آمد چیزیں آتی ہیں۔"

"مثلاً"۔۔۔؟" استہزائیہ انداز۔

"مثلاً"۔۔۔ آپ کی موٹر خراب ہے تو ٹھیک ہی سمجھیں۔۔۔ وہاں ہماری طرف سے پانی کا پائپ آجائے گا۔۔۔ صفائی کے لیے وقتی ملازم۔۔۔ اور میں' میں بھی آجایا کروں گا۔"

اس کا چھوٹا بھائی جو نجانے کب وہاں آن کھڑا ہوا تھا پٹر پٹر مجھے دیکھنے لگا۔

"ویسے آپ کے والد صاحب کو کہہ تو دیا تھا کہ مجھے اس راستے پر کوئی اعتراض نہیں۔۔۔ پھر آپ کو کیوں بھیج دیا انھوں نے۔۔۔"

مجھے ایک دم سے یاد آیا کہ ابا حضور امی کو پہلے ہی بتا

چکے تھے .... ابا جی یہاں موجود نہ ہوتے ہوئے بھی جیسے دوبارہ میرا کان مروڑنے لگے .... شرمندہ سا ہو کر میں سر کھجانے لگا۔ وہ میری بے عزتی کر کے پھاٹک سے باہر چلی گئی۔ کافی دیر تک باہر سے سامان ادھر ادھر کرنے کی آوازیں آتی رہیں۔ اتنی دیر میں ایک نیا منصوبہ تیار تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ اندر آئی اس کے ہاتھ میں بڑے لیمپ کا ڈبہ تھا۔ جس کے پیچھے سے صرف اس کا چہرہ ہی نظر آتا تھا.... پھاٹک کے پاس وہ دوبارہ رک گئی اور وہیں کھڑے کھڑے اپنی بھنویں دو تین بار جھٹکے سے اوپر کو ایسے تانی کہ پوچھتی ہو "اب کیا ہے؟"

"ارے .... میں یہ صرف دیوار کی بات تھوڑی پوچھنے آیا تھا میں تو یہ .... بتانے آیا تھا کہ رات کا کھانا آپ مت بنایئے گا ہم بھجوا دیں گے۔"

"یہ تو نوازش ہو گی آپ کی .... ویسے ہمارے یہاں تو اس چیز کو فرض مانتے ہیں .... آپ حق سمجھ کر کر دیں گے۔"

"کتنے لوگ ہیں آپ .... مطلب کھانا ....؟"

"تین لوگ۔"

"تین آپ .... ایک میں اور ایک میری امی .... یعنی کل پانچ .... تو پھر آپ پانچ لوگوں کے لیے برتن نکال کر رکھیے گا رات کو .... ٹھیک ہے۔"

اب کی بار وہ سو میگا واٹ بجلی کا جھٹکا کھائے ہوئے انسان کی طرح مجھے دیکھنے لگی اور لیمپ کا ڈبہ اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔

میرا چھوٹا بھائی فاخر پتا نہیں مشاہدے سے کہتا ہے یا نظریے سے لیکن بس وہ ہر بات سوچتے ہی کہہ دیا کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ میری بے تکلفی بعض اوقات اگلے کے لیے بڑی جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ میری وقتی بے تکلفی بیج کو پھوٹنے .... تنے سے پودے میں بدلنے میں تو مدد دیتی ہے لیکن پھر توجہ کا پانی نہ ملنے پر وہ دوبارہ خربوزے کے دانوں کی طرح کنکر کرتا کارہ بیج میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

معلوم نہیں یہ عادت مجھ میں ہے کہ نہیں .... پر بار

بار فاخر کے منہ سے سنتے رہنے کے بعد میں بھی اس بات پر صدق دل سے یقین کر چکا ہوں۔ زویا کو دیکھ کر میں نے بھی تہیہ کر لیا کہ فاخر کو اپنا نظریہ بدلنے پر مجبور کر دوں گا اور میرے جوشیلے حوصلے دھنک کی طرح خوش رنگ تو تھے اور۔۔۔ دھنک۔۔۔ کتنی بھی دلکش کیوں نہ ہو۔۔۔ بہت دیر تک آنکھیں اس پر نہیں گاڑی جا سکتیں نا۔



زویا پہاڑی علاقے کی رہنے والی۔۔۔ ان کی چوٹیوں پر ایستادہ درختوں کے جھرمٹ میں گھرے کسی چرچ میں بسنے والی کوئی راہبا معلوم ہوتی تھی۔ جو صد برگ کی طرح مکمل کھلی ہوئی لیکن زرگل کی طرح کہیں اندر ہی اندر دھنسی ہوئی سی بھی۔۔۔ زویا بھی پرت در پرت غلافوں سے ڈھکی بس اپنی شبیہہ واضح کرتی تھی۔ چھپتے رہنے۔۔۔ ڈھکے رہنے اور جھانکنے نہ دینے میں بظاہر اس کی اپنی کوئی تحریک یا جدوجہد کا عمل دکھائی نہ دیتا تھا اس لیے آنے والے بہت سے دن زویا کے ساتھ گزار لینے کے باوجود۔ وہ میرے لیے ایک ایسی پٹاری رہی جس میں سے انسان بیک وقت سانپ یا خزانہ نکلنے کی امید رکھتا ہے۔

درحقیقت تو زویا ایک سیدھی سادھی سی لڑکی تھی جو نہ ڈھول اڑاتی نہ شور مچاتی تھی۔ وہ تہلکہ مچا دینے اور اپنی دھاک بٹھا دینے والے دونوں اوصاف سے انجان تھی۔ اس کی ذات کے گرد ہمیشہ چپ، اداسی اور شام غریباں کے ان گنت پردے تنے رہے اور ان پردوں کو میں ایک ایک کر کے ایسے اتارتا رہا جیسے یوکلپٹس کے پودے پر سے اس کی چھال جھڑتی ہے۔ لہجوں، رویوں اور آنکھوں کے ان طویل سفروں پر سوار نجانے کب زویا مجھے اتنی پیاری لگنے لگی کہ محبوب ہو گئی اور محبت کی پہلی بوند سوکھی بنجر زمین پر گر کر اپنی خوشبو چاروں طرف پھیلانے لگی۔

یہ سب کچھ کیمیائی عمل کے زیر اثر ہوا۔ جیسے بانس دنوں میں دیکھتے ہی دیکھتے پروان چڑھتا ہے۔ میں اور میرے اندر کا ڈھکا چھپا سب ایسے ہی پروان چڑھا اور میں زویا کے گھر کا فرد سا بن گیا۔

ہم دونوں کے قریب آنے کی ایک وجہ شاید اکلاپا بھی تھا۔ وہ اور میں۔۔۔ ہم دونوں اپنے اپنے گھروں میں اپنے اپنے خاندانوں کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ساتھ نہیں تھے۔ دونوں بھی "سوتیا ڈاہ" (وجہ نزاع) کی آگ میں نہیں جلے تھے۔ میں اور صرف میں والی نوبت کبھی آئی ہی نہیں۔۔۔ جو کچھ تھا وہ کھلے میدان کی طرح صرف ہمارا تھا۔۔۔ پر میدان خالی تھا۔

فاخر نے اپنے شوق اور تھوڑے بہت ابا جی کے دباؤ کی وجہ سے ملٹری جوائن کر رکھی تھی۔ جب کبھی وہ اپنی چند دنوں کی چھٹیوں پر آتا تو ان دنوں کو مکمل آزادی کے ساتھ اپنے طریقے کے مطابق گزارتا، بدقسمتی سے میں اس کے طریقے میں زیادہ جگہ نہ بنا سکا اور زویا اپنے ابا کی وفات کے بعد راولاکوٹ سے اپنے چھوٹے بھائی نوفل اور عمر رسیدہ ناراض ماں کے ساتھ چچا کے گھر آباد ہوئی تھی۔

ادھر میرا اب یہ عالم تھا کہ ہر چیز میں راولاکوٹی پن ڈھونڈنے لگا تھا۔ اپنا ڈھائی مرلے کا باغ مجھے راولاکوٹ کی وسیع چراہ گاہ دکھنے لگا۔ بارش کا پرنالہ کسی چھوٹی آبشار کی طرح بہتا۔۔۔ فضا پہاڑوں کی خوشبو سے اٹی پڑی ہوئی۔۔۔ اور علاقے کی سڑکیں پگڈنڈیوں کی طرح بل کھاتی محسوس ہوئیں۔ زویا کی ماں بڑی بھوبھل (گرم راکھ) قسم کی خاتون تھیں۔ جو اپنی موجودہ عمر سے کہیں زیادہ کی لگتی تھیں۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ ان کے چہرے سے کسی قسم کی خواہش یا اندیشہ نہ ٹپکتا تھا سوائے پچھتاوے کے۔ وہ اس قدر سادہ تھیں کہ اپنی ناراضی اور بیٹی سے شکوے شکایتوں کو چھپا نہ سکتی تھیں۔ وہ تخت، صوفے، فرش گٹھڑی سی بن کر بیٹھتی تھیں جیسے بہت سے رازوں کو چھپائے، بظاہر لاتعلق سی، لیکن بیٹی کی ایک ایک حرکت ایک ایک عمل پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔

"اپنا گھر کیوں چھوڑا آپ نے؟" پہلی بار رات کا کھانا لے جاتے اور پانچ افراد کے مل کر کھانے کے

دوران امی نے پوچھا۔ امی بھی بڑی جہاندیدہ عورت ہیں زمانے کو پرکھی ہوئیں وہ جان بوجھ کر ایسے مختصر سوالات کرنے کی عادی ہیں جن کے جوابات مکمل جزئیات والے مفصل ہوں۔

"بیٹی جو زیادہ پڑھ لکھ گئی ہے۔۔۔ اپنی منوا رہی ہے ۔۔۔ انگلیوں پر نچا رہی ہے اور ہم ناچ رہے ہیں۔"

یک سطری جملے نے خاندان اور خاندان کی ساری تاریخ کھول کر رکھ دی اسی وقت میز کے کنارے پلیٹ ٹکائے کھانا کھاتی زویا کی پلیٹ گری اور سب ایسے دم مارے بیٹھے رہے جیسے یہ تو ہونا ہی تھا۔

پتا نہیں یہ فقرہ معصومیت میں کہا گیا تھا یا شکوؤں سے بے تاب ہو کر۔۔۔ بہرحال یہ بے حجاب۔۔۔ بے جھجک خاندان راولاکوٹ کی سرگزشت اور شجرہ نسب میری ماں کے دل میں ایسا چبھا کہ آنے والے دنوں میں نہ تو امی وہاں پھر کبھی گئیں اور نہ ہی وہاں سے بلوانے یا خود آنے کا سندیسہ کبھی آیا۔۔۔ جو بھی تعلق بنا وہ میرے اور زویا کے درمیان ہی بنا رہا۔۔۔ یہ تعلق نہ کسی کو نظر آیا نہ کسی نے سمجھنے کی کوشش کی کہ کچھ جانا جائے۔

اگلے دن۔۔۔ صرف ایک دن۔۔۔ تو جب میں زویا کے گھر جانے کے لیے بہانے سوچ رہا تھا اور نیا بہانہ ہر ہر زاویے سے سوچتے رہنے اور ذہن میں پڑا رہنے پر ایسا ہو جاتا اور مضحکہ خیز لگتا جیسے غبارے میں بند ہوا زہریلی ہونے لگتی ہے۔ اسی طرح میں نے بھی بہت ساری وجوہات اور حربوں کو فضول قرار دے کر ساری دوپہر بیڈ پر بیٹھے ہی گزار دی۔ تب نوفل مجھے بلانے آیا ۔۔۔ رحمت کا فرشتہ نوفل۔

"آپی آپ کو بلا رہی ہیں۔۔۔ کوئی کام ہے آپ سے ۔۔۔ جلدی آئیے گا۔"

"جلدی" میں زیر لب بڑبڑایا۔۔۔ ایکسپریس ٹرین کی رفتار سے ان کے گھر پہنچا اب اس سے زیادہ جلدی کیا ہوگی۔۔۔ ہاں تو اسی دن نوفل مجھے بلانے آیا تھا۔۔۔ اور میں تیز گام بنا زویا کے پلیٹ فارم پہنچا۔۔۔ ورنہ بعد میں تو جب بھی میں نے اس باغ والے راستے کو پار کیا اپنی فشار ہی لیا۔

"مستری، رنگ ساز، مزدور، ترکھان۔۔۔ بڑے لوگوں کی ضرورت ہے بکران صاحب۔۔۔ اس گھر کو بہتر کرنے کے لیے۔"

اتنے لوگوں کی ضرورت میں جو سنگ میل تھا اس کا نام سرے سے ہی غائب تھا۔ تب میں بکران صاحب سے بکران نہیں ہوا تھا، یہ تکلف بھی پہلے پہل کرسٹل کے گلدان کی طرح چمکتا ہوا بڑا پیارا لگا لیکن پھر ذرا ہاتھ بڑھانے پر ہی ایسا تڑاخ سے زمین پر گرا کہ کرچی کرچی ہو گیا۔ خود مجھے زویا کے گھر جاتے رہنے پر معلوم ہوا کہ میرے اندر تو ایک ہر فن مولا کی روح بستی ہے۔ اور وہ وہ کام جن کو کبھی میں نے ڈھنگ سے دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا ان ان میں، میں اتنا زیرک ہوں کہ ان کاموں کے ماہر افراد تک میری سوچ پر عش عش کر اٹھتے۔۔۔ زویا سے بے تکلفی پیدا کرنے کے چکر میں میں نے اپنے اندر مزدور، مستری، مالی، رنگ ساز اور سگھڑ بی بی کی سی خصوصیات پیدا کر لیں۔ گرد سے اٹی بیلیں سرے سے اکھاڑ ڈالیں۔ باغ میں سنہری گھاس کی جگہ سبز مخملی گھاس بچھ گئی۔ مالی کو نایاب، مہنگے اور خوب صورت پھول پودے لگانے کا آرڈر دیا گیا۔۔۔ گھر میں رنگ کروانے کے لیے بہترین رنگوں کا انتخاب کیا گیا۔ ماربل کے فرش پر دوبارہ پالش کروائی۔۔۔ لکڑی کے کام کی مرمت ہوئی اور چند ہی دنوں میں ان کا گھر ہمارے گھر سے بھی زیادہ لش پش کرنے لگا۔

ان سارے دنوں میں میں اپنے گھر صرف سونے یا نہانے کی غرض سے ہی گیا۔ باقی سارے مراحل زویا کے گھر ہی طے ہونے لگے۔ کھانا کھانے سے لے کر ڈکارنے تک۔۔۔ دنوں میں ہی آئس کریم پارلر، چھوٹے بڑے ریسٹورنٹ والے میرے زویا اور نوفل کے گروپ کو اچھا خاصا جاننے پہچاننے اور ماننے لگے۔

اور ان ہی سارے دنوں میں اباجی مجھے کوئی کورس کرنے کا کہتے ہی رہ گئے ان کی کورس کی ڈیمانڈ کمپیوٹر کمانڈ سے شروع ہو کر میری مصروفیات دیکھتے ہوئے امور خانہ داری کے کورس تک آ گئی۔ "تھوڑے دن

فارغ رہے گا تو آپ کا کیا چلا جائے گا۔" میری ماں کو ہم دونوں بھائیوں سے بہت محبت تھی اور وہ وقتاً" نوفل" اس بات کا ثبوت بھی دیتی رہتیں۔ اب میں اباجی کو کیسے بتاتا کہ جو ڈگری میں نے زویا کی مدد کر کے اسے بیت کے حاصل کی ہے وہ کسی بھی کمپیوٹر کورس سے زیادہ اہم ہے۔

☼ ☼ ☼

"گھر تیار ہو گیا زویا۔۔۔ اب تم اپنے رشتہ داروں کو بھی بلا سکتی ہو۔"

شیشے اور لکڑی کی نئی نئی بنی الماری جس کی پالش بھی ابھی گیلی تھی' میں وہ میری ماں کے ساتھ جا کر خرید کر لائے ہوئے مہنگے برتن لگا رہی تھی۔ اور میں کارٹن پر جھکا سمندری جھاگ کے چوکھٹوں میں پھنسے ہوئے برتنوں کو بڑی احتیاط سے نکال نکال کر اسے تھما رہا تھا۔

میری بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"وہ لوگ نہیں آئیں گے۔۔۔ کیا زیادہ ناراض ہیں وہ؟"

"تمہیں چڑی چھکا کھیلنا آتا ہے؟" میں سمجھ نہ سکا کہ رشتے داروں کے تعلق میں اچانک چڑی چھکا کیسے آگیا۔

"ہاں!"

"تو کل پھر تم نیٹ اور باقی سامان لے آنا۔۔۔ نوفل گھر میں بور ہوتا رہتا ہے تم دونوں کھیل لیا کرنا۔"

"اور تم۔۔۔؟"

"میں بھی کھیل لیا کروں گی۔۔۔ میں تو بہت ماہر ہوں۔"

"نوفل کو اسکول میں داخل کروا دو نا۔۔۔"

"میں تو داخل کروا دوں۔۔۔ لیکن امی نہیں مانیں گی۔"

"کیوں۔۔۔ اس لیے نہیں مانیں گی؟"

"نوفل کو اسکول میں داخل کرانے کے لیے۔۔۔ تم نہیں جانتے امی تعلیم کے بہت سخت خلاف ہیں۔۔۔ لیکن خیر فلتھ تک تو پڑھا ہی ہوا ہے۔۔۔ اگلے سال تک داخل کروا دوں گی۔۔۔ تب تک امی کی ناراضی بھی کچھ کم ہو جائے گی۔"

"لیکن تم تو گریجویٹ ہو۔۔۔"

"میری تعلیم کے بعد ہی تو وہ مزید خلاف ہوئی ہیں۔۔۔ یہ تحریک "اختلاف" میری وجہ سے ہی تو شروع ہوئی ہے۔"

اپنے راز جلد از جلد۔۔۔ مجھ تک پہنچا کر خود ہلکا ہو جانے کی عجلت میں اور ہر ستم کو جیسے بڑے تحمل سے برداشت کر لینے کی جدوجہد میں وہ ہر بات کو بڑی خود اعتمادی سے کہنے کی کوشش کرتی تھی' لیکن مجھ اور کبھی کا امتیاز کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ اس کا دیسی اور روایتی پن بھی جھلک جاتا اور وہ اپنی ہی کوششوں میں زیادہ کامیاب نہ ہو پاتی۔

"اس وجہ سے وہ تم سے ناراض رہتی ہیں؟" میں بڑی ڈش نکال کر اسے تھما رہا تھا چکنی جلد والی نئی نکور ڈش کی چمک اس کے چہرے پر پڑنے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں یا ان میں پانی بھر گیا تھا میں قریب ہونے کے باوجود فیصلہ نہ کر سکا۔

"نہیں۔۔۔ صرف اسی ایک وجہ سے تو نہیں۔"

"یعنی اور بھی بہت کچھ ہے۔"

"ہاں۔۔۔ بہت چھوٹی چھوٹی بے محل سی باتیں جو اب بہت بڑا پہاڑ بن چکی ہیں۔"

"کتنا بڑا۔۔۔؟"

"ہم پہاڑوں پر رہنے والوں کی ذات خالی پیالا ہوتی ہے بکران۔۔۔ ہم میں جو بھی جذبہ بھرتا ہے لبالب بھرتا ہے۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک جانے کو بے قرار ہو گئے۔۔۔ ڈش واپس کارٹن میں رکھ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم پریشان نہ ہو زویا۔۔۔ نوفل کو میں پڑھا دیا کروں گا۔۔۔ اپنے گھر پر۔"

"اس کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلے گا بکران۔۔۔ اور شاید صرف اتنا کہ تمہارا مجھ پر ایک اور احسان بڑھ جائے گا۔"

"نوفل کو کوئی فائدہ نہ ہوگا؟"
"ہوش سنبھالے گا تو وہ بھی مجھ سے ای کی طرح ناراض ہی رہے گا۔"
"کیوں.... ہربات کو منفی انداز سے کیوں سوچتی ہو؟"

"تم نہیں جانتے بکران .... ہمارے خاندان کو ناراض ہونے.... روٹھے رہنے کا خمیر لگ چکا ہے.... اب جب تک تقسیم نہ ہوگی کچھ بھی پہلے جیسا نہیں ہوگا۔"
کارٹن سے ڈش نکال کر الماری میں رکھ کر وہ پلٹی نہیں بلکہ اس کے سسکنے کی آوازیں آنے لگیں پھر وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی.... اور مجھے سمجھ نہیں آیا کہ اس لڑکی کو جو روتے ہوئے اب تک کے دیکھے ہوئے سارے رویوں سے الگ مجھے انجان سی دکھنے لگی ہے، کیسے چپ کرواؤں.... وہ روتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی اور میں بہت دیر تک وہیں کھڑا رہا۔



"بکران بھائی! آپ شٹل کو ٹھیک سے تھرو نہیں کر رہے۔" نوفل بے چارہ عاجز آگیا تھا۔
"کبھی کھیلا جو نہیں بھائی میرے .... بس ہمیشہ دیکھا ہی ہے۔"
"آپ تو کہہ رہے تھے آپ کو کھیلنا آتا ہے۔" زویا جوس سے بھرا جگ اور گلاس لیے آرہی تھی مجھے پتا ہی نہ چلا اور اس نے میری چوری پکڑلی میں تو ویسے ہی تھک چکا تھا تو فوراً کرسی پر بیٹھ گیا زویا نے جوس سے بھرا گلاس مجھے تھما دیا.... گلاس کے ساتھ میں نے اس کا ہاتھ بھی تھام لیا۔
"تب میں سمجھا تھا کہ تم بھی کھیلو گی میرے ساتھ .... مجھے کہاں پتا تھا کہ۔" میں جان بوجھ کر بے خبر ہوگیا کہ نوفل بھی قریب ہی کھڑا ہے .... لیکن زویا کو احساس تھا.... شرماہٹ کے تاثرات کو چھپا کر اس نے ہاتھ چھڑوالیا۔
"اچھا.... تو آپ آپی کے ساتھ کھیلنا چاہ رہے تھے۔" نوفل ہنسنے لگا۔
"ارے میرے ساتھ تو آپ کھیل نہیں پا رہے رہے.... آپی کے ساتھ کیا کھیلتے؟"
"کیوں! تمہاری آپی کیا ورلڈ چیمپئن ہیں.... بتاؤ زویا۔" میں نے آواز دھیمی کی "تم تو پہلے ہی ہار چکی ہو نا۔"
"ورلڈ چیمپئن ہی سمجھ لیں.... وہاں آپی سے کوئی نہیں جیت سکتا تھا.... محسن بھائی بھی نہیں۔"
زویا کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر چلا گیا.... انہی تاثرات نے مجھے فقرے پر غور کرنے کے لیے اکسایا.... اور میں نے نوفل سے پوچھا۔
"محسن.... کون؟"
"آپی کے منگیتر۔"
میں ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دینا چاہتا تھا لیکن ایک گھونٹ بھی نہ پی پایا تھا کہ ساکت سا ہو گیا۔
"ہمارے تایا ابو جی کا بیٹا.... میرے بڑے بھائی۔"
"نوفل بہت بولتے ہو تم.... چلو اندر۔"
اتنے سارے دنوں میں میں نے پہلی بار زویا کو نوفل کو ڈانٹتے دیکھا نوفل ریکٹ کو گھاس پر رکھ کر اندر چلا گیا اور میری آنکھوں میں موجود سوالیہ نشان کو زویا نے فوراً سے پڑھ لیا۔
"اب سب ختم ہو گیا ہے بکران.... ایسا کوئی تعلق کوئی رشتے داری نہیں رہی۔" نجانے اتنا اعتماد زویا کی ذات میں کہاں سے آگیا تھا کہ دل کی گہرائیوں سے یقین کر لینے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہ تھا اور میں اس کے آگے ماضی، حال، مستقبل ہار بیٹھا۔
یہ سب کچھ ہار جانے کا عمل بعض اوقات جیت سے زیادہ خوشی دیتا ہے.... کبھی کبھی چوٹی سے گرنے .... سمندر میں ڈوب کر اس میں تحلیل ہو جانے کی خواہش دل میں شور مچاتی ہے.... جو بچپن سے ہی ہر چیز "آنا فانا" مسخر کرتے آئے ہوں وہ کبھی نہ کبھی خود بھی تسخیر ہو جانے کے عمل سے گزر جانے کے لیے تڑپ اٹھتے ہیں۔ بات بہت معمولی ہے۔ لیکن اس معمولی عمل کے شروعاتی مراحل میں ہی بعض حاکمیت پسند

لوگ چوٹی سے گرتے گرتے راستے میں ہی کسی مرغزار کے اگ جانے اور سمندر میں ڈوبتے وہاں منجھدار میں کسی چٹان کے نکل آنے کا جنون سوار کر لیتے ہیں۔ انسان ایسا نہیں ہوتا جیسا وہ اپنے آپ کو سمجھتا ہے۔ میں بھی نہیں جانتا تھا کہ مجھے مستقبل میں کن حالات کا سامنا کرنا ہے۔

اگلے دنوں میں زویا پر ایک نیا جنون سوار ہوا' اخبارات میں نوکریوں کے اشتہارات دیکھنے فون نمبر نوٹ کرنے اور آئے دن کسی نہ کسی دفتر میں انٹرویو دینے جانے کا بھی' ٹھنڈے علاقے کی رہنے والی کو اتنی شدید گرمی کی عادت نہیں تھی اس لیے وہ جب بھی واپس آتی دھوپ اس کے چہرے پر ہی چمک رہی ہوتی۔ اس دن کے بعد سے نہ تو میں نے کبھی نوفل سے اس کے رشتے داروں کے بارے میں دریافت کرنے یا کریدنے کی کوشش کی اور نہ ہی نوفل نے کبھی دانستہ اور نادانستہ ان کا ذکر کیا۔

اس دن بھی زویا پسینے میں بھیگی گھر میں داخل ہوئی' باغ کے کونے میں لگا سفیدے کا درخت شام سے پہلے ہی کافی چھاؤں اور ٹھنڈک کر دیتا تھا اس کی چھاؤں تلے بیٹھنے سے گرمی کا احساس بھی جاتا رہتا تھا میں اور نوفل وہاں بیٹھ کر غلیل بنا رہے تھے اور غلیل سے آموں کو زمین پر گرانے کا ارادہ تھا جو ساتھ والوں کے باغ میں تھے لیکن ہماری طرف اپنا رخ کیے گئے تھے۔ زویا گیٹ کھول کر اندر آئی اور کونے میں ہمیں بیٹھا دیکھ کر خود بھی ہماری طرف چلی آئی تو نوفل زویا کو قریب آتے دیکھ کر اس کے لیے پانی لینے چلا گیا۔

"کیا ہو رہا ہے؟"

"غلیل بن رہی ہے.... آم توڑیں گے اب۔"

بیگ ایک طرف رکھ کر وہ ٹھنڈی گھاس پر بیٹھ گئی اور اپنے جوتے اتارنے لگی' لمبی گھاس میں اس کے سفید پیر دھنس سے گئے۔

"پیسوں کی ضرورت ہے یا مصروف رہنا چاہتی ہو؟" غلیل بن چکی تھی اور اس میں موٹا کنکر دبا کر میں دور دیوار پر بیٹھے کوے کا نشانہ لینے لگا۔

"دونوں۔"

"آپی پانی ...." نوفل نے اسے ٹھنڈے پانی کا گلاس پکڑایا۔ وہ بڑے تحمل سے گلاس میں موجود پانی کو ختم کرتی رہی۔

"پیسے تو بہت ہیں بکران .... لیکن ڈرتی ہوں .... کنویں سے ایک ڈول بھی روزانہ پانی کا نکالو تو ایک نہ ایک دن کنواں بھی سوکھ جاتا ہے.... دوسرا مصروف نہ رہوں.... گھر پر بیٹھی رہوں تو زنگ لگ جائے گا میری تعلیم کو اور پھر اس تعلیم کا کیا فائدہ جس کے لیے میں نے اتنے طعنے سنے اور جسے میں کسی مصرف میں نہ لاؤں۔"

"لیکن ماحول بہت خراب ہے شہر کا زویا .... تمہیں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔" نوفل میرے ہاتھ سے غلیل لے کر ہماری طرف والے باغ میں جا چکا تھا۔

"ماحول تو ہر جگہ کا ہی خراب ہوتا ہے بکران .... ادھر راولا کوٹ میں بھی تو.... خیر چھوڑو.... تم یہ بتاؤ کہ میں کوئی کورس نہ کر لوں؟"

"کیوں اب یہ کورس کیوں؟"

"خالی گریجویشن کو کون پوچھتا ہے.... زیادہ اچھی تعلیم حاصل کر لوں گی تو یقیناً فائدہ ہی ہوگا۔"

"دیکھ لو تمہاری امی اجازت دے دیں گی؟"

"امی .... وہ اب میرے معاملات میں نہیں بولتیں۔"

"رزلٹ کے بعد داخلے کھل جائیں گے.... پھر ہم دونوں کسی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیں گے۔"

"تمہاری ہر بات میں تمہارا اپنا ہی فائدہ ہوتا ہے بکران۔"

"اچھا نہیں.... ہم دونوں ایک ہی یونیورسٹی میں جائیں گے.... نہ تمہاری کسی لڑکے سے دوستی ہوگی نہ میری کسی لڑکی سے۔"

"اچھا! تو یہ بات ہے۔" وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی "تمہاری جگہ بھلا کوئی لے سکتا ہے.... جو مقام میرے دل نے تم کو دیا ہے وہ میں ساری زندگی کسی اور

کو نہ دے سکوں گی۔"

"کسی اور کو دینے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"

"وقت کا کہاں کچھ پتا ہوتا ہے بکران..... کیا خبر میں کسی وقت تمہاری امیدیں پوری کرنے سے قاصر ہو جاؤں..... اس لیے اس کی پیشگی معافی مانگ رہی ہوں ..... اور تمہیں بتا رہی ہوں کہ تم میرے لیے فرشتہ ثابت ہوئے ہو..... تمہارے آسرے پہ میں اپنی ماں اور بھائی کو بلا جھجک و بے خوف و خطر چھوڑ جاتی ہوں۔ اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی بھلا؟" وہ اپنی ممکنہ بے وفائی کی پہلے سے ہی معافی مانگ رہی تھی تب اگر مجھے آنے والے حالات کا علم ہوتا تو میں اسے بتاتا کہ بے وفائی کرنے والے معافیاں نہیں مانگا کرتے..... جواز دیا کرتے ہیں..... اور جو معافیاں مانگتے ہیں انہوں نے سرے سے محبت کی ہی نہیں ہوتی بلکہ شاید کوئی "گناہ" کیا ہوتا ہے۔

"جب محبتیں تباہ ہوتی ہیں تو وہاں کوئی "بلیک باکس" نہیں ملتا جو محبت کے تباہ ہونے کی وجہ بتا سکے۔"

زویا یہ بات "تم میرے لیے فرشتہ ثابت ہوئے ہو۔" دوسری بار بھی کہے گی۔ اس کا بھی مجھے اندازہ نہ تھا اور مجھے تو اس بات کا بھی گمان نہ تھا کہ دوسری مرتبہ کے بعد وہ مجھ سے ایک ایسا وعدہ لے لے گی جس کو پورا کرنا تو میرے بس میں ہوگا لیکن پھر بھی میں ناکام رہوں گا۔

✡ ✡ ✡

اس رات گرج دار بادلوں نے سرِ شام ہی آسمان کو چاروں اطراف سے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد توقع کے عین مطابق بارش شروع ہو گئی۔ نوفل کے کمرے کی کھڑکی بند تھی، اس لیے پتوں، دیواروں اور ماربل کے چکنے فرش پر گرتی بارش کی بہت ہلکی ہلکی آواز اندر محسوس ہو رہی تھی۔ میں کھڑکی میں کھڑا اس منظر سے محظوظ ہو رہا تھا، برسات کی بارشوں میں مجھے بن جوسہ کی بارشیں یاد آجاتی ہیں جو بدذوق سے بدذوق انسان کو بھی مبہوت سا کر دیتی ہیں۔ ایک بار نہیں بلکہ کتنی ہی بار میں اور فاخر وہاں جا چکے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں وہ میری اور فاخر کی پسندیدہ جگہ ہے۔ اب تو بے چارے کو وقت ہی نہیں ملتا کہ اپنا شہر ہی ٹھیک سے گھوم پھر سکے۔

"سو گیا؟" میں نے زویا سے پوچھا جو بیڈ پر بیٹھی نوفل کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھی تاکہ اس کا بخار کم ہو جائے۔

"ہاں..... سو گیا۔" اس کے لہجے میں جنگ ہارنے جتنا غم تھا۔ زویا کی امی ابھی کچھ دیر پہلے کمرے سے گئی تھیں اور ہمیشہ کی طرح انہیں دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل ہی رہا کہ وہ پریشان یا فکرمند ہیں بھی کہ نہیں؟

"پریشان مت ہو زویا..... ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اچھا۔ تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں..... وہاں راولا کوٹ میں ہوتا تو اب تک ٹھیک ہو چکا ہوتا۔"

"ادھر آؤ ایک چیز دکھاؤں۔"

وہ بے دلی سے چلتی میرے پاس کھڑکی میں آکر کھڑی ہو گئی۔

"بارش کو دیکھو۔"

آج کون سی نئی بارش ہے۔"

"غور سے دیکھو بارش تو نئی نہیں مگر دریافتیں تو نئی ہو سکتی ہیں نا۔"

وہ صاف شفاف شیشے کے پار نئی دریافتوں کی کھوج میں لگ گئی جیسے "دیپ..... نظر آئے۔"

"دیپ.....؟"

"ہاں..... دیپ..... "بارش چودھویں کے چاند کو لیے ہو تو پانی کے ایک ایک قطرے کے ساتھ ایک ایک دیپ بھی اترتا ہے زمین پر..... پانی چاند کی روشنی کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے نا.....

وہ یک ٹک شیشے کے پار دیکھتی رہی..... اور میں اسے۔

بارش پھوار کی صورت برس رہی تھی اب..... گہرے سیاہ بادلوں میں سے چودھویں کا چاند کبھی کبھی مکھڑا دکھا جاتا تھا رات گہری تھی لیکن اندھیری نہیں..... اندھیری کیسے ہوتی..... وہ اور میں ساتھ ساتھ

تھے۔

"سچ کہتے ہو۔۔۔ دیپ تو واقعی جل رہے ہیں۔" وہ نوفل کی بیماری کو یکسر بھول سی گئی۔

"پانی کے یہ دیپ صرف انہیں نظر آتے ہیں جن کے دلوں میں محبت کے دیپ جل اٹھے ہوں۔"

وہ کچھ نہ بولی لیکن مجھے خبر تھی کہ وہ اب صرف بارش کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ وہاں مجھے اور خود کو ڈھونڈ رہی تھی۔۔۔ ڈھونڈ چکی تھی اور مبہوت تھی۔

"یہ بات مجھے فاخر نے بتائی تھی جب ہم بن جوسہ میں تھے۔" "بن جوسہ وہ تو ہمارے گھر سے قریب ہی ہے۔"

"کبھی گئی ہو؟"

"ہاں۔۔۔ لیکن زیادہ نہیں۔"

"بن جوسہ کے ساکت پانی میں چاند ٹھہرا رہتا ہے۔۔۔ تحلیل نہیں ہوتا۔۔۔ بس ہچکولے کھاتا ہے۔ ایسے جیسے بن جوسہ کے پانی میں قدرت نے الگ سے ایک چاند کاڑھ دیا ہو۔۔۔ فاخر کی عادت تھی وہ وقفے وقفے سے ایک کنکر کھڑے چاند پر دے مارتا۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"چاند کا سارا عکس اتھل پتھل ہو جاتا ہے۔۔۔ شعاعیں پانی میں سرائیت کر جاتی تھیں۔۔۔ لہریں بنتیں اور لہر لہر میں ان گنت دیپ جلتے تھے، ایسے لگتا تھا کہ کوئی بہت چمکدار جھلمل کرتا ریشمی کپڑا ہوا کے زور سے پھڑپھڑا رہا ہو۔ تھوڑی دیر یہ منظر جاری و ساری رہتا۔۔۔ تمہیں معلوم ہے نا کہ پانی میں ایک بار بھنور پیدا ہو جائے تو پانی کو ساکت ہونے میں ذرا دیر لگتی ہے۔"

"بھئی اس طرح کے تجربے میں نے تو نہیں کیے جیسے تم کر چکے ہو۔"

"پانی رکتا تو میں ایک اور کنکر چاند پر پھر سے دے مارتا تھا۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔۔۔ سراسر بچپنا۔"

"کچھ مناظر بچپن، جوانی، بڑھاپے کی فصیلوں سے آزاد کر دیتے ہیں۔۔۔ ہم بڑی دیر تک وہاں ہی بیٹھے رہتے تھے۔"

"کتنی دیر تک؟"

"بن جوسہ اپنے اندر بہت بھید رکھتا ہے زویا! سمندروں، دریاؤں، ندی کے پانی اور۔۔۔ پہاڑوں کے مناظر دیکھتے رہنے سے نگاہیں نہیں تھکتیں۔۔۔ بلکہ زیادہ دیکھتے رہنے سے یہ سب چیزیں سرکتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اور انسان ان کے ساتھ ساتھ خود بھی سفر کرنے لگتا ہے۔"

میں چپ ہوا تو دیکھا کہ وہ میری باتیں ایسی محویت سے سن رہی تھی جیسے کوئی بانسری نواز کا میٹھا سر سن رہا ہو۔۔۔ اور میں اس کی آنکھوں میں وہ دیپ دیکھ رہا تھا جو بارش کے قطروں سے کہیں زیادہ بڑے، روشن اور حقیقی تھے۔ نجانے یہ گرم موسم میں عود آئی خنکی کا اثر تھا، بارش کی پھوار کا دلفریب منظر تھا یا چاند کا سفر کرتے کرتے ہماری کھڑکی تک آ جانے کا لمحہ تھا کہ میں نے زویا کو دونوں شانوں سے تھام لیا۔

"زویا۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ بکران۔۔۔" اس کی آواز بمشکل نکلی۔

"میں تمہیں لے کر جاؤں گا۔۔۔ پانی میں ٹھہرا چاند اور جھلمل کرتے دیپ دکھاؤں گا۔"

وہ مزید روشن ہوتی آنکھوں سے میری صورت دیکھے گئی۔

"ہم شادی کے بعد سب سے پہلے وہاں ہی جائیں گے۔۔۔ میں وقفے وقفے سے پانی میں کنکر پھینکوں گا۔۔۔ اور تم مجھے منع کرنا۔۔۔ ہم بہت دیر تک وہیں بیٹھے رہیں گے۔۔۔ اور تمہیں اٹھنے کی جلدی بھی کیوں ہو گی۔" پتا نہیں وہ آنسو جو اس وقت اس کی آنکھوں میں آئے تھے وہ خوشی کے تھے شکر گزاری کے یا میری غیر متوقع گفتگو کے اثر کے۔۔۔ تب تک میں سمجھتا تھا کہ زویا کو صرف آنکھوں میں آنسو لانے ہی آتے ہیں۔۔۔ جہاں اور جب بات کرنا خوشی کا اظہار مقصود ہوتا وہاں اس کی آنکھوں کے دیپ جگمگانے جھلملانے لگتے۔۔۔ لیکن بہت دنوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ تو بے تحاشا اور پھوٹ پھوٹ کر رونا بھی جانتی ہے۔

٭ ٭ ٭

رزلٹ آگیا تو یونیورسٹی میں داخلے شروع ہوگئے اور خدا کے فضل سے والد صاحب کی دلی آرزو کے برعکس میں پاس ہوگیا' میں اپنا اور زویا کا فارم لے آیا لیکن تب تک زویا کوئی اور ہی فارم فل کرچکی تھی اور میرے ذہن میں بھی یہ خیال نہ آیا کہ اتنے دنوں سے نہ تو زویا کہیں انٹرویو دینے گئی ہے اور نہ ہی اس نے اخبارات پر بڑے بڑے گول دائرے بنائے ہیں۔

"مجھے تمہاری محبت پر بڑا مان تھا بکران.... میں جانتی تھی تمہیں اچانک پتا چلا تو بھی تم ناراض نہیں ہوگے؟"

"لیکن زویا.... کراچی.... اتنی دور۔"

"کراچی.... بہت دور نہیں.... صرف چار ماہ کی تو بات ہے۔ میری تسلی ہوجائے گی۔"

"کورسز تو اسلام آباد میں بھی ہورہے ہیں زویا.... کراچی ہی جانے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے کہہ دیا جبکہ جانتا تھا کہ اب سب کہنا سننا عبث ہے.... جیسے موت انسان کو اس کے مقام فانی تک لے جاتی ہے اسی طرح اس کے کرم اس کی قسمت بھی اسے دربدر بھٹکاتے ہیں۔ مجھے اور زویا کو اگر خبر ہوتی کہ ان چار مہینوں میں کتنا کچھ بدل جائے گا تو کیا وہ کبھی کراچی جاتی؟

"چار مہینے زیادہ وقت نہیں ہوتا بکران.... اگر تم روکو گے تو میں فوراً "رک جاؤں گی لیکن اگر تم اجازت دوگے تو مجھے خوشی ہوگی.... میرے لیے یہ کورس بہت اہمیت رکھتا ہے۔"

"تم بھی فاخر کی طرح بات کرنے لگی ہو' اپنی بات منوانے کے لیے وہ بھی ہمیشہ سارا بوجھ میرے کندھوں پر ڈال دیتا ہے۔"

"اچھا میں.... تمہیں تمہارے بھائی کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیتی"

"کیا اب کمی کا احساس نہیں ہوگا۔"

"خوف میرے دماغ میں جڑ پکڑ چکا ہے بکران.... امی وہاں باغوں کی مالکن تھیں.... ان میں اب مالکن بنے رہنے کا ہی حوصلہ ہے.... یہ ملکیت اب قدرے کم ہوگئی ہے.... اور میں ان کے اعزازات انہیں واپس لوٹانا چاہتی ہوں.... نوفل کو جب یہ پتا چلے گا۔ اسے اس بات کا احساس ہوگا کہ میری وجہ سے اس نے نادانی میں اتنی بڑی قربانی دے رکھی ہے تو وہ بھی امی کی طرح مجھ سے بدظن ہوجائے گا.... میں اب بہت ڈرتی ہوں۔ تنہائی سے ناراضی سے.... خاموشی کے پردوں میں چھپے ہزاروں طعنوں سے.... نوفل کے بڑے ہوجانے سے پہلے میں اس کا ہر متوقع شکوہ مٹا ڈالنا چاہتی ہوں.... یہ سفر بہت لمبا ہے.... لیکن مجھے اسے طے کرنا ہی ہے۔"

"تھک جاؤ گی زویا۔"

تمہارا ساتھ ہوگا تو کبھی نہیں تھکوں گی۔"

"سب نارمل کیوں نہیں ہوجاتا زویا.... یہ مقابلہ یہ دوڑ ختم کیوں نہیں ہوجاتی؟"

"یہ دوڑ میرے باپ کی ہے.... اس کا ذمہ دار میرا باپ ہے.... خاندان والے کہتے ہیں میرے دماغ میں خلل ہے.... خلل کیسے نہ ہوتا.... میرا باپ اپنی جس خواہش کی ریزش بچپن سے میرے ذہن میں کررہا تھا وہ تو چٹان میں بھی سوراخ کردیتی.... میری روایتی سوچ میں شگاف کیونکر پڑتا.... میں اور میرا باپ گھر والوں کو برادری کو کیسے سمجھاتے.... تھوڑی بہت تعلیم کی مخالفت کوئی نہ کرتا.... لیکن ابا اور میں نے جب اسلام آباد آکر پڑھنے کا کہا تو ساری برادری کے ساتھ ساتھ امی بھی میری دشمن بن گئیں۔ گھر میں مشورہ دینے اور نصیحتیں کرنے والوں کا ہجوم لگ گیا.... مدتوں پہلے ہوچکے پرانے شہر کی ہوا لگنے کے واقعات از سر نو کھلے.... جیسے لنڈے بازار میں پرانے 'استعمال شدہ گندے کپڑوں کی گانٹھیں کھلتی ہیں نا' ویسے ہی ان سارے واقعات میں بھی صرف بدبو تھی گندی اور چیتھڑے چیتھڑے ہوئی کترنوں کی بدبو.... ابا کو نامہر اور اناخوردہ کا خطاب دے ڈالا.... اتنا بھی کہ اس کی تو سرے سے

ریڑھ کی ہڈی ہی نہیں ہے۔۔۔ ابا کو اپنے بہن بھائی، اپنی برادری بہت عزیز تھی۔۔۔ وہ خاموشی سے سب کو سنتے رہے اور ہاتھ جوڑ جوڑ سمجھاتے رہے۔۔۔ ان کے لہجے میں اپنے سیب کے باغوں کا گھمنڈ نہ تھا۔۔۔ اس وقت وہ صرف اپنے خاندان کا سب سے چھوٹا لڑکا تھے جسے لاڈ پیار کے بدلے اپنے بڑوں کی حد درجہ عزت کرنی پڑتی ہے۔۔۔ وہ کسی طور ان سے کٹ کر جینا نہیں چاہتے تھے تب مجھے اندازہ نہ تھا کہ ان کو دیے پیار کا بدلہ مجھے بھی ادا کرنا ہوگا۔

دو تین ہفتوں بعد جب غبار تھما تو میں ابا کے ساتھ اسلام آباد گئی دو سال کی پڑھائی چار سال تک جا پہنچی ۔۔۔ چار سال بعد جب میں واپس گئی تو میرے نظریات بدل چکے تھے اور میرے باپ کو مرے چھ ماہ گزر چکے تھے۔۔۔ اباجی کی میت پر روتے کسی نے مجھ سے نفرت بغض، حقارت کا اظہار نہیں کیا، سمندر کا طوفان گزر چکا تھا اور اب وہاں طوفان کے بعد والی خاموشی تھی۔۔۔ اور خاموشی قبل از طوفان ہو یا بعد ازاں۔۔۔ منحوس ہوتی ہے۔۔۔ سب کے رویے بدل چکے تھے بلکہ ایک طرح سے وہ خوش تھے کہ خاندان کی لڑکی اتنا پڑھ لکھ کر بھی اپنی روایات کے ساتھ جڑی ہے۔۔۔ تب مجھے اندازہ نہ تھا کہ یہ سب کتنا عارضی ہے۔۔۔ ایک دن برادری اسی طرح پھر سے ہمارے آنگن میں اکٹھی ہوئی جیسے اباجی کے مرنے پر ہوئی تھی۔

ہم پہاڑوں پر رہنے والے بہت کٹھور ہوتے ہیں ۔۔۔ ہماری ہر ہر چیز میں شدت ہوتی ہے۔۔۔ وہ محبت ہو نفرت ہو یا کینہ۔۔۔ اور ایسی خالص محبت میں نفرت تو دور ناپسندیدگی کی دراڑ بھی نہیں آتی۔۔۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں ان سب کو گالیاں بھی دوں گی تب بھی وہ مجھے اپنے مرحوم بھائی کی نشانی سمجھ کر اپنا حق جتاتے رہیں گے۔۔۔ اپنے فیصلے مجھ پر مسلط کرتے ہیں۔۔۔ مجھے نادان سمجھتے رہیں گے۔۔۔ اور مجھ جیسی نادان کی بات کی اہمیت ختم ہو کر رہ جائے گی۔۔۔ ان کے نزدیک زبردستی کرنا محض ڈانٹ دینے کے برابر تھا۔ بات کا بہت دیر تک برا منائے رکھنے کا وہاں رواج نہ تھا اور مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ان کی اندھی محبت کی بار بار تذلیل کروں یا اتنی بڑی قربانی دوں۔ محسن سے شادی سے انکار پہلی بار سنا تو آرام سے ٹل گئے لیکن آنے والے دنوں میں بار بار میرے منہ توڑ جواب پر وہ جان گئے کہ برقع چادر میں لپٹے رہنے کے باوجود مجھے شہر کی ہوا لگ گئی ہے۔۔۔ جس دن جائیداد میں سے حصے کا سمن تایا جی کو ملا اسی دن وہ ڈھیروں پیسے اور ڈھیروں آنسو لیے ہمارے آنگن میں آگئے۔'' زویا نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو ہتھیلی میں سمو لیا۔

''میں نے برا کیا۔۔۔ مجھے معلوم ہے لیکن میں کیا کرتی بکران! کیسے محسن سے شادی کر لیتی۔۔۔ میرے اور اس کے درمیان ہزاروں اختلافات تھے۔ اور ہماری برادری ہر اختلاف کو صرف ہنس کر ہی ٹال رہی تھی، ان کے نزدیک محسن کی شکل و صورت، جہالت، نظریاتی اختلافات، ذہنی ہم آہنگی سب بے معنی تھے میں کس کس بات پر سمجھوتہ کرتی۔۔۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔۔۔ میرے بچپن کا منگیتر ہے میں اس سے شادی کر لیتی۔۔۔ بتاؤ۔۔۔؟''

اب آنسو متواتر اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

''تا عمر سسکنے سے بہتر تھا کہ میں وہاں سے ہجرت کر لوں۔۔۔ لیکن امی۔۔۔ وہ مجھ سے ناراض ہو گئیں کہ میں نے ان سے ان کا سارا خاندان چھین لیا۔ تم بتاؤ بکران میں کیا کرتی آخر۔۔۔ اتنی بڑی قربانی۔۔۔ یہ تو خود کو خود سے تختہ دار پر لٹکا دینے کے مترادف تھا۔''

زویا کی ہچکیاں بندھ چکی تھیں۔

''میری ماں کہتی ہے اس نے بھی تو میری خاطر قربانی دی تھی میں بھی اس کی خاطر دے سکتی تھی۔۔۔ تم بتاؤ بکران کیسی قربانی۔۔۔ جس کا وہ مجھے سوتے جاگتے ۔۔۔ اٹھتے بیٹھتے احساس دلاتی ہیں۔ اگر امی کو مجھ سے پیار ہے تو وہ اس قربانی کو خاموشی سے کیوں نہیں سہہ جاتیں۔۔۔ اس لیے میں ڈرتی ہوں۔۔۔ اور مجھے ان کے شکووں کو پورا کرنا ہوگا، امی اس آس پر ہیں کہ تھوڑے بہت دن میں ادھر ادھر رو کر اپنی مرضی کر کے واپسی کی راہ لوں گی۔۔۔ لیکن میں کیسے واپس جاؤں۔۔۔ واپسی کا

مطلب تو محسن سے شادی ہے نا۔۔۔ اور یہ واپسی میں کیسے اختیار کروں جو میری ذات کے بھیتر سے مجھے ہی رخصت کر دے گی۔"

دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنا چہرہ چھپا لیا جو آنسوؤں نے گیلا کر ڈالا تھا۔ اور ٹھیک اسی وقت مجھے اندازہ ہوا کہ عورت کے وجود میں بہت طاقت ہوتی ہے وہ ہنستی ہے تو ہنساتی ہے۔۔۔ روتی ہے تو رلا دیتی ہے۔۔۔ اپنے رنگ میں رنگ لینے کی طاقت عورت کے پاس ہی تو ہوتی ہے۔

میں نے آگے بڑھ کر اسے شانوں سے تھام لیا اور میرے سینے سے لگ کے وہ میری شرٹ بھگونے لگی۔ میں اس صورت حال کے لیے بالکل تیار نہیں تھا سب بالکل غیر متوقع ہوا۔۔۔ مردوں کو عموماً دلاسہ دینے کی عادت نہیں ہوتی۔۔۔ یا انہیں دلاسہ دینا نہیں آتا۔۔۔ ہاں لیکن انہیں سہارا دینا خوب آتا ہے۔۔۔ ہمدردی کا' محبت کا' وقتی۔۔۔ عارضی عمومی سہارا۔۔۔ زویا جیسی پریشان حال انجان راستوں کی اندھی تقلید سے گھبرائی ہوئی لڑکی نے اس سہارے کو قیمتی پتھر جان کر اپنی ذات کے تاج پر سجا لیا۔

"تم خیال رکھو گے نا۔۔۔ امی اور نوفل کا۔" بہت دیر بعد وہ میرے کندھے سے جدا ہوئی۔

"تمہاری اماں تو مجھ سے بھی نالاں ہی رہتی ہیں۔"

"تنہائی میں انسان دیواروں کو بھی دوست بنا لیتا ہے ۔۔۔ اور ان کا یہ رویہ تو ویسے بھی میری وجہ سے ہے۔۔۔ تم دیکھنا میرے جانے کے بعد وہ تمہیں اپنا بیٹا بنا لیں گی۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ تم جانے کی تیاری کرو۔"

"نہیں۔۔۔ پہلے تم وعدہ کرو ہکران!"

"میں وعدہ کرتا ہوں یار۔۔۔" میں نے اپنا ہاتھ اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا جسے اس نے مضبوطی سے تھام لیا۔۔۔ تب تو مجھے شائبہ تک نہ تھا کہ وعدے کے اس کچے گھڑے کو سچائی اور بار آوری کی دھوپ نہ لگ سکے گی اور پانی کی معمولی سی باڑ اسے دوبارہ مٹی میں بدل دے گی۔۔۔ گھڑا ٹوٹنے کی نوبت بھی نہیں آئے گی۔



میں کیسے جان سکتا تھا کہ میری محبت "منفی" ثابت ہوگی۔۔۔ ذرا سی ماحول کی تبدیلی۔۔۔ بارش کی پیش گوئی۔۔۔ کاپی سمیت تحریر بھی اڑا لے جائے گی ۔۔۔ زویا کی محبت میں اثر نہ تھا یا اس کی قسمت خراب تھی۔۔۔ اس کے جانے کے بعد میرے دل کا جوار بھاٹا نقطہ انجماد بننے کے بجائے بھڑکتا کیوں رہا۔۔۔ یا مجھ پر بے وفائی کا ٹھپہ لگنا ہی تھا کہ جس دن زویا کراچی کے لیے روانہ ہوئی عین اسی دن میرے چچا چچی مہرو کے ہمراہ ہمارے گھر وارد ہوئے۔

بعض باتیں جب سیدھے سبھاؤ اپنے انجام کو پہنچ رہی ہوتی ہیں تو ان میں اپنے اندر ہی کہیں کوئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے پکی فصل پر سنڈیاں غالب آ جاتی ہیں اور جیسے ابر رحمت زیادہ دیر برس لے تو سیلاب آ جاتا ہے۔

میری ماں کے کہے "تیرے اندر ابھی تک کوئی بچہ ہے" اور اباجی کے جملے "سنجیدہ ہو جاؤ جوان کچھ سوچو اپنے بارے میں" پر مجھے ایک دم سے ادراک ہوا کہ ان دونوں جملوں کا تعلق جاگنگ، فیشن اور پلس کے بٹن سے ہرگز نہیں ہے۔۔۔ جیسے ایک مکمل چیز کو اس سے بھی زیادہ کامل مکمل کے آگے رکھ دیا جائے تو اول الذکر کی خامیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ بالکل اسی طرح مہرو کے آگے مجھے اپنے وجود میں بے تحاشا جھول' غیر مستقل مزاجی اور اناڑی پن نظر آنے لگا۔ اپنے آپ کو درست کرنے کے چکر میں میں سفیدے کے درخت جتنا بڑا ہو گیا۔۔۔

میرے جذبات' نظریات' خیالات' ہوش مندی بھی اتنی بلند اور چھتناور ہو گئی۔۔۔ لیکن افسوس اس کی چھاؤں زویا کے نصیب میں نہیں رہی تھی۔

مہرو تازہ ہوا کا جھونکا تھی۔ کینیڈا سے وہ اپنے ساتھ جوش و جذبہ' نت نئی شوخیاں اور بے تحاشا ہنسی لے کر آئی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے یقین نہ آیا کہ یہ میری وہی

کزن ہے۔ جو پانچ سال پہلے تک اپنے سر پر دو چوٹیاں کر کے عجیب کارٹون لگا کرتی تھی اور میرے نزدیک اوسط درجے کی حامل ہی رہی تھی۔ پانچ سالہ کینیڈین تیز رفتار زندگی نے اس کے اندر ایک ایسا الیکٹرک چارج بھر دیا کہ وہ ٹیوب ٹرین کی طرح سفر کرتی تھی۔۔۔۔ نظر اس پر سے کرنٹ کھا کر پلٹتی تھی۔۔۔۔ وہ کسی صورت ٹک کر بیٹھے رہنے۔۔۔۔ اور سہل پسندی میں غرق ہونے پر آمادہ نہ تھی۔۔۔۔ اسٹائلش کٹے بال' برفانی ملکوں میں رہنے والے چہروں کی خاص دلفریب خشکی کی پرت اور روشنی' لڑ کر جیت کر فاتح بن جانے والی آنکھیں۔۔۔۔ جیسے سوڈا واٹر کی ٹھنڈی ٹھار بوتل میں نمک ڈال کر اسے تیزی سے ہلا ڈالا جائے۔

ان سب باتوں کے باوجود اس کی زندگی گھڑی کی ٹک ٹک کے خوف سے چلتی تھی۔ اس کے ہر کام میں بڑا ڈسپلن اور شدت تھی۔ جس وقت ہم سب گھر والے سو کر اٹھتے اسے ورزش کر کے فریش ہوئے دو گھنٹے گزر چکے ہوتے۔ بہت جلدی ہم دونوں کی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی لیکن اس ساری ہم آہنگی میں کسی مشرقی فلمی جذبے نے سر نہیں اٹھایا تھا۔ صرف ایک بس اسٹاپ یا ٹرین کے مسافروں کی سی کیفیت تھی جہاں دو خاموش لوگ گھڑی گھڑی باتیں کر لیتے ہیں۔

شروع شروع میں (اپنے پرانے زعم میں) مہرو کو کوئی خاص اہمیت نہ دیتے ہوئے میں نوفل اور اس کی امی کے ساتھ ہی چپکا رہا' نوفل کو پڑھاتا' اس کے ساتھ کھیلتا' مست رہتا۔۔۔۔ زویا سے فون پر لمبی لمبی باتیں کرتا۔۔۔۔ آنٹی کے کھانے اور دوائی کے وقت کو یاد رکھتا۔۔۔۔ زویا ٹھیک کہتی تھی تنہائی میں انسان دیواروں' چھتوں' اور رسی' بہت ساری بے جان چیزوں کو دوست بنا ہی لیتا ہے آنٹی نے مجھے بھی دوست بنا ہی لیا۔۔۔۔ پھر بیٹا۔۔۔۔ اور نئے نئے بنے اس بیٹے سے پرانی رازداریاں بھی۔۔۔۔ وہ پہروں مجھے اپنے باغوں' اپنے جیٹھ' دیوروں' رشتے داروں کی باتیں سنایا کرتیں۔ ہر رشتے دار سے ان کا دہرا رشتہ تھا کوئی ایک ماموں تھا تو پھوپھا بھی۔۔۔۔ خالو تھا تو چچا بھی۔۔۔۔

باتوں ہی باتوں میں میں ان کے سارے خاندان سے مل بھی لیا اور انہیں چہرے مہرے کے بھرپور نقش کھینچے جانے سے دیکھ بھی لیا۔ شروع شروع میں مجھے ان کی باتیں لطف دیتی رہیں پھر جیسے سب کچھ شاہی قلعے کی سی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگا۔۔۔۔ اور ان کا اور میرا رشتہ ساتھ رہتے ہوئے بھی دھوپ میں رکھی ہوئی خوبانی کی طرح سوکھتا ہی چلا گیا۔ میں نجانے کب مہرو کے نظریات اور خیالات کا حامی ہو گیا۔ بعض اوقات طویل باتیں اور گہری نظریں کسی پلیٹ فارم پر نہیں رکتیں اور ان کی کوئی آخری منزل بھی نہیں ہوتی۔۔۔۔ جیسے زنگ آلود مشین کو گریس لگا دیا جائے اور پھر وہ فر فر چلنے لگے۔ میں اور مہرو بھی کھل کر باتیں کرتے ایک دوسرے میں ایسے گھل مل گئے جیسے دریائے دجلہ و فرات ملتے ہیں۔

میں اپنے ملک کے خلاف ہو گیا۔۔۔۔ ہر ہر بات۔۔۔۔ ایک ایک چیز میں مجھے خامیاں خرابیاں نظر آنے لگیں۔ میں اس ملک کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ جانے اور کینیڈا میں ہی کہیں ہمیشہ بسے رہنے کے خواب دیکھنے لگا اور رفتہ رفتہ میری حالت کووں کے اس نئے جوڑے کی سی ہو گئی جو خود گھونسلہ نہیں بنا سکتا لیکن دوسروں کے گھونسلے پر حق سے قبضہ کر لینا چاہتا ہے۔

مہرو واضح طور پر اپنے ملک کے خلاف نہ تھی۔ اس کی ہر بات ہر سوال میں ایک مضبوط دلیل تھی اور مضبوط دلیلوں نے مجھے جکڑ لیا۔۔۔۔ ان دلائل کے پس منظر میں میں نے بہت کچھ محسوس کیا۔۔۔۔ اپنے فیصلوں اور منصوبوں کی کج روی کو بھی۔۔۔۔ اور مہرو کی نظر التفات اور نظر قبولیت کو بھی۔۔۔۔

میں مہرو کو زویا کے بارے میں کچھ نہ بتا سکا اور اس کی نظر قبولیت کے آگے خود بھی دبیز قالین کی طرح بچھتا چلا گیا میرا دل مہرو اور زویا کے درمیان اٹکا ہوا تھا جیسے گھڑیال کا پنڈولم۔۔۔۔ کبھی دائیں کبھی بائیں۔۔۔۔ مجھے دونوں کا نہ چاہتے ہوئے بھی موازنہ کرنا پڑا۔۔۔۔ پنڈولم کو کہیں تو ٹھہرنا تھا نا۔ زویا کی ہنسی زرگل کی مانند اندر ہی اندر دھنسی ہوئی تھی۔۔۔۔ اور مہرو کی ہنسی بلوہان

کی طرح کھلی ہوئی۔۔۔ جو کشتی کو بھی سمت کی تعین پر کھینچتا ہے، میرے دل کی سمت کا تعین بھی جلد ہی ہو گیا۔ بارش کے بعد دھنک نکل آئی اور مبرہ کے ساتھ میں اس دھنک پر مست پاؤں چلنے لگا۔

زویا کے متعلق مبرہ کو بتانے کا ارادہ آج سے کل اور کل سے پرسوں پر ٹالتا رہا اور آج سے کل کبھی نہیں آیا۔

انہی دنوں مجھے نوفل بھی کھٹکنے لگا۔ میرا اور مبرہ کا ایک ساتھ باغ میں بیٹھنا اور نوفل کا آ ٹپکنا۔۔۔ آئس کریم پارلر، سنیما۔۔۔ تھیٹر۔۔۔ شاپنگ، ہر جگہ نوفل کا ساتھ۔۔۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں ایک بچے کا باپ بن گیا۔ اس جھنجلاہٹ اور مبرہ کی آنکھوں کی جوت نے میرے وجود کو اتنا تپا دیا کہ وہ گرم لوہے کی طرح ہلکی سی چوٹ پر ہی مڑنے کے لیے بے قرار ہو گیا تھا۔

میرا دل مڑنے کے لیے تیار تھا یا مبرہ کو اس ساری صورت حال پر قدرت حاصل تھی۔ دراصل انسان اپنے آپ کو جھوٹی دلیلیں دینے میں بڑا ماہر ثابت ہوا ہے لیکن اگر ان ہی دلیلوں اور تاویلوں کو سچی ساج (تلوار تیز کرنے کا آلہ) پر چڑھا کر صیقل کر کے نکھارا جائے تو ہمیشہ صرف خود غرضی اور مطلب پرستی ہی سامنے آئے گی۔ لیکن انسان میں اتنی طاقت کب ہوتی ہے کہ وہ صیقل گر (تلواریں تیز کرنے والا) بنے جس صیقل گری میں سارا خسارہ اپنے پلے ہی ڈالنا پڑتا ہے۔ ایک دن نوفل میرے پاس چلا آیا۔

”بھائی کیا آپ ہمیں چھوڑ کر جانے والے ہیں؟“

”تمہیں کس نے بتایا؟“ میں مبرہ کو باہر لے جا رہا تھا اور نوفل کی آمد مجھے بہت ناگوار گزری۔

”آپ کی امی نے۔۔۔“

”ہاں جانے والا ہوں۔۔۔“ میں اسے بتا نہ سکا کہ باہر کے ملک جانا کیوں ضروری ہوتا ہے۔

”لیکن آپ نے تو آپی سے وعدہ کیا تھا کہ آپ ہمارا خیال رکھیں گے۔“

میرے کان کھڑے ہو گئے، اعصاب تن گئے۔۔۔ ظاہری بات ہے نوفل نے اس دن وعدہ یکائی کے لمحے کوئی تو میں دیکھا ہو گا۔ اچانک میرے دل میں تجسس سا بڑھ گیا۔ شاید یہ سب جانتا ہے۔۔۔ مجھے میں ساری اکتاہٹ دور ہو گئی اور اس کی جگہ ہمدردی نے لے لی اور پھر بھی میں اسے بتا نہ سکا کہ کچھ فیصلے ہمارے اختیار میں نہیں ہوتے ان کا ہو جانا بالکل ایسے ہی ہوتا ہے جیسے چنے کے کھیت کا دھوپ میں رنگ بدلنا۔۔۔ یہ دل بھی رنگ بدل لیتا ہے۔۔۔ اپنی مرضی کے۔۔۔ اپنی مرضی سے۔۔۔ جب اس پر پڑنے والا محبت کا سورج اپنی سمت بدل لیتا ہے۔

جس دن میرا اور مبرہ کا نکاح ہوا اس کے ٹھیک ایک ہفتے بعد ہم دونوں کی کینیڈا کی فلائٹ تھی۔ فاخر نکاح کے لیے ایمرجنسی میں آیا اور ایمرجنسی میں ہی چلا گیا، امی ابو کو میرے اور مبرہ کے نکاح پر کسی قسم کا اعتراض تھا نہ ہی کینیڈا روانہ ہونے پر۔۔۔ جس ایئرپورٹ سے ہم دونوں کینیڈا کے لیے اگلے ایک گھنٹے میں فلائٹ پکڑنے والے تھے اسی ایئرپورٹ پر اگلے چوبیس گھنٹوں بعد زویا واپس آنے والی تھی۔۔۔ کل رات اس کا فون بھی آیا تھا وہ بہت خوش تھی۔۔۔ کورس میں کامیاب ہو گئی تھی اب آگے آئندہ زندگی کے لیے بہت پر امید تھی اس ایک چھوٹی سی کامیابی کے بل بوتے پر وہ ایفل ٹاور کھڑا کرنے کے منصوبے بنا رہی تھی۔ میں اسے ایک دم سے مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے بتاتی رہی کہ اب زندگی اسے کتنے شاندار موقعے دے گی، زندگی کو اسے آگے لے جانا ہی پڑے گا وہ اپنی ماں کے سارے شکوے ختم کر دے گی اسے اسلام آباد میں ہی باغات کی مالکن بنا دے گی۔ نوفل کبھی اس بات کا شکوہ نہ کر سکے گا کہ خاندان سے کٹ کر وہ زندگی کی سہولتوں سے کٹا رہا، وہ بولتی رہی میں سنتا رہا میں ایک ہی فقرے میں اس کی زندگی اور اس کی محبت کا گلا نہ گھونٹ سکا۔

”بکران تم کچھ بولتے کیوں نہیں۔ سب خیریت تو ہے نا؟“ آدھ گھنٹے کی گفتگو میں وہ پہلی بار پریشان ہوئی۔

مجھے اگلے دن کے لیے پیکنگ کرنی تھی، تیاری ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی اور وہ پوچھ رہی تھی سب

خیریت تو ہے؟ میرے پاس کہاں اتنا وقت تھا کہ میں اسے شروع سے آخر تک بتاتا کہ اس ملک سے ایک دم سے میرا دل کیوں اچاٹ ہو گیا ہے۔۔۔ مجھے مہرو پسند آگئی ہے اور اس کا ملک بھی۔۔۔ اس کی ہنسی۔۔۔ اس کی شوخی۔۔۔ اس کی تیزی۔۔۔ اور زویا تم۔۔۔ تم نجانے تم ایک دم سے کیوں اور کیسے پس منظر میں چلی گئیں۔۔۔ کوئی قوس قزح ہو گئی ہو۔۔۔ غائب۔۔۔ گم ہی ہو چکی ہو۔۔۔ کسی چھلاوے کی مانند۔۔۔ ابھی یہاں تھی اور۔۔۔ پھر ابھی یہاں تو کبھی تھیں ہی نہیں۔۔۔ اور میرا دل۔۔۔ کیا میں اسے سمجھاؤں' بتاؤں کہ یہ بے وفا نہیں ہے۔۔۔ دراصل مرد کبھی بے وفا نہیں ہوتے۔۔۔ کیونکہ یہ کبھی وفادار نہیں ہوتے۔ جیسے زیبرا جو نہ کالا ہوتا ہے نہ سفید۔۔۔ بلکہ ان دو رنگوں کا ملغوبہ۔۔۔ ایسے ہی مرد وفاداری اور بے وفائی کا ملغوبہ ہوتا ہے۔۔۔ اس پر کسی بھی ایک چیز کی پکی مہر نہیں لگ سکتی۔۔۔ یہ مرد کی فطرت ہے۔۔۔ کسی لوک گیت کی طرح وہ اپنے پرانے سازوں کے ساتھ ساتھ نئے سُروں کے اندر بھی مدغم ہونا چاہتا ہے۔

میں اس سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کس بل بوتے پر مجھے یوں اکیلا چھوڑ کر چلی گئی تھی؟ کیا اسے میری وفا اور اپنی محبت پر ایسا اندھا اعتماد تھا اور میرا دل۔۔۔ کیا اسے بتاؤں کہ مرد کی محبت پر اس طرح کا اعتماد انسان کو خود بھی اندھا کر دیتا ہے۔

تمہیں کس نے کہہ دیا تھا زویا کہ "تعویذ حب" پہن لینے سے ساری محبتیں ساری زندگی کے لیے اپنے ساتھ نتھی ہو جاتی ہیں۔ یہ نتھی کرنے کا عمل ہی تو بڑا جان لیوا ہوتا ہے۔ محبوب کو پابہ زنجیر کرنا پڑتا ہے۔۔۔ اسٹین لیس اسٹیل کی کھونٹی سے سیسہ پلائی دیوار کے ساتھ باندھنا پڑتا ہے۔۔۔ برگد کی جڑوں کا مضبوط جال بنانا پڑتا ہے۔۔۔ یہ عروجی چوٹے عام طریقے سے نہیں بنتے۔۔۔ اس کے لیے مانجھا لگی ڈور استعمال کرنی پڑتی ہے۔۔۔ ہاتھوں کو زخمی کرنا پڑتا ہے۔۔۔ بڑے جان جوکھوں کے مراحل ہوتے ہیں۔

زویا۔۔۔ سارے عمل دل پر بھاری گزرتے ہیں۔۔۔

تب کہیں جا کر قسمت کا پھل ملتا ہے۔۔۔ محبت کا پھل۔۔۔ افسوس کہ تم ان سارے مراحل سے نہ گزر سکیں اور مجھے چھوڑ کر کراچی چلی گئیں۔۔۔ پورے چار ماہ کے لیے۔۔۔ یہاں تو لمحوں میں زندگی بدل جاتی ہے۔۔۔ آتش فشاں پھٹ پڑتے ہیں۔۔۔ طوفان آجاتے ہیں۔۔۔ جل تھل ہو جاتا ہے۔۔۔ اور تم چار مہینوں کے لیے چلی گئیں۔۔۔ بہت لمبا عرصہ ہے یہ زویا۔۔۔ وفا اور بے وفائی کے ملغوبے کے لیے۔۔۔ یہ تو بہت ہی لمبا۔



سات سال بعد۔۔۔ میں بڑی فراغت سے پاکستان آیا تھا۔۔۔ یہ سال کسی ٹک ٹک کے خوف کے بغیر گزرے۔ میں دو بچوں کا باپ بن گیا' امی ابو کینیڈا میرے پاس دو ایک چکر لگا گئے وہ عارضی طور پر آتے اور چلے جاتے نہ انہوں نے کبھی مستقل میرے پاس رکنا چاہا نہ میں نے روکنا چاہا۔ فاخر شادی سے پہلے اور شادی کے بعد بھی جونک کی طرح امی ابا کے ساتھ چمٹا رہا۔ ملٹری کی جاب کرتے کرتے وہ گھر سے اتنی دیر باہر اور امی ابا سے اتنا دور رہا تھا کہ وہ ہر وقت ان کی گود میں چھپا کسی خلش کو دور کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ اس کی بیوی زارا خوب صورت اور ملنسار لڑکی تھی۔۔۔ اسی لیے مجھے امی ابا کے رہن سہن کے حوالے سے کبھی کوئی تشویش نہیں ہوئی۔

مہرو کی محبت اگرچہ پہلے دن کی طرح نہیں رہی تھی لیکن یہ محبت بڑھاپے یا اکتاہٹ کا شکار بھی نہیں ہوئی تھی۔ دراصل مہرو کے فیکٹس اینڈ فیگرز ہمیشہ ہی بہت اچھے رہے ہیں۔ اس کے ساتھ شادی کے بعد کبھی پچھتاوے کی رمق یا ناامیدی کی لو نہیں پھڑپھڑائیں' کسی موڑ پر وہ مجھ سے محبت نہ کر سکی تو خیال کا جذبہ سر اٹھا دیتا۔۔۔ خیال سے بھی نیچے جاتی تو احساس کا جذبہ غالب آتا۔۔۔ اور احساس بھی غالب نہ رہتا تو انسانی ہمدردی و حقوق آڑے آجاتے' محبت اور محبت کے پیچھے بدلتے ہوئے درجوں میں کہیں بھی مطلب پرستی یا بے توجہی نہ تھی۔ وہ شادی شدہ زندگی کو پیار و

سکون کے ساتھ دیر کے ساتھ مل کر ایک جاب کی طرح چلا رہی تھی۔۔۔ ہر چیز میں وقت کی بڑی اہمیت تھی۔ وقت پر کام۔۔۔ وقت پر بے منٹ۔۔۔ نہ غیر حاضری کی نوبت نہ ریزائن دینے کا دھیان۔۔۔ وہ میری باتوں کو بہت غور سے سنتی اور بڑے تحمل سے میرے اختلافات دور کرتی۔۔۔ ان سات سالوں میں کوئی ایسا جھگڑا یا جھڑپ میرے ذہن میں محفوظ نہ ہو سکی جس کی شروعات مہرو نے کی ہو۔ وہ اپنے ذاتی 'جھگڑے' مطلب 'شکایتیں' خود ہی حل کرنے کی عادی تھی' وہ مشرق اور مغرب دونوں طرح کی بیویوں کا امتزاج تھی' جو شوہر کے ساتھ پیار بھی کرتی ہیں اور پیار سے اسے سہتی بھی ہیں' دوسری صفت زیادہ پیار کرنے والی بیویوں کی علامت ہے۔

ابھی تک مہرو کی ہنسی ویسی ہی تھی۔۔۔ پورے کا پورا بادبان کھل جانے والی ہنسی جو محبت کی کشتی کو سیدھی سمت رواں دواں رکھتی ہے۔ مہرو کی ان ہی خوبیوں کے باعث ہماری سات سالہ ازدواجی زندگی میں کبھی کج روی نہ آئی۔

شادی کے بعد میرا پہلا چکر سال بعد لگا تھا۔ میرا دل پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا' میں پریشان تھا کہ زویا کا سامنا کیسے کروں گا لیکن یہ مشکل پہلے سے ہی حل شدہ نکلی۔ ابو نے بتایا کہ ساتھ کا گھر بڑی عجلت میں اور اونے پونے بیچ دیا گیا تھا اور نئے مالک مکان بھی اسے خرید کر جیسے بھول گئے تھے گھر نئے سرے سے کھنڈر بننے جا رہا تھا سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا صرف سفیدے کا درخت کٹ چکا تھا اور باغ کی دیوار کی کھوہ جو دونوں گھروں میں آنے جانے کا کام دیتی تھی کو اینٹوں سے بھر دیا گیا تھا۔ آمدورفت کا راستہ بند کر دیا گیا تھا۔ یہ منظر میرے دل میں برچھی کی طرح اترا۔ وہ نئی دیوار زویا کی طرف سے ہوئی تھی ابا نے ہی بتایا تھا میں ابا امی سے زویا کے بارے میں کچھ پوچھ نہ سکا۔ نجانے وہ اپنی ناراض ماں اور چھوٹے بھائی کو لے کر کہاں گئی تھی۔ مکان کیوں بیچ دیا۔۔۔ باغ کے خلا میں دیوار کیوں کروائی۔۔۔ یہ اور ایسے ہی سوالات میرے ذہن میں ایسے سر اٹھاتے جیسے گرم ریت میں مکئی کے دانے اچھل اچھل کر بھنتے ہیں۔ میں دنوں ماضی کے خیالات کی چادر بنتا رہا۔ انہی دنوں میرے گھر بیٹے کی ولادت ہوئی اور سارا ذہنی کرب ایسے بیٹھ گیا جیسے بارش دھول کو بٹھا دیتی ہے۔

اگلا چکر فاخر کی شادی میں لگا۔۔۔ اس کے بعد دو ایک چکر سردیوں کی چھٹیوں میں لگے۔۔۔ بس آیا اور گیا زیادہ قیام نہ کر سکا۔ تاہم اب سات سال کے بعد ابا کی وفات پر میں بڑی فراغت سے پاکستان واپس آیا تھا۔۔۔ بہت سارے دنوں کے لیے۔۔۔

ابا جی طویل العمر تھے اپنی طبعی موت مرے۔۔۔ ابا جی کی موت میرے لیے اتنی ہی اہمیت رکھتی تھی جتنی کسی بھی بڑی عمر کے آدمی کے لیے اس کی بچپن کی یاد کا ایک کھلونا۔۔۔ سات سال جسمانی طور پر دور رہتے میں ذہنی طور پر بھی ان سے دور ہو گیا تھا۔۔۔ اور ویسے بھی طبعی موت اپنے اندر اتنا غم اور افسوس نہیں رکھتی جتنا حادثاتی موت رکھتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کچھ دنوں میں امی سمیت ہم سب نارمل ہو گئے۔

اور ابا جی کی موت اور موت کا غم ایسے ہماری زندگیوں سے اترا جیسے دھاگے کی نلکی پر سے سارا دھاگا اترتا جاتا ہے۔

"کسی ہل اسٹیشن نہ چلیں۔۔۔ امی کا بھی دل بہل جائے گا۔" فاخر نے کہا اور جیسے میری سوچ میرے چہرے کی ساخت سے پڑھ لی۔ جیسے وہ میری ساری الجھنوں سے واقف ہو گیا ہو ایک خوف کی پرچھائیں میرے اوپر سے گزر گئی۔ اگر فاخر سب جان سکتا ہے تو مہرو اب تک کہاں لاعلم رہی ہو گی۔ انسان کی یہ بدقسمتی رہی ہے کہ کتنی بھی اکثر یا ٹھوس دلیل سے خود کو مطمئن کر کے بے وفائی کرتا ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہی بے وفائی اتنا ہی بڑا اور ٹھوس احساس گناہ بن جاتی ہے۔

"کہاں کھو گئے آپ؟"

"ہاں۔۔۔ بولو کہاں چلنا ہے" میں چونکا۔

"جہاں آپ کہیں وہیں چلتے ہیں۔۔۔ بالاکوٹ۔۔۔

تاران۔۔۔ کیلاش، راولا کوٹ۔"

"راولا کوٹ۔۔۔" گرم چائے میرے ہاتھ سے چھلک گئی۔

"ارے۔۔۔ سنبھل کر۔۔۔" مہرو تیزی سے ٹشو لے کر میرے ہاتھوں پر گری چائے صاف کرنے لگی۔

"تو پھر۔۔۔ بولیے بھائی۔"

"ارے۔۔۔ وہاں چلتے ہیں۔۔۔ کیا نام ہے اس جگہ کا۔۔۔ بتائیے نا بھران آپ۔۔۔ جس جگہ کے قصے سناتے تھے مجھے کہ جب پاکستان جائیں گے تو وہاں ضرور جائیں گے۔۔۔ بن جوسہ۔۔۔ ہاں یہی ہے۔۔۔ ہے نا۔" میز پر رکھے کپ کو دوبارہ پکڑنے کی مجھ میں ہمت نہ رہی۔

"بہت بار گئے ہیں ہم دونوں وہاں۔۔۔ راولا کوٹ سے ذرا آگے ہے بس۔" ٹھنڈے علاقوں میں جانے کے لیے ساری پیکنگ دو دن میں ہی ہو گئی اور یہ دو دن میں سخت اذیت کی حالت میں رہا۔ بن جوسہ دیکھنے کے لیے سب اس قدر پرجوش ہو رہے تھے کہ میں نہ جانے کا کوئی جواز ڈھونڈ ہی نہ سکا۔

راولا کوٹ میں آج چھٹا دن تھا۔ امی نہ آسکی تھیں۔ زارا یہاں بھی ہماری میزبانی کے فرائض سر انجام دے رہی تھی اس کے سر سے یہ بھوت اتر ہی نہیں رہا تھا کہ اس کے جیٹھ اور جٹھانی کینیڈا سے پاکستان صرف چند ہفتوں کے لیے آئے ہیں۔

رہائش ہر طرح سے آرام دہ، گرم اور پرسکون تھی۔ ہم ادھر ادھر خوب گھومتے پھرتے رہے۔ ایک جگہ سے دوسری۔۔۔ دوسری سے تیسری جگہ منتقل ہوتے رہے۔ ایسی چستی رگ و پے میں بھر چکی تھی کہ دل چاہا پاکستان کے سارے شمالی علاقہ جات ایک ہی دن میں دیکھ ڈالیں۔ فاخر ملٹری کا بندہ تھا اس لیے اس کو ملنے والی ہر سہولت کا ہم فائدہ اٹھا رہے تھے۔ بن جوسہ ہماری آخری اور طویل قیام گاہ تھی یہاں سے جب بھی روانگی ہوتی تھی سیدھی گھر کی طرف ہوتی تھی۔ اس لیے یہاں آتے ہی سب اپنے طور پر مطمئن سے ہو گئے۔ دو ایک دن تو درختوں، پانیوں، پرندوں کو کھوجنے

میں لگا دیے۔۔۔ ساتھ پہاڑوں کی سرد پتھریلی جادر راتوں کے مزے لیے۔۔۔ پھر پاؤں پسار کر ایسے رہنے لگے جیسے مدتوں سے اسی جگہ مقیم ہیں۔

میرے اور فاخر کے تاش کے وہ پیکٹ نکل آئے جو بے چارے میٹرک کے بعد کبھی کھلے نہ تھے۔ وہاں سے تھکتے تو لمبی چہل قدمی کے لیے نکل جاتے۔ میں اپنی کینیڈین تیز گام زندگی اور فاخر اپنی ملٹری کی سخت قواعد و ضوابط بھری زندگی سے گن گن کر بدلہ لے رہے تھے۔ زارا اور مہرو کو اپنا اور بچوں کا ہوش نہیں تھا۔ ان چند دنوں میں ہی دونوں نے دوستیاں بھی بنالی تھیں اور انہی دوستوں کے سنگ وہ چھوٹے چھوٹے بازاروں کا رخ کرنے لگی تھیں، کمروں میں پہاڑی علاقے کی بناوٹ والے مخصوص کپڑوں اور دوسری چیزوں کا ڈھیر لگنے لگا تھا۔ دونوں کو ایک ہی بے چینی تھی کہ پتا نہیں اب یہاں کب دوبارہ آنا ہو۔۔۔ مہرو نے اتنی خریداری کینیڈا میں سات سالوں میں نہیں کی تھی جتنی زارا کے ساتھ مل کر اس نے ان اتنے سے دنوں میں کرلی تھی۔ بازار سے واپسی پر بھی وہ جیسے بازار میں ہی کہیں موجود رہتیں۔

"اس کا شوہر دیکھ کر تو میں حیران ہی رہ گئی ایسی پڑھی لکھی اور ایسا خصم۔" زارا خالص پنجابی انداز میں خیالات کا اظہار کر رہی تھی۔

"کون۔۔۔ کس کا خصم۔۔۔؟" فاخر زارا سے پوچھ رہا تھا۔

"ہے ایک ہماری سہیلی۔۔۔ شادی نہ ہوئی ہوتی تو اسے اپنے بھائی کے لیے کینیڈا لے جاتی۔" مہرو بہت متاثر نظر آرہی تھی وہ کم ہی کسی سے اتنا مرعوب ہوتی تھی۔

"کیا اتنی پیاری ہے؟"

"ہاں۔۔۔ بکران! قسم سے دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ شادی شدہ ہے اور دو بچوں کی ماں بھی۔۔۔ بہت تعلیم یافتہ ہے۔۔۔ لیکن یہاں کے لوگوں میں یہی تو خرابی ہے کہ وہ تعلیم تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن اس کا فائدہ نہیں اٹھاتے۔"

میری بیوی "یہاں کے لوگ" کا لفظ ایسے استعمال کرتی تھی جیسے وہ پیدا ہی کینیڈا میں ہوئی تھی۔

اگلے دن مہرو باقاعدہ مجھ سے پوچھ رہی تھی "بکران! آپ کیسے نہیں جانتے اسے وہ تو کچھ عرصہ اسلام آباد میں بھی رہ چکی ہے زویا نام ہے اس کا۔۔۔ اور وہ تو کئی بار پوچھ چکی ہے۔۔۔ کہہ رہی تھی کہ امام صاحب کے بیٹے کو کون نہیں جانتا۔۔۔ کل چلیے گا ہمارے ساتھ۔۔۔ شاید کچھ یاد آجائے۔"

تو زویا تم واپس آگئی تھیں۔۔۔ تم نے تو زندگی میں آگے بڑھنا تھا۔۔۔ محسن سے شادی کر کے تم کیسے اتنی بڑی قربانی دے سکتی تھیں لیکن شاید تمہارا واپس آجانا ہی بہتر تھا میں نے تمہارے لیے وہاں چھوڑا ہی کیا تھا جو تم وہاں ٹکی رہتیں۔۔۔ اور اپنی ماں کے طعنے سہتی رہتیں۔

چیونٹی صرف تھوڑی دیر کے لیے اپنی قطار سے جدا ہوتی ہے زویا۔۔۔ لیکن بالآخر واپس اسے اپنی ہم نسلوں کے ساتھ ہی ملنا پڑتا ہے۔۔۔ تم بھی واپس اپنے آبائی قبیلے آگئیں زویا۔۔۔ اب وہ لوگ تمہیں کھانا دیں گے رہائش دیں گے، چاہت و شفقت دیں گے اور بدلے میں ایک چیز مانگیں گے۔۔۔ قطار کی سیدھ۔

یہ سیدھ اکیلا انسان کبھی نہیں سیکھ سکتا زویا۔۔۔ آگے اور پیچھے حدیں لگانی پڑتی ہیں۔ تمہارا وجود بھی اب صرف نسل انسانی کی بقا کے لیے کار آمد ہے ورنہ جو محبت میں نے تمہیں دے کر چھین لی اس نے تو تمہیں اندر تک کھوکھلا کر دیا ہوگا۔ فاخر بالکل ٹھیک کہتا ہے کہ میری بے تکلفی اگلے کے لیے بعض اوقات جان لیوا ثابت ہوا کرتی ہے۔۔۔ جو بیج کو پھوٹنے میں مدد تو دیتی ہے لیکن بے توجہی کی وجہ سے دوبارہ اسے ناکارہ بیج بنا دیتی ہے۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا زویا۔۔۔ لیکن میں نے کہا نا مرد بے وفا نہیں ہوتا۔۔۔ بس وہ وفا اور بے وفائی کا ملغوبہ ہوتا ہے۔ یہ ساری سوچیں رات تک میرے دماغ پر چپٹی رہیں "بس اب واپس چلتے ہیں۔۔۔ بہت دیر ہو گئی۔" اعلان غیر متوقع نہ تھا دو دن سے میرے گھر والے میرا منہ دیکھتے ہوئے

بیٹھے تھے۔
اس اعلان کے ہو جانے کی آس لگائے

"صرف دو دن اور بھائی ۔۔۔ پرسوں چاند کی چودھویں ہے نا۔۔۔ سب مون لائٹ ڈنر کریں گے۔"

میرے پاس فاخر کی بات کا کوئی جواب نہ تھا اور نہ ہی واپس جانے کے لیے کوئی ٹھوس وجہ۔

☼ ☼ ☼

باہر سے مجھے سب کے قہقہوں کی آوازیں بڑی دیر تک سنائی دیتی رہیں۔ میری عمر ابھی زیادہ تو نہ تھی کہ مجھے جوڑوں کے درد کا خوف ہو۔۔۔ اور نہ ہی بن جوسہ کی سردی کینیڈا کی سردی سے زیادہ ہے۔۔۔ کھانا کھا کر میرا دل باہر نہ لگا اور میں اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ باہر بچے، فاخر، مبرہ، زارا نجانے کتنی دیر تک بیٹھے رہے آدھی رات کے قریب سب کا شور تھما۔۔۔ مبرہ بچوں کو سلا کر کمرے میں آگئی۔

"ابھی تک جاگ رہے ہیں آپ؟"

"ہاں۔۔۔ ویسے ہی۔۔۔ نیند نہیں آرہی تھی۔"

"سو جائیں، صبح جلدی نکلنا ہے۔"

"اپنی دوست کو خدا حافظ کہہ آئی ہو؟"

"ہاں کہہ آئی۔" مبرہ کے لہجے میں بہت کچھ انوکھا تھا۔

"اچھا ہوا یہ دوستی یہاں ہی ختم ہو گئی۔۔۔ میں کہاں کینیڈا تک اس دوستی کو سنبھالتی پھرتی۔"

"ہوا کیا۔۔۔؟"

"عجیب فلسفی لڑکی تھی۔۔۔ دماغ چاٹ لیتی تھی۔۔۔ پتا ہے آج کیا کہنے لگی۔۔۔ کہتی۔۔۔ میری آنکھوں کے آگے جو کن پردے ڈل چکے ہیں وہ مجھے ہر روز کھینچ کر یہاں لے آتے ہیں۔ قسم سے یہاں کے لوگ بہت عجیب ہیں بکران۔۔۔ ایک آپ ہی شاید مختلف نکل آئے ورنہ ہر ایک نے اپنے الگ فلسفے پال رکھے ہیں۔۔۔ شکر ہے بکران آپ ان جیسے نہیں۔۔۔ اور آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں کہ آپ کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کر ہی نہیں سکتے تھے۔۔۔ آپ کی سوچ سے مطابقت رکھنے والی تو شاید پورے پاکستان میں نہ ملے۔"

میں سمجھ نہ سکا کہ آدھی رات کے وقت میری بیوی میری تعریف کر رہی ہے یا مجھ پر تنقید۔۔۔ میری سوچ سے مطابقت رکھنے والی سے اس کی کیا مراد ہے۔۔۔ میری ذات کے زاویے خود غرضانہ ہیں یا میں پرانی چیزوں کو جلد بھول جانے کا عادی ہوں اس لیے۔

مبرہ گہری نیند سو چکی تھی اور مجھے نجانے کیوں آج رات نیند نہیں آرہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پانی میں کنکر گرنے کی آواز آرہی تھیں اور یہ دھپ دھپ میرے دل پر پڑ رہی تھی اپنے گرد چادر کو لپیٹ کر میں باہر آگیا چاند کی روشنی میں اس کا وجود چمکتا تھا جیسے سفید کھدر کے کپڑے میں مقیش جڑے ہوں

اس نے میرے آنے کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ جیسے پہلی بار میرا کان مروڑتے وقت نہ لیا تھا۔ میں اس کے ساتھ تھوڑا فاصلہ رکھ کر بیٹھ گیا۔ بہت دیر ہم دونوں میں خاموشی رہی۔ اب سوچتا ہوں کاش خاموشی ہی رہتی۔

"مجھے خود نہیں پتا میں نے تم سے کیا کیا چھین لیا ہے زویا۔۔۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔"

"تم نے مجھ سے کچھ چھینا نہیں بلکہ تم نے مجھے دیا ہے۔ اگر تم آکر نہ جاتے میری زندگی میں تو میں پستی اور بلندی کا فرق کیسے کرتی میں تو نا سمجھ ہی رہتی نا۔۔۔ تم نے تو مجھ پر احسان کیا ہے۔"

بہت دیر بعد وہ بہت مضبوط آواز میں بولی۔ میرے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔

"مجھے کیسے پتا چلتا کہ خاک سے بدتر چیزوں کو سر کا تاج نہیں بنانا چاہیے۔" جھیل کے پانی کو میں نے سوکھتے دیکھا۔

"تم زویا۔۔۔" میں نے بولنے کی کوشش کی۔

"ہاں میں زویا۔۔۔ زویا محسن۔۔۔"

"جانتا ہوں کہ تم نے شادی کر لی ہے۔"

"کیوں تمہیں کیا لگتا تھا میں تمہارا روگ پال کر بیٹھ جاؤں گی؟"

ایک زناٹے دار تھپڑ کی طرح مجھے یہ جواب لگا۔

مرد کی وبلت ہر عورت کو اسیر کیے رکھنا نے مجھے یہ دن دکھایا تھا۔ سوکھی ہوئی جھیل میں ڈوب مرنے کو میرا جی چاہا۔ میں تو سمجھتا تھا زویا آج بھی مجھے چاہتی ہوگی۔ راتوں کو سو نہیں سکتی ہوگی اور ساون میں بھیگتے اپنے آنسو چھپاتی ہوگی۔ یہی خواہش رکھتا ہے نا مجھ جیسا مرد کہ عورت اس کے نام پر اپنی اجلی زندگی کو تاریک رات میں بدل دے اور بین ڈالتی پھرے۔ آہیں بھرے لیکن خوش نہ ہو۔ اگر کسی دوسرے مرد کے ساتھ منسلک بھی ہو جائے تو اس پہلے مرد کے نام پر ہجر کے الاؤ میں خود کو ہر پل جلاتی رہے۔ جلا کر خود کو بھسم کر ڈالے لیکن باغ و بہار نہ کرے۔

"آنکھوں پر سے پردہ ہٹتا ہے تو انسان کیا کرتا ہے۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر پوچھ رہی تھی۔ میں اس سوال پر خاموش رہا۔ کیونکہ میں اس کے جواب کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

"میں بتاتی ہوں۔۔۔ جب نام نہاد محبت کی آنکھوں پر سے پردہ ہٹتا ہے نا تو انسان روتا ہے۔ اس شخص کے لیے نہیں بلکہ خود اپنے لیے کہ اس نے خود کو ایسے کیوں گرا لیا۔ اسے تکلیف ہوتی ہے اپنے بے وقوف بننے پر نہیں بلکہ اپنی عقل استعمال نہ کرنے پر۔۔۔ میں بھی روئی بہت روئی۔ مگر اپنے لیے روئی۔ میں تڑپی لیکن اپنے لیے اس میں تم کہیں بھی نہیں تھے۔ تمہیں ایک بار میں نے نکالا تو دوبارہ واپس نہیں آنے دیا۔" وہ نفرت کے انداز میں بولی۔

مجھے یقین ہو گیا کہ آئندہ آنے والی کسی بھی رات میں سکون سے نہیں سو سکوں گا۔ سکون تو اس سامنے والی جھیل کے پانی کے ساتھ سوکھ کر ختم جا رہا تھا۔۔۔

"تم محسن کے ساتھ خوش ہو؟" میں نے اپنی طرف سے اس پر طنز کیا۔ میں جانتا تھا اگر اس نے اسی کے ساتھ خوش رہنا ہوتا تو وہ مجھ سے محبت نہ کرتی اسی سے شادی کر لیتی۔ کیوں ایسے بھاگی پھرتی۔۔۔

"میں ایک خالص اور بلند انسان کو اپنی زندگی میں لا کر خود کو بہت معتبر محسوس کرتی ہوں۔۔۔ مجھے کتنا سکون ملتا ہے ہر بار اسے دیکھ کر یہ سوچتے ہوئے کہ محسن تمہاری طرح جھوک۔ (ٹیڑھا) ہوپ نہیں ہے۔"

بس بہت ہوئی میری سانسیں اٹکنے لگیں کینیڈا کی آسائش زندگی اور میرو کا سارا حسن مجھے ہیچ لگنے لگا۔ میری آنکھوں میں اتنا دھواں بھر گیا کہ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے چاند کی روشنی تلاش کرنی چاہی۔ اور مجھے صرف اندھیرا نظر آیا۔

"تو تم رات رات بھر اس جھیل کے کنارے بیٹھ کر کون سا سوگ مناتی ہو۔" میں نے خود کو تسلی دینے کے لیے ایک اور وار کیا۔

"میں یہاں خود کو داد دینے آتی ہوں۔ اور اس شخص کے بارے میں جو میرا شوہر ہے گہرائی اور شفافیت سے سوچنے آتی ہوں۔ میں اسے سوچتے سوچتے تھکتی ہی نہیں۔ رات ختم ہو جاتی ہے میری سوچ نہیں۔ اس شفاف پانی کے کنارے میں اس شفاف انسان کو اپنے دل میں۔۔۔ گہرائی میں۔۔۔ اور بہت گہرائی میں اتارنے آتی ہوں۔ محسوس کرتی ہوں اسے۔۔۔"

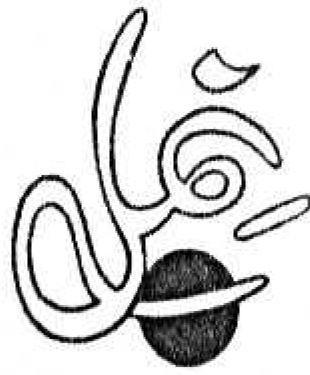
اور مجھے بحران کو پچھتاوا ہوا کہ میں نے اس سے یہ آخری سوال کیوں کیا تھا۔ میں خود کو بہلاوا دے سکتا تھا کہ وہ میرا سوگ منانے اس جھیل کنارے رات رات بھر بیٹھنے آتی ہے۔ اس بہلاوے سے میں اپنی باقی زندگی قدرے سکون سے گزار سکتا تھا نا۔۔۔

"زویا میں۔۔۔" میں نے کچھ کہنا چاہا۔

لیکن وہ اٹھی اور اپنے قدموں کے نشان اپنے پیچھے اور میرے آگے چھوڑتی پرسکون انداز میں مضبوط چال لیے چلی گئی۔ اس کی چال بتا رہی تھی کہ محسن کے ساتھ وہ کیسی زندگی گزار رہی ہے۔ پرسکون۔۔۔ معتبر۔

میں نے ایک بڑا کنکر اٹھا کر اس جھیل میں پھینکا جو میرا سارا سکون لیے سوکھ چکی تھی۔ اور یہ ابتدا تھی اور میں جان گیا تھا اس کی انتہا بھی ہوگی۔ محبت کے نام پر ڈھونگ کرنے والوں کے لیے یہ کوئی بڑی سزا تو نہیں۔۔۔

نمرہ احمد

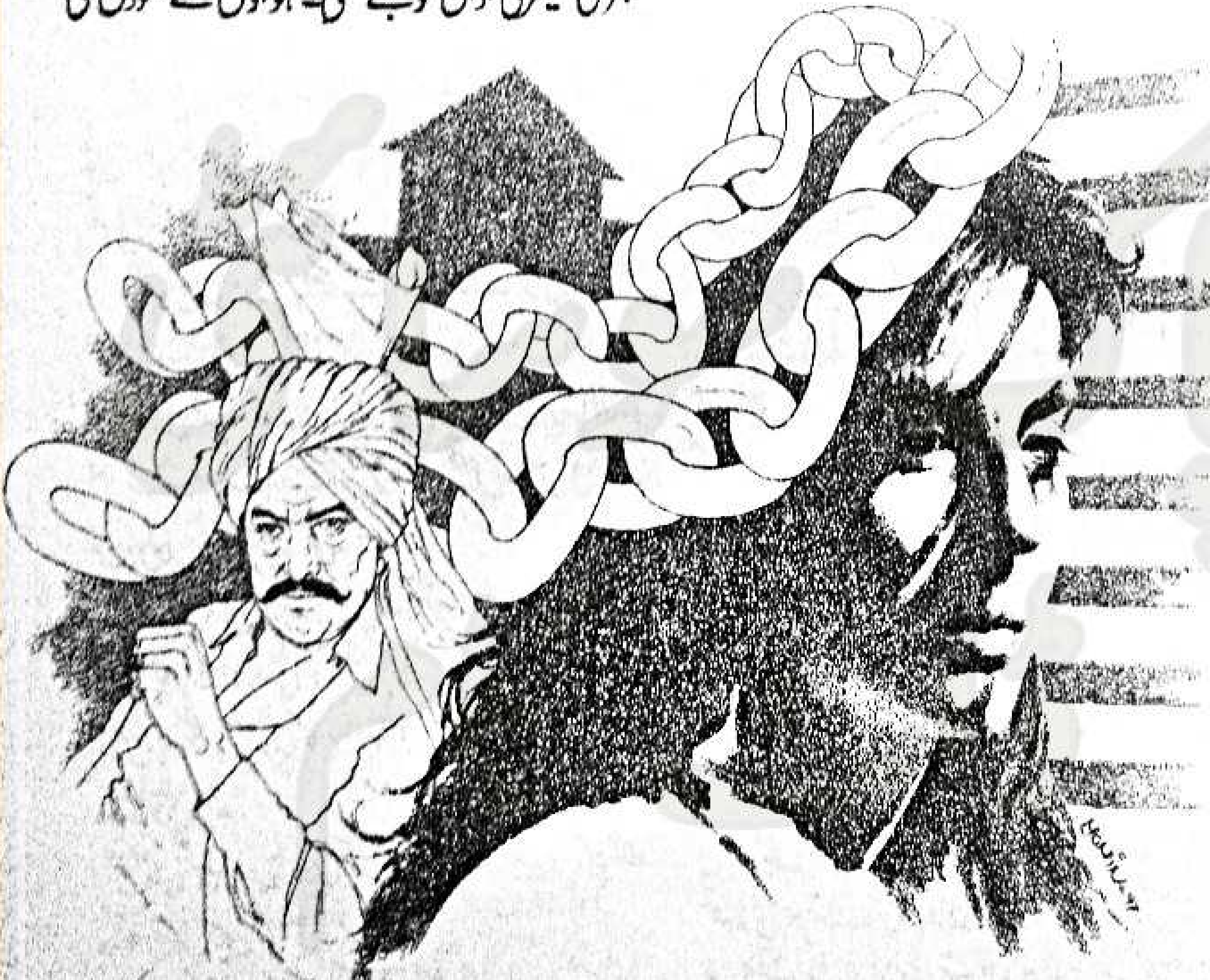




اور خدا نے انعام کیا
نوح علیہ السلام پر
اور ان کے بیٹوں پر
اور ان سے فرمایا
آباد رہو اور پھیلتے جاؤ
اور زمین کو بھر دو
تمہارا خوف اور تمہاری ہیبت
ہوگی زمین کے ہر درندے پر

آسمانوں کے ہر پرندے پر
مٹی پہ رینگنے والی ہر شے پر
اور سمندر کی تمام مچھلیوں پر
تمہارے ہاتھوں میں وہ پہنچائی جائیں گی
ہر زندہ متحرک شے تمہاری غذا ہوگی
اور جیسے میں نے تمہیں عطا کیے ہیں
سرسبز پودے
ویسے ہی میں تمہیں ہر شے عطا کروں گا

مکمل ناول



مگر!
تم اس کو اس کی جان کے ساتھ نہیں کھاؤ گے
اور اس کی جان اس کا خون ہے
اور تمہاری جان کے خون کا
میں حساب لوں گا
ہر درندے اور ہر انسان سے
اور میں یقیناً "حساب لوں گا ہر انسان سے
اس کے ساتھی انسان کی
جان کا!
(کتاب فرہنش' عہد نامہ قدیم 'تورات)

نہ دعا' نہ شہادت حساب پاک ہوا

صحن تاریک تھا اور طویل برآمدہ نیم روشن۔ فجر کی دو اذانیں دی جا چکی تھیں اور آسمان گہرا جامنی تھا۔ برآمدے کے آگے کوٹھڑیاں در کوٹھڑیاں تھیں۔ جن کے دروازے سلاخ دار تھے اور جن کی میلی دیواروں پہ لکیریں' نشان' نام لکھے تھے۔ کچھ قیدی سو رہے تھے۔ کچھ جاگ رہے تھے۔ یہاں زندگی دو انتہاؤں کے درمیان لٹکتی تھی۔

سیاہ دھاری' سفید دھاری سے مکمل الگ ہو چکی تو فجر کی تیسری اذان گونجنے لگی۔ ہواؤں نے موذن کی آواز کو اپنے پروں پہ اٹھایا اور صحن میں پھیلا دیا۔

"اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔"

ایسے میں برآمدے میں دو پہرے دار ٹہلتے ٹہلتے ایک ستون کے ساتھ آکھڑے ہوئے تھے۔ ایک نے بیڑی سلگائی اور دوسرے کو پیش کش کی' جسے دوسرے نے مسترد کر کے پہرے اس حوالاتی قیدی کی کوٹھڑی کو دیکھا۔ جس کے سامنے وہ کھڑے تھے۔

پہلے سپاہی عبدالشکور نے بھی گردن موڑی' پھر استہزائیہ مسکا کر سر جھٹکا۔

"محمد دین! بار بار اس بدمزاج آدمی کو نہ دیکھا کر۔ اس کا دماغ پہلے ہی خراب رہتا ہے۔ تیری ہمدردی سے وہ اور شیر ہو جائے گا۔" لبوں سے دھواں چھوڑتے اس نے تنبیہہ کی۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جس کی عبادت کرنی چاہیے۔" موذن کی صدا برابر آ رہی تھی۔

محمد دین تاسف سے اسی کوٹھڑی کو دیکھتا رہا۔ جس میں سفید لباس میں ملبوس قیدی نماز کا کپڑا بچھاتا نظر آ رہا تھا۔

"کیا یوں نماز پڑھنے سے اللہ معاف کر دیتا ہے؟" محمد دین نے مایوس آواز میں پوچھا۔

قیدی اب آستینیں کلائیوں تک برابر کر رہا تھا جو اس نے وضو کے لیے اوپر چڑھائی تھیں۔ اس کی پشت ان دونوں کی جانب تھی۔

"قتل کبھی معاف نہیں ہوتا اور جو اس کی طرح اپنی بیوی اور سگے بھائی کو قتل کر دے۔ وہ تو کبھی معاف نہیں ہو گا۔" بیڑی کا بڑا سانس اندر کھینچتے عبدالشکور نے فتویٰ دیا۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم' اللہ کے رسول ہیں۔"

"میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم' اللہ کے رسول ہیں۔"

"مگر اس کی بیوی اور اس کے بھائی کے تعلقات تھے۔ اس نے غیرت میں قتل کیا تھا۔ یہی سننے میں آیا ہے۔ تب ہی تو چار سال سے جیل میں ہے۔"

محمد دین ستون سے ٹیک لگائے ترحم سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"نماز کی طرف آؤ' نماز کی طرف آؤ۔"

قیدی اب کپڑے کے سرے پہ کھڑا تکبیرات پڑھتا رفع یدین کر رہا تھا۔ برآمدے کی مدھم روشنی میں اس کا نیم رخ واضح تھا۔ سفید شلوار' سفید کرتا' بالکل کفن جیسا۔ اب گردن جھکی تھی۔ ہاتھ سینے پہ تھے۔ قدرے لمبے بال دو انچ کی پونی میں بندھے تھے۔ اس کا عمومی تاثر صاف ستھرے' اونچے' مضبوط جسم اور خوب صورت نقوش والے مرد کا پڑتا تھا۔

"فلاح کی طرف آؤ' فلاح کی طرف آؤ۔"

اذان ہواؤں میں ترنم گھولتی سنائی دے رہی تھی۔

"تو بیوی کو طلاق دے دیتا' بھائی سے تعلق توڑ لیتا' قتل کرنا ضروری تھا؟ اور لوگ نماز توبہ دوبہ کے لیے نہیں پڑھتے' ان کو رہائی چاہیے ہوتی ہے۔" تلخی سے کہہ کر اس نے ایک اور کش کھینچا۔

"مگر ایک بات ماننے کی ہے۔ اس کے غصے کے علاوہ یہ بندہ برا نہیں تھا۔ تجھے پتا ہے۔ اس کا انٹیلی جنس میں اونچا عہدہ تھا۔ اچھا خوب صورت' جوان تھا۔ مگر بیوی ایسی نکلی کہ..... چچ چچ۔ زندگی برباد ہو گئی فارس غازی کی۔"

اندر فارس غازی اب رکوع میں جھک رہا تھا۔

"نماز نیند سے بہتر ہے۔ نماز نیند سے بہتر ہے۔" فضا میں تیرتی آواز ملائمت سے ستونوں سے ٹکرا رہی تھی۔

"ہاں تو اپنا کیا سامنے آتا ہے۔ اب یہ بچ گا تھوڑی ہو نہہ....." لاپروائی و استہزا سے سر جھٹک کر عبدالشکور جانے کو پلٹا۔ تب ہی محمد دین کسی سحر کے زیر اثر بولا۔

"مگر وہ کہہ رہا تھا' یہ رہا ہو جائے گا۔"

عبدالشکور نے حیرت سے رک کر اپنے ساتھی کو دیکھا۔

"یہ..... فارس غازی' رہا ہو جائے گا؟ یہ کس نے کہا؟"

"وہی..... وہ لمبا..... خوب صورت..... گھنگھریالے بالوں والا لڑکا جو اس سے ملنے ہر ہفتے آتا ہے۔" محمد دین

کی نگاہیں ہنوز اس پہ مرکوز تھیں۔ فارس غازی اب سجدے میں سر رکھے ہوئے تھا۔

"وہ اس کا بھانجا؟ کیا نام ہے اس کا؟ اور اس کے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟"

"اس کی بات ہمیشہ سچ ہو جاتی ہے۔ پہلے اس نے کہا تھا جج بدل جائے گا اور اس کے کیس کا جج بدل گیا۔ پھر اس نے کہا۔ روزانہ کے حساب سے پیشی ہوگی۔ ایسا ہی ہوا۔ اس روز وہ کہہ کر گیا کہ اس ہفتے یہ رہا ہو جائے گا۔"

"تا تو اس کا بھانجا یہ سب تجھے کیوں بتا رہا ہے؟" عبدالشکور بیڑی لبوں سے ہٹائے مشکوک نظروں سے محمد دین کو دیکھ رہا تھا۔

"ابے مجھے کہاں۔۔۔ اسی کو بتا رہا تھا میں نے یوں ہی سن لیا۔"

"اللہ سب سے بڑا ہے۔۔۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔" اذان اب دھیمی پڑ رہی تھی۔

"چھوڑ یار۔۔۔ یہ نہیں رہا ہونے والا۔" اس نے تلخی سے کہہ کر بیڑی پھینکی اور پھر سلگتے، بجھتے انگارے کو دیکھنے لگا۔

"اللہ کے سوا کوئی ایسا نہیں جس کی عبادت کرنی چاہیے۔"

آواز دم توڑ گئی۔ فضا میں سکوت چھا گیا۔ پھر بلبل نے صدا لگائی، درختوں نے پتے جھکائے اور ساری مخلوق اپنی عبادت میں مشغول ہوگئی۔

قیدی سلام پھیر کر اٹھا۔ جائے نماز کا کونا موڑا، کف کلائی پہ موڑے اور چلتا ہوا سلاخوں تک آیا۔ اس کا چہرہ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں واضح ہوا۔ اس کی آنکھیں سنہری تھیں انہیں سکیڑ کر تیکھی نظروں سے ان دونوں کو دیکھتے اس نے انگلی سے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

محمد دین میکانکی انداز میں قریب آیا۔ عبدالشکور اتنا متاثر نہ تھا۔ مگر اس نے بھی پیروی کی۔

"اپنے کان صاف کر کے دھیان سے سنو۔" وہ تیز نگاہوں سے دونوں کو باری باری دیکھتے ہوئے بولا۔

"پہلی بات وہ میرا سگا نہیں، سوتیلا بھائی تھا۔ دوسری بات میرے بھانجے کا نام سعدی یوسف ہے اور آخری بات' اگر آئندہ تم مجھے میری ملاقات کے اوقات میں اپنے قریب بھٹکتے نظر آئے تو اگلے دن یہاں پہرہ وہیل چیئر پہ دوگے۔ سمجھ میں آیا؟"

"تجھے تو میں ابھی۔۔۔" عبدالشکور غصے سے آگے بڑھا۔ مگر محمد دین نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر پیچھے دھکیلتے "چھوڑ' جانے دو" کہہ کر اسے روکا اور واپس لے گیا۔

"کیا۔۔۔ ہاں؟ ابھی کیا؟" سلاخیں تھامے فارس نے بھنچے جبڑے اور غصیلی آنکھوں سے پکارا۔ مگر محمد دین بمشکل سمجھا بجھا کر اسے دور کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

فارس نے سر جھٹکا اور واپس ہو لیا۔ صبح کی سفیدی آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی۔



ع میں زخم زخم ہوں پھر بھی دکھائی نہ دوں

ٹھیک اسی وقت اسلام آباد کے دوسرے حصوں پر بھی فجر ایسے ہی طلوع ہو رہی تھی۔ اس اپر مڈل کلاس کالونی میں ایک گھر کی کھڑکیاں نیلے اندھیرے میں روشن تھیں۔

چھوٹے سے لان کے سامنے لاؤنج کی کھڑکی نظر آتی' مگر گھر کی بغلی گلی سے اندر جاؤ تو پہلے کچن کا بند دروازہ آتا اور پھر ایک بیڈ روم کی کھڑکی جس سے چہرہ لگا کر دیکھو تو اندر لیمپ جل رہا تھا اور کارپٹ پہ ایک لڑکی نماز پڑھ کر سلام پھیر رہی تھی۔

بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کے جلتے لیمپ کے ساتھ موبائل' پانی اور چند دوائیاں رکھی تھیں۔ ایسی دوائیاں جو گردے کا وہ مریض استعمال کرتا ہے جس کو ڈونر گردہ (کسی دوسرے کا) لگا ہو۔

وہ نماز ختم کر کے' بنا دعا مانگے اٹھی' جاء نماز اسی میز

کے خانے میں رکھ دی۔ دوپٹا اتار کر بال آزاد کیے۔ پھر پلٹ کر اسٹڈی ٹیبل تک آئی تو اس کا چہرہ سامنے آیا۔

وہ صاف مگر قدرے زرد رنگت کی دراز قد' دبلی پتلی سی تھی۔ نقوش متناسب' آنکھیں بادامی رنگ کی' گہری بھوری پلکیں' مڑی ہوئی اور ناک میں ہیرے کی ننھی سی لونگ' بالکل مونگ کے دانے جتنی۔ وہ بہت خوب صورت نہیں تھی۔ مگر اس کے بال خوب صورت تھے۔ گہرے بھورے' سر سے کان تک سیدھے اور پھر موٹے موٹے Curls کی صورت گھنگریالے ہو جاتے۔ وہ اسٹیپ میں تھے۔ سامنے سے ٹھوڑی تک' پھر کندھوں تک اور پیچھے کمر تک آتے۔

اس نے الماری کھول کر ایک فائل نکالی اور بے دھیانی میں ایک ڈبے کو لڑھکا دیا۔ جس سے اخبار کے چند تراشے پھسل کر باہر گرے' مگر چونکہ اس نے دیکھا نہیں تھا۔ سو اسٹڈی ٹیبل پہ آبیٹھی اور فائل کھول لی۔ اخبار کے تراشے اس کے قدموں میں گرے رہے۔ کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ وہ ٹھیک سے پڑھے نہ جاتے تھے۔ مگر پھر کھڑکی کے باہر صبح پھیلتی گئی اور روشنی اندر بھرتی گئی اور ان کی تحریر واضح ہو گئی۔

ان تراشوں کی سرخیاں کہہ رہی تھیں۔

"اسسٹنٹ ڈائریکٹر نیب وارث غازی پراسرار طور پہ کمرے میں مردہ پائے گئے۔ پولیس نے موت کو خود کشی' عزیز و اقارب نے قتل قرار دے دیا۔ کمرے سے لیپ ٹاپ اور اہم ڈاکومنٹس بھی غائب۔"

"اسلام آباد کے پوش علاقے میں نامعلوم افراد کی فائرنگ سے ایک خاتون جاں بحق' ایک زخمی' جاں بحق خاتون کچھ روز قبل مبینہ طور پر خود کشی کرنے والے نیب ڈائریکٹر کے بھائی کی اہلیہ تھیں۔"

"زخمی خاتون کے دونوں گردے فائرنگ کے نتیجے میں ضائع ہو چکے ہیں' نیز ان کا تعلق۔"

"نیب ڈائریکٹر کے قتل کا معمہ حل' پولیس نے سوتیلے بھائی فارس غازی کو گرفتار کر لیا۔ پولیس کے مطابق اپنی بیوی اور رشتے دار خاتون پہ فائرنگ کے پیچھے بھی اسی کا ہاتھ۔"

دو ہاتھوں نے تیزی سے وہ کاغذ سمیٹے اور ان کو ڈبے میں ڈالتے ہوئے الماری بند کی۔ پھر سیدھی ہو کر کھڑی ہوئی۔

وہ تیار ہو چکی تھی اور اب گیلے گھنگھریالے بال برش کر رہی تھی۔ فجر بیتے کافی دیر ہو چکی تھی اور باہر ہر طرف سنہری روشنی تھی۔



اس کی کھڑکی کے باہر پتلی گلی میں واپس چلتے جاؤ تو اب کچن کا دروازہ کھلا تھا اور جالی سے باتیں کرنے کی آوازیں اور ناشتے کی خوشبو آرہی تھی۔ ملازم لڑکا کھڑا چائے دم پہ رکھ رہا تھا۔ ساتھ ایک ہی گلی اس کے طبقے کی عورت کھڑی تھی۔

"دے صداقت! ماں کا سارا پیغام سمجھ میں آگیا نا؟ اب میں تسلی سے گھر جاؤں چلی جاؤں؟" وہ جیسے کوئی لمبی چوڑی بات سمیٹ رہی تھی۔ لڑکے نے "ہاں نا چاچی!" کہتے تشفی کروائی۔ چاچی نے جیسے فراغت سے ادھر ادھر دیکھا۔

"یہ تو اپنی باجی کا ناشتا بنا رہا ہے؟" اس نے کچن کی بابت استفسار کیا۔

"ہاں۔ اور صاحب کا بھی۔ باجی کے ابو۔ دو لوگ ہی تو ہیں گھر میں۔"

"تا تو تیری باجی کی شادی وادی نہیں ہوئی؟"

"صاحب نے بووووہت پہلے۔" انڈا توڑتے ہوئے "بہت" کو بہت کھینچا۔

"باجی کی منگنی کی تھی' شادی بھی ہونے والی تھی' مگر پھر بازار میں فائرنگ ہوئی اور باجی کو بھی گولی لگ گئی۔ بس دونوں گردے ضائع ہو گئے۔ کسی انگریز عورت نے گردہ تو دے دیا اور لگ بھی گیا' پر منگنی ٹوٹ گئی۔ پھر باجی نے شادی نہیں کی۔"

"چچ چچ۔ بے چاری۔ سنا میں اتھا میں کی تو

ہوگی؟"

"ارے۔۔۔ تینتیس چونتیس سے کم کی نہیں ہیں باجی، لگتی چھوٹی ہیں۔" صداقت نے فخر سے کہتے ہوئے انڈا تیل پہ ڈالا۔ شرر شرر کی آواز آئی اور تیل میں بلبلے بننے لگے۔

"تجھے کیسے پتا اس کی عمر؟" چاچی نے مشکوک نظروں سے لڑکے کو دیکھا۔

"عمر کا نہیں، سالگرہ کا پتا چل جاتا ہے۔ وہ ہر سالگرہ پہ سعدی بھائی کارڈ اور پھول جو لے آتا ہے۔"

"سعدی بھائی کون؟"

"لے۔۔۔ تجھے سعدی بھائی کا نہیں پتا؟" صداقت نے انڈا پلٹتے ملامتی نظروں سے چاچی کو دیکھا۔ "باجی کا بھتیجا ہے۔ بڑے صاحب کا پوتا۔"

"دیکھ۔۔۔ ایسے ہوتے ہیں بھتیجے اور تو گرائیں آتا ہے تو مجال نہیں کہ چاچے، چاچی کو شکل بھی دکھا دے۔" ساتھ ہی لڑکے کی پشت پہ دھموکا جڑا۔ وہ بلبلا کر رہ گیا۔ "اسی لیے تو باجی اپنے بھتیجے سے بڑا پیار کرتی ہوگی۔"

"کہاں؟" برا سا منہ بنائے صداقت نے اسی انداز میں کہا۔ "وہ تو سعدی بھائی سے بات بھی نہیں کرتی، ملتی بھی نہیں ہے، وہ تب ہی گھر آتا ہے جب وہ نہیں ہوتی۔ وہ اس سے ناراض ہے۔"

"ائے ہئے کیوں؟"

"پرانی ناراضی ہے، باجی کو جو گولی لگی تھی، وہ سعدی بھائی کے ماموں نے ماری تھی۔ بس تب سے ان کے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔" وہ سر جھکائے کام کرتے ہوئے تبصرہ کیے جا رہا تھا۔ چاچی نے پرسوچ ہنکارا بھرا۔

"تو اسی لیے باجی کے بھائی کا خاندان ان کے ساتھ نہیں رہتا۔"

"وہ نہیں چاچی! وہ تو ہمیشہ سے الگ رہتے تھے۔ پھر خاندان میں اور ہے بھی کون؟ باجی کے ایک ہی بھائی تھے سعدی کے ابو، عرصہ ہوا فوت ہو چکے۔ ان کی وفات سے بھی سالوں پہلے سے انہوں نے گھر الگ کر لیا تھا۔ ان کی بیوی کی اپنی ساس، مطلب باجی کی مرحومہ امی سے نہیں بنتی تھی، پھر بھی باجی بڑا خیال کیا کرتی تھیں اپنے بھتیجوں کا، سعدی بھائی لوگ تین بہن بھائی ہیں، یہ تو بس اب کچھ سالوں سے ان کی بول چال۔"

"صداقت! اگر آپ ہمارے شجرہ نسب پہ روشنی ڈال چکے ہو تو ناشتا ٹیبل پہ لگاؤ گے؟"

صداقت کے ہاتھ سے چمٹا گرتے گرتے بچا۔ چچی، بھتیجا گھبرا کر پلٹے۔ وہ کوٹ بازو پہ ڈالے دوسرے ہاتھ میں پرس لیے چوکھٹ پہ کھڑی تھی اور یہ فقرہ اس نے بنا کسی غصے یا طنز کے بہت سادگی و نرمی سے ادا کیا تھا۔

"لایا باجی بس۔۔۔" وہ جیسے کرنٹ کھا کر ایک دم تیز تیز کام کرنے لگا۔ چاچی نے بھی خفیف سا سلام کیا۔ وہ اسی نرمی مگر سنجیدگی سے جواب دے کر راہداری میں آگے چلتی گئی اور ہیل کی فرش سے ٹکراتی آواز گونجتی گئی۔

راہداری کے سامنے بڑا سا لونگ روم تھا۔ اس کا آدھا حصہ صوفوں سے آراستہ ٹی وی لاؤنج تھا۔ باقی نصف میں ڈائننگ ٹیبل بچھی تھی۔ سربراہی کرسی کی جگہ پہ ایک معمر صاحب وہیل چیئر پہ بیٹھے عینک ناک پہ جمائے اخبار دیکھ رہے تھے۔

وہ دائیں ہاتھ کی پہلی کرسی پہ آ بیٹھی، چیزیں ایک طرف رکھیں، پلیٹ اٹھائی، کانٹا اس میں رکھا۔

"آج گھر کب آؤ گی؟"

"جلدی آنے کی کوشش کروں گی۔"

وہ بہت ٹھہرے ہوئے نرم انداز میں بولتی تھی اور اس کے فقرے ایک روانی میں لبوں سے ادا ہوتے تھے اور وہ ہمیشہ بات ختم کر کے سانس لیا کرتی تھی۔ اس کے باوجود ہر لفظ واضح اور کلیئر ہوتا تھا۔

"زمر!" انہوں نے پکارا۔ زمر نے جواب میں صرف "ہوں" کہا۔

"کل کی تاریخ یاد ہے کیا تھا؟"

"کوئی کرکٹ میچ تھا؟" زمر نے اسی اطمینان سے پوچھتے ہوئے نیپکن گود میں بچھایا۔

"سعدی کی سالگرہ تھی۔ وہ پچیس سال کا ہو گیا ہے۔"

اس کے ہاتھوں کی حرکت سست ہوئی ' بھوری آنکھوں میں سایہ سا لہرایا۔ وہ ایک دم چہرہ موڑ کر صداقت کی طرف متوجہ ہو گئی جو لوازمات میز پہ رکھ رہا تھا اور زمر سے نظریں بھی نہیں ملا پا رہا تھا۔ بڑے ابا بھی اخبار کو ہی دیکھ رہے تھے۔

صداقت اندر چلا گیا تو انہوں نے کہا۔ "تم پھر بھول گئیں نا۔"

"سوری!" وہ پلیٹ میں آملیٹ نکالنے لگی۔

"کیا تمہیں یہ یاد ہے کہ تم کیا کیا بھولنے لگی ہو؟ چار سال سے اس کی ہر سالگرہ بھول جاتی ہو' چار سال سے اس کے گھر جانا بھول گئی ہو' ڈیڑھ سال سے اس کی شکل دیکھنا بھول چکی ہو۔"

زمر نے میز کے وسط میں رکھے گلدان کو دیکھتے ہوئے کپ لبوں سے لگایا' بولی کچھ نہیں۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔

"وہ تمہاری کوئی سالگرہ نہیں بھولتا۔"

"میں اسے کال کرلوں گی۔"

"کال کرنا' پروا کرنے کے مترادف نہیں ہوتا۔"

زمر نے سنجیدگی سے بڑے ابو کا چہرہ دیکھا جو اب اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

"وہ میرا بھتیجا ہے' میں اس کی پروا کیوں نہیں کروں گی؟"

"تو پھر اس سے ناراضی ختم کیوں نہیں کرتی ہو؟"

"میں اس سے ناراض نہیں ہوں' سعدی میرے لیے کیا ہے' آپ جانتے ہیں اور کوئی بھی چیز اس حقیقت کو نہیں بدل سکتی۔"

"تو پھر اس سے ملتی کیوں نہیں ہو؟"

"آل رائٹ' آپ ہمارا ناشتا spoil (خراب) کرنا چاہتے ہیں تو ایسے ہی سہی۔" پیالی پرچ پہ رکھ کر وہ مکمل طور پہ ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ "وہ مجھ سے کیوں نہیں ملا۔ جب میں بیمار تھی؟ ابا! میرے گردے ضائع ہو گئے تھے۔ ایک اجنبی فرنچ عورت مجھے گردہ دے سکتی ہے' مگر میرا بھتیجا مجھ سے ملنے نہیں آسکتا۔ کیونکہ اس کی پڑھائی زیادہ ضروری تھی۔ ابا! وہ میرا بیٹا تھا۔ میرا بھائی تھا۔ میرا سب سے اچھا دوست تھا۔ مگر وہ میرے پاس نہیں تھا۔ جب مجھے اس کی ضرورت تھی۔ وہ انگلینڈ چلا گیا اور رہاں وہ وہاں سے مجھے کال کرلیتا تھا۔ مگر کال کرنا پروا کرنے کے مترادف تو نہیں ہوتا نا۔"

"تم اس کی یہ بات درگزر کر دیتیں۔ اگر اس نے یہ نہ کہا ہوتا کہ فارس بے گناہ ہے اور۔۔۔۔"

زمر رک گئی۔ اس کے تاثرات بدلے' آنکھوں میں گہرا کرب' تکلیف' غصہ ابھرا۔

"فارس غازی کا نام میرے سامنے مت لیا کریں' اس شخص نے میرے ساتھ کیا کیا۔ آپ بھول گئے ہیں تو میں یاد کرا دیتی ہوں۔" اس کا جیسے ناشتا حرام ہو چکا تھا۔ لبوں کو نیپکن سے تھپتھپا کر بال کان کے پیچھے اڑسے اور ان کی آنکھوں میں دیکھ کر سپاٹ لہجے میں بولی۔

"وہ۔۔۔ آپ کے پوتے کا ماموں۔۔۔ اس نے چار سال پہلے میری زندگی برباد کر دی تھی۔ اس نے اپنی بیوی اور مجھے ایک جگہ بلا کر' ہم دونوں کو شوٹ کر دیا' تاکہ میں اصل ٹارگٹ سمجھی جاؤں۔ ان تین گولیوں نے جو مجھے کمر میں لگی تھیں کہ اس شخص نے میری پشت پہ حملہ ہی تو کیا تھا۔ میرے صرف گردے نہیں چھینے' ہر چیز چھینی اور سعدی۔۔۔ اس نے تب بھی کہا تھا اب بھی کہے گا کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ گریٹ!"

دونوں ہاتھ اٹھا کر اس نے جیسے کسی نادیدہ ہستی کو شاباش دی۔ اس کا رنگ بگڑ چکا تھا اور وہ شدید ڈسٹرب نظر آرہی تھی۔

"اس نے سعدی کے بڑے ماموں اور اپنی بیوی کو مارا۔ یہ ان کا اپنا معاملہ ہے' مگر اس نے مجھے بھی مارنا چاہا تھا اور یہ میرا معاملہ ہے۔ مگر ابا! اس کے باوجود میں فارس غازی کے کیس کو فالو نہیں کرتی' کیونکہ جب

جب اس واقعے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مجھے نئے سرے سے تکلیف ہوتی ہے۔ پلیز مجھے کم از کم ناشتے کی میز پہ یہ تکلیف مت دیا کریں۔"

بہت دکھ سے کہتے ہوئے اپنی چیزیں سمیٹتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ بڑے ابا نے خاموش تاسف سے اسے جاتے دیکھا۔ پھر اس کی آدھی چائے کی پیالی کو۔

ہر "سعدی..." سے شروع ہو کر "فارس" پہ ختم ہونے والی گفتگو کے نتیجے میں چائے' ناشتے اور کھانے یوں ہی ادھورے رہ جاتے تھے۔

☆ ☆ ☆

مِرے پھر حشر کے ساماں ہوئے ہیں

فجر کو قضا ہوئے کئی ساعتیں بیت چکی تھیں اور سورج ابھی تک ٹھنڈا تھا۔ شہر کے مضافات میں ایک پوش علاقے میں زندگی اتنی صبح بھی یوں بیدار اور چاق و چوبند تھی جیسے کبھی سوئی نہ ہو۔

وہ ایک بلند اور عالیشان محل نما گھر تھا۔ باہر سیکورٹی چیک پوائنٹس' مسلح گارڈز' کرنٹ سے لبریز تاریں تھیں۔ اندر عمارت سبزہ زار کے درمیان میں کھڑی تھی اور آگے پیچھے' اونچی نیچی پہاڑیوں کی مانند لان کہیں نشیب میں جاتا' کہیں اوپر اٹھ جاتا۔

لان میں باوردی ملازم جو کسی سے کام نپٹا رہے تھے۔ کسی بڑے ایونٹ سے پہلے ہونے والی پلاننگ ایک سنہرے باب کٹ والی لڑکی جو دودھیا رنگت اور دلکش نقوش کی مالک تھی' ہاتھ سے مختلف جگہوں پہ اشارہ کرتی۔ ایونٹ آرگنائزر کو ہدایات دے رہی تھی۔ جسے آرگنائزر مستعدی سے سر ہلاتا یہ نوٹ کرتا جا رہا تھا۔

دور سے ایک فلپینو ملازمہ جو خوش شکل اور بااعتماد تھی اور سفید بلاؤز' اسکرٹ اور ٹائٹس میں ملبوس تھی۔ چلتی ہوئی آئی اور اس لڑکی کے سامنے مسکرا کر' سر کو خم دے کر پوچھا۔

"کیا آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے' مس شہرین؟"

شیرین آرگنائزر کو بتا رہی تھی کہ اسے پھول کیسے اور کدھر چاہییں۔" اس نے رک کر بے زار نظر اس پہ ڈالی۔

"صرف اتنا فینو نا کہ تم ہر دو منٹ بعد آکر مجھ سے یہ سوال مت پوچھو۔" اور واپس مصروف ہو گئی۔

فینو نا کی مسکراہٹ برقرار رہی۔ سر کو خم دیتے کروہ وہاں سے چلی آئی۔ یقیناً" وہ عملے کی سپروائزر تھی" تب ہی بہت تمکنت سے تھوڑی دور ایجنسی کی طرف سے آئی۔ فاضل میڈز کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔

"سب ٹھیک جا رہا ہے؟" اس نے تحکم سے جائزہ لیا۔

"پرفیکٹ... ویسے ابھی پارٹی میں ایک ہفتہ ہے۔ ہم کچھ جلدی تیاری نہیں کر رہے؟"

"اونہوں... یہاں ہر کوئی وقت سے پہلے کام کرنے کا عادی ہے اور یہ ہاشم کاردار کی بیٹی کی سالگرہ ہے۔ کوئی عام بات نہیں۔" فیونا نے قدرے فخر سے جتایا۔ ملازمہ نے مڑ کر بے اختیار شیرین کی سمت دیکھا۔

"یہ ہاشم کاردار کی بیوی ہے نا؟ ان ہی کی بیٹی کی سالگرہ ہے۔"

"ہاں مگر ان کی علیحدگی ہو چکی ہے' یہ یہاں نہیں رہتیں' پارٹی کے لیے آئی ہیں۔"

"اور ادھر کون رہتا ہے؟" ملازمہ کو دلچسپی ہوئی تو اس طرف اشارہ کرتے ہوئے جہاں لان ڈھلان میں جا کر ختم ہوتا تھا وہاں ایک چھوٹی سی عام سی عمارت تھی' جیسے انیکسی ہو۔

"وہ... وہ تو فارس غازی کا پورشن ہے۔" فیونا نے برا سا منہ بنایا۔

"وہ کون ہے؟"

"ہاشم صاحب کی پھپھو کا بیٹا ہے' مگر وہ گھر مقفل ہوتا ہے۔ کیونکہ فارس جیل میں ہے۔" پھر آواز دھیمی کی۔ "اس نے اپنے سوتیلے بھائی' مطلب اپنے باپ کی پہلی بیوی کے بیٹے کو قتل کر دیا تھا اور اپنی بیوی کو بھی۔"

"اوہ!" ملازمہ کی آنکھیں حیرت و تجسس سے پھیلیں۔ "تو اس کے مقتول بھائی کا خاندان یہاں نہیں رہتا؟"

"بتایا تو ہے' وہ اس کے باپ کا بیٹا تھا۔ سوتیلا بھائی تھا۔ ہاشم صاحب اس کی ماں کی طرف سے کزن ہوئے' تو ان سوتیلے رشتے داروں کا یہاں سے کیا تعلق؟" گوسپ کا لطف ختم ہوا تو وہ منہ بنا کر مڑ گئی۔

گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اس کی کروفر بھری چال میں عاجزی آگئی۔ اس نے لونگ روم پار کیا' جس میں سیڑھیاں اوپر جاتی دکھائی دیتیں اور گھر کی چار منزلیں ختم ہونے کے بعد چھت آتی' یوں لونگ روم بہت عالی شان تاثر ڈالتا' پھر وہ ڈائننگ ہال میں آئی اور سربراہی کرسی ادب سے کھینچی۔ یہاں سے لونگ روم نظر آتا تھا اور اسے اپنی مالکن بھی آتی نظر آ رہی تھی۔

وہ مسکراتی ہوئی باریک ہیل سے تیز تیز چلتی آ رہی تھی۔ ٹائٹس پہ انگریزی طرز کا بغیر آستین کے گھٹنوں سے اوپر آتا لباس پہن رکھا تھا۔ ہلکے بھورے ڈائی بال سیدھے اور کمر پہ تھے اور شیرنی جیسی آنکھیں تھیں' چہرہ خوب صورت و ملائم۔ وہ یقیناً" کافی عمر کی تھی' مگر بے حد اسمارٹ اور ترو تازہ۔

"گڈ مارننگ مسز جواہرات!"

"مارننگ...!"

مسکرا کر جواب دیتی وہ سربراہی کرسی پہ ملکہ کی شان سے بیٹھی' نیپکن گود میں بچھایا اور باادب کھڑی فینو نا کو شیریں لہجے میں مخاطب کیا۔

"میرے بیٹے کدھر ہیں؟"

"ہاشم تیار ہو رہے ہیں اور نوشیرواں ابھی نہیں اٹھے۔"

جواہرات نے جواب دیے بنا پلیٹ اپنے قریب کی۔

"میم... آپ کی فلر ٹریٹمنٹ کی اپائنٹمنٹ آج شام کی ہے۔ آپ نے ریمائنڈ کروانے کو کہا تھا۔"

"اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ایسی باتیں آواز مدھم رکھ کر کیا کرو۔" اسی شیریں مسکراہٹ سے اس نے

فینونا کو دیکھ کر کہا "اور اپنا میک اپ کم کرو، مجھے اسٹاف کی بے ربطگی بالکل پسند نہیں ہے۔"

"سوری میم!" فینونا کی مسکراہٹ اڑن چھو ہوئی۔ اس نے جلدی سے رومال سے لپ اسٹک رگڑی، جواہرات اب ناشتا پلیٹ میں نکال رہی تھی۔

سیڑھیوں کے اوپر پہلے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اندر اے سی کی خنکی اور مردانہ پرفیوم کی مہک نے فضا کو معطر کر رکھا تھا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے کے سامنے کھڑا ٹائی کی ناٹ باندھ رہا تھا۔ کوٹ قریب ہی ٹنگا تھا۔ بال ماتھے پہ پیچھے کو سیٹ کیے۔ وجیہہ نقوش، شان دار شخصیت اور پرکشش سیاہ آنکھیں، بالکل جواہرات کے جیسی۔

دفعتا" ٹائی درمیان میں چھوڑ کر اس نے وقت دیکھا اور موبائل اٹھا کر چند بٹن دبائے، پھر ایک کال ملائی۔

"باجوہ صاحب! ابھی آپ کو ایک ای میل بھیجی ہے۔ اس کو دیکھنے کے بعد آپ مجھ سے یقینا" بات کرنا چاہیں گے۔" اگلے کی بات سنے بغیر مسکرا کر فون بند کیا اور رکھ دیا۔ ٹائی کی ناٹ باندھ چکا تو فون بجا اور پھر بجتا گیا۔ چھ سات کالز آئیں۔ مگر اس نے نہیں اٹھایا۔ ذرا خاموشی ہوئی تو اس نے ایک اور نمبر ملایا۔

"خاور.... کام ہو گیا ہے۔ اس لڑکی جو بھی نام ہے اس کا۔ اس کو غائب ہونے کو کہہ دو.... اب وہ باجوہ سے نہیں ملے گی اور دوپہر تک میری سیکریٹری اس کی پے منٹ کلیئر کردے گی۔" کال کاٹی ہی تھی کہ پھر سے باجوہ صاحب کی کال آنے لگی۔ اس نے مسکرا کر کس کیا اور آئینے میں دیکھتے ہوئے خود پہ پرفیوم چھڑکتے بولا۔

"کیسا لگا میرا تحفہ؟ اگر تم نہیں چاہتے کہ میں اس پر تمہاری بیٹیوں کی رائے لوں تو آج بورڈ کے اجلاس میں تم میری قرارداد کے حق میں ووٹ دو گے۔ ورنہ میں کتنا بے رحم ہوں، تم جانتے ہو۔" دوسرے کا غصہ، احتجاج، درخواست کچھ بھی سنے بغیر اس نے فون رکھ دیا۔ خود پہ دو، تین اسپرے مزید کیے۔ کف لنکس لگائے، کوٹ پہنا اور باہر نکلا۔ راہ داری میں موجود باوردی ملازم نے فورا" اندر جا کر اس کا بریف کیس اٹھا لیا۔

وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا تو جواہرات جوس گھونٹ گھونٹ پیتی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے قریب آکر اس کا ماتھا چوما، پھر دائیں ہاتھ کرسی کھینچتے ہوئے بیٹھا۔

"میرا خیال تھا، مسز کاردار اب تک آفس جا چکی ہوں گی۔" ساتھ ہی ہاشم نے ابرو سے فینونا کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ فورا" غائب ہو گئی۔

"تمہاری ایکس وائف صبح سویرے آگئی تو میں کیسے جاتی؟"

"شہری کیوں آئی ہے؟" ہاشم نے توس پہ اسپریڈ لگاتے ہوئے غیر دلچسپی سے پوچھا۔ جواہرات نے نزاکت سے شانے اچکائے۔

"سونیا کی سالگرہ ہم نے اسے اس کے گھر نہیں کرنے دی، تو وہ ہفتہ پہلے سے تیاری شروع کر کے انتقام لے رہی ہے۔"

"سونیا کو ساتھ لائی ہے؟"

جواہرات نے نفی میں گردن ہلائی۔

"انی ویز باجوہ کا ووٹ میرے پاس ہے یوں آج عبدالصمد کو ہم ووٹ آؤٹ کر دیں گے۔"

جواہرات کھلے دل سے مسکرائی۔

"یہ تم نے کیسے کیا؟"

ہاشم مسکراتے ہوئے شانے اچکا کر بولا۔ "ہاشم سب سنبھال سکتا ہے۔"

"سوائے اس گھر کے اسٹاف کے۔ مطلب کوئی کام کا بندہ ہے یہاں؟ کبھی کوئی میری کار مار دیتا ہے۔ کبھی میرا سوٹ برباد ہو جاتا ہے، حد ہو گئی۔"

آواز پہ دونوں نے اس طرف دیکھا۔ ٹراؤزر اور شرٹ میں نوشیرواں بستر سے اٹھ کر آیا تھا اور بہت بگڑے موڈ میں آیا تھا۔

"اور اب کیا ہوا ہے؟" ہاشم نے چھری کانٹے سے ٹکڑا توڑتے ہوئے مسکرا کر اس کو دیکھا۔

"میرا سوٹ برباد کر دیا اس جاہل ریاض نے۔ آپ اس کی پے سلپ اس کے حوالے کر دیں ممی۔۔۔ میں نے اسے۔۔۔ کر دیا ہے۔" سیب اٹھا کر اس میں دانت گاڑتے ہوئے وہ خفا خفا سا بولا۔ وہ چوبیس پچیس سال کا خوش شکل نوجوان تھا۔ ہاشم جتنا نہیں مگر اچھا تھا۔ فرنچ کٹ اور بالوں کی الجھی بکھری اسپائکس۔۔۔ آنکھوں میں بےزاری اور لاپروائی۔۔۔ جواہرات نے ناپسندیدگی سے اس کی بات سنی۔

"تم کب بڑے ہو گے؟ جب ہاشم تمہاری عمر کا تھا تو وہ اتنا چھوٹا ہرگز نہیں تھا۔"

ہاشم نے ماں کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا اور نرمی سے ٹوکا۔ "میں سمجھاؤں گا نا۔" اور پھر نوشیرواں کی طرف متوجہ ہوا۔ "آج تمہیں آفس میں نظر آنا چاہیے۔"

"اوں گا بھائی! مگر اپنے وقت پہ۔" اس نے اب مسکرا کر بےنیازی سے کہا۔ ہاشم نے بمشکل مسکراہٹ روکی۔ اسے نوشیرواں پہ کبھی غصہ نہیں آتا تھا۔

"صبح ہو چکی ہے شیرو! اب تم بالکل نہیں سوؤ گے اور تیار ہو کر آفس آؤ گے۔"

"اوکے!" وہ لاپروائی سے کہہ کر سیب کھانے لگا۔

ہاشم کا فون پھر سے بجنے لگا۔ اس نے جوس کا گھونٹ بھرا اور موبائل کان سے لگایا۔

"ہاشم کاردار؟" نسوانی آواز نے استفسار کیا۔

"آگے بولو۔" اس کا لہجہ بےلچک اور سپاٹ ہو گیا۔

"میں کامران حیات کے آفس سے بات کر رہی ہوں۔ پلیز لائن پہ رہیے گا، کامران صاحب بات کریں گے۔"

"اپنے باس کو بولو کہ میں سیکریٹریز سے بات نہیں کرتا۔ اسے مجھ سے کام ہو تو مجھے خود کال کیا کرے۔" بےنیازی سے کہہ کر اس نے موبائل بند کر دیا۔ جواہرات اور نوشیرواں نے اپنی خفگی بھلا کر مسکراتی مگر فخریہ نگاہوں کا تبادلہ کیا۔ ہاشم کا موبائل پھر سے بار بار بجنے لگا تو شیرو کو کہنا،

"اٹھا لیں بھائی! بےچارے کی کال۔"

"شام کو اٹھاؤں گا۔ اسے پورا دن خوار ہونے دو۔ کام ہو تو ہاشم کاردار یاد آ جاتا ہے۔" وہ ناشتا ختم کر کے اب اٹھ رہا تھا۔ جواہرات نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کورٹ جا رہے ہو؟"

"پہلے آفس پھر کورٹ۔۔۔ جنرل نوید کے بیٹے والا مسئلہ، وقت پہ نہ گیا تو زمر سیٹلمنٹ سے انکار ہی نہ کر دے۔ اس مغرور عورت کا کوئی بھروسا نہیں۔"

"زمر کو میرا سلام کہہ دینا۔" جواہرات نے دلچسپی سے کہا۔

"شیور۔۔۔" ہاتھ صاف کر کے اس نے موبائل اٹھایا ہی تھا کہ وہ پھر سے بجا۔ ہاشم نے "ہاں خاور بولو" کہہ کر عجلت میں کال ریسیو کی تھی۔ مگر دوسری طرف جو کہا جا رہا تھا، اسے سن کر وہ بالکل رک گیا۔ آنکھیں سکیڑلیں اور آہستہ آہستہ واپس بیٹھ گیا۔

"ہوں۔۔۔ پچھلے دو مہینے میں وہ کس کس سے ملا ہے۔ اپنے وکیل کے علاوہ، مجھے ایک ایک ملاقات کی تفصیل دو۔ تمہارے پاس دس منٹ ہیں۔" سرد لہجے میں کہہ کر اس نے فون بند کیا تو وہ دونوں اسی کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ اس نے صرف ایک لفظ کہا۔ "فارس!"

جواہرات کے ہاتھ سے سیب کی قاش پھسلی، آنکھوں میں الجھن ابھری۔

"فارس۔۔۔ کا کیا ذکر؟"

"اس کا کیس۔۔۔ آج اس کا فیصلہ متوقع ہے۔" وہ ڈسٹرب لگ رہا تھا۔

جواہرات سانس لینا بھول گئی۔

"اور تمہیں اب پتا چل رہا ہے؟"

ہاشم کی آنکھوں میں خفگی ابھری۔

"میں اراضی کے مقدمات میں پھنسا تھا۔ اس طرف دھیان نہیں گیا۔ مجھے عجیب لگ رہا ہے کہ اس کا فیصلہ اچانک سے آنے والا ہے۔"

ڈائننگ ہال میں خاموشی چھا گئی۔ جواہرات کی مسکراہٹ اب غائب تھی۔ وہ بالکل یک ٹک ہاشم کو

دیکھ رہی تھی۔

"ڈونٹ وری ووہ بابا نہیں ہو گا۔" ہاشم کو کہنا پڑا۔

"اسے رہا ہونا بھی نہیں چاہیے اور تم اس بات کو یقینی بناؤ گے ہاشم!" وہ بے حد مضطرب لگ رہی تھی۔

"میں سنبھال لوں گا ممی!"

"ہمارے اس کزن کے رہا ہونے کا مطلب ہے کہ عدالت کے نزدیک وہ قاتل نہیں ہے۔ یقیناً" اگلا سوال یہ ہو گا کہ پھر قاتل کون ہے؟" نوشیرواں نے سیب کھاتے چباتے ہوئے کہا۔ دونوں نے بے اختیار اسے دیکھا۔ اس کا چلتا منہ رک گیا۔

"یوں ہی کہہ رہا تھا۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"یہ بات میں دوبارہ تمہارے منہ سے نہ سنوں شیرو!" جواہرات نے بمشکل غصہ ضبط کیا، پھر ہاشم کو دیکھا۔ جیسے خود بھی وہی سوال پوچھ رہی ہو۔ اس کی شیرنی جیسی آنکھوں میں تپش تھی۔

ہاشم نے ذرا سے کندھے اچکائے۔ "فیصلہ اس کے خلاف ہی آئے گا، ڈونٹ وری۔ وہ باہر نہیں آئے گا اور آ بھی جائے تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" تب ہی اس کا فون پھر بجا۔ اس نے فوراً کال وصول کی۔

"ہاں خاور... ہوں... اچھا..." سنجیدہ، سپاٹ تاثرات کے ساتھ وہ سنتا رہا، پھر فون رکھ دیا۔

"سعدی! سعدی یوسف!" اس نے ہولے سے کہا اور...

نوشیرواں کا چہرہ یوں ہو گیا جیسے اس نے زہریلا سیب نگل لیا ہو۔

☆ ☆ ☆

مت چھیڑو ہم اہل جنوں کو

زمر نے جب گاڑی سگنل سے تیزی سے گزاری تو بتی زرد تھی اور اس کے نکلتے ہی وہ سرخ ہو گئی۔ اس نے بے اختیار سائیڈ مرر میں دیکھا۔ ٹریفک سارجنٹ اس کو اشارہ کر رہا تھا۔ گہری سانس لے کر سر جھٹکتے اس نے کار سائیڈ پہ کی۔ انجن بند نہیں کیا۔ بٹن دبایا، شیشہ نیچے کرتا گیا۔ اس نے سن گلاسز اوپر کر کے گھنگھریالے بالوں پہ لگائے اور اسٹیئرنگ پہ دونوں ہاتھ رکھ کر منتظر سی نظر آنے لگی۔

"بی بی... آپ نے سگنل توڑا ہے۔" وہ کھڑکی تک آیا اور کھردرے لہجے میں بولا۔

"سگنل میرے گزرنے کے بعد ریڈ ہوا تھا۔" اس نے گردن ذرا اٹھا کر بے نیازی سے جواب دیا۔

"نہیں جی... آپ نے لال بتی کراس کی ہے، چالان بنتا ہے۔" وہ بک کے صفحے پلٹتے معمول کے مطابق کہہ رہا تھا۔

"آپ اسے سنبھال کر رکھیں۔ کیونکہ ہم دونوں کو پتا ہے کہ میں نے سگنل نہیں توڑا۔"

"میں گواہ ہوں، آپ نے سگنل توڑا ہے۔"

"بتی زرد تھی۔"

"تو آپ کو معلوم ہو گا کہ زرد کے بعد بتی لال ہوتی ہے۔ آپ کو نہیں گزرنا چاہیے تھا۔" وہ قلم کھول رہا تھا۔

"پھر آپ کو بھی معلوم ہو گا کہ آپ کے سگنل کا ٹائمر خراب پڑا ہے۔" اس نے سگنل کی جانب اشارہ کیا۔ "تو مجھے کیسے پتا چلے گا کہ کتنے سیکنڈ بعد بتی سرخ ہوتی ہے۔"

"بی بی! آپ بحث کیوں کر رہی ہیں؟ چالان دیں اور جائیں۔" وہ اکتا کر بولا۔ زمر نے اثبات میں گردن ہلائی، چابی گھمائی اور کار بند کر دی، پھر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"میں تو چالان نہیں دوں گی، کیونکہ میری غلطی نہیں ہے اور آفیسر آپ مجھ سے اونچی آواز میں کافی بدتمیزی سے بات کر رہے ہیں۔ اس لیے میں کروں گی یہ کہ میں کار ادھر سائیڈ پہ لگاؤں گی، پھر ڈسٹرکٹ بار فون کروں گی۔ آدھے گھنٹے میں یہاں بار کے نمائندے اور دو مخالف میڈیا چینلز کے کیمرے ہوں گے اور میں اسی جگہ پریس کانفرنس کر کے ان کو بتاؤں گی کس طرح نااہل ٹریفک پولیس اپنے ٹائمر ٹھیک کروانے کے بجائے خواتین کو روک کر ان سے بدتمیزی کر رہی ہے اور جب سارا میڈیا آئی جی ٹریفک کو لائن پہ لے کر ان

کی کارکردگی پہ سوال اٹھائے گا تو وہ یقیناً "سب سے پہلے اس آفیسر کا نام جاننا چاہیں گے جس نے ایک خاتون کو غلط روک کر نہ صرف اس سے بدتمیزی کی بلکہ اسے سماعت پہ وقت پہ پہنچنے سے بھی روکا۔ کیونکہ میں ڈسٹرکٹ پراسیکیوٹر زمر یوسف ہوں اور اگر میں پانچ منٹ بھی لیٹ ہوئی اور اس سے اس کیس پہ ذرا سا بھی اثر پڑا تو میں اس امر کو یقینی بناؤں گی کہ آپ اپنی زندگی کے اگلے پانچ سال عدالت کے دھکے کھاتے ہوئے گزاریں گے۔ میں جن لوگوں سے روزانہ ڈیل کرتی ہوں وہ قاتل، چور اور rapists ہوتے ہیں۔ اس لیے میری کار سے ہاتھ ہٹائیں۔ جا کر اپنی ڈیوٹی کریں اور مجھے میری ڈیوٹی کرنے دیں۔"

اس نے گلاسز واپس آنکھوں پہ لگائے۔ چابی گھمائی، ایکسیلیٹر پہ دباؤ بڑھایا۔ آفیسر بے اختیار پیچھے ہٹا اور وہ زن سے کار آگے لے گئی۔

"اللہ ان عورتوں کو زبان نہ دے، یا پھر وکیل نہ بنائے۔" وہ غصے اور بے بسی سے بڑبڑاتے ہوئے اپنی جگہ پہ واپس جا رہا تھا۔



ہے اس شہر دل نواز کے آداب دیکھنا

"سعدی؟ فارس کا بھانجا؟" جواہرات نے اچنبھے سے ابرو اٹھائیں۔ نوشیرواں نے بے زاری سے سیب رکھ دیا۔ اس کا کھانا حرام ہو چکا تھا۔

"وہ ہر ہفتے فارس سے ملنے آتا ہے۔" ہاشم گہری سوچ میں ڈوبا آنکھوں کی پتلیاں سکیڑے کسی غیر مرئی نقطے کو دیکھ رہا تھا۔

"اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔"

"مگر۔ وہ مجھے بھی اپنے آس پاس نظر آیا ہے۔ ایک، دو دفعہ، بالکل رینڈم جگہوں پہ۔ جہاں اس کا کوئی کام نہیں تھا۔ یہ لڑکا کچھ گڑبڑ ہے۔" ہاشم پہلے سے زیادہ ڈسٹرب لگ رہا تھا۔

"ہاشم۔ مجھے اس سارے مسئلے کا حل بتاؤ۔" وہ مضطرب اور بے چین سی بولی۔

"ممی! بھائی سنبھال لے گا نا۔"

ہاشم نے سنا ہی نہیں، اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے فینو نا کو آواز دی اور اسے دو دعوت نامے لانے کو کہا۔

"بہت عرصہ ہوا میں اس سے نہیں ملا۔ اب اسے میری پارٹی میں آنا چاہیے۔" وہ جیسے کوئی لائحہ عمل ترتیب دے کر بولا تھا۔

"اوہ پلیز۔ اگر وہ آئے گا تو میں پارٹی میں نہیں ہوں گا۔ میں اسے اپنے گھر میں نہیں برداشت کر سکتا۔" نوشیرواں کا موڈ بگڑ چکا تھا۔ "یونیورسٹی کے پانچ سال میں نے اسے برداشت کیا ہے۔ اب اور نہیں۔" پھر یکایک اس کے تاثرات بدلے۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ جواہرات نے لاؤنج کی سمت دیکھا۔ شہرین ادھر ہی آ رہی تھی۔ نوشیرواں کا چہرہ ایک دم چمکنے لگا۔ جواہرات نے مسکرا کر گہری سرد نظروں سے باری باری دونوں کو دیکھا۔

"آپ کب آئیں؟ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔" نوشیرواں کو اپنے رف حلیے پہ جیسے شرمندگی ہوئی تھی۔

"بدقسمتی سے شہری میری بیٹی کی ماں ہے اور اس کی سالگرہ کی تیاری کے لیے یہ یقیناً "ارلی مارننگ ہی آئی ہوگی۔" ہاشم مسکرا کر کہتے ہوئے اٹھا اور مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ بے زاری سے نظرانداز کر کے جواب دیے بنا جواہرات کی طرف متوجہ ہوئی۔

"میں نے میٹنگ ارینج منٹ فائنل کر دی ہے۔ آپ دیکھ لیجیے گا۔" پھر نوشیرواں کو دیکھ کر تکلفاً مسکرائی۔ ہاشم تب تک باہر نکل چکا تھا۔

"لسٹ میں دو نام اور بھی ایڈ کرنے ہیں۔ سعدی یوسف اور زمر یوسف۔" جواہرات نے اسی سرد مسکراہٹ کے ساتھ نشاندہی کی۔ شہرین ذرا چونکی۔

"سعدی؟ وہ۔ فارس کا بھانجا؟"

"آپ اسے جانتی ہیں؟" نوشیرواں کو برا لگا۔ وہ ابھی تک کھڑا تھا۔

"ہوں۔ کچھ زیادہ نہیں۔" وہ سنبھل کر بے نیاز

نظر آنے لگی۔ پھر جب جانے کے لیے پلٹی تو جواہرات نے آواز دی۔

"کیا تم شام میں آؤ گی؟"

"نہیں۔" وہ باہر جا چکی تھی۔ جواہرات نے مسکرا کر نوشیرواں کو دیکھا اور نزاکت سے ایئر رنگ پہ انگلی پھیرتے ہوئے بولی۔

"وہ ایک دن میں بھی دوسری دفعہ اس گھر میں آنا پسند نہیں کرتی۔"

نوشیرواں چونکا' پھر خفیف سا سر جھٹکا اور کھڑا ہو گیا۔

"یہ سعدی لوگوں کا ریسٹورنٹ وہیں ہے نا؟" بات بدلنے کو اس نے پوچھا پھر وہ واقعی اسی نہج پہ سوچ رہا تھا۔ جواہرات نے شانے اچکا کر گلاس لبوں سے لگا لیا۔

☼ ☼ ☼

؎ ہوا کی زد پہ بھی وہ اک چراغ روشن ہیں

صبح ابھی تازہ تھی اور سفیدی سنہرے پن میں نہیں بدلی تھی۔ کاردارز کے گھر گو کہ ناشتا ختم ہو چکا تھا' فجر کی آئی شیرین واپس' نوشیرواں دوبارہ سونے اور ہاشم کورٹ کے لیے نکل چکا تھا۔ مگر اکثر گھروں میں ناشتے' اسکول' کالج کی تیاری ابھی چل رہی تھی۔ اس سیکٹر کے درمیانے درجے کے گھروں میں ایک وہ چھوٹے باغیچے والا گھر بھی تھا جس کی بیرونی تختی پہ ذوالفقار یوسف (مرحوم) لکھا تھا۔ گھر کے اندر جاؤ تو کمروں سے کمرے نکلتے تھے۔ دو منزلہ گھر چھوٹا سا تھا۔ اسی لیے کچن میں پکتے ناشتے کی مہک اور دھواں سارے میں پھیلا تھا ایک فربہی مائل خاتون پراٹھا توے پہ پلٹتے ہوئے غصے سے زور' زور سے آوازیں بھی دیے جا رہی تھیں۔

"اسامہ۔ حنین۔ اٹھ جاؤ۔ وین آنے والی ہے۔"

"کیا امی۔ میں کب کا تیار بھی ہو چکا ہوں۔" ایک تیرہ برس کے لڑکے نے ناراضی سے کہتے کچن میں جھانکا۔ وہ یونیفارم میں ملبوس تھا اور برش سے گیلے بال سنوار رہا تھا۔ اس کے بال گھرے' بھورے اور گھنگھریالے تھے۔ اپنی زمر پھپھو کی طرح۔

ندرت نے عجلت میں مڑ کر اسے دیکھا۔ "اچھا شاباش۔ اور حنین کدھر ہے؟"

"کٹو بیگم ابھی تک سو رہی ہے۔"

"کتنی دفعہ کہا ہے سیم کہ بڑی بہن کو ان ناموں سے مت پکارا کرو۔"

"گن کر بتاؤں کتنی دفعہ امی؟"

اس سے پہلے کہ وہ جوتا اتارتیں' وہ بھاگ چکا تھا۔ ایک کمرے میں آ کر وہ رکا۔ وہاں دو پلنگ مخالف دیواروں سے لگے تھے۔ ایک کی سائیڈ ٹیبل پہ اسامہ کا بیگ رکھا تھا۔ دوسرے پہ لحاف منہ تک لیے وہ سو رہی تھی۔

"حنین۔ حنی ی ی ن۔" اس کے نام کو لمبا کھینچ کر پکارا۔ "کٹو بیگم' اٹھ جاؤ۔" پھر غصے سے اس کا لحاف میں دبکا بازو ہلایا۔ اندر کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ اسامہ کے تاثرات بدلے۔ آنکھوں میں شرارت چمکی۔ وہ پائنتی کی طرف آیا۔ وہاں ایک نسوانی پیر لحاف سے باہر تھا۔ اس نے دو انگلیوں سے پیر کے نیچے گدگدی کی۔

پیر تیزی سے اندر کھینچا گیا۔ ساتھ ہی لحاف اتار کر وہ دھاڑی۔

"بدتمیز۔ الو۔ میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔" جھک کر بیڈ کے آس پاس جوتا تلاش کیا' مگر وہ بھاگ کر چوکھٹ کے باہر چھپ گیا تھا۔ پھر کچھوے کی طرح گردن اندر کر کے بولا۔

"وین آنے والی ہے' آج میں تمہیں چھٹی نہیں کرنے دوں گا کٹو بیگم۔" جوتا اڑتا ہوا اس تک آیا' مگر اسامہ اڑن چھو ہو چکا تھا۔

"میں چھٹی کر بھی نہیں رہی' پیپر ہے میرا' مگر مجال ہے جو یہ دس منٹ زیادہ سونے دے۔" وہ منہ بسورتی' پیر فرش پہ مارتی اٹھی۔ "کیا یار۔ روز صبح صبح اٹھنا پڑتا ہے۔" پھر جیسے کچھ یاد آیا۔ لپک کر راہداری میں آئی اور زور سے چلائی۔

ماموں نے جواب دیا "تم میرے پاس گلی پہ کور
پڑھوانے؟ وہ تو ہو سکے۔"

غصہ نکال کر اندر آئی۔ گھڑی دیکھی تو اوہ نو۔ وہ بھاگ بھاگ کر تیار ہونے لگی۔ الماری کھولی تو کپڑوں کا ڈھیر باہر کو گرا۔ بمشکل اس ڈھیر کو ہاتھ سے روک کر اندر سے ایک سوٹ کھینچا۔ ڈھیر کو واپس دھکیلا اور باتھ روم میں گھس گئی۔

باہر آئی تو جلدی جلدی جوتے پالش کیے۔ کپڑے کوئی خاص استری نہ تھے۔ ساتھ ساتھ امی کی صلواتیں۔

"کتنی دفعہ کہا ہے کہ رات کو کام کر کے رکھا کرو۔ بس دن میں نہ کروں تم دونوں کوئی کام نہیں کرو گے۔" وہ رلودادی کے سرے پہ گول میز پہ ناشتا رکھتے افرا تفری میں ڈانٹ بھی رہی تھیں۔ "ایک میرا سعدی ہے، کبھی مجھے تنگ نہیں کیا، بغیر کہے ہر کام کرتا ہے۔"

وہ جو زمین پہ بیٹھی جوتے پالش کر رہی تھی، ایک دم رکی۔ "امی۔ بھائی کہاں ہے؟"

"ریسٹورنٹ۔ آج کل آفس سے چھٹی لے رکھی ہے، مگر فجر کے بعد آفس کا کام لے کر ریسٹورنٹ چلا جاتا ہے۔ کالونی کی مسجد میں فجر بھی آج اسی نے پڑھائی تھی۔ امام صاحب بیمار ہیں نا اور ایک تم دونوں ہو جس دن جوتے نہیں کھاؤ گے نماز کے لیے نہیں اٹھو گے۔"

"افف۔ بھائی بھی نا، چھٹی لے کر بھی کام کرنا نہیں چھوڑے گا۔" وہ جوتے پہن کر اٹھی۔ یہ بات کہتے ہوئے انداز میں فخر در آیا تھا۔

تب ہی وین کا ہارن سنائی دینے لگا۔

"جاؤ موٹے، جا کر بیٹھو، انکل کو تسلی ہو۔" اسامہ نے فوراً ہدایت پہ عمل کیا اور "اچھا گڈ بیکم" کہتا باہر بھاگا۔ حنین نے توجہ نہیں دی۔ وہ برش لیے جلدی سے ماں کے قدموں میں آ بیٹھی اور گردن اونچی کی۔ وہ تیز تیز اس کی فرنچ چوٹی بنانے لگیں۔

"ہاں دعا کرنا۔ بس آج کا پیپر اچھا ہو جائے۔ پھر تین رہ جائیں گے، جان چھٹنے گی۔" وہ سر اونچا کیے کہہ رہی تھی۔ وہ انیس، بیس سال کی دبلی پتلی سی لڑکی تھی۔ رنگت گندمی تھی اور نقوش معمولی۔ خوب صورت تو بالکل نہیں تھی، مگر اچھی لگتی تھی۔ درمیانی سی، بال سیاہ اور سیدھے تھے۔ کندھوں سے ذرا نیچے آتے اور ماتھے پہ برابر کٹے تھے۔ امی نے فرنچ چوٹی بناتے ہوئے ماتھے والے چھوڑ دیے تھے اور پچھلوں کو گوندھ کر ربربینڈ لگا دیا۔

بیگ اٹھا کر، دوپٹا کندھے پر برابر کر کے، باہر نکلتے نکلتے حنین نے ایک دم مڑ کر ندرت کو پکارا۔

"امی۔ بھائی نے وعدہ کیا تھا کہ آج فارس ماموں رہا ہو کر گھر آجائیں گے۔ امی! کیا وہ واقعی آجائیں گے؟" اس کی آواز میں امید بھی تھی اور آس ٹوٹنے کا خوف بھی۔

"تمہارے بھائی نے کب اپنا وعدہ پورا نہیں کیا؟" ندرت نم آنکھوں سے مسکرائیں تو وہ بھی مسکرا دی۔ وین کا ہارن پھر بجا تو وہ بوکھلا کر باہر بھاگی۔

اسامہ اگلی سیٹ پہ انکل کے ساتھ بیٹھا تھا اور پچھلی نشستوں پہ لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ حنین کے بیٹھتے ہی وین چل پڑی۔ اس کی کلاس فیلو رافعہ نے ذرا منہ بنا کر کہا۔

"حنین! جلدی آیا کرو۔"

اسامہ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"رافعہ باجی۔ جب آپ لوگ تھرٹی ون اسٹریٹ میں رہتے تھے اور آپ کو ہم سے بعد میں انکل پک کرتے تھے تو ہم بھی آپ کا اسی طرح انتظار کرتے تھے۔"

رافعہ ہونٹ سکیڑ کر خاموش رہی۔ حنین نے فاتحانہ نظروں سے اسے دیکھا اور اپنا بیگ آگے اسامہ کی طرف بڑھایا، جسے اس نے اپنے قدموں میں رکھ لیا۔ رافعہ اور نکل نے بھی اپنے اپنے بیگ اسی نیت سے اٹھائے کہ ذرا زیادہ آرام سے بیٹھ سکیں۔ اس سے قبل کہ وہ اپنے بیگ آگے پاس کرتیں۔ حنین نے بازو بڑھا کر اسامہ کی گردن کی نبض محسوس کی، پھر لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے ایکسائیٹڈ سی بولی۔

"یہ بھی سانس لے رہا ہے، ایسا کرو تم سب اپنے

پکڑ دے دو' تاکہ بچے کا سانس صحیح سے تو بند ہو۔"
پکڑ آگے بڑھاتے ہاتھ فوراً" رکے اور منہ بنا کر واپس ہو گئے۔ حنین کے چہرے کے تاثرات بدلے اور وہ تنبیہی نظروں سے ان سب کو دیکھ کر پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔ اسامہ نے گردن ذرا موڑ کر مسکراہٹ چھپاتے اسے دیکھا اور ایک آنکھ دبائی۔ حنین نے بھی بے ساختہ امڈ کر آتی مسکراہٹ روک لی۔
گھر کی مرغی اور باہر کی دال میں واضح فرق تھا۔



اسلام آباد پہ صبح کا دودھیا پن زرد ہو کر خستہ پڑ گیا اور سورج سوا نیزے پہ پہنچا تو سارے درخت پسینے میں نہا گئے۔ مگر لندن میں ابھی صبح تازہ تھی۔ ٹھنڈی سی چھایا میں گھرے ہلٹن ہوٹل کے اندر لابی میں معمول کی گہما گہمی تھی۔
ایک کارنر میں ایک فربہی مائل' سوٹڈ بوٹڈ صاحب کے ساتھ ایک سوٹ میں ملبوس نوجوان کھڑا تھا۔ وہ صاحب جیسے کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ دفعتاً" نوجوان نے گھڑی دیکھتے ہوئے ان کو مخاطب کیا۔
"کانفرنس شروع ہونے میں خاصا وقت ہے۔ ڈاکٹر عطا کیوں نا ہم اندر چل کر بیٹھیں؟"
"بس تھوڑی دیر اور خضر۔"
"آپ کی واپسی کب ہے اسلام آباد کی؟"
"کانفرنس اٹینڈ کر کے نکل جاؤں گا شام کو۔ تم لوگ کب تک ہو؟" مگر پھر خضر کا جواب سنے بغیر ہی وہ جیسے دور کسی کو دیکھ کر شناسا سا مسکرائے تو خضر نے اس جانب دیکھا۔
"آپ ڈاکٹر سارہ کا انتظار کر رہے تھے؟"
"آؤ... تمہیں ملواتا ہوں۔" وہ اسے لیے انٹرنس تک چلے آئے۔ جہاں سے وہ چلتی آ رہی تھی۔ وہ گوری گلابی' نیلی سبز آنکھوں والی تھی۔ عمر تیس سے پینتیس کے درمیان' مگر کافی دبلی پتلی' خوب صورت نہیں تھی' پیاری تھی۔ مسکراتی تو آنکھوں کے گرد لکیریں پڑتیں۔ بال فرنچ ناٹ میں باندھ رکھے تھے۔

مجموعی طور پر اس کے چہرے پہ ایک سادہ اور پر خلوص سا تاثر تھا۔ وہ ان کو دیکھ کر شناسائی سے سر کو خم دیتی قریب آئی۔ ہاتھ میں فائل' فولڈر' بیگ' بہت کچھ اٹھا رکھا تھا۔
"سوری ڈاکٹر عطا... مجھے دیر تو نہیں ہو گئی۔ بیٹیوں کو اسلام آباد چھوڑ کر آئی ہوں۔ آپ کو پتا ہے نا ان سے تفصیلی بات نہ کر لوں تو مجھے تسلی نہیں ہوتی۔" بہت سادہ اور معذرت بھرے انداز میں بولی۔ "بالکل ایسا ہی ہے' اچھا ان سے ملو' یہ خضر ہیں' پلاننگ کمیشن میں شاید تم نے کبھی ان کو دیکھا ہو اور خضر' یہ ڈاکٹر سارہ غازی ہیں۔ کیمیکل انجینئر ہیں' تھر کول پاور پروجیکٹ کی پروجیکٹ ڈائریکٹر' ایرو اسپیس ڈیزائن میں پی ایچ ڈی کرنے والی پہلی پاکستانی اور آج کی انٹرنیشنل انرجی ایجنسی کے اس سیمینار میں ہمارے ملک کی نمائندگی کریں گی۔ مختصراً" یہ ایک راکٹ سائنٹسٹ ہیں۔" بات ختم کر کے انہوں نے فخر سے اس عہدیدار کے تاثرات دیکھے۔
"سر مجھے میڈم کے کریڈینشنلز سننا اچھا لگ رہا تھا' ورنہ ہماری بہت اچھی ملاقات ہے۔ میڈم کا پلاننگ کمیشن میں روز کا آنا جانا ہے۔" خضر نے تب بتایا جب وہ سب کہہ چکے۔ سارہ نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا۔ ڈاکٹر عطا بے حد محظوظ نظر آنے لگے۔
"میں بڑوں کو نہیں ٹوکتی' ورنہ مجھے اپنے کریڈینشنلز سننا بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔" پھر خضر کی طرف متوجہ ہوئی۔ "اور سنائیں خضر پلاننگ کمیشن والے ٹھیک ہیں؟"
"سنائیں گی تو آپ میم... آپ لوگوں نے انٹرنیشنل کورٹ میں آئی ایم ایف کے خلاف کیس جیتا ہے' جتنی مبارک دوں کم ہے۔"
"جی خضر صاحب... اس کا تو گورنر صاحب کو کریڈٹ جاتا ہے جنہوں نے اپنے خرچ پہ کیس لڑا تھا۔" وہ ابرو اٹھا کر سادگی اور خوشی سے کہہ رہی تھی۔
"کوئی شک نہیں۔" ڈاکٹر عطا نے تائید کی۔ پھر

جیسے کچھ یاد آنے پہ پوچھنے لگے۔ "ڈاکٹر سارہ۔ کل ہی کسی نے مجھ سے پوچھا تو سوچا آپ سے معلوم کروں گا' آپ کے ہزبینڈ کے مرڈر کیس کا کیا بنا؟"

سارہ کی مسکراہٹ پھیکی پڑی۔ آنکھوں میں سائے لہرائے۔ اس نے خفیف سا سر جھٹکا۔ پلاننگ کمیشن کے عہدیدار نے سوالیہ ڈاکٹر عطا کو دیکھا۔

"سارہ کے ہزبینڈ۔ وارث غازی نیب آفیسر تھے۔ تین' چار سال پہلے ان کا مرڈر ہوا تھا۔ ان کے بھائی نے ہی کیا تھا۔" "سارہ! کیا اسے سزا ہوئی؟" وہ دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"اوہ۔ بہت افسوس ہوا۔" خضر کو جیسے شرمندگی ہوئی۔

"میں نہیں جانتی کہ ان کے بھائی نے قتل کیا بھی تھا یا نہیں' ڈاکٹر عطا' سب کہتے تھے کیا تھا تو شاید کیا ہو' مگر میں اس کیس کو فالو نہیں کرتی۔ انتقام' قصاص' بدلہ' ان سب سے کچھ حاصل نہیں ہوتا' میرا کل اثاثہ میری بیٹیاں ہیں اور وہ ابھی بہت چھوٹی ہیں' سو میں کسی ایسے معاملے میں نہیں انوالو ہونا چاہتی جو ان کی سیفٹی کو خطرے میں ڈالے۔" بھری محفل میں کسی کے دکھ کا ذکر چھیڑ دینا' بری نیت سے ہو یا اچھی نیت سے' دل ہمیشہ ایک طرح سے ہی دکھاتا ہے۔ وہ بھی افسردہ ہو گئی تھی۔

"میم۔ آپ سے کچھ ڈاکومنٹس مانگے تھے میں نے۔" آپ نے کہا تھا میل کروا دیں گی' مگر مجھے ملے نہیں ابھی تک۔" خضر نے جیسے بات بدلی۔ وہ ابھی تک لابی میں کھڑے تھے اور ماحول خاصا سوگوار ہو گیا تھا۔ لمحے بھر میں وہ تینوں اردگرد سے کٹ گئے تھے۔ سارہ زبردستی مسکرائی۔ "آئی ایم سوری خضر' میرا سینئر انجینئر چھٹی پہ ہے' کچھ دنوں میں شام میں اسلام آباد واپس جا رہی ہوں۔ جاتے ہی اس کو یاد کرواؤں گی۔ وہ آپ کو میل کر دے گا۔"

"اوہ ہاں۔ میں پوچھنے لگا تھا۔ آپ کا سینئر انجینئر آپ کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے ہمیشہ' آج نظر نہیں آ رہا۔"

"وہ کسی ذاتی کام میں مصروف ہے۔" کہتے ہوئے اس کی زبردستی مسکراہٹ قدرتی مسکان میں بدلنے لگی۔

خضر نے ماتھے کو چھوا۔

"میں اس کا نام ہمیشہ بھول جاتا ہوں' کہیں یہ نہ ہو کہ میں اس کی میل مس کر دوں۔"

"سعدی۔ سعدی یوسف!" سارہ نے یاد دلایا' پھر چہرے پہ دوبارہ بشاشت لاتے ہوئے ان دونوں کو دیکھا۔ "اندر چلتے ہیں' آج ہمارے پاس توانائی کی دنیا کو دکھانے اور بتانے کے لیے بہت کچھ ہے۔" وہ کہہ کر آگے بڑھی تو دونوں اس کے ساتھ ہو لیے۔ البتہ ڈاکٹر عطا ابھی تک یہ موضوع چھیڑنے پہ پشیمانی محسوس کر رہے تھے اور خضر یاد کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"بالکل۔ سعدی یوسف۔ بہت ہی competent لڑکا ہے۔ میں ایک دفعہ ملا تھا۔" وہ دور ہوتے گئے اور لابی کی گہما گہمی میں ان کی آوازیں مدھم پڑتی گئیں۔

☼ ☼ ☼

گو گرفتہ دل تھے مگر حوصلہ نہ ہارا تھا۔

اسلام آباد میں دوپہر تیز شعاعوں کے ساتھ گویا برس رہی تھی۔ ایسے میں سنہری روشنی میں نہائے چھوٹے باغیچے والے گھر سے آگے مین روڈ پہ نکلیں تو مرکز شروع ہو جاتا' جہاں ایک قطار میں دکانیں تھیں اور قطار کے کونے پہ آخری دکان میں ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ تھا۔ اوپر بڑے سے بورڈ پہ جلی حروف میں لکھا تھا۔ " Foodily Everafter "

یقیناً" یہ پریوں کی کہانیوں کے اختتامی happily everafter کی اشتہا انگیز نئی شکل تھی۔

ریسٹورنٹ کے برآمدے میں بچھی کرسیاں خالی تھیں۔ قریب ہی پھولوں کا اسٹال لگائے کم عمر پٹھان بچہ موجود تھا۔ ریسٹورنٹ کی سڑک کے سامنے کی دیوار

شیشے کی تھی۔ جس سے اندر جھانکو تو سب سونا پڑا تھا۔ ابھی لنچ ٹائم نہیں ہوا تھا۔ سو سوائے ویٹرز کے جو کام نپٹاتے پھر رہے تھے۔ وہاں کوئی گاہک موجود نہ تھا۔ سب میزیں خالی تھیں۔ سوائے شیشے کی دیوار سے لگی میز کے۔ اس پہ لیپ ٹاپ رکھا تھا۔ ایک کھلی فائل اور دو موبائلز۔۔۔ ساتھ کافی کا مگ جس سے وہ وقفے وقفے سے گھونٹ بھر رہا تھا۔ جبکہ اس کی نگاہیں لیپ ٹاپ اسکرین پہ جمی تھیں۔ وہ کافی سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ جینز پہ بٹنوں والی شرٹ جس کی آستینیں پیچھے موڑ رکھی تھیں۔ اسکرین پہ جمی آنکھیں گہری بھوری اور پرکشش تھیں۔ رنگت بہت صاف اور نقوش کافی ہینڈسم۔ بال پیچھے کی طرف برش کر رکھے تھے۔ سامنے سے دیکھو تو سیدھے لگتے۔ پیچھے سے دیکھو تو گھنگھریالے تھے۔ بالکل زمر جیسے اس کی مجموعی شخصیت ذہن پہ ایک صاف ستھرا' خوشگوار سا تاثر چھوڑتی تھی۔

لیپ ٹاپ کی طرف دیکھتے ہوئے وہ گاہے بگاہے۔ ایک نظر ان فونز پر بھی ڈال لیتا۔ قریب سے گزرتا ویٹر بھی ان ہی فونز کو دیکھ رہا تھا۔

"سعدی بھائی؟" ویٹر نے رک کر اسے مخاطب کیا۔

"ہوں؟" وہ مصروف سا پڑھتا رہا۔

"اس موبائل کا مالک ابھی تک نہیں آیا؟"

"اس کے ابو کو اطلاع تو کردی ہے' آجائے گا۔" وہ پڑھتے پڑھتے نچلا لب دبائے بولا۔ اس کی آواز بھاری اور صاف تھی۔ اردو کا لہجہ کسی بھی علاقائی زبان کے اثر میں نہیں تھا۔

"بڑا کوئی لاپروا لڑکا تھا' اتنا قیمتی موبائل میز پہ چھوڑ گیا۔ آپ نہ دیکھتے تو کوئی چرا کر لے جاچکا ہوتا۔"

سعدی کے لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ گردن ہلائے بغیر صرف نگاہیں اٹھا کر ویٹر کو دیکھا۔

"کسٹمر تو اس کے بعد آئے ہی نہیں' میں نہ ہوتا' تب بھی تم دونوں پھر تو رہے ہو۔ پھر کون چرا کر لے جاتا؟"

ویٹر جھینپ گیا۔ "مطلب۔۔۔ تم سکتا تھا۔ کر سکتا تھا۔ شکر آپ نے دیکھ لیا۔ میڈم کی طرح آپ بھی بہت دیانت دار ہیں بھائی۔"

"تھوڑا سا مکھن' کریم سوپ کے لیے بچا کر رکھو جنید!" ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ نرم سی تنبیہہ کرتا وہ اب کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ جنید گڑبڑا کر وہاں سے کھسک گیا۔



دفعتاً" اس نے موبائل اٹھایا اور کال ملائی۔ یہ اس کا اپنا موبائل تھا۔

"سعدی یوسف بات کر رہا ہوں' تھر کول سے۔ جی۔۔۔ جی۔۔۔" اس نے رک کر سنا' پھر اثبات میں سر ہلا کر بولا۔

"جی میں نے وہ رپورٹ دیکھ لی ہے' مگر جو چیز میں نے آپ سے مانگی تھی وہ مکمل نہیں ہے۔ میں آپ کو اپنی ڈیمانڈ لکھ کر میل کر رہا ہوں۔ اگلے ہفتے' ہمیں فیلڈ پہ جانا ہے' تب تک۔۔۔" وہ دھیمے مگر قطعی لہجے میں چند منٹ بات کرتا رہا تھا۔ اتنے میں باہر سے پھولوں والا پٹھان لڑکا آکر اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"ہاں۔۔۔ گل خان۔۔۔ کیسے ہو؟" فون بند کر کے اس نے پھر سے ٹائپ کرتے ہوئے اس کو مخاطب کیا۔

"یار سعدی بھائی! تمہارے شہر کا لوگ بڑا خراب ہے۔" بڑے ہی بگڑے موڈ میں کہتے ہوئے ٹانگ پہ ٹانگ رکھی اور ناک سے مکھی اڑائی۔

"اچھا۔۔۔ اب کیا کردیا ہے میرے شہر کے لوگوں نے؟"

"وہ جو سڑک کے دوسری طرف بیٹھا ہے نا۔" اشارے پہ سعدی نے اس طرف دیکھا۔ جہاں دور پھولوں کا ایک اور اسٹال لگا تھا۔ جس کو گل خان سے ذرا بڑا بچہ چلا رہا تھا۔

"وہ خانہ خراب کا بچہ ہمارا پھول چرانے کے پیچھے ہوتا ہے۔"

"اچھا۔ تم اسی لیے یہاں آکر بیٹھ گئے ہو' تاکہ اسے

پڑانے میں مشکل نہ ہو؟" سعدی نے سمجھ کر اثبات میں سر ہلایا۔

"یار سعدی بھائی! مذاق نہ کیا کرو۔ ہمارے ساتھ' وہ ہماری نظر کے نشانے پہ ہے۔" پھر آگے ہو کر بولا۔

"بھائی۔۔۔ تمہارا نام سعد ہے نا کیا؟ مطلب پیار سے سعدی کہتے ہیں؟"

"نہیں۔۔۔ مجھے غصے سے بھی سب سعدی ہی کہتے ہیں۔ سعد نہیں ہے یہ۔ سعدی ہی ہے۔ شیخ سعدی سے۔" وہ بچے کو دیکھے بغیر کام کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تمہارا ابو کیسا ہے؟ صبح نماز پہ نہیں تھا۔"

"بس اب بابا ہماری طرح تھوڑی ہے کہ پہلی اذان پہ اٹھ جائے۔" اس نے گردن اکڑا کر کہا۔

"ہاں اور پھر مسجد میں آکر سجدے میں سو جائے۔ دیکھ رہا تھا میں تمہیں آج۔۔۔"

گل خان برا سا منہ بنا کر سیدھا ہوا۔ "یار! تمہارا ایک آنکھ پیچھے بھی لگا ہوا ہے۔ کبھی تو معاف کر دیا کرو۔ تم اتنا لمبا سورت پڑھتا ہے' ہمیں نیند آجاتا ہے۔" پھر کچھ یاد آنے پہ تاثرات بدلے۔ دلچسپی سے مزید آگے کو ہوا۔ "بھائی! تم نے اتنا اچھا قرآن پڑھنا کدھر سے سیکھا؟"

"میرے اسکول کے ایک قاری۔۔۔" وہ بتاتے بتاتے رکا۔ جیسے کچھ یاد آیا۔ سر اٹھا کر جنید کو پکارا۔ "اسکول کا آرڈر تیار ہو گیا؟" ساتھ ہی وال کلاک دیکھا۔

"کون سا آرڈر بھائی؟" جنید' سفیان دونوں بھاگے آئے۔

سعدی نے اچنبھے سے دونوں کو دیکھا۔ "کیا مطلب۔۔۔ فہیم نے نہیں بتایا؟ کل میں ادھر تھا جب فون آیا تھا۔ پکنک کا آرڈر تھا۔ فہیم کو بتا کر گیا تھا میں۔" وہ کہتے ہی کھڑا ہوا تھا' جیسے الارم سا بج رہا ہو کہیں۔

"وہ فہیم تو بیمار تھا۔ آج آیا ہی نہیں ہے۔ اس نے تو کوئی ذکر نہیں کیا بھائی۔"

"یا اللہ۔۔۔ دو گھنٹے تک ڈلیوری کرنی ہے اور یہاں کام بھی نہیں شروع ہوا۔" وہ اٹھتے ہوئے چیزیں سمیٹنے لگا۔ اس کا ارادہ بھانپ کر دونوں بوکھلا گئے۔

"بھائی! آپ رہنے دیں' ہم کر لیں گے۔"

سعدی نے سنجیدگی سے جنید کو دیکھا۔

"ان کی کال کل میں نے اٹھائی تھی۔ آرڈر میں نے نوٹ کیا تھا۔ جب انہوں نے نام پوچھا تو میں نے سعدی یوسف بتایا تھا۔ میں نے ان کو زبان دی ہے کہ آج سہ پہر تک آرڈر تیار ہو گا تو اب وہ میرے بھروسے آئیں گے۔ سو آرڈر بھی مجھے ہی پورا کرنا ہے۔" قطعیت سے کہتا وہ لیپ ٹاپ بند کر کے میز کے پیچھے سے نکلا۔ گل خان نے اس کا کپ اٹھا کر کافی چکھی۔ سعدی کے خود کو دیکھنے پہ مسکرایا۔

"ہم پہ تو پرائے گھر کا پانی بھی حرام ہے۔ مگر تم تو اپنا بھائی ہے۔" دو گھونٹ اور بھرے۔ سعدی اس کا کندھا تھپک کر ریسپشن تک آیا۔ ایک دم گل خان "اوہ خانہ خراب" کہتا کپ چھوڑ کر بھاگا۔ ان تینوں نے مڑ کر دیکھا۔

سڑک پہ مقابل والا لڑکا پھول اٹھائے بھاگ رہا تھا۔ گل خان اس کے پیچھے لپک رہا تھا۔ ایک سفید گاڑی قریب آتی دکھائی دے رہی تھی۔

سعدی واپس رجسٹر کی طرف متوجہ ہوا مگر ذہن میں جیسے کچھ اٹکا۔ سفید گاڑی؟ اس نے تیزی سے گردن موڑی۔

وہ سفید رولز رائس تھی۔ پاکستان میں کچھ عرصہ قبل تک اس طرح کی صرف دو گاڑیاں تھیں۔ پہلی ایک پرائیویٹ نیوز چینل کے مالک کے پاس اور دوسری ایک ہاؤسنگ اسکیم کے ارب پتی مالک کی ملکیت تھی۔ مگر اب تیسری بھی دکھائی دیتی تھی اور اس کے مالک کو تو وہ لاکھوں میں پہچانتا تھا۔

"نوشیرواں کاردار!" وہ بے اختیار گلاس ڈور کے قریب آ کھڑا ہوا۔

"تو ٹھہر تو سہی۔۔۔" دونوں لڑکے آگے پیچھے بھاگتے سڑک پہ آئے۔ رولز رائس نے ایک دم بریک لگائے۔ ٹائر چرچرائے' دوسرا تو بھاگ گیا تھا' گل خان

دبک کر سر پہ ہاتھ رکھے سڑک پہ بیٹھ گیا۔

گاڑی کا دروازہ کھول کر سرخ چہرہ لیے نوشیرواں تیزی سے باہر نکلا۔

"اندھے۔۔۔ ایڈیٹ۔۔۔ تمہارے باپ کی سڑک ہے؟ چلنے کی تمیز نہیں ہے۔ ابھی میری گاڑی کہیں لگ جاتی تو کیسے نقصان پورا کرتے؟ اپنے ماں' باپ کو بیچ کر؟" اس کا جیسے بس نہیں چل رہا تھا۔ لڑکے کو دو تھپڑ لگا دے۔ ڈریس پینٹ' شرٹ' اور بنا آستین کے ویسٹ میں ملبوس' وہ آفس کی تیاری میں لگ رہا تھا۔

سعدی جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے قدم قدم چلتا باہر آیا اور ریسٹورنٹ کا سبزہ عبور کر کے سڑک کے کنارے آرکا۔

"اور اگر تمہاری گاڑی سے اس بچے کو چوٹ لگ جاتی تو تم کس کو بیچ کر نقصان پورا کرتے؟"

نوشیرواں جو بگڑے تیوروں کے ساتھ گاڑی کی طرف پلٹ رہا تھا' بے اختیار پلٹا۔ سعدی کو دیکھ کر غصہ جیسے کم ہوا' مگر آنکھوں میں تپش اور کینہ بڑھ گیا۔ گل خان لپک کر سعدی کے پیچھے آکھڑا ہوا۔

"اچھا۔۔۔ میں سمجھ گیا۔" نوشیرواں نے طیش کو دبا کر طنزیہ مسکرانے کی کوشش کی۔ "یہ شاید تمہارا مین بزنس ہے۔ ان آوارہ لڑکوں کو چوٹیں لگواؤ اور پھر گاڑیوں کے مالکان سے رقم وصول کرو۔ گڈ گڈ۔ کیا یہ کرنے سے ریسٹورنٹ کا کرایہ پورا ہو جاتا ہے؟"

سعدی آنکھیں سکیڑے' ٹھنڈے تاثرات کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔

"میرا اصل بزنس تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اگر تمہارا موڈ خراب نہ ہو تو میں دہرا دوں کہ میں کس پروجیکٹ پہ کام کر رہا ہوں؟"

نوشیرواں کے چہرے پہ پھر سے سرخی بڑھنے لگی۔ لب بھینچ کر بمشکل ضبط کیا۔

"میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ سعدی! کہ میں تمہارے آفس کی روداد سن سکوں۔ میرے پاس میری ایک کمپنی ہے جہاں جانے کے لیے میں اس تمہارے اسسٹنٹ کی وجہ سے لیٹ ہو رہا ہوں۔" اس نے حقارت سے ابرو سے بچے کی طرف اشارہ کیا' جو سعدی کے بازو کی اوٹ سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اچھا۔ تم آفس جا رہے ہو۔ ویری گڈ۔۔۔ مگر میرا جغرافیہ اگر درست ہے تو میرا ریسٹورنٹ تمہارے گھر سے آفس کے راستے میں نہیں پڑتا۔ ان فیکٹ تمہارے کسی راستے میں نہیں پڑتا۔ سو میری چھٹی حس مجھے یہ بتاتی ہے کہ یقیناً" تمہارے اردگرد آج کسی حوالے سے میرا ذکر ہوا ہو گا اور تم حسب معمول غصے میں بے قابو ہو کر مجھے چیک کرنے آئے ہو۔ سو۔۔۔ اب تم دیکھ ہی چکے ہو کہ میں وہی سعدی ہوں۔"

کندھے ذرا سے اچکا کر سعدی نے بہت آرام سے کہا۔ ویٹرز' جنید' سفیان' گل خان کا باپ اور ایک دو راہ گیر اب جمع ہوئے کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ ضبط کی شدت سے نوشیرواں کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔

"میں اچھی طرح جانتا ہوں تم کون ہو۔"

"میں بھی جانتا ہوں کہ میں کون ہوں۔ میں ایک یتیمی میں بڑا ہونے والا لوئر مڈل کلاس لڑکا ہوں۔ میری ماں یہ چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہے اور میرا گھر اس سے بھی چھوٹا ہے۔ میں انگلینڈ پڑھنے بھی اسکالر شپ پہ گیا تھا اور میں نے زندگی میں وہ دن بھی دیکھے ہیں جب پیسے نہ ہونے کے باعث ہمیں چٹنی سے روٹی کھانی پڑتی تھی۔ آج میں ایک کیمیکل انجینئر ہوں۔ ایک سائنس دان اور آج بھی میری تنخواہ بہت زیادہ نہیں ہے۔ اپنے خاندان' اپنے گھر' اپنی مالی حیثیت مجھے کسی چیز کے بارے میں سچ بتانے سے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ میں سعدی یوسف خان ہوں اور یہاں سب مجھے جانتے ہیں۔ کیا اب تم بھرے مجمع میں اپنا تعارف کروا سکتے ہو؟"

نوشیرواں کا غصہ ٹھنڈا اور آنکھوں کی تپش مزید بھڑک چکی تھی۔ وہ خاموش رہا تو سعدی نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"اگر نہیں۔۔۔ تو بہتر ہے کہ تم اپنی قیمتی کار کو ٹھیک

سے ڈرائیو کرنا سیکھ لو۔۔۔ کیونکہ یہ پہلی دفعہ نہیں ہے۔ جب تم غلط ڈرائیو کررہے ہو اور اگر تمہارا یہیں کھڑے رہنے کا ارادہ ہے تو پھر گاڑی آگے پیچھے کرلو۔ تاکہ ہمارے کسٹمرز کو تکلیف نہ ہو۔" اسی طرح جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ واپس پلٹ گیا۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا وہ اندر آیا تو باہر نوشیرواں گاڑی میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کررہا تھا۔

گل خان بھی اس کے ساتھ اندر آیا تھا اور اب خاصی مضبوطی سے کھڑا تھا۔

"تو سعدی بھائی۔۔۔ کتنے کی ہوگی اس کی ڈبّا گاڑی جس پہ یہ اتنا اکڑ رہا تھا؟"

سعدی نے ہلکا سا مسکرا کر اسے دیکھا۔ "زیادہ نہیں۔۔۔ بس چار۔۔۔ ساڑھے چار کروڑ روپے کی۔"

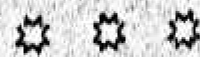
گل خان کا منہ مارے شاک کے کھل گیا۔ سعدی آستینیں دوبارہ فولڈ کرتا کاؤنٹر تک آیا۔ مگر اس کا فون بج اٹھا۔ نمبر دیکھ کر اس نے تیزی سے کال لی۔ ایڈووکیٹ خلجی کالنگ۔

"جی خلجی بھائی۔۔۔ کیا بنا؟ سماعت ہوگئی؟" پوچھتے ہوئے اس کے چہرے پہ لمحے بھر کو ڈر اور امید کا ملا جلا تاثر ابھرا' پھر جواب سن کر وہ تاثر مسکراہٹ میں ڈھلتا گیا۔

"ریئلی۔۔۔! ماموں بری ہوگئے؟ ہر چارج سے؟ گریٹ!" فون رکھ کر اس نے فوراً باہر دیکھا۔ نوشیرواں کی کار جاچکی تھی۔ اس کی دھول تک وہاں نہیں تھی۔

سعدی نے پُرعزم مسکراہٹ کے ساتھ دور آسمان کو دیکھا۔

"یہ خبر سن کر آپ کی شکل کیسی ہوگی' میں دیکھنا چاہتا ہوں ہاشم بھائی۔۔۔!" اور پھر عملے کی طرف مڑ گیا۔ "کم آن بوائز۔۔۔ ہمارے پاس ابھی دو گھنٹے ہیں۔"



ہاشم کو جب یہ خبر ملی تو وہ کوریڈور میں کھڑا تھا۔ اس نے کمال ضبط سے اپنے کڑوے ہوتے تاثرات چھپا لیے۔ وہ ابھی اتنا مصروف تھا کہ ایک دم ری ایکٹ نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے خود سے عہد کیا کہ اگر اس میں سعدی کا ہاتھ ہے۔ تو اسے حساب دینا ہوگا اور توجہ زمر کی طرف مبذول کردی جو سامنے سے فائل کے صفحے سرسری انداز میں پلٹتی' تیز تیز اس طرف آرہی تھی۔ ایک معمر خاتون اور ایک دوپٹا اوڑھے نوجوان لڑکی بھی اس کے ہمراہ تھی۔ ہاشم کوریڈور کے سرے پہ اسے ملا تھا۔ زمر اس کے سلام کا مختصر جواب دے کر آگے ہولی۔ وہ بنا کچھ کہے ساتھ چلنے لگا۔ ایک کریو کٹ والا نوجوان اس کے بائیں جانب تھا۔

کورٹ روم تک کی یہ واک خاموشی سے کٹ جاتی۔ اگر ہاشم کی کسی بات کے جواب میں وہ نوجوان بگڑے تاثرات سے یہ نہ کہتا۔

"نہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں رقم ادا کررہا ہوں۔ ورنہ کورٹ میں یہ مجھے Rapist (عزت لوٹنے والا) ثابت نہیں کرسکتے۔" ساتھ ہی دبے دبے غصے سے اس لڑکی کو دیکھا۔

ہاشم نے نظروں سے تنبیہہ کی' مگر زمر کے قدم ایک دم رکے تھے۔ وہ گھوم کر اس کے سامنے آئی اور سنجیدہ مگر تیکھی نگاہوں سے اس کو دیکھا۔

"آپ کو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں نے آپ کو سیٹل منٹ دی ہے۔ ورنہ اگر ہم ٹرائل پہ جاتے تو آپ کو معلوم ہے کیا ہوتا؟"

ہاشم نے ابرو اٹھا کر لڑکے کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ مگر وہ جو پہلے ہی بہت برے موڈ میں تھا۔ اکھڑا۔۔۔ اکھڑا۔۔۔ سا بولا۔

"میں باعزت بری ہوجاتا اور مجھے یہ پیسے نہ دینے پڑتے اور میری جاب بھی۔"

مدعی لڑکی کی ماں تلخی سے کچھ بڑبڑائی تھی۔ ہاشم نے لڑکے کو ہاتھ اٹھا کر خاموش کیا اور زمر کو دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔

"میڈم پراسیکیوٹر۔۔۔ میں آپ کو جانتا ہوں کہ ٹرائل پہ جانے کے بعد کیا ہوگا۔"

الفاظ کی سنجیدگی کے باوجود ہاشم کی مسکراہٹ برقرار

تھی۔ "بارہ سال... کم سے کم بھی بارہ سال کیس عدالت میں چلے گا اور کچھ ثابت نہیں ہو گا۔ ثنا نے فرید کو خود وہاں بلایا تھا۔ میرے پاس ان کے ٹیکسٹ میسجز کا ریکارڈ ہے اور اس بات سے ثنا انکار نہیں کر رہی کہ ان کا چھوٹا موٹا سہی مگر افیئر تھا تو۔ نہ صرف میں عدالت میں اس افیئر کے ثبوت پیش کروں گا۔ بلکہ دس ایسے لوگوں کو بھی لاؤں گا جن کو اس لڑکی نے زندگی میں کبھی دیکھا بھی نہیں ہو گا اور وہ قرآن پہ ہاتھ رکھ کر کہیں گے کہ یہ ان کے ساتھ بھی یہی کر چکی ہے۔ میں اس کو عدالت میں پیشہ ور عورت ثابت کر کے دکھاؤں گا۔ اس کا خاندان اور محلہ اس کو ڈس اون کر دے گا۔ کوئی اس سے شادی نہیں کرے گا اور بارہ سال بعد آخری پیشی پہ جب یہ ہار جائے گی تو اس کے پاس نہ شوہر ہو گا اور نہ بچے۔ اس لیے آپ کو واقعی ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ہم نے آپ کو سیٹل منٹ دی ہے۔"

فرید نے فخریہ مسکرا کر ہاشم کو دیکھا۔ ثناء کی ماں لبوں میں کوئی بددعا بڑبڑائی، ثنا کے چہرے کا رنگ بدل چکا تھا۔ زمر ہلکی سی مسکرائی اور نفی میں سر ہلایا۔

"اصل میں ہو گا یہ ہاشم! کہ جب کیس ٹرائل پہ جائے گا تو میں اسے ٹرائل تک نہیں رکھوں گی۔ پہلے مہینے میں ہی میں پوری اسٹوری میڈیا پہ لیک کر دوں گی۔ یہ شام کے اخبار کی سرخی جتنا کیس نو بجے کی خبروں میں آئے گا۔ آٹھ اور دس بجے والے ٹاک شوز اس پہ بات کریں گے۔ ثنا کو مارننگ شوز پہ بلایا جائے گا جہاں پہ شاؤنسٹ قسم کی خواتین کے ساتھ بیٹھ کر ظلم کی پوری داستان سنائے گی۔ این جی اوز اس کے لیے واک کریں گی۔ یہ انٹرنیشنل سیمینارز پہ مدعو ہو گی۔ اینٹی آرمی طبقہ اس کو فرید کی ثنا کے ساتھ نہیں، بلکہ ایک جرنیل کے بیٹے کی ایک مظلوم لڑکی کے ساتھ زیادتی بنا دے گا اور تمہارا۔" فرید کی طرف رخ کرتے ہوئے اس نے بات جاری رکھی "سوشل سرکل تمہیں آؤٹ کر دے گا۔ تمہارا باس تمہاری رپورٹ پہ مشکوک الفاظ لکھے گا۔ کوئی بھی لڑکی تم سے شادی کرنے سے پہلے سو دفعہ سوچے گی کیونکہ قاتل کو لوگ قبول کر لیتے ہیں، بدکار کو نہیں۔ میں ثنا کو ایک اسٹار بنا دوں گی اور بارہ سال بعد تم کیس جیت بھی جاؤ تو تم بہت کچھ ہار چکے ہو گے اور وہ ہارے ہوئے رشتے تمہیں یہ تمہارا پچاس ہزار کے ہیئر کٹ اور ڈھائی لاکھ کے سوٹ پہنے کھڑا وکیل واپس نہیں لا کر دے گا۔ سو اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو پراسیکیوٹر کے سامنے اپنے منہ سے نکلنے والے اگلے الفاظ کو روک لیتی۔"

مسکراہٹ معدوم تھی اور ایک کٹھیلی نظر ان دونوں پہ ڈال کر وہ آگے بڑھ گئی۔ فرید کا چہرہ اب ثنا سے مختلف نہ تھا۔ ہاشم پہ البتہ کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ وہ کندھے ذرا سے اچکا کر اس کے پیچھے ہو لیا۔

☼ ☼ ☼

اس نے پیپر مکمل کر لیا تھا اور ابھی امتحانی دورانیہ ختم ہونے میں پندرہ منٹ تھے۔ تب تک ممتحن ٹیچرز نے اسے وہیں بیٹھے رہنے کو کہا تھا۔ حنین پرچہ الٹا رکھ کر بیٹھی لکھ لکھ کر دکھتی انگلیوں، جن پہ کہیں کہیں نیلی انک لگ گئی تھی کو سہلا رہی تھی۔ اسے پیپر کر کے پڑھنے کی عادت نہیں تھی اور بعد میں باہر لڑکیوں کے گروپ میں کھڑے ہو کر ایک ایک جواب ملانے سے تو وہ بھاگتی تھی۔ آدھے جواب تو وہیں غلط نکل آتے تھے۔

"بس تین پرچے مزید اور پھر لی اے ختم۔ شکر..." اس نے خود کو تسلی دی۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔ لڑکیاں سر جھکائے دھڑا دھڑ لکھے جا رہی تھیں۔ امتحانی عملے کی خواتین کڑی نظروں سے دیکھتی، ٹہل رہی تھیں۔ حنین کی نظریں روشن دان تک گئیں۔ تین، تین، تین، ایک، ٹوٹل ہوئے دس... وہ اسی طرح کھڑکیاں، دروازے، سڑک کنارے درخت گنا کرتی تھی اور وہ بھی دس دس کے گروپ بنا کر پھر سے شروع کرتی۔

سارے دروازے گن کر اس نے ایک خشک سیاہی والا قلم نکالا اور اس کی نب کو کرسی کے بازو پہ رگڑ کر ان دیکھے لفظ لکھنے لگی۔ وہ عموماً "پھول بناتی تھی یا تکون اور

پھر اپنا نام لکھنا شروع ہو جاتی۔ Yousuf Haneen حنین یوسف۔۔۔ حنین۔۔۔ حنین۔۔۔ اور لاشعوری طور پہ اس کے بنا سیاہی کے قلم نے لکھنا شروع کر دیا۔

"ہاشم کاردار۔ ہاشم۔ ہاشم۔"

وہ ایک دم چونکی۔۔۔ پھر قدرے گھبراہٹ سے ادھر ادھر دیکھا۔ چہرے کا رنگ تھوڑا سرخ ہوا۔ بے چینی سے ماتھے پہ گرے بال ٹھیک کیے۔ جو بات کبھی کسی سے کہی نہ ہو، وہ اچانک باہر نکل آئے، جیسے بھرا ہو گلاس چھلک جاتا ہے، تو انسان اپنے ہی ہاتھوں سے ڈرنے لگتا ہے۔ اس نے قلم رکھ دیا۔ پھر آنکھیں بند کیں۔

نظروں کے سامنے وہ چند لمحات، چند گھڑیاں گزریں۔۔۔ جب اس نے کبھی ہاشم کو دیکھا تھا یا اس سے ملی تھی۔ خاندانی دعوتیں۔۔۔ تہوار۔۔۔ وہ ان کی ماں کے سوتیلے بھائی کا فرسٹ کزن تھا۔ ہر وقت مسکراتا ہوا۔۔۔ بہت شاندار اور متاثر کن۔۔۔ مگر ایک دور کا رشتہ دار۔۔۔ اس کے قریب کھڑے ہو کر اس کو دیکھنا ایسے تھا جیسے بندہ ایفل ٹاور کے نیچے ہجوم میں کھڑا ہو۔

مگر اب ایفل ٹاور تک گئے بھی کتنا عرصہ ہو گیا تھا۔ خاندان میں دور۔۔۔ دور تک کوئی ایسی تقریب ہی نہیں ہوئی جس میں اس کی ایک جھلک بھی نظر آجاتی۔ پتا نہیں کب دوبارہ وہ اسے دیکھے گی؟

اس نے بے دلی سے سوچا اور خشک نب سے پھر سے نکونیں بنانے لگی۔۔۔ پھر پھول۔۔۔ پھر حنین۔۔۔ اور پھر سے ہاشم۔۔۔

✡ ✡ ✡

ہاشم نے دروازے پر دستک دی اور پھر ہینڈل پکڑ کر دھکیلا۔

اندر آفس میں پرسکون خاموشی تھی۔ وہ اپنی کرسی پہ بیٹھی، تھرماس سے پیالی میں چائے انڈیل رہی تھی۔ قریب ہی فائلز اور موٹی سیاہ جلد والی کتابیں کھلی رکھی تھیں۔ زمر نے بس ایک نظر اسے دیکھا، پھر خاموشی سے چینی دان اٹھایا۔

"اونہوں۔۔۔ مجھے پھیکی چائے پسند ہے۔" ہاشم نے مسکرا کر کہتے منع کیا۔۔۔ دروازہ بند کر کے اندر آیا۔۔۔ کرسی کھینچی۔۔۔ ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بیٹھا۔۔۔ کوٹ کا بٹن کھولا اور اس کے آگے سے پیالی اٹھا کر لبوں سے لگائی۔

زمر نے ابرو اچکا کر چینی دان واپس رکھ دیا اور فائل کے صفحے پلٹنے لگی۔

دو۔۔۔ تین گھونٹ بھر کر ہاشم نے پیالی میز پہ رکھی۔۔۔ پھر خوش گوار مسکراہٹ سے اس کو دیکھ کر بولا۔

"سو۔۔۔ ہم اب ٹھیک ہیں آپس میں؟"

"آپ کو کیا لگتا ہے؟" وہ فائل پہ چہرہ جھکائے سنجیدگی سے بولی۔

"شاید نہیں۔۔۔ کیونکہ جس طرح ابھی باہر آپ میرے، ہیئر کٹ اور سوٹ کو درمیان میں لائیں۔۔۔" ہاشم نے ذرا سے شانے اچکائے۔ "اس پہ میں صرف اتنا کہوں گا کہ آپ ایک منتقم مزاج خاتون ہیں۔"

اس نے نگاہیں اٹھا کر سنجیدگی سے ہاشم کو دیکھا۔ "اگر اگلی دفعہ آپ نے کسی کو یوں میرے سامنے ہراساں کرنے کی کوشش کی۔۔۔ تو ہم اس کے بعد ٹھیک نہیں ہوں گے، از دیٹ کلیئر؟"

"کرسٹل!" ہاشم نے پیالی سے دوبارہ گھونٹ بھرتے ہوئے مسکرا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کے گھنگھریالے بال کیچر میں آدھے بندھے تھے۔ ناک کی لونگ چمک رہی تھی اور سکیڑی ہوئی آنکھوں میں ٹھنڈی سی بے رحمی تھی۔

"میں اپنی جاب کر رہا تھا، پھر بھی معافی مانگتا ہوں۔"

"آپ کو مانگنی بھی چاہیے۔" وہ پھر سے فائل کی طرف متوجہ ہو گئی۔ چند لمحے کے لیے ہاشم کچھ نہ بولا تو زمر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"مجھے یقین ہے آپ صرف سوری کرنے نہیں آئے۔ آپ کو کوئی فیور چاہیے۔" فائل بند کر کے وہ پیچھے ہو کر بیٹھی۔ "کہیے میں سن رہی ہوں۔"

ہاشم نے مسکرا کر ایک پیپر بیگ سامنے رکھا۔ زمر نے اسے کھولا۔ اندر سے ایک کارڈ نکلا۔

"کیا آپ دوبارہ شادی کر رہے ہیں؟" اسی سرد انداز میں مسکرا کر زمر نے کارڈ سامنے کیا' وہ اکا سا ہنسا۔

"او نہوں۔۔۔ میری بیٹی' سونیا کی چھٹی سالگرہ ہے اور آپ انوائیٹڈ ہیں۔"

زمر نے کارڈ دیکھا۔ وہ مستطیل ڈبے میں رکھا تھا۔ کسی شیلڈ کی طرح۔ سب سیاہ تھا اور اس پہ سنہرے رنگ سے تفصیلات لکھی تھیں اور سامنے سنہرے ربن سے وہ بنا ڈھکن کا ڈبہ بند ہوتا تھا۔ اندر ایک چھوٹا آر ایس وی پی کارڈ بھی رکھا تھا۔ جس کی ایک سطر میں شرکت کرنے کی ہاں اور دوسرے میں معذرت تھی اور دونوں کے آگے خالی خانے بنے تھے۔

"تھینک یو ہاشم۔۔۔ میں کوشش کروں گی' وعدہ نہیں کرتی' مگر انویٹیشن اور فیور میں فرق ہوتا ہے۔" اس نے کارڈ بے نیازی سے میز پہ ڈال کر اسی ٹھنڈے پُرسکون انداز میں پوچھا۔

ہاشم نے ابرو سے پیپر بیگ کی طرف اشارہ کیا۔ زمر نے دیکھا۔ اس میں ایک اور کارڈ بھی تھا۔ اس نے وہ نکالا۔ اس پہ درج تھا۔ "سعدی یوسف اینڈ فیملی۔"

ہاشم نے غور سے زمر کے بدلتے تاثرات دیکھے۔ اس کی آنکھوں میں تکلیف ابھری' چہرے پہ مضطرب سا احساس نمایاں ہوا۔ پھر وہی خاموشی چھا گئی۔ اس نے بے تاثر آنکھوں سے ہاشم کو سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"آپ اسے کوریئر کر دیں یا ہینڈ ڈلیور۔"

"نہ وہ میرے کوریئر کرنے سے آئے گا' نہ خود بلانے سے۔ مگر آپ کہیں گی تو وہ آئے گا۔"

زمر نے دھیرے سے شانے اچکائے۔ "میں اسے بھجوا دوں گی۔ کہلوا بھی دوں گی' مگر وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ آپ کسی کو مجبور تو نہیں کر سکتے نا۔" وہ سلجھے جیسے انداز میں بول رہی تھی۔ مگر سمندر میں پتھر پھینکنے کے بعد کے بنتے دائرے ابھی تک پھیل رہے تھے۔

"نہ میں آج پیدا ہوا ہوں' نہ آپ۔ ہم دونوں جانتے ہیں کہ وہ آپ کا کہا نہیں ٹالے گا۔" ہاشم ذرا آگے ہوا۔ اس کی آنکھوں میں گہری سنجیدگی تھی۔ "سعدی کو میری پارٹی میں ہونا چاہیے۔ کسی بھی طرح۔ آپ اسے وہاں لائیں گی۔"

زمر نے جواب نہیں دیا۔ وہ بس کارڈز کو دیکھتی رہی۔ ہاشم کپ رکھ کر واپس پیچھے ہوا اور اس کے چہرے کو مسکرا کر پڑھتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔ "وہ کیا کر رہا ہے کل؟"

"ہوں۔۔۔ جاب۔" وہ کسی سوچ میں تھی۔

ہاشم خاموش رہا۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اس نے پھر بھی آخری گھونٹ اندر انڈیلا اور ذرا آواز سے پیالی رکھی۔

زمر نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور ہلکے سے اثبات میں سر ہلایا۔ "آپ ابھی تک یہیں ہیں' یعنی آپ کو کوئی اور فیور بھی چاہیے۔"

ہاشم نے مسکرا کر سر کو خم دیا اور بولنے کے لیے لب کھولے کہ۔۔۔

"میرا جواب انکار ہے۔"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"ابھی میں نے کچھ کہا ہی نہیں۔"

"میں جانتی ہوں' آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔" دائرے اب پھیل پھیل کر مٹ چکے تھے اور وہ سنبھل چکی تھی۔ "آپ کو سرکار بنام عبدالغفور حیدر میں سیٹل منٹ چاہیے۔ مگر نہیں۔۔۔ ہم ٹرائل پہ جا رہے ہیں۔"

ہاشم کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ اس نے واقعی حیرت سے ابرو اٹھائی۔ "لیکن یہ ایک ایکسیڈنٹ تھا۔ غلطی ڈرائیور کی نہیں تھی۔ پھر بھی وہ دیت دینے کو تیار ہے۔"

"وہ ایک سولہ سال کی لڑکی تھی جو اس ایکسیڈنٹ میں مر گئی ہے ہاشم' ہم ٹرائل پہ جا رہے ہیں۔"

"مگر لڑکی کا خاندان دیت لینے پہ راضی ہو گیا تب پراسیکیوٹر کا کیا خیال ہو گا؟"

"تب پراسیکیوٹر اپنی جیب سے دیت جتنی رقم ادا کر کے متاثرہ خاندان کو مجبور کردے گا کہ وہ ٹرائل پہ جائیں۔"

"اوہ۔ آپ خود یہ رقم ادا کریں گی ان کو؟" اس نے مصنوعی حیرت سے ابرو اٹھائی۔

زمر پہلی دفعہ پورے دل سے مسکرائی۔

"میں نے کہا، ہم ٹرائل پہ جارہے ہیں، میں نہیں۔ سوری مگر آپ کو شاید معلوم نہیں، یہ کیس میں پلیڈ نہیں کررہی، یہ پراسیکیوٹر بصیرت کا کیس ہے۔"

وہ ایک لمحے کے لیے بالکل خاموش رہ گیا۔ بھنویں سکیڑ کر اس نے واقعتاً "اچنبھے سے زمر کو دیکھا اور پھر سمجھتے ہوئے سرہلایا۔

"پچاس ہزار کا ہیئر کٹ اور ڈھائی لاکھ کا سوٹ۔ آپ واقعی ایک منتقم مزاج خاتون ہیں۔" بظاہر مسکراتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔ "آپ نے جان بوجھ کر یہ کیس انہیں دے دیا، کیونکہ جب انہیں معلوم ہوگا کہ ڈیفنس میں ہاشم کاردار ہے تو وہ کبھی اسے سیٹل نہیں کریں گے۔ گڈ، ویری گڈ۔" زمر نے مسکرا کر ابرو اچکائے۔

"میں معاف نہیں کیا کرتی ہاشم۔ یو نو دیٹ۔ کیا میں اب بھی آپ کی پارٹی میں انوائیٹڈ ہوں؟"

"بالکل اور آپ سعدی کو بھی لائیں گی۔ ہمارے ذاتی تعلقات اس سب کی۔ وجہ سے متاثر نہیں ہوسکتے۔" وہ مسکرا کر اٹھا۔ کوٹ کا بٹن بند کیا۔ بار بار بجتا موبائل سائیلنٹ کیا۔ پھر اسی رسان سے بولا۔

"میں اس کیس کو سیٹل کروالوں گا، ہاشم سب سنبھال لیتا ہے، یو نو دیٹ۔ باوجود اس کے کہ بصیرت صاحب کے پاس آج کے بعد بہت وقت ہوگا۔" اس نے سمندر میں دوسرا پتھر پھینکا۔

"کیوں؟ آج کیا ہوا ہے؟" اس نے دوبارہ سے فائلز کھول لیں۔

"ان کے کیس کا فیصلہ جو آگیا ہے۔"

"کس کیس کا؟" وہ اب ایک سطر کو انڈر لائن کررہی تھی۔ ہاشم نے جواب نہیں دیا۔ زمر نے دوسری سطر انڈر لائن کی، پھر ایک دم اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

"کس۔ کس کیس کا؟" اب کے سوال کی نوعیت مختلف تھی۔ آنکھوں میں بے پناہ شاک اور اضطراب تھا اور چہرہ سفید پڑتا جارہا تھا۔ جیسے سنہرے صحرا میں اچانک سے برف باری ہوجائے۔

"اوہ۔ آپ کو نہیں معلوم تھا؟ مجھے بھی ابھی پتا چلا۔" ہاشم کو جیسے بہت افسوس ہوا تھا۔

"کیا فیصلہ آیا؟" اس نے اگلی سانس میں پوچھا۔ وہ جگہ سے بھی نہیں اٹھی۔ گردن اٹھا کر ہاشم کو دیکھتی وہ بالکل ساکن تھی۔

"ناٹ گلٹی۔ ہر الزام سے بری۔" ہاشم نے ہمدردی سے سر جھٹکا۔ "آئی ایم سوری۔" پھر دوبارہ سے بجتے موبائل کی طرف متوجہ ہوتا باہر نکل گیا۔ کوریڈور میں آکر اس نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کے آفس کے بند دروازے کو دیکھا۔

"میں بھی معاف نہیں کرتا، یو بچ!" اور سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

اندر زمر ابھی تک اسی طرح بیٹھی تھی۔ صحرا میں برف باری ہنوز جاری تھی۔



ہے یہی جنوں کا یہی طوق و دار کا موسم

دوپہر۔ سہ پہر میں بدل گئی۔ مگر اس جیل کا آہنی گیٹ ویسا ہی تپ رہا تھا۔ باہر نکل کر اس نے سنہری آنکھوں کی پتلیاں سکیڑے اِدھر اُدھر کسی کو تلاش کیا اور پھر وہ اسے نظر آگیا۔ دور گاڑی کے دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا سعدی۔ اسے آتا دیکھ کر سعدی بھی مسکراتے ہوئے آگے بڑھا۔ دونوں نے قدم قدم فاصلہ عبور کیا اور آمنے سامنے آئے۔ فارس اپنے بھانجے سے دو انچ لمبا تھا۔

اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ یوں بڑھایا جیسے آرم ریسلنگ کے لیے پنجہ بڑھاتے ہیں۔ سعدی نے جوابی پنجہ اس کے ہاتھ سے ملایا۔ فتح کا نشان، سعدی مسکرا رہا

تھا۔ فارس سنجیدہ تھا۔

"کہاں چلیں؟" کار میں بیٹھ کر پہلا سوال سعدی نے پوچھا۔ "تمہارے گھر یا کاردار زکی طرف؟"

"قبرستان۔"

سعدی نے ہوں کہہ کر گاڑی اسٹارٹ کردی۔

فارس نے ایک نظر دونوں کی سیٹوں کے درمیان گیئر کے ساتھ خانے میں رکھے۔ سعدی کے موبائل کو دیکھا اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

"میں آؤں؟" قبرستان کے سرے پہ گاڑی روک کر سعدی نے پوچھا۔

"مجھے تنہائی کی عادت ہے، وقت لگے گا۔" یہ واضح نہ تھا۔ کہہ کر وہ نکل گیا۔

سعدی خاموشی سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔ اس نے یہ نہیں دیکھا کہ اس کا موبائل اب خانے میں نہیں پڑا تھا۔

قبرستان میں ان دو قبروں پہ فاتحہ پڑھ کر وہ اٹھ گیا۔ پھر ایک درخت کی اوٹ میں آیا جہاں سے سعدی اسے نہیں دیکھ سکتا تھا اور اس کے موبائل پہ نمبر ڈائل کیا۔

"ہاں اسٹیفنی۔۔۔ غازی بول رہا ہوں۔" بات کرتے ہوئے عادتاً کان کی لو کو دو انگلیوں سے مسل رہا تھا۔

"ہاں میں باہر آگیا ہوں۔ بات سنو دھیان سے۔ مجھے کچھ چیزیں چاہئیں۔ کل شام تک تیار رہوں۔ میری گن 'میراج فو' وہ جدید اسلحے کے چند نام گنواتا گیا۔

پھر رک کر جیسے اکتاہٹ سے اس کی بات سنی۔

"جو کہا ہے وہ کر کے دو، زیادہ سوال مت کرو۔" کال بند کر کے ریکارڈ مٹایا اور ایک آخری نظر ان دو قبروں پہ ڈالی۔ زرتاشہ فارس غازی، وارث غازی۔

جب واپس آیا تو سعدی ادھر ادھر ہاتھ مارتا کچھ تلاش کر رہا تھا۔

"کیا ہوا؟"

"پتا نہیں موبائل کدھر رکھ دیا۔"

"یہ۔۔۔ تمہاری سیٹ کے پیچھے گرا ہے۔" سعدی نے چونک کر دیکھا۔ اس کا موبائل پچھلی نشست کے نیچے گرا تھا۔ جیسے اگلے خانے سے سلپ ہو کر پیچھے گر گیا ہو۔ سعدی نے شکر کرتے ہوئے فون اٹھایا اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔

"کیا تمہیں حیرت نہیں ہوئی کہ جج نے مجھے رہا کردیا؟" فارس کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔

سعدی نے شانے اچکائے۔

"آپ نے وہ قتل نہیں کیے' میں جانتا ہوں۔"

"کیا فرق پڑتا ہے؟ پوری دنیا تو یہی سمجھتی ہے اور وہ جج۔۔۔ وہ اتنی آسانی سے کیسے مانا۔۔۔ مجھے حیرت ہے۔" کہتے ہوئے مڑ کر غور سے سعدی کا چہرہ دیکھا۔

"اگر تمہارا اس میں کوئی ہاتھ ہے سعدی! تو کہہ دو میں سن رہا ہوں۔"

"میرا ہاتھ کیسے ہو سکتا ہے؟ میری بات جج سنے اور مانے گا بھی کیوں؟" اس نے لاپروائی سے پھر شانے اچکائے اور ڈرائیو کرتا رہا۔

فارس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "یو نو واٹ سعدی۔۔۔ تم نے میری بات کی تردید نہیں کی۔"

اور کھڑکی کے باہر بھاگتے درختوں کو دیکھنے لگا۔

سعدی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموش رہا۔



ع دل کو لہو کریں کہ گریباں رفو کریں

اس بلند و بالا عمارت کے ٹاپ فلور کا وہ کشادہ اور پر تعیش انداز میں آراستہ آفس مکمل روشن تھا۔ پاور سیٹ پہ جواہرات ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ سامنے کرسی پہ بیٹھے ہاشم کو دیکھ رہی تھی جو سر جھکائے موبائل پہ کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔

پیچھے نوشیرواں مضطرب، جھنجلایا ہوا سا ٹہل رہا تھا۔ کسی پنڈولم کی طرح۔ دائیں سے بائیں اور واپس دائیں۔

"مجھے وضاحت چاہیے ہاشم!" جواہرات نے مسکراتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ "تم اتنے بے خبر کیسے ہو سکتے ہو کہ اس کے رہا ہونے سے پہلے تمہیں معلوم بھی نہ ہو سکے۔"

"میں اراضی کے مقدمات میں مصروف تھا اور یہ

سب اچانک ہوا ہے۔" ہاشم نے فون رکھ کر کندھے ذرا جھٹک کر کہا۔ "جسٹس سکندر کے تاثرات میں نے دیکھے تھے۔ وہ ذہن بنا کر آیا تھا۔ یقیناً" اسے اس کام کے لیے پہلے سے راضی کرلیا گیا تھا۔"

"ان لوگوں کی اتنی حیثیت نہیں کہ اس بااثر جج کو خرید سکیں۔"

"ججز صرف خریدے نہیں جاتے' ان کو مجبور کرنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہوتے ہیں۔"

نوشیرواں گھوم کر ہاشم کے سامنے آیا۔ "اور اگر کسی نے اس جج کو بلیک میل کیا ہے بھائی! تو وہ اس سعدی کے علاوہ کوئی نہیں ہوسکتا۔"

"پلیز شیرو... کیا ہم سعدی سے سے ہٹ کر کوئی بات کرسکتے ہیں؟" مسکراتی ہوئی جواہرات کی آنکھوں میں سخت تنبیہہ ابھری۔

"اس نے وہاں دس لوگوں کے سامنے میری بے عزتی کی اور آپ چاہتی ہیں کہ میں اسے بھول جاؤں؟" حسب عادت نوشیرواں بھڑک اٹھا۔

"تمہیں وہاں نہیں جانا چاہیے تھا۔" مگر وہ ہاشم کی بات نہیں سن رہا تھا۔

"وہ مجھے جتا رہا تھا کہ وہ میرے چالان کے متعلق جانتا ہے جو انگلینڈ میں ہوا تھا۔ وہ خود کو سمجھتا کیا ہے؟ ممی میں آپ کو بتا رہا ہوں' آپ اسے پارٹی میں انوائیٹ نہیں کررہیں۔ میں اس کو اپنے گھر میں برداشت نہیں کروں گا۔"

"میں کارڈ دے چکا ہوں... سوری...!" ہاشم نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"شیرو! سعدی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ پارٹی میں آئے گا تو میں اسے دیکھ لوں گی۔ اپنے بیٹے کی بے عزتی کا بدلہ کیسے لینا ہے۔ مجھے معلوم ہے۔" کہتے ہوئے آگے ہوکر نرمی سے اس نے شیرو کا ہاتھ دبایا۔ وہ ذرا ڈھیلا پڑا۔

"مسئلہ فارس ہے۔ میں اسے اپنے اردگرد برداشت نہیں کرسکتی۔ مجھے بتاؤ ہاشم! تم اس معاملے کو حل کرنے کے لیے کیا کررہے ہو؟"

ہاشم اب کاغذ پہ کچھ لکھ رہا تھا۔ یقیناً" وہ بھی ڈسٹرب تھا۔ مگر کمپوزڈ نظر آرہا تھا۔

"میں نے اسے ایک دفعہ اندر کروایا تھا۔ دوسری دفعہ بھی کرواسکتا ہوں۔"

"وہ ایک دفعہ باہر آسکتا ہے تو دوسری دفعہ بھی آجائے گا۔ سو بہتر ہے کہ تم اس کے ساتھ اچھا کھیلو۔ وہ نہیں جانتا کہ قتل کس نے کیے تھے اور اس کے نزدیک' ہم اس کی واحد فیملی ہیں۔" جواہرات مطمئن نہیں تھی۔

"وہ ہمیں کبھی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔" نوشیرواں اکتا کر کہتا کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"اس لیے بہتر ہے کہ وہ ہم سے دشمنی نہ رکھے۔ کیونکہ باہر آنے کے بعد وہ سب سے پہلے یہ جاننے کی کوشش کرے گا کہ وہ سب کس نے کروایا تھا۔"

"ہاشم سنبھال لے گا۔ آپ کیوں فکر کرتی ہیں؟" ہاشم بہت اعتماد اور اطمینان سے پیچھے ہوکر بیٹھتے بولا۔

"میں نے تب بھی جو کچھ کیا' اپنی فیملی کے لیے کیا' اب بھی اپنی فیملی کو پروٹیکٹ کرنے کے لیے مجھے جو بھی کرنا پڑا میں کروں گا۔ اپنی فیملی کے لیے کچھ بھی کرنا جرم نہیں ہوتا۔ اگر میں وارث غازی کو راستے سے نہ ہٹاتا تو وہ ہمارے خلاف کیسز کھول کر ہمیں تباہ کرسکتا تھا اور وہ زر تاشہ میں اس کو نہ مرواتا تو اس قتل کو کبھی آنر کلنگ کی شکل نہ دے سکتا۔ مجھے اس کے لیے افسوس ہے' مگر میرے پاس اور کوئی آپشن نہیں تھا۔ پھر جب قتل ہوتا ہے تو کسی کو تو جیل جانا پڑتا ہے۔ مجھے فارس سے ہمدردی ہے۔ اس کے چار سال ضائع ہوئے' مگر وہ ایک انٹیلی جنس آفیسر تھا۔ اگر وہ اندر نہ جاتا تو قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا۔ اپنے خاندان کو محفوظ رکھنے کے لیے میں نے اسے بزی رکھا تو کیا غلط کیا؟ حکومت نے پانچ سال سے کسی کو سزائے موت نہیں دی۔ اس ملک میں سزائے موت کا قانون شاید جلد ختم ہوجائے' وہ زندہ سلامت ہے' اس کا تو کچھ نہیں گیا۔ اپنوں کو تو سب کھوتے ہیں۔ ہم نے بھی ڈیڈ کو کھویا تھا۔ بے شک نیچرل ڈیتھ سے ہی

سہی۔ مگر ہماری زندگیوں میں بھی دکھ ہیں' پریشانیاں ہیں' مجھے افسوس ہے۔ ان سب کے لیے۔ مگر زمرو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں نے اسے گواہی کے لیے زندہ چھوڑ دیا۔ وہ ٹھیک ہے۔ زندگی گزار رہی ہے۔ پرفیکٹ تو نہیں ہو سکتی نا اب زندگی۔"

ہاشم نے بات کرتے ہوئے ذرا سے شانے اچکائے۔

"بہت سے لوگوں کی زندگی اگر دو' چار کی قربانی سے بچ جاتی ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں۔ میں فارس کو سنبھال لوں گا۔ اسے آنے دیں۔ ممی۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اوکے۔"

پھر سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا "اب ہم تمہارے پروجیکٹ کے بارے میں بات کر لیتے ہیں شیرو۔"

اور نوشیرواں نے جیسے کڑوی گولی نگل لی۔ وہ بے دلی سے کرسی کھینچ کر بیٹھا۔

"اور میرے پروجیکٹ کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے والے بھی کون ہیں بھائی؟ سعدی اور اس کی باس۔"

ہاشم بے اختیار ہنس دیا۔ "یار یہ تمہارا اور سعدی کا کسی لڑکی پہ جھگڑا تو نہیں ہے؟"

جواہرات نے مسکرا کر سر جھٹکا اور بغور شیرو کے تاثرات دیکھے۔ جو مزید خفا لگنے لگا تھا۔

"شیری۔ سونیا کو کب گھر لائے گی؟" جواہرات نے اسی کو دیکھتے ہاشم کو مخاطب کیا۔ شیرو ایک دم کوئی فائل اٹھا کر دیکھنے لگا۔ البتہ اس کی گردن میں ابھر کر ڈوبتی گلٹی واضح محسوس ہوئی تھی۔

"اس وقت اس کا کیا ذکر؟" ہاشم نے گویا ناک سے مکھی اڑائی اور کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

؎ جو رنجشیں تھیں جو دل میں غبار تھا نہ گیا

اس درمیانے درجے کے بنگلے کے لاؤنج کی بڑی سی کھڑکی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ شیشہ آئینہ بنا لان کا عکس دکھا رہا تھا۔ کھڑکی سے چہرہ لگا کر دیکھو تو اندر وہ تھکی تھکی سی چیزیں اٹھائے داخل ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ درمیان سے مانگ نکال کر گھنگھریالے بال کیچر میں باندھے' وہ جھولتی لٹ کان کے پیچھے اڑستی کچن کے دروازے تک گئی۔

"صداقت! کھانا تیار ہے؟"

"جی باجی۔ بس روٹی ڈال رہا ہوں۔"

"پھر کھانے کے بعد۔ سعدی کی طرف جانا' ایک کام ہے۔"

لاؤنج میں وہیل چیئر پہ کتاب پڑھتے بڑے ابا نے بے اختیار اس طرف دیکھا۔ وہ اب واپس آ رہی تھی۔

"دن کیسا گزرا تمہارا؟" انہوں نے معمول کا سوال کیا۔

"بس روز مرہ کے کام تھے۔" وہ صوفے پہ بیٹھ کر جوتوں کا اسٹریپ کھولتے ہوئے بولی۔

"سماعت کیسی رہی؟"

"ہاشم کاردار کا کلائنٹ تھا' کیسی ہو سکتی تھی۔" ابا کے کتاب پہ جھکے چہرے پہ ناگواری ابھری۔

"ہر کرپٹ اور گناہ گار تو ہی اسی کا کلائنٹ کیوں ہوتا ہے؟"

"وہ ایک اچھا ڈیفنس لائر ہے ابا۔ اسے گناہوں کی جسٹی فکیشن دینا آتی ہے۔" وہ کیچر اتار کر بال جوڑے میں باندھنے لگی۔

"مجھے وہ سخت ناپسند ہے۔ انتہائی جھوٹا اور مکار آدمی ہے۔"

"سو تو ہے۔" زمر نے تائید کی۔

بڑے ابا نے کتاب پرے کر کے اس کا چہرہ دیکھا۔

"سعدی سے کیا کام ہے؟"

"ہاشم نے اپنی بیٹی کی سالگرہ کا کارڈ دیا تھا سعدی کے لیے۔ وہی دینا ہے۔" وہ سرسری سا بتا کر ریموٹ اٹھا کر چینل بدلنے لگی۔

"تو تم دے آؤ۔" انہوں نے ایک دم اتنی امید اور منت سے کہا کہ زمر نے بے اختیار ان کو دیکھا۔

"میں نہ بھی جاؤں تو فرق نہیں پڑتا۔ میں اس سے ناراض نہیں ہوں ابا!"

"تو پھر چلی جاؤ۔ اس کی سالگرہ پر ہی وش کر دینا۔"
زمر نے ان کی آنکھوں کو دیکھا۔ وہ اداس نظر آ رہی تھیں۔ اس کے دل کو کچھ ہوا۔

"وہ چھوٹا ہے۔ تم تو بڑی ہو۔ اگر اس سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو تم معاف کر دو۔ وہ تمہاری بیماری میں تمہارے ساتھ نہیں تھا۔ واقعی یہ اس کی خطا تھی۔"

"میں کب کا معاف کر چکی۔ میں اس کے خلاف برا نہیں سوچ سکتی۔ وہ میرا بیٹا ہے ابا۔"

"تو کارڈ تم خود دے آؤ۔ زندگی کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ کون کب چلا جائے اور دوسرے کو تا زندگی پچھتاوا ہی رہے۔"

وہ بنا کچھ کہے اٹھ گئی۔ ابا دکھ سے اسے جاتا دیکھتے رہے۔ انہوں نے پھر کتاب نہیں اٹھائی۔ وہ کمرے میں جاتے ہوئے صداقت کو آواز دیتی گئی۔ "میری روٹی مت بنانا۔" اور وہ مزید دکھی ہو گئے۔ اب اس کا موڈ بگڑ چکا تھا اور وہ کھانا کھائے بغیر کمرے میں بند ہو جائے گی۔

دس، پندرہ منٹ بعد وہ کپڑے بدل کر، فریش ہو کر کمرے سے نکلی تو انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کھانا نہیں کھانا؟"

"کیا آپ کا پوتا مجھے کھانا بھی نہیں پوچھے گا؟" عام سے انداز میں سنجیدگی سے کہہ کر اس نے میز سے کارڈز اٹھائے اور پرس کندھے پہ ڈالا۔

ابا جہاں تھے، وہیں رہ گئے۔ آنکھوں میں تحیر، بے یقینی ابھر کر معدوم ہوئی اور اس کی جگہ خوش گوار تذبذب نے لے لی۔ جیسے کوئی خواب میں آنکھ کھلنے کے ڈر سے صحیح سے خوش بھی نہ ہو پائے۔ ایک دم ان کا چہرہ بجھا۔

"کیا تمہیں پتا چل چکا ہے کہ فارس رہا ہو گیا ہے؟"

وہ جیسے ٹھنڈی سانس لے کر دروازے سے پلٹی۔

"اگر آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ میں سعدی سے یہ پوچھنے جا رہی ہوں کہ فارس کیسے رہا ہوا تو ایسا نہیں ہے۔ میں اتنی اسٹریٹ فارورڈ ہوں کہ اگر مجھے اس سے کچھ بھی پوچھنا ہو تو میں چار منٹ کی کال کر کے بغیر تمہید کے بھی پوچھ سکتی ہوں۔ ابھی مجھ سے ہاشم نے ایک فیور مانگا ہے اور میں اسے وہی دینے جا رہی ہوں۔" اسی سنجیدگی سے کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔

ابا کے چہرے پہ خوش گوار حیرت ابھر آئی۔ صداقت بھی بھاگ کر چوکھٹ میں آ کھڑا ہوا تھا اور اب ان ہی حیران، مگر مسرت آمیز تاثرات کے ساتھ ان کو دیکھ رہا تھا۔



؎ یہی ہے جبر یہی ہے اختیار کا موسم

حنین اور اسامہ تب سے فارس کے گرد بیٹھے تھے جب سے وہ آیا تھا۔ سعدی خاموشی سے گول میز پہ ان کے مقابل بیٹھا تھا۔

"ماموں۔۔۔! کیا وہ دوبارہ تو آپ کو۔۔۔ نہیں لے جائیں گے؟" حنین نے جھجکتے ہوئے انجانے خوف کے زیر اثر سوال کیا۔ فرنچ چوٹی اور ماتھے پہ کٹے ہوئے بالوں کے ساتھ وہ اب گھر کے لباس میں تھی۔

فارس ہلکا سا مسکرایا۔ "نہیں۔" ساتھ ہی سعدی کو دیکھا، سعدی نرمی سے مسکرا دیا اور پھر دوسری جانب دیکھنے لگا۔

"اب آپ ہمارے ساتھ رہیں گے نا؟" سیم نے اشتیاق سے پوچھا۔

"میرے لیے اچھا ہو گا اگر میں اپنا گھر کھولوں۔"

"کیوں جاتے ہو ادھر؟ یہیں رہو نا۔" ندرت نے ناراضی سے کہتے میز پہ مٹر قیمہ کا ڈونگا رکھا۔ کھانا بس لگ چکا تھا۔

"مجھے بہت سے کام کرنے ہیں آپا! مگر آتا جاتا رہوں گا۔" وہ سنجیدگی بھرے سپاٹ انداز میں کہہ رہا تھا۔ وہ عموماً دھیما بولتا تھا، چھوٹے چھوٹے فقرے، لیکن غصہ چڑھنے پہ آواز بلند ہو جاتی تھی۔

ندرت نے تازہ چپاتی لا کر رکھی ہی تھی کہ فارس ہاتھ دھونے کے لیے اٹھ گیا۔ ویسے بھی وہ لباس تبدیل کر چکا تھا۔ جینز کے اوپر بٹنوں والی شرٹ، بال اسی طرح

پونی میں مقید سعدی نے پیچھے سے آواز لگائی۔

"ماموں! آپ کو ہونٹ کٹ کی اشد ضرورت ہے۔"

"نہیں۔ ماموں اس ہیئر اسٹائل میں زیادہ اچھے لگ رہے ہیں۔" حنین نے فوراً" مخالفت کی۔ ساتھ ہی وہ پلیٹ سے کھیرے ٹونگ رہی تھی۔ اسامہ نے اس کے ہاتھ کو پرے کیا۔ اس نے غصے سے اسامہ کو دیکھا۔ "کیا ہے؟"

"ابھی کھانا شروع نہیں ہوا' تم کیوں کھا رہی ہو؟"

"تمہارے حصے کا تو نہیں کھا رہی۔ زیادہ ٹوکا مت کرو ورنہ تمہاری دم باندھ دوں گی۔"

"میری کوئی دم نہیں ہے۔" وہ غصے سے کہتا کھڑا ہوا۔

"بس!" سعدی نے ایک دم سنجیدگی سے کہا' بس ایک لفظ اور وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

"کتنی دفعہ کہا ہے' مت لڑا کرو آپس میں' مگر مجال ہے جو۔" ندرت کی بات گھنٹی کی آواز نے کاٹ دی۔ فارس اسی وقت واپس آتا دکھائی دیا تھا۔ اسامہ بھاگ کر دروازے پہ گیا اور اس کے ساتھ کھڑکی کا پردہ سرکا کر دیکھا۔

"کون ہے اسامہ؟" سعدی نے بیٹھے بیٹھے پوچھا' مگر اسامہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس وہیں کھڑا رہا۔

"اسامہ' کون ہے؟" ندرت نے سوال دہرایا۔ فارس بھی اس طرف دیکھنے لگا۔ اسامہ آہستہ سے ان کی طرف پلٹا۔

"پھول لائی ہیں۔"

"کون؟"

"پھپھو۔ زمر پھپھو آئی ہیں اور پھول لائی ہیں۔"

چند لمحے کے لیے راہداری میں سناٹا چھا گیا۔ جیسے سانس آنا بھی بند ہو گیا ہو۔ ندرت پلیٹیں لگاتی رک گئیں۔ حنین کا کھیرا اٹھاتا ہاتھ رکا' چہرہ بالکل سپاٹ ہو گیا۔ البتہ سعدی تیزی سے دروازے کی طرف گیا۔ فارس نے باری باری سب کو دیکھا۔

"سعدی!" اس نے بے اختیار اسے روکا۔ "میں کمرے میں ہوں۔" ساتھ ہی نگاہوں سے اشارہ کیا' جیسے نہ ملنا چاہتا ہے' نہ اس کی آمد کی خبر کی جائے۔ سعدی نے سمجھ کر سر ہلایا۔

حنین پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔ بھنویں کھنچ گئیں' چہرے پہ خفگی چھا گئی۔

دروازہ کھلنے پہ باہر کھڑی زمر نے سر اٹھایا۔ گھنگھریالے بال ہاف باندھے' وہ زرد چہرے کے ساتھ کھڑی تھی۔ بازوؤں میں سوسن کے پھولوں کا بوکے تھا۔ بدقت مسکرائی۔ اسی پل ناک کی لونگ چمکی۔ آنکھیں بھی چمکیں۔

"سالگرہ مبارک ہو' سعدی!" پھول اس کی طرف بڑھائے۔ سعدی ابھی تک سکتہ میں تھا' پھر اس کے ہونٹ مسکراہٹ میں ڈھلتے گئے۔ آنکھوں میں بے پناہ حیرت اتر آئی۔

"تھینک۔ تھینک یو پھپھو۔ آئیں نا اندر!" کسی معصوم بچے کی طرح خوش ہوتا سعدی ہٹا اور اسے راستہ دیا۔ زمر کی مسکراہٹ معدوم ہوئی' نرم تاثرات والے چہرے کے ساتھ متذبذب سی اندر داخل ہوئی۔ جس گھر میں چار سال تک قدم نہ رکھا تھا' وہاں چار قدم بھی مشکل سے پڑ رہے تھے۔

"زمر۔ کیسی ہو؟" ندرت فرط مسرت سے نہال اس سے آکر ملیں۔ پھر ڈائننگ چیئر پیش کی۔ زمر نے ایک لمحے کو گول میز کو دیکھا' جہاں کھانا چنا تھا۔ گن کر پلیٹیں رکھی تھیں۔ ایک فیملی کھانا کھانے ہی والی تھی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

سعدی نے اصرار کیا "تھوڑا سا لے لیں" مگر وہ وہاں نہیں بیٹھی۔

"میں کھانا کھا چکی ہوں۔" شائستگی' تکلف' تذبذب' حنین کی آنکھوں میں ناراضی گہری ہوئی۔ بہرحال اس نے اٹھ کر ڈرائنگ روم کم لاؤنج کا دروازہ کھولا۔

"کیسی ہو' حنین؟"

حنین جیسے اس سوال پہ ڈسٹرب ہوئی تھی مگر پھر سپاٹ چہرے کے ساتھ "ٹھیک" کہہ کر اندر صوفے کی طرف ہاتھ کیا۔ "بیٹھیں۔"

زمر اسی تکلف سے صوفے کے کنارے ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھ گئی تو اسامہ آکر ملا۔ وہ جیسے اب ذرا کھل کر مسکرائی' اس کا گال چوما' پھر پیشانی سے گھنگھریالے بال نرمی سے ہٹا کر بولی' کیسے ہو اسامہ؟"

چوکھٹ میں کھڑے سعدی کی مسکراتی آنکھوں میں تکلیف سی ابھری۔ ایک پرانا منظر ان میں جھلملایا۔

اسکول یونیفارم میں گھنگھریالے بالوں والا لڑکا بنچ کے پاس کھڑا تھا' اور گھٹنوں کے بل اس کے سامنے یونیفارم میں ایک لڑکی بیٹھی تھی' اور اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"کس نے مارا ہے؟ مجھے بتاؤ' میں ابھی اس کو دیکھتی ہوں۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ ہمارے سعدی کو مارے؟ ادھر دیکھو' روؤ مت' میں ہوں نا تمہارے ساتھ' تمہاری سپورٹ اور پروٹیکشن کے لیے۔" وہ فکرمندی اور غصے سے کہہ رہی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ؟" اسامہ کی شرماتی آواز پہ وہ چونکا پھر سامنے آکر بیٹھ گیا اور پھولوں کو میز پہ رکھ کر بولا۔

"آپ کو یاد تھا' مجھے سوسن پسند ہیں۔"

زمر نے سر کو خم دیا' بولی کچھ نہیں۔ ندرت کھانے پہ اصرار کرنے لگیں' پھر چائے پہ' وہ بس ایک کپ کے لیے راضی ہوئی۔ حنین سعدی کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی' شکوہ آمیز نظروں سے پھپھو کو دیکھتی' مگر خاموش۔

"مجھے یہ کارڈ دینا تھا۔ ہاشم نے دیا ہے۔ تمہارے لیے۔" کہتے ہوئے اس نے کارڈ سعدی کی طرف بڑھایا۔ سعدی تو چونکا ہی حنین زیادہ چونکی۔ اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

"ہاشم کی بیٹی کی سالگرہ ہے" اس نے بہت اصرار کیا تھا تو میں نے تمہاری طرف سے ہامی بھرلی۔ مجھے امید تھی کہ تم لوگ آؤ گے۔"

حنین سعدی کے کندھے پہ سے جھک کر کارڈ دیکھنے لگی۔ سعدی کے تاثرات وہ نہیں رہے تھے۔ اس نے بالکل خاموشی سے سیاہ پہ سنہری عبارتیں پڑھیں' پھر کارڈ حنین کی طرف بڑھا دیا۔

"ہاشم بھائی مجھے اپنی پارٹی میں کیوں دیکھنا چاہیں گے پھپھو؟"

"تم اس کے رشتے دار ہو۔"

سعدی پھیکا سا مسکرایا۔ "ہاشم بھائی کے ذہن میں ہر کام کی کوئی خاص وجہ ضرور ہوتی ہے۔ بہرحال' آپ ان سے معذرت کرلیجئے گا۔ ہم نہیں آسکیں گے۔"

کارڈ پڑھتی حنین نے بے اختیار سعدی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ ایک دم بجھا تھا۔

"گھر کی بات ہے سعدی! پہلے بھی تو جاتے رہے ہو ان کے گھر تو۔۔۔"

"گھر میں ہے فنکشن؟" سعدی نے چوکنا سا ہو کر بات کاٹی اور تیزی سے کارڈ لے کر جیسے تصدیق کی۔ آنکھوں میں کچھ چمکا تھا۔ پھر وہ سنبھل گیا۔

"او کے۔۔۔ ہم۔۔۔ آئیں گے۔" وہ نارمل انداز میں مسکرایا۔

حنین ساری ناراضی بھول کر دوبارہ کارڈ دیکھنے لگی۔ اسامہ بھی آکر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"بلیک اور گولڈ تھیم ہے۔ مطلب' ہم صرف سیاہ یا سنہری لباس پہن سکتے ہیں۔" وہ اسامہ کو بتانے لگی۔ پھر ایک دم اس نے سعدی کے ہاتھ کو دیکھا جس میں اس نے کی چین پکڑی ہوئی تھی۔ زمر بھی وہی دیکھنے لگی۔ اور سعدی نے بھی گردن جھکا کر اسے ہی دیکھا۔

دو تین چابیوں کے ساتھ رنگ میں ایک تین انچ کا سیاہ' مصنوعی ڈائمنڈ سا پرو یا تھا۔ وہ دو انچ موٹا تھا اور اوپر سے گول' نیچے سے تکون تھا۔ کسی ہیرے کی طرح وہ روشنی منعکس کرتا تھا۔ اس پہ سنہری حروف میں لکھا تھا۔

Ants Everafter

(ہمیشہ کے لیے چیونٹیاں!)

زمر کے لبوں پہ لو اس مسکراہٹ ابھری۔

"تم ابھی تک چیونٹیوں پہ یقین رکھتے ہو؟"

"میں ایسی چیزوں کے لیے جیتا ہوں۔ جن پہ یقین

رکھتا ہوں۔" اسی اداس مسکراہٹ کے ساتھ کہتے سعدی نے سیاہ ہیرے کو دیکھا۔

چائے آئی اور ساتھ کباب' کیک اور دو ایک چیزیں مگر ندرت کے اصرار کے باوجود زمر نے صرف پیالی اٹھائی اور گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

"یہ کاردار کرتے کیا ہیں؟ ان کا بزنس کس چیز کا ہے؟" کارڈ میں محو حنین نے پوچھا۔ اس کی نظریں نیچے لکھے ہاشم کے نام اور ساتھ درج موبائل نمبر پہ جمی تھیں۔

ایک دم سے بجلی چلی گئی' اور ہر روشنی کے بجھ جانے کی خاموش آواز سنائی دی' پھر یو پی ایس پہ بتی جلی اور پنکھا کڑ کڑ کرتا گھومنے لگا۔ سعدی ہلکا سا مسکرایا اور سر جھٹکا۔

"وہ ایک آئل کارٹیل کے سربراہ ہیں۔"

"کارٹیل کیا ہوتا ہے؟" حنین نے بے اختیار پوچھا' پھر جیسے اپنی کم علمی پہ پھپھو کے سامنے شرمندہ ہوئی۔

"ایسے سمجھو جیسے مارکیٹ میں برگر کی تین دکانیں ہوں۔" زمر نے نرمی سے کہنا شروع کیا "اور دو دکانیں پچاس کا برگر بیچیں اور ایک چالیس کا' تو زیادہ کس کے بکیں گے؟"

"چالیس والے کے۔" حنین کے لبوں سے پھسلا۔ وہ ساری ناراضی بھول گئی تھی۔

"بالکل۔ مگر کم قیمت کے باعث چالیس والا بھی منافع زیادہ نہیں کما سکے گا' اور باقی دونوں ویسے ہی نقصان میں رہیں گے سو یہ تینوں یوں کریں گے کہ مل کر ایک گروپ یعنی ایک Cartel کارٹیل بنالیں گے' اور یہ طے کرلیں گے کہ تینوں دکانیں ایک ہی قیمت پہ برگر بیچیں گی یوں تینوں کو کاروبار ملے گا۔"

"اور تینوں جب چاہے قیمت اکٹھی بڑھادیں' لوگوں کے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں ہوگا تو وہ مہنگا خریدنے پہ بھی مجبور ہوں گے۔" سعدی نے مسکراتے ہوئے اضافہ کیا۔ "اور ہاشم بھائی یہی کرتے ہیں۔ وہ ملک کی تمام آئل کمپنیز کے کارٹیل کو لیڈ کرتے ہیں' اور یہ تیل سے بجلی بنا کر حکومت کو بیچتے ہیں' اور ان کا جب دل کرتا ہے' یہ بجلی کی قیمت بڑھادیتے ہیں' اور پھر یہ ہوتا ہے!"

اس نے ابرو سے پنکھے کی طرف اشارہ کیا جو یو پی ایس پہ چل رہا تھا۔ زمر نے گہری سانس اندر کو کھینچی۔

"میرا نہیں خیال کہ انرجی کرائسز کی وجہ آئل کمپنیز ہیں۔"

"یہ تھرکول پراجیکٹ کے سائنس دانوں اور آئل کمپنیز کے مغرور اور امیر ایگزیکٹیوز کی جنگ نہیں ہے' پھپھو! یہ کوئلے اور تیل کی جنگ ہے۔ مجھے یقین ہے' ہاشم پارٹی میں سنہری رنگ پہنے گا۔ ایک بچی کی سالگرہ کو بلیک اور گولڈ کا تھیم دے کر وہ لوگ صرف دنیا کو اپنے مضبوط اعصاب دکھانا چاہتے ہیں۔ سیاہ اور سنہرا یعنی کوئلہ اور تیل۔"

وہ نرمی سے ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔

"اینی ویز' اب میں چلتی ہوں۔" اس نے جیسے کسی بات میں دلچسپی نہیں لی' بس اٹھنے کی تیاری کرنے لگی۔ حنین نے کارڈ چھوڑ دیا' چہرہ پھر سے بجھ گیا۔ سعدی چپ ہوگیا۔ اسے لگا جیسے اس کی صاف گوئی نے اسے ناراض کردیا تھا۔

"کچھ دیر تو بیٹھو!" ندرت اصرار کرنے لگیں مگر اس کا کہنا تھا کہ اگلے ہفتے تفصیل سے پارٹی پہ ساتھ بیٹھیں گے۔ سعدی اسے دروازے تک چھوڑنے گیا۔ واپس آیا تو حنین اکیلی لاؤنج میں بیٹھی تھی۔

"چار سال بعد آئیں اور چالیس منٹ بھی نہیں بیٹھ سکیں!" وہ بڑبڑائی۔

"ایسے نہیں سوچتے حنین!" وہ جیسے ہرٹ ہوا تھا۔

"مگر میں تو ایسے ہی سوچتی ہوں بھائی! آپ کا دل بہت بڑا ہے' آپ بھول سکتے ہیں' مگر مجھے یاد ہے۔ پھپھو نے ہمیں تب چھوڑا جب ہمیں ان کی ضرورت تھی۔ ہمارے ماموں بے گناہ تھے مگر پھپھو نے ان کو گناہ گار مانا' اور اس لیے آپ بھی زیر عتاب آئے۔ مگر یہ لڑائی تو آپ کی' ماموں اور پھپھو کی تھی'

میں نے تو کچھ نہیں کیا تھا۔ میرا کیا قصور تھا؟ مجھے کیوں چھوڑا؟" بولتے بولتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سعدی کا دل بے حد دکھا۔

"انہوں نے بہت کچھ لوز کیا ہے اس سب میں۔ ان کی صحت، ان کی شادی۔ ان کی زندگی، سب ختم ہو گیا۔"

"تو کیا میں نے کچھ لوز نہیں کیا؟ میں نے پھپھو کو لوز کیا ہے، بھائی۔ ان چار سالوں میں کتنے ایسے دن آئے جب مجھے ان کی ضرورت تھی۔ پھپھو نہ ماں ہوتی ہے نہ بہن، وہ ان دونوں سے ہٹ کر ہوتی ہے، میری تو کوئی بہن بھی نہیں تھی، میرا بھی دل چاہتا تھا۔ میں ان سے بہت کچھ شیئر کروں، وہ میری بات سنیں، مگر وہ اب ہماری پرواہ نہیں کرتیں۔ انہوں نے ہمیں تب چھوڑا جب ہمیں ان کی ضرورت تھی، یو نو واٹ بھائی، اب ہم بڑے ہو چکے ہیں، اب ہمیں ان کی ضرورت نہیں رہی۔ میں وہ حنین نہیں ہوں جو ان کے جانے کے بعد دیر تک کھڑکی سے ان کی راہ تکتی تھی کہ شاید وہ کچھ بھول گئی ہوں۔ تو واپس آئیں، میں بھی اب ان کی پرواہ نہیں کرتی۔"

اس نے رخ موڑ لیا۔ سعدی نے کچھ کہنا چاہا، پھر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ ابھی بیچ راہداری میں تھا کہ کسی احساس کے تحت واپس آیا اور دھیرے سے لاؤنج کے اندر جھانکا۔

حنین کھڑکی کا پردہ سرکائے باہر دیکھ رہی تھی، دور سڑک پہ جیسے کسی کو تلاش کر رہی تھی۔ کسی کے بھول کے واپس آنے کا انتظار کر رہی ہو۔

سعدی کی آنکھوں میں اداسی اور لبوں پہ مسکراہٹ در آئی، وہ خاموشی سے وہاں سے ہٹ گیا۔ راہداری میں واپس چلتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑے سیاہ اور سنہرے کارڈ کو دیکھا۔

ایک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے جھلملایا۔

ہوٹل کی لابی زرد روشنیوں میں چمک رہی تھی۔ چار، پانچ سوٹ میں ملبوس افراد خوشگوار انداز میں ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔ ان میں ایک ہاشم کاردار بھی تھا جو کسی سے مسکرا کر کچھ کہہ رہا تھا۔ ہاشم کے پیچھے اس کی سیکریٹری کھڑی تھی، جس نے ایک ہاتھ میں ہاشم کا لیپ ٹاپ اٹھا رکھا تھا اور وہ ہاتھ پہلو میں گرا ہوا تھا۔ وہ بھی سامنے، مسکراتے ہوئے میٹنگ کے لیے آئے افراد کو دیکھ رہی تھی۔

دور سے جینز شرٹ اور پی کیپ میں ملبوس سعدی چلتا ہوا آیا۔ اس کا سر جھکا تھا، وہ اسی طرح سیکریٹری کے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گیا۔ سیکریٹری وہیں متوجہ رہی۔ اس نے نہیں دیکھا کہ لڑکے کے گزرنے کے بعد لیپ ٹاپ کے سائیڈ کے ساکٹ میں ایک فلیش ڈرائیو لگ چکی تھی۔

سعدی ایک قریبی میز پہ جا بیٹھا، کندھے سے بیگ اتارا، اندر سے ٹیبلٹ نکالا اور اس پہ مختلف جگہیں انگلی سے پریس کرنے لگا۔ اسکرین پہ پیغام آ رہا تھا۔

"آپ کی ڈیوائس کو ایک ہارڈ ڈرائیو ملی ہے، کیا آپ سارا ڈیٹا کاپی کرنا چاہیں گے؟"

سعدی نے مسکراتے ہوئے "یس" دبایا۔ اگلے ہی لمحے اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ اسکرین پہ پیغام جل بجھ رہا تھا۔

"پاس ورڈ داخل کریں۔"

"اوہ نہیں یار۔" اس نے بے بسی سے مڑ کر دیکھا جہاں وہ لوگ ابھی تک کھڑے باتوں میں مصروف تھے۔ اسے کیوں خیال نہیں آیا کہ ہاشم کے لیپ ٹاپ پہ پاس ورڈ ہو سکتا ہے۔

وہ جلدی سے سب سمیٹ کر اٹھا اور سر جھکائے ان کے قریب سے گزرا اور سیکریٹری سے ٹکرا گیا اور خفیف سا سوری کہتا آگے بڑھ گیا۔ ہاشم نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر دور تک سوچتی نگاہوں سے اس کا تعاقب کیا۔

"چلی گئیں؟" فارس کی آواز پر سعدی چونکا۔ اس کے سامنے فارس کھڑا تھا۔

"ہوں!" اس نے کارڈ بڑھایا جیسے پھپھو کے آنے کا مقصد بیان کیا ہو۔ فارس نے سرسری سا دیکھا اور پھر گول میز تک آ گیا۔ حنین، اسامہ سب واپس آ گئے۔

ذرا سی بحثوں کے بعد زندگی جیسے پھر نارمل روٹین پہ آگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

غم اب نہ فرصت ہے نہ احساس ہے غم سے اپنے

آسمان پہ سیاہی پھیل رہی تھی۔ وہ اسٹڈی ٹیبل پہ فائلز پھیلائے بیٹھی تھی۔ ہلکی سی آہٹ نے اسے سر اٹھانے پہ مجبور کیا۔ ابا وہیل چیئر گھسیٹتے اندر آرہے تھے۔ وہ بے اختیار کھڑی ہوگئی۔

"آپ کے بلانے پہ نہ آتی جو آپ خود آگئے؟"

رسان سے شکوہ کرکے وہ وہیل چیئر پیچھے سے تھامے سامنے لائی گو پھر خود مقابل صوفے پہ پاؤں اوپر کرکے بیٹھ گئی۔ بڑے ابا منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"کیا اس نے کھانا نہیں پوچھا جو شام میں تم نے واپس آکر کھایا؟"

"میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں کھا کر آؤں گی۔ کھانا میٹر نہیں کرتا۔" گھنگھریالی لٹ انگلی پہ لپیٹتے اس نے جواب دیا۔

"کیا وہ خوش تھا؟"

"آپ کو دن میں دو دفعہ تو فون کرتا ہی ہے، پوچھ لیجیے گا۔"

پھر دونوں کے بیچ کھڑکی کے باہر پھیلی رات جیسی خاموشی چھا گئی۔ ابا فکرمندی و تاسف سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"پھر بات آپ نے شروع کرنی ہے یا میں نے؟ اور اگر آپ نے تو کتنے فقروں کی تمہید باندھیں گے؟" اس نے اطمینان سے پوچھا۔

"زمر۔ شادی کرلو۔" وہ آزردگی سے بولے۔

"آج آپ نے تمہید ہی نہیں باندھی۔" اس نے کشن اٹھا کر گود میں رکھا۔

"کب تک اس ٹوٹے رشتے کا سوگ مناؤ گی، میری بچی؟ میری موت آسان کردو اب بس کردو۔"

"آپ جانتے ہیں میں جذباتی بلیک میلنگ میں نہیں آیا کرتی۔ جب مجھے کرنا ہوگی، میں بتادوں گی۔ ویسے بھی اب میں بوڑھی ہورہی ہوں۔ کون کرے گا مجھ سے شادی؟"

"دو چار سال میں واقعی بوڑھی لگنے لگو گی۔ میں اس تکلیف کے ساتھ نہیں مرنا چاہتا۔"

"او کے ابا، صاف بات کرتے ہیں۔" اس نے کشن پرے رکھا، پیر نیچے کیے، ٹانگ پہ ٹانگ جمائی، بال کانوں کے پیچھے اڑسے اور گہری سانس لی۔ وہ واپس ڈسٹرکٹ پراسیکیوٹر کے روپ میں چلی گئی تھی۔

"آپ میری شادی کسی بھی ایکس وائی زیڈ سے کرادیں، میں کرلوں گی، پھر چند دن میں مزید بدل ہوجاؤں گی، زیادہ بے زار اور تلخ۔ وہ مجھ سے توقعات باندھے گا جو میں پوری نہیں کروں گی، میں ایسی ہی رہوں گی، وہ شروع میں برداشت کرے گا، کہے گا ماضی بھلادو، میں کہوں گی شادی جب کی تب اس فیز سے نہیں نکلی تھی، ابھی وقت لگے گا۔ وہ صبر کرلے گا مگر پھر جلد ہی صبر کھودے گا، غصہ کرے گا، ہاتھ اٹھائے گا، نفرت کرے گا، تین ماہ میں گھر سے نکال دے گا، اور میں یہیں آکر بیٹھی ہوں گی۔ اب بتائیں، آپ کے لیے کیا زیادہ تکلیف دہ ہوگا؟"

ابا نے دکھ سے اسے دیکھا۔ "کیا تم اپنی شادی کو کامیاب بنانے کی کوئی کوشش نہیں کرو گی؟"

"اس فیز سے نکلی ہی نہیں تو کیسے کروں گی؟"

"کب نکلو گی اس فیز سے؟"

"آپ مجھے جانتے ہیں، جب میرے اوپر کچھ طاری ہوجائے تو میرے لیے اس کو جھٹکنا ناممکن ہوتا ہے۔ میں اسی کو اپنی زندگی بنالیتی ہوں۔ اور جب آخری دفعہ ہم نے یہی بحث کی تھی تو دو دن تک ایک دوسرے سے بات نہیں کی تھی۔ اس دفعہ کتنے دن کا ارادہ ہے؟"

ابا نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔ "مگر تم کوشش تو کرو گی نا اس فیز سے نکلنے کی؟"

"میں چار سال سے کوشش کررہی ہوں، میں بہت زمانے گزری ہوں، میرے گردے ضائع ہوگئے، تیار

شادی کینسل ہوگئی' وہ حمار مجھے چھوڑ کر چلا گیا یماری کے عالم میں' وہ وقت بہت برا تھا پاپا! میں آگے بڑھ نہیں سکتی جب تک اس وقت کو بھلا نہ دوں۔ مجھے کچھ ٹائم دیں۔"

وہ سر ہلاتے ہوئے واپس پلٹ گئے۔ زیرِ دکھ سے ان کو جاتے دیکھتی رہی مگر وہ خود بھی بے بس تھی۔

٭٭٭

رات کا سیاہ پردہ سارے گناہ' سارے عیب ڈھانپ چکا تھا۔ ایسے میں کاردارز کے اونچے گھر کی ساری بتیاں روشن تھیں۔ جواہرات باریک ہیل سے تیز تیز چلتی ڈائننگ ہال میں آئی تو قطار میں کھڑے ملازم جیسے اسی کے منتظر تھے۔

لینو نا نے آنکھ سے ایک سر جھکائے کھڑی فلپائنی ملازمہ کی طرف اشارہ کیا۔ جواہرات مسکراتی ہوئی اس کے قریب گئی تو اس فلپائنی میری امبجیو نے سر اٹھایا' پھر ندامت سے جھکا لیا۔

"کیا تم اس جوہری سے میرا نیکلس لے آئی ہو جس کو تم نے وہ بیچا تھا؟" سرد سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے پوچھا۔

میری نے سرخ متورم آنکھیں اٹھائیں۔ "یس میم!" اور ڈبہ آگے کیا' پھر کھولا۔

جواہرات نے دو انگلیوں پہ وہ نیکلس اٹھا کر دیکھا۔ ہیروں کا نازک نیکلس ویسا ہی تھا۔

"اور تمہاری چوری کا علم ہونے پر میں نے تم سے کیا کہا تھا؟" وہ انگلیوں میں مسل کر نیکلس کو دیکھ رہی تھی۔

"یہی میم۔ کہ اگر میں نیکلس واپس لادوں تو آپ میری ایجنسی کو نہیں بتائیں گی اور میں باعزت طریقے سے اپنے ملک واپس جاسکوں گی۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

جواہرات نے شیرنی جیسی تیکھی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ "تو پھر خوش ہو جاؤ۔ کیونکہ میں تمہاری ایجنسی کو پہلے ہی سب کچھ بتا چکی ہوں۔ کل تمہیں یہاں سے ڈی پورٹ کر دیا جائے گا اور تم دوبارہ زندگی بھر یہ نوکری نہیں کر سکو گی۔ کیونکہ میرے نزدیک اس کی اہمیت یہ تھی۔"

کہتے ہوئے جواہرات نے نیکلس اچھال دیا۔ وہ اڑ کر ایک مصنوعی پودے کے گملے میں جاگرا۔

"وفاداری سے بڑھ کر کسی چیز کی اہمیت نہیں ہوتی۔ میری! اب تم جاسکتی ہو۔"

اس نے تمکنت سے لینو نا کو اشارہ کیا۔ جو شاکڈ اور صدمے سے چور میری کو وہاں سے لے جانے لگی۔

کسی ملازم میں ہمت نہیں تھی کہ گملے میں گرے نیکلس کو دیکھ بھی لیتا جواہرات اسی طرح چلتی ہوئی ہال کراس کر کے لاؤنج میں آئی اور چہرے پہ معصوم معذرت خواہانہ مسکراہٹ سجائے فارس کو مخاطب کیا جو ایک پینٹنگ کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ ابھی ابھی آیا تھا۔

"تمہیں دیکھ کر بہت اچھا لگا فارس۔۔۔ تم ٹھیک تو ہو؟" وہ اس کی طرف پلٹا تو جواہرات نے اس کے کندھوں کو تھام کر کسی بچے کی طرح اسے اپنے سامنے کیا۔

"اوہ۔۔۔ تم کتنے کمزور ہو گئے ہو۔ اپنی رنگت تو دیکھو۔"

وہ جو بے نیازی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ذرا سا سر جھٹکا۔ "ٹھیک ہوں۔ میرے پورشن کی چابی۔۔۔"

"آف کورس۔ وہ میرے پاس ہے۔ میں اس کی صفائی کرواتی رہی ہوں' مگر تم دیکھ رہے ہو' پارٹی قریب ہے اور سارا اسٹاف مصروف ہے۔ مجھے جیسے ہی تمہاری آمد کا پتا چلا' میں نے گیسٹ روم سیٹ کروادیا۔"

"آنٹی۔۔۔ میں اپنے گھر میں جانا چاہتا ہوں۔" اس نے جیسے بے زاری کو ظاہر نہ کرتے ہوئے کہا۔

جواہرات مسکرا کر اس کو بازو سے تھامے آگے بڑھنے لگی۔ وہ خاموشی سے ساتھ چلتا آیا۔

"کیا تم مجھے صرف ایک ہفتے کے لیے اپنی مہمان

نوازی کا حق بھی نہیں دو گے؟ تم جانتے ہو، تمہاری رہائی کے لیے میں نے اور ہاشم نے بہت کوشش کی، مگر میری جان! ہم کیا کرتے۔ یہ عدالتی نظام بہت خراب ہے۔ آئی ہوپ تم ہم سے خفا نہیں ہو گے۔"

"نہیں۔۔۔ ایسی بات نہیں ہے۔" وہ راہ داری میں آکر رکا، جواہرات نے مسکراتے ہوئے فینو نا کو اشارہ کیا۔ اس نے فوراً" دروازہ کھولا۔ اندر سجا، سجایا کمرہ تیار تھا۔

"پارٹی کے بعد تمہارا پورشن تیار کروا دوں گی۔ اب تم آرام کرو، ہوں۔" مسکرا کر کہتی وہ وہیں کھڑی رہی۔ فارس خاموشی سے اندر چلا گیا۔ وہ شاید خود بھی اپنے گھر سے بچنا چاہتا تھا۔ دروازہ بند کر دیا۔ جواہرات کی مسکراہٹ سمٹی، آنکھوں میں اضطراب ابھرا اور کڑھن، وہ پلٹی تو بیرونی دروازے سے ہاشم آرہا تھا۔ پیچھے ایک سوٹ میں ملبوس ملازم بریف کیس اٹھائے ہوئے تھا۔

جواہرات تازگی سے مسکرا کر تیزی سے اس تک آئی۔ ہاشم نے دروازہ بند ہونے سے قبل فارس کو دیکھ لیا تھا۔ تب ہی تاثرات برہم ہوئے۔ ماں کے قریب آکر دبی دبی سی آواز میں غرایا۔

"یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"مجھے اسے پارٹی میں دکھنا ہے اور تب تک اسے یہاں روک کر رکھنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہے۔" پھر مسکرا کر ہاشم کا شانہ تھپکا "اور مجھے اس کے یہاں ہونے سے کوئی ڈر نہیں۔ کیونکہ میں جانتی ہوں ہاشم سنبھال لے گا۔" مگر ہاشم کو تسلی نہیں ہوئی وہ مسکرا بھی نہ سکا۔

"بابا۔" سیڑھیاں بھاگ کر اترتی فراک میں ملبوس چھوٹی سی بچی ادھر آرہی تھی۔ کوٹ کے بٹن کھولتا ہاشم بے اختیار مڑا۔ آنکھوں میں بے پناہ پیار امڈ آیا۔ وہ جھکا اور دوڑتی ہوئی بچی کو اٹھالیا۔

"بابا کی جان۔۔۔ کب آئی ہو؟" باری باری اس کے گال چومتا وہ پوچھ رہا تھا۔ جواہرات نے مسکرا کر دونوں کو دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔

ع تلخئی کام و دہن کب سے عذاب جان ہے



رات ذرا گہری ہوئی تو اس چھوٹی سی مارکیٹ کی دکانیں بند ہونے لگیں۔ اب فقط چند بتیاں روشن تھیں۔ دور ایک درخت کی اوٹ میں چھوٹی سی گاڑی کھڑی تھی۔ ڈیش بورڈ پہ ایک خاکی پھولا ہوا لفافہ رکھا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے سعدی نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی اور پھر پیچھے دیکھا۔ ارد گرد کوئی نہیں تھا۔

تب ہی اس کا موبائل بجا۔ اس نے اسے سامنے کیا تو نیلی روشنی چہرے پہ پڑنے لگی۔ "بلاکڈ نمبر کالنگ" لکھا آرہا تھا۔

سعدی نے اٹھا کر احتیاط سے ہیلو کہا۔ پھر دوسری جانب سے آواز سن کر جیسے اعصاب ڈھیلے پڑے۔

"جی باس۔۔۔ کیسی رہی کانفرنس؟"

"تم نے ایک بہت اچھی چیز مس کی ہے۔ اس سے زیادہ اہم کچھ نہیں ہونا چاہیے تھا تمہارے لیے۔" فون میں سے ہلکی سی نسوانی آواز سنائی دے رہی تھی۔ سعدی کا چہرہ تاریکی میں نیم واضح تھا۔ اس نے زخمی سا مسکراتے پھر پیچھے دیکھا۔

"کچھ بہت اہم تھا یہاں۔ خیر۔۔۔ کانفرنس کا سنائیں۔"

"تم جانتے ہو، آدھا وقت تو ان کو یہ واضح کرنے میں گزر جاتا ہے کہ ٹھیک ہے۔ ہمارا کوئلہ اینتھراسائٹ نہیں ہے۔ مگر ہم کہہ بھی نہیں رہے کہ وہ اینتھراسائٹ ہے۔ میں مان رہی ہوں کہ وہ لگنائیٹ ہے اور ہمارے علاقے میں صدیوں سے دبے fossils اس سے بہتر کوئلے میں تبدیل نہیں ہو سکتے ویسے بھی۔۔۔ اور اگر۔۔۔" وہ روانی سے بولتے ہوئے رکی۔

"پتا ہے سعدی! آج مجھ سے کسی نے وارث کے کیس کے بارے میں پوچھا۔ اس کا کیا بنا؟ فارس کو سزا ہو گئی؟ میں نے تو اتنے عرصے سے تم سے پوچھا ہی نہیں۔"

"آپ اتنی بہادر نہیں ہیں کہ اس کیس کو فالو کریں۔ سو مجھ پہ چھوڑ دیں۔"

"مگر..."

"جو بھی بتانا ہو گا میں خود ہی بتا دوں گا۔ خالہ! میں نے آپ سے ایک وعدہ کیا تھا کہ ماموں کو مارنے کے بعد ان کے لیپ ٹاپ اور فائلز کو جس نے بھی چرایا تھا میں وہ آپ کو واپس لا دوں گا۔ بس میں اس شخص کے لیپ ٹاپ تک پہنچ جاؤں ایک دفعہ' پھر میں آپ کو بتاؤں گا کہ ماموں کو کیوں قتل کیا گیا۔"

"کون؟ کس کی بات کر رہے ہو؟"

"ایک الزام نے فارس غازی کی زندگی کے چار سال لے لیے۔ میں بنا ثبوت کسی پہ الزام نہیں لگانا چاہتا۔ ثبوت کے بعد بتاؤں گا۔"

"اتنے سال ہو گئے سعدی! کیوں پڑے ہو اس کیس کے پیچھے؟ ختم کرو۔ اللہ کے حوالے کر کے چھوڑ دو۔"

"اونہوں... کیسے چھوڑ دوں؟ میرے خاندان کے دو لوگ مارے گئے' میری پھپھو کی زندگی برباد ہو گئی۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو قتل کو معاف کر دیتے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے 'قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے' اور میرے خاندان کے باقی لوگوں کی زندگی قصاص میں ہی ہے۔ میں تو برابر کا بدلہ لوں گا۔ جس نے یہ کیا ہے۔ وہ جان سے جائے گا۔ بس...! اچھا مجھے جانا ہے' بائے۔"

ایک دم سے اس نے فون بند کیا۔ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر ایک فربہی مائل' ادھیڑ عمر شخص اندر بیٹھ رہا تھا۔ سعدی خاموشی اور سنجیدگی سے سامنے دیکھنے لگا۔ اس شخص نے تلخی سے سعدی کو دیکھا۔

"میں نے اسے بری کر دیا ہے' اب وہ دو' جو تم نے دینا تھا۔"

سعدی نے خاموشی سے ڈیش بورڈ سے خاکی لفافہ اٹھا کر انہیں تھمایا۔ جسٹس سکندر نے اندر جھانکا' چہرے پہ مزید کڑواہٹ پھیلی' کان کی لوئیں سرخ پڑیں۔ "میرے بارے میں اگر یہ گند باہر نکلا تو..." غم و غصے سے آواز کانپنے لگی۔ سعدی نے گردن موڑ کر ان کو دیکھا۔

"اگر آپ مجھے جانتے ہوتے تو اندازہ لگا لیتے کہ میں ایک شخص کی زندگی بچانے کے لیے آپ کے خاندان کے پانچ افراد کی زندگی برباد نہیں کروں گا۔ میں اس حد تک کبھی نہ جاتا اگر آپ میری بات سن لیتے۔ میں آیا تھا آپ کے پاس جسٹس صاحب۔ میں نے آپ کی منت کی تھی کہ فارس غازی بے قصور ہے' مگر آپ نے میری نہیں سنی تھی' ہاشم کا پیسہ ہر جگہ بول رہا تھا۔ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔ سوری...!" کندھے اچکا کر بے نیازی سے سوری کہا۔

"بکواس مت کرو' مجھے بتاؤ' تمہارے پاس اس کی کوئی کاپی ہے یا نہیں؟"

"ہو سکتا ہے میرے پاس کاپی ہو' کیونکہ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ فارس غازی کو دوبارہ اس کیس میں پھنسایا جائے۔ آپ اپنے اینڈ پہ خیال رکھیے گا۔ میں اپنے اینڈ پہ رکھوں گا۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔"

وہ تو جیسے رکنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ سر پہ ٹوپی اور گردن کا مفلر درست کیا۔ تاکہ شناخت نہ ہو پائے اور باہر نکل گئے۔ سعدی نے ہلکے سے کندھے اچکائے اور کار اسٹارٹ کر دی۔



نشتر چھپے ہوئے تھے رگ جاں کے آس پاس

صبح جب سورج کی روشنی بادلوں کے کناروں کو سرخ اور جامنی رنگ میں دہکا رہی تھی تو شہر کے کاروباری علاقے میں اس اونچی عمارت میں وہ داخل ہو رہا تھا۔ اس نے سیاہ پینٹ پہ بٹنوں والی شرٹ پہن رکھی تھی۔ بال بہت چھوٹے کٹوا لیے تھے۔ فوجیوں کی طرح گویا استرا پھیرنے کے دو چار دن بعد کے انچ بھر بال ہوں۔ وہ ہفتے قبل رہا ہونے والے فارس سے وہ بہتر لگ رہا تھا۔

دھات کا ڈیٹیکٹر داخلے کے سامنے کھڑا تھا۔ لوگ اس میں سے گزر کر اندر جا رہے تھے' وہ سائیڈ سے نکل کر چلا گیا تو گارڈز چونکے۔ کسی نے اسے آواز دی۔ فارس نے بغیر ریسپشن پہ لمحے بھر کو رکے

"ہاشم کاردار کا آفس؟" ابرو اٹھا کر اکھڑے انداز میں پوچھا۔

"پانچویں فلور پہ۔۔۔ مگر آپ۔۔۔" ریسپشنسٹ کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔ وہ آگے بڑھ چکا تھا۔ گارڈز بے اختیار پیچھے آئے۔ لفٹ میں داخل ہو کر اس نے ان کے آنے سے پہلے بٹن دبا کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ گارڈ گھبرا کر وائرلیس پہ اطلاع دینے لگا۔

پانچویں فلور پہ جب لفٹ کا دروازہ کھلا تو وائرلیس پکڑے ایک گارڈ اسے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ فارس نظر انداز کر کے راہ داری میں آگے بڑھ گیا۔ اسے غالباً" آفس یاد تھا۔ فلور ذہن سے نکل گیا تھا۔

"ہاشم اندر ہے؟" سیکریٹری سے بس سرسری سا پوچھا۔ وہ "جی" کہتی حیران سی اٹھی۔ گارڈ دوڑتا ہوا آرہا تھا۔ اسے روکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ "سر۔۔۔ مسٹر کاردار مصروف ہیں' آپ اندر نہیں جاسکتے۔" وہ دروازے کی طرف آیا تو گارڈ سامنے آگیا۔

"سر۔۔۔ آپ یوں اندر نہیں جاسکتے' آپ نے نیچے سیکورٹی کو۔۔۔"

"میرے منہ نہ لگو!" تیوری چڑھائے فارس نے ہاتھ سے اس کے کندھے کو پیچھے دھکیلا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ گارڈ حواس باختہ سا پیچھے بھاگا۔

اندر ہاشم اپنی سیٹ پہ ٹیک لگا کر بیٹھا' سامنے موجود دو افراد سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس اچانک افتاد پہ سر اٹھا کر دیکھا۔ فارس سے گارڈ تک نظروں نے سفر کیا۔

"ان کو بھیجو' مجھے بات کرنی ہے۔"

فارس نے تیسری کرسی کھینچی اور ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بیٹھا۔ ہاشم کے لب بھینچ گئے۔ آنکھوں میں ابھرتی ناگواری کو اس نے ضبط کر لیا۔

"سر! میں ان کو منع کر رہا تھا مگر یہ۔۔۔"

"ہاں۔ ٹھیک ہے' میں نے ہی بلایا ہے!" تازہ دم ہو کر مسکراتے ہاشم نے ان کو جانے کا اشارہ کیا۔

وہ نکلے تو ہاشم پیچھے ہو کر بیٹھا اور خاموشی سے فارس کو دیکھا۔

"کیوں بلایا ہے؟" اس نے ابرو اٹھا کر اکھڑے اکھڑے انداز سے پوچھا۔

ہاشم اٹھا اور دیوار تک گیا۔ وسط دیوار میں ایک پینٹنگ لگی تھی۔ ہاشم نے پینٹنگ کو سلائیڈنگ ڈور کی طرح دائیں طرف سلائیڈ کیا۔ اندر دیوار میں نصب سیف تھا۔ اس نے کچھ نمبرز ڈائل کر کے سیف کھولا۔ اس کی پشت اب فارس کے سامنے تھی اور وہ پاس ورڈ یا اندر سے سیف نہیں دیکھ سکتا تھا۔

ہاشم سیف بند کر کے پلٹا اور میز پہ کچھ ڈاکومنٹس اور ایک پلاسٹک بیگ رکھا۔ شفاف بیگ کے اندر زیورات دکھائی دے رہے تھے۔

"تمہاری امانت۔۔۔ تمہارے گرفتار ہونے کے بعد پولیس باربار گھر آتی رہی تھی۔ اس لیے ممی نے پہلے ہی تمہاری تمام قیمتی اشیا وہاں سے نکال لی تھیں۔ چیک کر لو۔" واپس بیٹھتے ہوئے اس نے دوستانہ مگر محتاط انداز میں کہا۔ فارس نے بس ایک نظر اس سب کو دیکھا اور پھر ابرو تان کر ہاشم کو۔

"ٹھیک۔۔۔ اور کچھ؟"

"تمہاری رہائی کے لیے میں نے بہت کوشش کی تھی۔ جسٹس سکندر کو بہت فیورز دیے ہیں اور اب جبکہ میں اس سے مایوس ہو چکا تھا' اس نے تمہیں رہا کر ہی دیا۔ بہرحال۔۔۔ تم اب باہر ہو' نئی زندگی شروع کرنے۔۔۔"

"تمہید کاٹو اور مطلب کی بات پہ آؤ۔" فارس نے اس کی بات بے زاری سے کاٹی۔ ہاشم نے گہری سانس باہر کو خارج کی اور ذرا سے شانے اچکائے۔

"تمہیں جاب چاہیے ہو گی اور میرے پاس تمہارے لیے ایک اچھی پوسٹ ہے۔"

"نہیں چاہیے۔۔۔ اور کچھ؟" وہ کھڑا ہوا اور اپنی چیزیں اکٹھی کیں۔ ہاشم نے سر اٹھا کر تاسف سے اسے دیکھا۔

"ہم کزنز ہیں یار۔۔۔ تمہاری پرابلم میری بھی پرابلم ہے۔"

"مگر میری بیوی تمہاری بیوی نہیں تھی۔" فارس

کی آواز بلند ہوئی' آنکھوں میں غصہ اترا' کان کی لو میں سرخ پڑ گئیں۔ "تمہیں لگتا ہے میں بھول گیا ہوں کس طرح تم اس کو میرے خلاف اکسایا کرتے تھے۔"

"او خدا۔" ہاشم نے جھکتے ہوئے۔ انداز میں سر جھٹکا۔ "تم اپنی اس غلط فہمی کو دور کیوں نہیں کر لیتے ایک دفعہ۔ وہ میری بہن کی طرح تھی' اس بات پہ تم مجھ سے کوئی مقدس صحیفہ اٹھوانا چاہتے ہو تو اٹھوالو' میں ایک۔ اور ایمان دار آدمی ہوں۔"

فارس شک و شبہ سے آنکھیں سکیڑے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تمہارے اس رویے کے باوجود میں نے تم پہ شک نہیں کیا۔ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا کہ تم نے وہ قتل کیے ہوں گے۔ مجھے تمہاری بے گناہی پہ یقین تھا۔ مگر تمہیں مجھ پہ یقین نہیں ہے۔" وہ ہرٹ نظر آ رہا تھا۔

فارس کے تاثرات دھیمے پڑے۔ مگر وہ اسی طرح اسے دیکھتا رہا۔ ہاشم اب اٹھا۔ دونوں کے درمیان میز حائل تھی۔

"اور مجھے تمہاری فکر ہے۔ کیا کرنا چاہو گے اب؟"

"جس کے خاندان کے دو فرد مار دیے گئے ہوں' اسے کیا کرنا چاہیے؟ سوائے ہر ذمہ دار شخص کا گریبان پکڑنے کے؟"

کمرے میں جیسے کاربن مونو آکسائیڈ بھر گئی تھی۔ ہاشم کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے بے اختیار ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھ سے اچھا وکیل تمہیں نہیں ملے گا۔ جو اس کیس کو دوبارہ سے زندہ کر کے اصل قاتلوں کو سامنے لائے۔ اس لیے جاب نہیں کرنی یہاں' مت کرو' مگر جب اور جیسے تمہیں کچھ معلوم ہو' تم سب سے پہلے مجھے آ کر بتاؤ گے۔ گڈ لک!"

ہاشم نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ فارس اکھڑا اکھڑا سا دیکھتا رہا' پھر متذبذب سا ہاتھ ملا لیا۔ ہاشم مسکرا دیا۔

فارس باہر نکلا تو جواہرات چوکھٹ پہ دکھائی دی۔ اس کے چہرے پر اضطراب تھا۔ تیزی سے ہاشم تک آتے اس نے پوچھا۔

"یہ کیوں آیا تھا؟" ساتھ ہی دروازہ بند کیا۔ "جب بھی اس کو آزاد دیکھتی ہوں تو مجھے تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑی نظر آتی ہے۔" ہاشم نے اس کی فکر و پریشانی کو صاف نظر انداز کیا۔

"میں نے بلایا تھا۔ جاب آفر کی' مگر نہیں مانا۔"

"جاب؟ تاکہ وہ مصروف رہ کر کسی بھی انتقامی کارروائی سے باز رہے؟"

ہاشم نے اثبات میں سر ہلایا۔ جواہرات نے ٹھنڈی سانس اندر اتاری۔

"اسے تم پہ شک تو نہیں ہے نا؟" اس کے خدشے بڑھتے جا رہے تھے۔

"اگر ہوتا تو اس طرح آرام سے نہ چلا جاتا۔ وہ ہاتھوں سے بات کرنے کا عادی ہے اور اداکار تو بالکل نہیں ہے۔" اس کا فون پھر بجا تو اس نے جھنجلا کر کال ریسیو کی۔

"جی۔۔۔ جی۔۔۔ میں آپ کے آفس پہنچ گیا ہوں۔ بس لفٹ میں ہوں' آ رہا ہوں۔" کال کاٹی۔ پھر بریف کیس میں ضروری چیزیں ڈالنے لگا۔

"کام سے جا رہا ہوں' شام کو ملتے ہیں۔"

"ہوں۔۔۔!" جواہرات بدقت مسکرائی۔



وہ اس نفاست اور خوب صورتی سے آراستہ بنگلے کا اسٹڈی روم تھا جہاں وہ لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھی کام کر رہی تھی۔ بال جوڑے میں بندھے تھے اور سبز آنکھیں سکیڑے' لبوں سے بال پین کا کنارہ دبائے وہ اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ پھر سر جھکا کر فائل پہ کچھ لکھنے لگی۔ دفعتاً اس نے کھڑکی پہ نگاہ دوڑائی تو رک گئی۔ دو جڑواں بچیاں اپنے ہم عمر دو' تین بچوں کے ہمراہ باہر جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔

سارہ چین چھوڑ کر بے اختیار باہر لپکی۔ لاؤنج میں زرینہ بیگم بیٹھی' سلائیوں پہ کچھ بن رہی تھیں۔ گاہے بگاہے چلتے ٹی وی پہ بھی نظر ڈال لیتیں۔ "سارہ یہ ترک ڈرامے دیکھ دیکھ کر ہم کچھ بے حیا نہیں ہوتے جارہے؟" انہوں نے تائید چاہی۔ مگر وہ سن ہی نہیں رہی تھی۔

"امی۔۔۔ آپ نے بچیوں کو پھر پارک بھیج دیا۔ میں نے منع کیا تھا نا۔" بھنویں سکیڑے وہ بے بسی سے کہتی ان کے سر پہ کھڑی تھی۔ زرینہ بیگم نے خفگی سے عینک کے اوپر سے اسے دیکھا۔

"بس کرو بی بی۔۔۔ تم تو ایسے پریشان ہو رہی ہو جیسے اکیلا بھیج دیا ہو۔ آس پاس کے بچے بھی تھے اور کرنل خورشید کی ملازمہ بھی۔ ابھی گھنٹے بھر میں آجائیں گی۔"

"آپ بھی نا کمال کرتی ہیں۔" وہ ناراضی سے کہتی ان کے ساتھ بیٹھی' مگر نشست کے بالکل کنارے پہ۔۔۔ "پتا ہے نا امی! حالات کتنے خراب ہیں' پھر بھی ان کو باہر بھیج دیتی ہیں۔"

"اچھا تمہاری بیٹیاں ہیں تو میری نواسیاں بھی ہیں' دشمن نہیں ہوں میں ان کی۔ گھر میں قید کرکے رکھوں تو بزدل اور ڈری سہمی سی بن جائیں گی' بالکل تمہاری طرح۔" انہوں نے اسے ذرا خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنی سلائی جاری رکھی۔

"میں نہیں ہوں بزدل' وہ سعدی بھی ہر وقت یہی کہتا رہتا ہے۔" وہ خفا بھی تھی اور پریشان بھی۔ "وارث کی موت بھول گئی آپ کو؟ کیسے ان کو مار دیا گیا تھا۔ جب کسی خاندان میں کوئی قتل ہو جائے تو خاندان والے پہلے جیسے نہیں رہتے' رہ ہی نہیں سکتے۔"

"سچ۔۔۔ تم نے بتایا ہی نہیں فارس کے رہا ہونے کا۔ مجھے عزیز بھائی کی بیوی نے بتایا۔" وہ سلائی روک کر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔ اس کی ساری باتیں نظر انداز کردیں۔ سارہ کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔

"فارس۔۔۔ وہ تو رہا نہیں ہوا۔۔۔ وہ۔۔۔ کیا

مطلب؟"

"تمہیں نہیں پتا؟" وہ الٹا حیران ہوئیں۔ "جب تم لندن میں تھیں' تب ہی تو رہا ہوا تھا وہ۔"

"سعدی کو بھی پتا نہیں ہوگا۔ پھر تو... ورنہ وہ ذکر تو کرتا۔" وہ حیران بیٹھی تھی۔

"تو... وہی تو اسے لینے گیا تھا۔ اسے کب کسی بات کا نہیں پتا ہوتا؟"

"مگر... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اچانک سے؟" وہ الجھ سی گئی۔ "اور سعدی نے بھی نہیں بتایا۔" پھر چونک کر ماں کو دیکھا۔ "اور کیا بتایا آنی نے؟"

"یہی کہ اپنے ماموں کے گھر رہ رہا ہے۔ جواہرات کے پاس' اپنا گھر نہیں کھولا اور ندرت کے پاس بھی نہیں رہ رہا۔ مگر اچھا ہی ہوا۔ مجھے تو کبھی بھی وہ قصوروار نہیں لگا تھا۔ شکر کہ بچے کی جان بچ گئی۔" انہوں نے پھر سے سلائیاں اٹھالیں۔

"ہوں... سعدی بھی یہی کہتا تھا۔ فارس ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔ مگر ایک ہفتہ ہوگیا اور مجھے پتا ہی نہیں۔" وہ اچنبھے میں تھی' پھر بے اختیار گھڑی دیکھی اور فون کی طرف بڑھی۔

"کس کو کرنے لگی ہو؟"

"کرنل خورشید کی میڈ کا نمبر ہے میرے پاس۔ اس کو کہتی ہوں کہ انہیں جلدی گھر لائے۔ پورے پندرہ منٹ ہوگئے ہیں۔"

فکرمندی سے کہتی وہ کارڈلیس اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔ زرینہ بیگم ماتھا چھو کر بڑبڑائیں۔ سارہ کا کوئی علاج نہ تھا۔



سینٹورس مال میں رنگوں اور روشنیوں کا سیلاب جگمگا رہا تھا۔ تیسرے فلور کے ایک بوتیک کی ساری بتیاں روشن تھیں۔ وسط میں مخملیں صوفے بچھے تھے۔ کپڑوں کے ریکس کونوں میں تھے۔ وہیں ایک قدآور آئینے کے سامنے شہرین کھڑی تنقیدی نگاہوں سے اپنا پہنا ہوا گولڈن گاؤن دیکھ رہی تھی۔ جس کی ایک آستین نہیں تھی اور دوسری کلائی تک آئی تھی۔ اس نے دائیں اور بائیں دونوں طرف سے ترچھی ہو کر عکس دیکھا۔ سنہرے باب کٹ بالوں کو دو انگلیوں سے پیچھے کیا اور بے زاری سے منہ بنایا۔

"فال اتنی اچھی نہیں ہے جتنی میں نے کہی تھی۔" وہ سخت چڑچڑی لگ رہی تھی۔

قریب کھڑی لڑکی اسے جلدی جلدی وضاحت دینے لگی۔ جیسے اس نے گویا سنا ہی نہیں۔ وہ خود کو ہر زاویے سے آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے عکس میں پیچھے صوفے پہ بیٹھی سونیا اور ساتھ مستعد کھڑی ملازمہ بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ سونیا بور سی ہو کر بار بار پاؤں قالین سے رگڑ رہی تھی۔

عکس میں دکان کا دروازہ بھی نظر آ رہا تھا اور وہ جو بگڑے موڈ سے منیجر کو کچھ کہنے لگی تھی۔ دروازے کو دیکھ کر بالکل ساکت ہوگئی۔ پھر اس نے تھوک نگلا

چوکھٹ پر سعدی کھڑا تھا۔ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے مسکراتے ہوئے وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

شہری نے مڑ کر صوفوں کی سمت دیکھا۔

"ثمینہ... سونیا کو لے کر اوپر فوڈ کورٹ جاؤ' میں کچھ دیر میں آتی ہوں۔"

پھر منیجر سے مخاطب ہو کر بولی۔ "میں آپ سے ذرا ٹھہر کر بات کرتی ہوں۔" وہ تو سر ہلا کر چلی گئی۔ البتہ ثمینہ نے بچی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پس و پیش کی تھی۔

"میم اوپر کس جگہ؟"

"ثمینہ!" اس نے تیز نظروں سے گھورا تو وہ فوراً سونیا کی انگلی تھامے باہر نکل گئی۔

شہرین پھر سے آئینے میں دیکھتے ہوئے گاؤن کا فال والا گلا انگلیوں سے ادھر ادھر کرنے لگی۔ وہ قدم قدم چلتا اس کے کندھے کے پیچھے آکھڑا ہوا۔

"تو آپ گولڈن پہن رہی ہیں۔ گڈ! میں بلیک پہن رہا ہوں۔"

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" وہ مڑے بغیر آئینے میں اس کو دیکھتے ہوئے تیزی سے بولی۔ سعدی نے مصنوعی حیرت سے شانے اچکائے۔

"یہ ایک مال ہے اور یہاں لوگ شاپنگ کرنے آتے ہیں۔"

"مجھے گھر سے فالو کر رہے تھے یا فون سے ٹریس کیا ہے؟"

"کیا آپ یہ نہیں مان سکتیں کہ ہم اتفاق سے ملے ہیں؟"

"ایک لمحے کے لیے بھی نہیں۔"

سعدی نے جواباً" اثبات میں سر ہلایا۔

"اوکے۔۔۔ آپ کے فون سے ٹریس کیا ہے۔"

شہرین اس کی طرف پلٹی اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"ہمیں اس طرح ایک ساتھ نہیں نظر آنا چاہیے۔"

"اسی لیے آپ نے ان کو بھیج دیا؟"

"وہ ہاشم کو بتا دے گی۔" اس نے گویا جھڑک دیا۔

"اتنی ناقابل اعتبار ملازمہ؟" وہ حیران ہوا۔

"وہ نہیں۔۔۔ سونیا۔۔۔ میری بیٹی۔۔۔ وہ اپنے باپ کو ہر بات بتاتی ہے۔" تلخی سے کہہ کر وہ کان میں پہنے سیاہ نگوں والے آویزے اتارنے لگی۔

"آپ اتنا ڈرتی ہیں ہاشم بھائی سے؟"

"سعدی!" شہرین نے دبے دبے غصے سے اسے دیکھا۔ "میں اس سے نہیں ڈرتی' مگر وہ سونیا کو مجھ سے لے سکتا ہے' اگر میں اس کے خلاف گئی اور یو نو واٹ' تمہارے یہاں آنے کا مطلب ہے کہ تمہیں ہاشم کے خلاف میری مدد چاہیے اور میں ایسا کچھ بھی نہیں کرنے والی۔"

"جب آپ نے مجھ سے مدد مانگی تھی تو میں نے بھی کیا ایسے ہی منع کیا تھا؟" وہ اب بہت سنجیدہ تھا۔ شیری ایک ثانیہ کو خاموش رہ گئی۔

"وہ اور مسئلہ تھا۔" اس کی آواز دھیمی پڑی۔

سعدی جواب دیے بنا اس کو دیکھتا رہا۔ وہ بھی اسے دیکھتی رہی' پھر سر جھٹکا۔

"کیا چاہیے؟"

وہ ہلکا سا مسکرایا اور اندرونی جیب سے ٹیبلٹ نکال کر میز پہ رکھے شہرین کے پرس میں ڈال دیا۔ سب اتنی پھرتی سے کیا کہ وہ الجھی سی کھڑی رہ گئی۔

"میرا ٹیبلٹ آپ کل مجھے پارٹی میں واپس کر دیں گی۔ اتنا سا کام۔"

"مگر تم یہ خود بھی لے کر جا سکتے ہو پارٹی میں۔" وہ حیران ہوئی۔

"سیکیورٹی پروٹوکول سخت ہے۔ موبائلز وغیرہ کی اجازت نہیں ہے۔ مگر آپ تو فیملی ہیں نا۔"

"تم کیا کرنا چاہ رہے ہو؟"

"آپ دوسرا کام کرنے کی ہامی بھریں۔۔۔ میں بتا دوں گا۔"

"اور کیا ہے وہ دوسرا کام؟" اس نے بہت ضبط سے سینے پہ بازو لپیٹتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے ہاشم بھائی کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ چاہیے۔ ہر صورت میں۔"

"تم۔۔۔ اف۔۔۔" اس کا صبر جواب دینے لگا۔ "تم پارٹی میں نا ہی آؤ سعدی! تم ہم دونوں کو مشکل میں ڈالو گے۔"

"میں ایک ہفتے سے' جب سے ہاشم بھائی نے بالخصوص میرے لیے کارڈ بھجوایا تھا۔ اس پارٹی کی تیاری کر رہا ہوں اور میں آپ پہ اعتبار کر رہا ہوں۔ آپ کو ہاشم بھائی سے اپنے تمام دکھوں اور اذیتوں کا بدلہ لینا ہے نا؟ تو پھر آپ کو میرے ساتھ کھڑے ہونا ہو گا۔ چاہے آپ پسند کریں یا نہ کریں۔ آپ مجھے ہاشم بھائی کا پاس ورڈ لا کر دیں گی۔" اس نے سنجیدگی اور مضبوطی سے ایک ایک لفظ ادا کیا۔

شہرین کے تاثرات دھیمے پڑے۔ اس نے تذبذب' امید اور خدشات سے بھری آنکھوں سے سعدی کو دیکھا۔

"تم کیا کرنے جا رہے ہو؟"

وہ اداسی سے مسکرایا۔ ایک زخمی سی مسکراہٹ۔

"جو انہوں نے ہم سے چرا لیا تھا' میں وہ واپس چرانے جا رہا ہوں۔"

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

آسیہ مسعود

چاند سا اک ٹکڑا

تپتی دوپہر‘ اوپر سے پنکھے کی گھرر گھرر... جو سماعتوں پر مسلسل کسی عذاب کی طرح مسلط تھی۔ اس پر مستزاد انتظار کی بے قراری... کسی بندہ بشر کی آنکھ لگے بھی تو کیسے۔

میں نے قمیص اتار کر کھلی کھڑکی کے پٹ سے لٹکائی اور ذرا ذرتے ذرتے پچھلی تنگ سی راہ داری میں جھانکا جو بالکل ویران پڑی تھی۔ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر میں واپس اپنے پلنگ پر آبیٹھا۔ گھرر... گھرر... ایک بار پنکھے محترم نے مجھے مخاطب کیا۔

”اف خدایا! یقیناً“ یہ پنکھا موہن جودڑو کے کھنڈرات سے برآمد ہوا ہوگا۔“ اسے گھورتے ہوئے میں نے احمقوں کی طرح ہزار بار کی سوچی بات ایک بار پھر سوچ کر دل ہلکا کیا۔ ”کام کم اور شور زیادہ... بالکل رابعہ خالہ کی طرح۔“ اگلے خیال پر خود ہی ہنسی آگئی جبکہ ایسا سوچنے میں... میں حق بجانب تھا۔ پچھلے ایک مہینے سے رابعہ خالہ کے ہاتھ کے بنے کھانے کھا کھا کر اب کھانے سے اتنی ہی رغبت رہ گئی تھی کہ فقط زندہ رہا جاسکے۔ کہاں گاؤں کی تازہ آب و ہوا اور خالص غذاؤں کا پلا بڑھا مجھ سا گبھرو جوان اور خوش خوراک بھی ایسا کہ اماں دیسی گھی کے پراٹھے بناتے نہ تھکتیں اور میں کھاتے ہوئے اور کہاں یہ فلیٹ کی زندگی... اونچی اونچی عمارتیں اور چھوٹے چھوٹے فلیٹ یوں جیسے کندھے سے کندھا جوڑے لوگوں کا ہجوم پسلی میں پسلی گھسی جاتی ہو اور سانس لینا دشوار... دھوئیں کے غبار میں اتنا کھڑکی بھر ٹکڑا سا آسمان دیکھتا تو گاؤں کے دھلے دھلائے گہرے نیلے... وسیع آسمان کی قدر اور بڑھ جاتی۔

”ہک ہاہ...“ مجھے ہی ملازمت کا شوق چرایا تھا۔ ورنہ ابا نے تو بہتیرے روڑے ڈالے۔

”پتر... زمین تھوڑی سہی‘ پر اپنی تو ہے۔ رج کے روٹی کھانے کو مل جاتی ہے اور کیا چاہیے۔ اماں بہشتن کہتی تھی۔ زمین تو مرے کے منہ میں بھی دودھ ڈالتی ہے۔“

میں صرف سنتا۔

”تو بلا ضرورت ملازمت کے چکر میں پڑ گیا ہے‘ آج نہیں تو کل یہ زمین داری تجھے ہی سنبھالنا ہے۔ پھر خوامخواہ کی خواری کیوں؟؟“

سچ تھا کہ مجھے ملازمت کی کچھ خاص ضرورت نہیں تھی لیکن سب کچھ سنتے سمجھتے اور مانتے ہوئے بھی میں نکل کھڑا ہوا۔ نئی نئی حاصل کی ہوئی تعلیم کا زعم تھا۔ پھر اپنے قوت بازو کو بھی آزمانا تھا۔

قریبی شہر میں نوکری ملی تو سب ٹھیک ہوگیا۔ صبح سویرے بس پکڑ کر نکلتا اور سورج ڈھلنے سے پہلے گھر آپہنچتا مگر یہ عافیت سال بھر بعد رخصت ہوگئی۔ جب کمپنی نے ترقی دیتے ہوئے میرا تبادلہ ہیڈ آفس کردیا۔

”اتنی دور!“ جس نے سنا منہ میں انگلی دبالی۔

”نہ پتر نہ... بڑا شہر بڑے سیاپے... پھر ہم تو کبھی دوسرے ضلع نہیں گئے۔“ ابا کی بچ کوئی نے مجھے رتی برابر متاثر نہ کیا۔

”فکر کی کوئی بات نہیں ابا! میرے تین چار دوست کئی سالوں سے وہاں کام کررہے ہیں۔ میں بھی ان ہی کے ساتھ رہ لوں گا۔“ ترقی کے مواقع روز روز نہیں ملتے۔ گھر آئی خوش بختی کو ٹھوکر مارنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ گاؤں کے نمبردار کے کہنے پر ابا نے کچھ



نرمی اختیار کرلی تو اماں کو اپنا اکیلا پن ستانے لگا۔

"تیرے پیچھے ہمیں کچھ ہو گیا تو؟" وہ منہ پر دوپٹا ڈال کر رونے لگتیں۔

"اماں! میں کوئی لندن یا امریکا تو نہیں جا رہا۔ یہیں پاکستان میں ہی ہوں۔" ان کی سینکڑوں منطقوں کے جواب میں میری ہزاروں دلیلیں..... کئی دن کی بحث و تکرار کے بعد آخر کار وہ دونوں مان گئے۔

"لیکن رہو گے تم صرف رابعہ بہن کے گھر۔" چلتے چلتے ایک شرط عائد کر ہی دی۔

"پرائے شہر میں ہم کسی غیر پر بھروسا نہیں کر سکتے۔" رشتے کی دور پرے کی بہن اماں کو اچانک بہت قریبی لگنے لگی تھی۔ جس سے ملاقات کو بھی کم و بیش دس سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ ناچار مجھے کچھ ان کی بھی ماننی ہی پڑی۔

گاڑی سے اُترا تو اسٹیشن پر ایک جم غفیر دیکھ کر گھبرا گیا۔ جیسے سارا شہر اسٹیشن پر ہی آگیا ہو۔ تھوک نگل کر میں نے خشک حلق کو تر کیا اور متلاشی نظروں سے ارد گرد کسی شناسا چہرے کو ڈھونڈنے لگا۔

"حد ہو گئی یار! یہ تو کسی راہ بھٹکی دوشیزہ سے بھی زیادہ گھبرا رہا ہے۔" قریب ہی کوئی زور سے ہنسا تھا۔ پلٹ کر دیکھا تو جان میں جان آگئی۔ میرے جگری یار راشد، فیض اور گامی میرے سامنے تھے۔

"اوئے کدھر مر گئے تھے تم لوگ؟" باری باری سب سے بغل گیر ہوتے ہوئے میں نے بے تکلف شکوہ کیا۔

"ہم تو تیرے بتائے وقت پر ہی پہنچے ہیں۔ تھوڑی بہت دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے جگر! یہ اپنا گاؤں نہیں۔ یہاں تو اسٹیشن تک پہنچنے میں ہی گھنٹہ لگ جاتا ہے۔

تو... تو ایسے گھبرا رہا ہے جیسے ڈربے سے نکلی ککڑی... دو کھیت آگے آکر راستہ بھول گئی ہو...." وہ تینوں فلک شگاف قہقہے لگا رہے تھے۔ مجھ پر جملے کس رہے تھے مگر میں اب مطمئن تھا۔

خالہ رابعہ کا گھر ایک بوسیدہ سی رنگ اُڑی عمارت کی چوتھی منزل پر تھا۔ اس چھوٹے سے فلیٹ کے اندر بھی باہر کی دنیا کی طرح افراد کی کمی نہ تھی۔ ہر چہرہ بے زاری اور بے نیازی لیے ہوئے اپنی اپنی دنیا میں مگن تھا۔ کوئی کھانا سامنے رکھے موبائل سے چپکا ہوا ہے، کوئی ٹی وی اسکرین پر نظریں گاڑے سبزی بنانے میں مصروف، کہیں گنگناتے ہوئے کپڑے دھوئے جا رہے ہیں تو کہیں جھاڑو لگ رہی ہے۔ غرض یہ کہ لڑکا لڑکی کی تمیز کے بغیر سب کاموں میں لگے تھے اور ایک طرف بیٹھ کر سب پر چلاتی ہوئی خالہ رابعہ.... ٹول پلازہ کی طرح میں ہر ہر موڑ پر رک کر یکطرفہ تعارف کا مرحلہ نپٹاتا ہوا آخر کار خالہ تک پہنچ ہی گیا۔

ہمارے گاؤں میں کوئی مہمان آجائے تو میزبان تو ایک طرف اڑوس پڑوس والے بھی بنا کہے دھرنا دے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہاں کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔

وہ اپنی راجدھانی میں اکڑ کر بیٹھی شاید اس بات پر فاخر تھیں کہ بچوں کی تعداد میں ہی سہی گاؤں والوں پر سبقت تو حاصل کی۔ ان کی آنکھوں میں نصب ایکسرے مشین سے گھبراتے ہوئے میں خود کو کوس رہا تھا اور بے زاری تھی کہ حد سے سوا ہوتی جاتی تھی۔ تابعداری کی بھی کبھی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑ جاتی ہے۔

ابھی کچھ دیر پہلے دوستوں کی سنگت میں کتنا کھلا جا رہا تھا۔ فیض وغیرہ مجھے اپنے ساتھ اپنی رہائش پر لے گئے تھے۔ میری شامت ہی آئی تھی کہ کھانا کھاتے ہی شور مچانے لگا۔ اماں، ابا کا فون آنے سے پہلے پہلے مطلوبہ پتے پر پہنچا دو یار.... اور اب.... اس سے پہلے دل کملا کر رہ جاتا۔ یکایک ایک تازہ ہوا کا جھونکا آیا اور ہر شکوہ جاتا رہا۔ وہ چائے کی ٹرے لے کر آئی تھی۔

"صبا! یہاں میز پر رکھ دو۔" شاید جھجک کے باعث وہ دو قدم پیچھے رکی تھی۔ پھر خالہ رابعہ کی پُر حکم آواز پر سامنے آکر میز پر چائے کے برتن رکھنے لگی۔

"ہاں... صبا ہی ہونا چاہیے اس کا نام۔" خالہ سے نظر بچا کر میں نے ایک جھلک دیکھی اور فوراً فیصلہ دے دیا۔

دودھ میں گندھے میدے جیسی رنگت.... بھرا بھرا گداز جسم اور رسیلے ہونٹوں پر ٹھہری مبہم سی مسکراہٹ جیسے.... جیسے ان کی دہلیز پر کوئی راز افشا ہونے کو بے قرار ہو اور.... اور اجلی صبح کی پہلی کرن جیسی روشن آنکھیں.... اڑی اڑی رنگت والے ان درجن بھر چہروں اور سوکھے ڈھانچے نما لڑکے لڑکیوں میں وہ الگ ہی نظر آ رہی تھی۔

وہ جس خاموشی سے آئی تھی۔ اسی طرح واپس جا کر اس مختصر سے گھر کے کسی کونے میں روپوش ہو گئی۔ مگر اب مجھے کوئی گلہ نہیں تھا۔ نہ چپ چپ کرتے موسم سے، نہ خالہ رابعہ کی ٹٹولتی نظروں اور کرخت لہجے سے اور نہ ہی ارد گرد موجود دوسرے افراد کی بے نیازی سے۔



ایک نسوانی سسکی کی آواز ابھری اور میں جو ابھی ابھی دروازہ کھول کر اندر آیا تھا' ٹھٹک کر رک گیا۔

"الٰہی خیر۔۔۔ کوئی جننی یا بھوتنی مجھ پر عاشق تو نہیں ہو گئی۔ آخر کو گھر کا سب سے خوب صورت مرد ہوں۔" ایک ہاتھ میں آفس فائل اور دوسرے میں برگر کا ڈبہ (جو اس گھر کے بدذائقہ کھانوں سے تحفظ کے طور پر لایا تھا۔) پکڑے در و دیوار کو خوف زدہ نظروں سے گھور رہا تھا۔

اب کے سسکی پہلے سے زیادہ واضح آواز میں ابھری۔۔۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ کوئی بھی متوقع جننی کمرے کے اندر نہیں' بلکہ پچھلی سمت بنی تنگ سی راہداری میں ہے۔

"نوشابہ! تم ہی بتاؤ' اس میں میرا کیا قصور ہے۔" روہا روہا لہجہ' نم سی آواز۔۔۔ میں اس جانب کھلتی اکلوتی کھڑکی سے جا لگا۔ قریب ہی فرش پر بیٹھی دو لڑکیوں میں سے ایک صبا تھی۔ اس کی گیلی پلکیں آپس میں چپکی ہوئی تھیں۔ ہتھیلی کی کٹوری میں ٹھوڑی رکھے جانے کب سے رو رہی تھی۔ دوسری لڑکی کا چہرہ میرے لیے اجنبی تھا۔ شاید کوئی پڑوسن یا سہیلی وغیرہ تھی۔

"میں اپنی مرضی سے تو موٹی نہیں ہوں نا۔ اللہ نے بنایا ہی ایسا ہے۔ لاکھ کوشش کر دیکھی۔۔۔ مگر اس منحوس موٹاپے نے جان نہ چھوڑی۔ اب کیا سرے سے کھانا پینا ہی چھوڑ دوں۔" بات مکمل کرتے ہی وہ پھر سے رونے لگی تھی۔

"موٹاپا!" پہلی نظر میں وہ مجھے بالکل موٹی نہیں لگی تھی۔ اب بھی غور کرنے پر معمولی فربہی مائل ہی لگی۔ البتہ آنکھوں کے نیچے حلقے خاصے نمایاں تھے۔ یقیناً" ڈائٹنگ وغیرہ کی کارستانی تھی۔ شہری لڑکیاں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ یہ جس بات پر رو رہی ہے۔ ہمارے گاؤں میں ہوتی تو اسی بات پر فخر کرتی۔ ہک ہا۔۔۔ سوکھی سڑی۔۔۔ دھان پان سی لڑکیاں بھی خوب صورت ہوتی ہیں بھلا۔ میں نے اپنے مخصوص تکیہ کلام کے ساتھ افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اس پھولے پھولے

گالوں والی لڑکی کو دیکھا۔ مسکراہٹ بے اختیار میرے ہونٹوں پر آ رکی مگر اس کا رونا ابھی بند نہیں ہوا تھا۔

"اچھا یہ بتاؤ' اس دبئی والے رشتے کا کیا بنا۔" نوشابہ نامی لڑکی پہلی بار بولی۔

"وہی جو ہمیشہ ہوتا ہے۔ لڑکے کی ماں کہنے لگی۔ اتنی موٹی لڑکی کو میں اپنی بہو نہیں بنا سکتی۔ میرے بیٹے کی ساری کمائی تو اس کے کھانے پینے پر ہی صرف ہو جائے گی۔ ہوں بڑی آئیں۔۔۔ ان کا اپنا حدود اربعہ ملاحظہ کیا تھا۔" رونا چھوڑ کر وہ یک دم غصے میں بولی۔

"صرف والدہ! خود لڑکے میاں کو دیکھا ہے۔ تصویر میں بھی کالا انجن لگتا ہے۔ سامنے سے دیکھنے میں تو پھر اللہ ہی حافظ ہے۔" نوشابہ کی بھرپور طرف داری کے باوجود وہ پھر سے دھواں دار انداز میں رونے لگی تھی۔ میرا دل اس کے آنسوؤں میں ہی کہیں بہتا چلا جا رہا تھا۔ میں کھڑکی سے ہٹ آیا۔

کچھ سال پہلے کا منظر میری آنکھوں کے سامنے اسکرین کی طرح چل رہا تھا' وہ دکھ بھرا اداس منظر کئی سال تک میرے گھر کے آنگن کی فضا پر چھایا رہا تھا۔ میری اکلوتی آپا کے ہونٹوں سے ہنسی چھن گئی تھی۔ ہم باقی گھر والے بھی جیسے ہنسنا بھول گئے۔ آپا موٹی تھیں' نہ بدصورت۔ فقط بچپن کی منگنی اچانک ٹوٹ جانا ان کا قصور بن گیا تھا۔ نوید نے بیرون ملک جا کر گرین کارڈ کے لالچ میں خفیہ شادی کر لی تھی۔ معلوم ہونے پر ہم گھر والے تو شکر ادا کرنے لگے کہ بروقت خبر ہو گئی' شادی کے بعد پتا چلتا تو خسارہ عمر بھر کا مقدر بن جاتا۔ مگر توہمات میں جکڑے گاؤں کے ان لوگوں کو کون سمجھائے جنہیں منگنی ٹوٹ جانے سے زیادہ برا شگن کوئی اور نظر ہی نہ آتا تھا۔ آپا کو چھپ چھپ کر روتے دیکھتا تو کلیجہ کٹ جاتا۔ کئی سال کی تگ و دو کے بعد آخر کار ان کا گھر آباد ہوا تو چین آیا۔ مگر آج صبا کو دیکھ کر وہ سارے زخم پھر سے ہرے ہو گئے تھے۔

لڑکیاں شہروں کی پروردہ ہوں یا دیہاتوں میں بسنے والی کم پڑھی لکھی سادہ ذہن' ان کے دل ایک سے ہوتے ہیں پھول کی پتیوں سے زیادہ نازک' جن پر

[illegible] جذبات ذرا سی ٹھیس سے مجروح ہو جاتے ہیں۔ معاشرے کا رویہ بھی کم و بیش اس صنف کی جانب ایک سا ہوتا ہے۔ خود ساختہ نظریات و معیار پر پرکھنے والا۔ ظالم۔ بے دردی سے کچل کر گزر جانے والا۔

میں جو ہر وقت شہری اور دیہاتی زندگی کے موازنہ میں لگا رہتا تھا۔ آج اس سانجھے مسئلے کی الجھی تاروں میں خود بھی الجھ گیا تھا۔

٭٭٭

''اماں جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔ نہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔۔۔ جی کھانا بھی بہت اچھا مل جاتا ہے۔ خالہ رابعہ بہت مزے کے کھانے بناتی ہیں۔'' اماں کی تسلی کے لیے ایک بار پھر بھرپور آواز میں جھوٹ بول کر دل ہی دل میں استغفار پڑھی۔۔۔ لیکن ان کی تسلی کروانا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ ہر فون کال کا تین چوتھائی حصہ اسی جھوٹ کی نذر ہو جاتا۔ پھر اگلی کال تک میں توبہ کرتا رہتا۔۔۔ مگر لاحاصل۔۔

میں نے بمشکل بات سمیٹ کر رخصت لی اور آج کے کاموں کی زبانی فہرست بنانے لگا۔ کہنے کو تو آج چھٹی کا دن تھا مگر مصروفیت کا عالم عام دنوں سے بڑھ کر تھا۔ میرے میلے کپڑوں کا ایک ڈھیر تھا جسے دھونا، سکھانا اور پھر اگلے ہفتے کے لیے استری کر کے لٹکانا۔ یہی نہیں اپنے اس ڈربہ نما کمرے کی صفائی ستھرائی بھی خود میرے ہی ذمہ تھی۔ فیصل، فہیم اور فخر صرف رات کو سونے کے لیے ہی آتے تھے۔ وہ نیچے چٹائی بچھا کر سو جاتے۔ کمرے میں موجود اکلوتا پلنگ اور واحد الماری میرے زیر استعمال تھے۔ لہٰذا کمرے کی نامزدگی بھی میرے ہی کھاتے میں پڑتی تھی۔ ان سب کاموں سے اگر کچھ وقت بچ جاتا تو خالہ سامان کی ایک لمبی لسٹ تھما کر بازار روانہ کر دیتیں۔ آخر ان کے نمک کا حق بھی ادا کرنا تھا۔ یہ بھی شکر تھا۔ پیسوں کی ادائی اس نمک حلالی میں شامل نہ تھی۔ ورنہ میرا دیوالیہ ہو جاتا۔ اس بے زار کن مصروفیت میں واحد فرحت بخش

خیال ان بھیگے نین کٹوروں کا تصور تھا، جو مجھے یہاں رہنے پر بھی مجبور کیے ہوئے تھا۔ ورنہ کمپنی کی طرف سے اس سے بہت بہتر رہائش کی موجود سہولت سے فائدہ اٹھا سکتا تھا اور تنخواہ اتنی تو تھی کہ سب کاموں کے لیے باآسانی ایک مستقل ملازم رکھ لیتا مگر اس صورت میں مجھے ان انمول گھڑیوں سے محروم ہونا پڑتا جو پورے دن میں صرف ایک بار۔۔۔ مگر باقاعدگی سے میرے دروازہ دل پر دستک دینے چلی آتی تھیں۔

ساڑھے تین بجے دوپہر کو میری آفس سے واپسی ہوتی، جب تک سب ہی افراد خانہ تپتی دوپہر سے بچنے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں جا چھپتے۔ اسے بھی شاید اسی وقت کا انتظار رہتا تھا۔ سہیلی کے آگے دل کا بوجھ ہلکا کرنے اس پچھلی راہ داری میں آ بیٹھتی اور میں کھڑکی کی زنگ آلود جالی سے اس کے بھیگے چہرے کو چوری چوری تکتے ہوئے خود بھی اس کے غم میں بھیگتا رہتا۔

''میرج بیورو والی آنٹی جو رشتہ لائی تھیں، تمہیں معلوم ہے ان کا کیا جواب آیا ہے۔'' صبا کی آواز پر میرے کان کھڑے ہو گئے۔

میں ابھی ابھی آفس سے لوٹا تھا۔ اپنی فائلیں وغیرہ ایک طرف گتے کے ڈبے پر رکھیں۔ جسے میں نے ایک کپڑے سے ڈھانپ کر عارضی میز کی شکل دے رکھی تھی۔ خود پلنگ پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا مگر جیسے ہی صبا کی آواز ابھری ایک موزا ہاتھ میں پکڑے، دوسرا ابھی پاؤں میں ہی تھا، کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا۔

''تمہارا لڑکا تو بہت ہینڈسم ہے۔ یہ لڑکی تو اس سے عمر میں بڑی لگتی ہے۔ گھرانہ ہمیں پسند ہے۔ اس لیے چاہیں تو چھوٹی کا رشتہ دے دیں۔'' آج وہ مذکورہ آنٹی کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے بتا رہی تھی۔

''کیا! یعنی صدف۔۔۔ وہ تو تم سے تین سال چھوٹی ہے۔'' نوشابہ کی حیرانی بجا تھی۔ میں خود اس لڑاکا اور کم عمر سی صدف کو کئی بار آتے جاتے دیکھ چکا تھا۔ جو وجہ بے وجہ ہر ایک سے بھڑ جاتی تھی۔

''پھر۔۔۔ پھر۔۔۔ کیا کہا آنٹی نے۔'' نوشابہ کے لہجے میں دبا دبا سا اشتیاق مجھے بری طرح چبھ رہا تھا۔

"امی نے کیا کہنا ہے... مجھے ہی مورد الزام ٹھہرانے لگیں۔ آج تو صاف الفاظ میں مجھے منحوس کہہ دیا۔" اب اس کی آواز میں نمی گھل رہی تھی۔

میں بوجھل قدموں سے چلتا اپنے بستر پر آکر دراز ہوگیا۔

"ہمارا معاشرہ جس ڈگر پر چل نکلا ہے اس کا انجام یقیناً "بہت برا ہوگا۔" دل میں اٹھتے ایک سوال سے نظریں چرانے کے لیے میں نے زیر لب فلسفہ جھاڑنا شروع کردیا۔

میں اس سوال سے بچنا کیوں چاہ رہا ہوں۔ جبکہ یہی سچ ہے۔ مجھے صبا اچھی لگتی ہے۔ بلکہ وہ معصوم صورت اور بہت ہی حساس دل کی مالک لڑکی اگر میرے دل کی مکین بن گئی ہے تو مجھے پورے استحقاق کے ساتھ اس سچ کو اپنالینا چاہیے۔ دل نے گویا حکم صادر کیا اور میں جھٹ سے موبائل اٹھا کر ابا کا نمبر ملانے لگا۔



"صبا دھی تو بالکل ہمارے ہی جیسی ہے۔ پوری کی پوری پنڈ کی مٹیار لگتی ہے۔" ابا کا پہلا تبصرہ سن کر میری رکی ہوئی سانس بحال ہوئی تھی۔ جبکہ اماں تو خوشی سے نہال ہوئی جارہی تھیں۔

"صرف مٹیار نہیں بانکی مٹیار آخر بھانجی کس کی ہے۔" اماں نے اترا کر کہا اور دوبارہ بڑے سے تھال میں لڈو بھرنے لگیں جو اب سارے گاؤں میں تقسیم ہونا تھے۔

فون پر میں نے صرف اپنے گاؤں آنے کا بتایا تھا۔ وہاں پہنچ کر جب مدعا بیان کیا تو اماں ابا دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ کچھ مشاورت کے بعد انہوں نے میرے ساتھ چلنے کی ہامی تو بھرلی لیکن راستہ بھر میں ان کے تاثرات سے عاری چہرے دیکھ دیکھ کر گھبراتا رہا۔ عام طور پر اپنے بیٹے بلکہ ہونہار بیٹے کا رشتہ لے جاتے ہوئے والدین کی نظروں اور ہر انداز میں جو احساس تفاخر ہوتا ہے' وہ مفقود تھا۔

"اماں اگر بہن کا منہ رکھنے کے لیے مان بھی گئیں تو ابا ضرور کوئی نہ کوئی نکتہ نکال کر اڑ جائیں گے۔ پھر رابعہ خالہ کا مزاج بھی کچھ کم نہیں۔"

میں خدشوں میں گھرا ہوا تھا۔ لہٰذا ان کے ساتھ زیادہ دیر خالہ کے پاس نہ رکا۔ بلکہ اپنے کمرے میں آکر بری خبر کا انتظار کرنے لگا۔ دل رک رک کر دھڑک رہا تھا۔ اس وقت تو بالکل ہی رک گیا۔ جب دھاڑ سے دروازے کے پٹ کھلے اور فیصل اور فخر منکر نکیر کی طرح میرے دائیں بائیں آکھڑے ہوئے۔

"آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔" سنجیدگی سے کہا گیا۔

دو ماہ قیام کے باوجود میں یہاں کسی بھی فرد سے بے تکلف نہ تھا۔ لہٰذا کچھ پوچھ نہ سکا۔ چلنے کا اشارہ ہوا اور میں چل پڑا۔ سمجھا تو خیر اس وقت بھی کچھ نہ تھا۔ جب وہ دونوں درمیانی کمرے میں آکر رک گئے۔ فیصل نے مجھے دونوں کندھوں سے پکڑا اور فخر نے پورا کا پورا لڈو منہ میں ٹھونس دیا۔

"ارے... یہ سب کیا ہے؟" میں چلایا۔ مگر وہ اپنے قہقہوں میں مجھے سن ہی کب رہے تھے۔

دونوں فریقین کی باہمی رضامندی سے یہ رشتہ نہ صرف طے ہوگیا' بلکہ ٹھیک تین ماہ بعد صبا عروسی جوڑا پہنے اصلی پھولوں سے بنی سیج پر میرے سامنے بیٹھی تھی اور میں سولہ سنگھار سے لیس حسن کی تاب نہ لاتے ہوئے اس کے قدموں میں ڈھیر تھا۔

کمپنی کی جانب سے ملنے والے رہائشی الاؤنس پر میں نے ایک بہت اچھا سا مکان شادی سے پہلے ہی کرائے پر لے لیا تھا جو صبا کے آنے سے گھر بن گیا۔ بہت جلد اس نے اپنی محبت' خلوص اور خدمت سے گھر کو جنت میں بدل دیا تھا۔ اپنی خوش اخلاقی سے اس نئے علاقے میں بھی بہت جلد اچھے مراسم قائم کرلیے اور تو اور میرے گھر والوں کو بھی اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ ابا جو دوسرے ضلع تک نہ جانے کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اب آئے دن اپنی لاڈلی بہو سے ملنے دوسرے صوبے آنے کو تیار رہتے۔ ادھر صبا نت نئے کھانے (جو ذائقہ کی بنا پر خالہ رابعہ کے گھر کی کوکنگ کا راز فاش کردیتے

تھے۔) بنا کر ان دونوں کا یوں انتظار کرتی جیسے لڑکیاں میکے والوں کا کرتی ہیں۔ خود بھی گاؤں جانے کے لیے اتنی پُرجوش رہتی گویا گاؤں نہیں کسی ہل اسٹیشن جارہی ہے۔ ابا کی صبا کے لیے لمبی لمبی فون کالز آتیں تو میں حیران ہو جاتا۔ وہ تو کبھی میری خیر خیریت پوچھنے کے لیے بھی فون نہیں کرتی تھیں۔ ہمیشہ یہ ذمہ داری میری ہی رہی اور اب۔۔۔ مجھے سچ مچ حسد ہونے لگتا۔

"ہاتھوں میں ذائقہ ہو نہ ہو دل میں خلوص ہونا ضروری ہے۔ جو لڑکی رشتوں کو جوڑ کر رکھنا اور نبھانا جانتی ہو، ہو ہی نہیں سکتا وہ شوہر کے دل کی مالک نہ بنے۔"

میں دوستوں میں بیٹھ کر بڑے فخر سے صبا کا ذکر کرتا۔ ثابت ہوا کہ ہر مرد کے دل کا راستہ معدے سے ہو کر نہیں گزرتا، اس فقرے پر سب دوست خوب ہنستے اور اپنے صحیح انتخاب پر فخر سے میرا سینہ مزید چوڑا ہو جاتا۔

☆ ☆ ☆

"مما! آج ہم پارک جائیں گے۔"

"کیوں نہیں اگر آپ نے وقت پر ہوم ورک کر لیا تو ضرور جائیں گے۔" ننھے صہیب کی پیشانی پر آئے بال سنوارتے ہوئے صبا نے اسے پچکارا۔

"نہیں، آج ہم پارک نہیں جاسکتے۔" کمرے میں اچانک داخل ہو کر میں ماں بیٹے کی گفتگو میں مخل ہوا تھا۔

"مگر آج تو سنڈے ہے نا بابا۔" صہیب کے ساتھ ساتھ صبا کے چہرے پر بھی مایوسی چھا گئی تھی۔ دونوں ماں، بیٹا میری بے انتہا مصروفیت سے ہفتہ بھر سمجھوتا کیے رکھتے تھے۔ واحد ایک اتوار کے دن ہی میں انہیں میسر ہو پاتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ بھی اچانک ہو جانے والی کسی اہم میٹنگ کی نذر ہو جاتا۔

"آفس کی کوئی میٹنگ ہے کیا؟" صبا کے دھیمے لہجے میں چھپے خدشے کو محسوس کر کے میں مسکرا دیا۔

"نہیں بالکل نہیں۔۔۔ اس بار ویک اینڈ اسپیشل ہو گا۔ ہم خوب انجوائے کریں گے۔"

"یاہو۔۔۔" صہیب نے خوشی سے نعرہ لگایا اور بیڈ پر اچھلنے لگا۔

"پہلے ہم خوب ساری شاپنگ کریں گے۔ پھر کسی اچھے سے ہوٹل میں ڈنر، آخر میں ادریس انکل کی طرف بھی جائیں گے۔" میرے مزید انکشاف پر وہ تالیاں پیٹنے لگا۔

"بابا! میں ریموٹ والا ہیلی کاپٹر بھی لوں گا۔"

"بالکل لینا میری جان!"

"پھر جب ہم ادریس انکل کے گھر جائیں گے تو میں کائنات کو ہیلی کاپٹر چلا کر بھی دکھاؤں گا۔ زوم۔۔۔ زوم۔" وہ ہاتھ کا ہیلی کاپٹر بنا کر خود ہی اڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

"اس کی ہر بات کی تان کائنات پر آکر ٹوٹتی ہے۔" مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔

"مگر یہ سب کس خوشی میں ہو رہا ہے۔ آخر ہمیں بھی پتا چلے۔" صبا خوشگوار حیرت میں مبتلا تھی۔

"کمپنی کی طرف سے نہ صرف ڈبل بونس ملا ہے۔ بلکہ بیسٹ پرفارمنس پر سالانہ ایوارڈ بھی میرے نام اناؤنس ہوا ہے۔" میں نے دونوں کندھوں سے اسے تھام کر اپنے قریب کیا۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔ اماں اور ابا کی دعاؤں کے بعد تمہاری پُرخلوص رفاقت ہی کا نتیجہ ہے کہ میں اتنی جلدی ترقی کی منازل طے کر رہا ہوں۔ آئی رئیلی لو یو صبا!"

شادی سے پہلے مجھے اس کی صورت سے محبت ہوئی تھی۔ مگر اب اس کی سیرت سے بھی عشق تھا مگر اظہار کرنے پر وہ ہمیشہ اول شب کی دلہن کی طرح جھینپ جاتی تھی۔ اب بھی وہ مسکرا کر میری بانہوں کے حصار سے نکل کر بیڈ کی چادر درست کرنے لگی۔

"مما! ہم کائنات کے لیے بھی گفٹ لے کر جائیں گے۔" صہیب بھاگا ہوا آیا اور صبا کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ میرے کولیگ ادریس چوہدری کی بہت

گھلو سی بیٹی کائنات صہیب کی ہم عمر تھی۔ دونوں میں خوب دوستی تھی۔ وہ آدھا دن اسکول میں اس کے ساتھ گزار کر گھر آتا اور باقی آدھا دن ماں سے اس کا ذکر کرتے گزارتا۔

"ٹھیک ہے بیٹا! ہم کائنات کے لیے باربی ڈول لے جائیں گے۔" صبا کے اطمینان دلانے پر وہ پھر سے ہیلی کاپٹر چلاتے ہوئے باہر نکل گیا۔

"لگتا ہے ادریس چوہدری کی بیٹی پر میرے بیٹے کا دل آگیا ہے۔ اچھی بات ہے۔ اب ہمیں بہو تلاش کرنے کی زحمت نہیں کرنی پڑے گی۔" میں نے بے اختیار ہنستے ہوئے چٹکلا چھوڑا تھا۔

"ارے واہ ایسے ہی۔۔۔ میرے بیٹے کے لیے وہ چھوٹا سافٹ بال ہی رہ گیا ہے کیا۔ میں تو چاند سی بہو لاؤں گی۔"

غیر سنجیدہ انداز میں کہہ کر صبا بھی ہنسنے لگی تھی۔ یقیناً" یہ ایک مذاق تھا۔ مگر میری ہنسی کو اچانک بریک لگ گیا تھا۔ اس مذاق میں دبی ایک ماں کی خواہش نے مجھے بے چین کردیا تھا۔ صبا جیسی حساس دل کی مالک اور ایسی سوچ۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں وہ تو خود اس کرب سے گزر چکی ہے اور اچھی طرح جانتی ہے جب کوئی چھوٹی چھوٹی باتوں کو وجہ بنا کر رد کردیتا ہے تو نازک پنکھڑیوں جیسے دلوں پر کیا بیتتی ہے۔ میں نے سر جھٹک کر فضول سوچوں کا راستہ روکا مگر ایک دزدیدہ سی نظر بے اختیار اس کے چہرے پر کچھ کھوجتی ہوئی پلٹ آئی۔ وہ بے نیازی سے ڈریسنگ ٹیبل کی اشیا درست کررہی تھی۔ جیسے اس نے کچھ کہا ہی نہ ہو۔

"ہاں یاد آیا۔" وہ یک دم پلٹی۔ "چھوٹی پھپھو اپنی بیٹی کے لیے فیصل کے رشتے پر بہت زور دے رہی ہیں۔ آج کل امی پر انہوں نے بلاوجہ کا دباؤ ڈال رکھا ہے۔" وہ مجھ ہی سے مخاطب تھی شاید۔۔۔ مگر میں اپنی سوچوں میں اس قدر ڈوبا تھا کہ پوری طرح سن نہ پایا۔

"کیا مطلب؟"

"آپ خود ہی بتائیں فیصل اور شیریں کا کوئی جوڑ ہے بھلا؟" اس نے بھی میرا سوال نہیں سمجھا تھا۔

"ہاں شاید۔۔۔ شیریں خاندان کی سب سے پڑھی لکھی لڑکی تھی اور فیصل تھرڈ ڈویژن میں گریجویٹ۔" اپنی اس سوچ کو الفاظ کا روپ دینے ہی والا تھا کہ وہ بول اٹھی۔

"سارا سال مختلف ٹوٹکوں کے پیچھے خوار ہوتے گزرا ہے لیکن نہ شیریں کے چہرے سے پیدائشی نشان دور ہوتے ہیں۔ نہ اس کا احساس کمتری۔ ایسی لڑکی کو ہم اپنے گھر کی بہو کیسے بنائیں۔"

لاپروا سے لہجے میں اپنی بات مکمل کرتے ہی وہ دراز کھول کر کچھ ڈھونڈنے لگی تھی اور میں اس کے چہرے پر چھائے تاثرات میں سے اپنی صبا کو۔

عورت تو عورت کے دکھ کو بہت اچھی طرح سمجھ سکتی ہے اور اس کا مداوا بھی خود عورت ہی کے ہاتھ میں ہے۔ مگر ایک بے نام سی کڑواہٹ میرے حلق تک اتر گئی تھی۔ وقت رکتا نہیں۔

شیریں پر سے بھی یہ کڑا وقت آخر گزر ہی جائے گا۔ جیسے صبا پر سے گزر گیا تھا۔

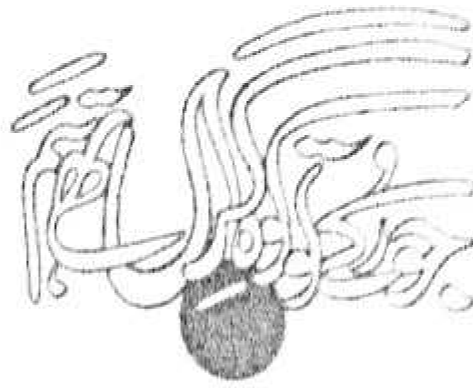
میں نے سنگھار میز پر جھکی صبا کے سراپے کو دیکھا، جو ان پانچ سالوں میں معمولی موٹاپے سے پھیل کر چھوٹی سی پہاڑی کا روپ دھار چکا تھا۔

"چاند سی بہو!" اس کی خواہش مجسم ہو کر میری آنکھوں کے آگے ناچنے لگی۔

کہتے ہیں چاند میں بھی دھبہ ہوتا ہے۔ لیکن روشن حصہ چمکتا ضرور ہے اور اسی حصے کی خوب صورتی کی وجہ سے چاند خوب صورت کہلاتا ہے مگر جن کی نظر دھبہ پر ہوتی ہے۔ وہ یقیناً اس خوبصورتی کو نہیں سراہ سکتے۔



عنیزہ سید



"میرا [illegible] تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم اب اس کے پیچھے جا رہے ہیں نہ ہی اس کی کوئی بات کر رہے ہیں۔" بلال سلطان [illegible] ابراہیم کے لیے حوصلہ افزا ہر گز نہیں تھی۔

"[illegible] وہ لڑکی [illegible] آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس نے منمنا کر ایک کوشش مزید کرنا چاہی۔

"[illegible] میں بہت فارغ ہوں جو جب کوئی مجھ سے ملنا چاہے میں اس سے ملنے کے لیے [illegible] موجود ہوں۔" وہ سخت اور خشک لہجے میں بولے۔

"[illegible] جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں۔" ابراہیم نے زبان پھیر کر اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے [illegible] کہ اسے میں اپنے ساتھ لایا تھا۔" اس نے ایک جذباتی وار کھیلنے کی کوشش کی۔ "میں نے [illegible] انکل میری بات کو اون کرتے ہیں کیونکہ مجھے وہ اپنے بیٹے جیسا ہی سمجھتے ہیں۔"

۲۸

اٹھائیسویں قسط

رازی نے بلال سلطان کو مسکراتے دیکھا اور اس کا رکا ہوا سانس بحال ہوا۔

"آپ مسکرا رہے ہیں سر! جبکہ میں سمجھ رہا تھا کہ مس ماہ نور کے یوں چلے جانے پر آپ ناراض ہو سکتے ہیں۔" اس نے ان کے اچھے موڈ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔



"ہوں!" وہ مسکرا کر بولے۔ "بات ہی مسکرانے والی سنائی تم نے۔" انہوں نے رازی کی طرف دیکھ کر کہا۔
"رازی! کیا تم جانتے ہو کہ عشق اور آتش دونوں برابر کیسے ہو سکتے ہیں۔"
"عشق اور آتش!" رازی نے دہرایا اور اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سامنے دیکھتے ہوئے غور کرنے لگا۔
"اچھا چلو رہنے دو اگر نہیں پتا تو۔" وہ ہنس دیے۔ "دماغ پر زیادہ زور ڈالنے سے نقصان ہوتا ہے۔"
"لیکن صوفی سر!" رازی نے باچھیں پھیلائیں۔ "وہ ایک wise (ذہین) لیڈی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اسے ضرور پتا ہو گا عشق اور آتش دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔"
"واہ!" وہ ایک دفعہ پھر کھل کے ہنس دیے۔ "تم شاید دنیا کے واحد انسان ہو جو اپنی بیوی کی عقل مندی کا اتنا اور زوردار اعتراف کرتے ہو۔"
"آئی ایم آنرڈ سر!" رازی نے ان کی بات پر غور کیے بغیر باس کے ہنس دینے پر نوکری کے تقاضے پورے کرتے ہوئے کہا۔ بلال سلطان کو ایک بار پھر ہنسی آگئی۔
"تمہیں پنجابی آتی ہے رازی؟" انہوں نے اپنی ہنسی کو بمشکل ضبط ہوئے کہا۔
"آ آ آ۔" رازی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ فوری طور پر کیا جواب دے۔ جس سے نوکری پر کوئی زد نہ آئے۔
"آپ بولیں سر! اگر کوئی بات ہے پنجابی کی میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔"
"اچھا تو پھر سنو! ایک مشہور پنجابی کہاوت ہے کہ "جس تن لاگے اوہی جانے"
"اچھا سر!" رازی نے ایک بار پھر باچھیں پھیلائیں۔ "ویل سیڈ سر!"
"تمہاری سمجھ میں آیا اس کا مطلب کیا ہے۔"
"نہیں سر! لیکن جو بڑی بات ہوتی ہے، جو اچھی بات ہوتی ہے اکثر وہی کوٹ کی جاتی ہے، آپ نے بھی بڑی اور اچھی بات ہی کوٹ کی ہو گی نا سر!"
"ہوں!" بلال نے سرہلایا۔ "تمہیں پتا ہے میں نے یہ بڑی اور اچھی بات کیوں کوٹ کی؟"
"نہیں سر!"
"تم سے ماہ نور کا یوں چلے جانا سن کر مجھے یہ بات یاد آگئی۔" وہ سنجیدہ ہو گئے۔ "جس دل کو لگن لگی ہوتی ہے نا کسی چیز کی، وہی جانتا ہے کہ اس کا حال کیا ہے۔"
"ہوں، مجھے معلوم نہیں کہ مس ماہ نور کے دل کو کیا لگن لگی ہے سر! لیکن وہ اس طرح کیوں چلی گئیں پھر بھی۔"
"تم نہیں سمجھ پاؤ گے۔" بلال نے سرہلایا۔ "یہ بتاؤ سارہ کہاں ہے؟"
"مس سارہ اندر ہیں مس انجلینا ڈی اعتبر ڈریسر ان کے بال بنا رہی ہیں غالباً"۔
"اچھا!" بلال سلطان مسکرائے۔ "بہت اچھے اور وہ جو خاتون ہیں سیمی وہ؟"
"وہ بھی مس سارہ کے پاس ہی ہیں۔"
"صوفی سے بولنا" واپس آکر اپنے ساتھ سیمی کو بھی ایڈ کرلے مینجمنٹ میں۔ مجھے یقین ہے کہ "سیمی" ایک پرفیکٹ ہاؤس منیجر ثابت ہو سکتی ہیں۔"
"جی سر!" رازی کا دل ڈوبنے لگا۔
"ڈونٹ یو وری رازی!! اس سے تمہاری نوکری پر کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔" بلال سلطان اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے۔ "میرے پاس کام کرنے والے لوگ جب بھی کام چھوڑ کر گئے اپنی مرضی سے گئے۔ میں نے

خود بھی کسی کو فائر نہیں کیا لہٰذا تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"جی سر۔ تھینک یو سر!" رازی کو اطمینان ہوا۔

"سارہ، صوفی اور سیمی کے جانے کے اگلے روز میرا تین، چار روز کا بیگ تیار ہونا چاہیے۔" انہوں نے جاتے جاتے رک کر کہا۔

"کیا آپ بھی کہیں جا رہے ہیں سر؟"

"ہاں۔ ارادہ باندھ رہا ہوں۔ دیکھو، جانا ہوتا ہے یا نہیں۔" وہ کمرے سے باہر جاتے ہوئے بولے۔

"Yepice" بلال کے جانے کے بعد رازی نے ایک چھوٹا سا نعرہ مارتے ہوئے خود کو مخاطب کیا۔ "صوفی بھی جا رہی ہے اور باس بھی اور تم مسٹر رازی! بہت ہی زیادہ مزے کرنے والے ہو۔" اس نے اپنے شانے سے نامحسوس گرد انگلی کی مدد سے جھاڑتے ہوئے کہا۔ "ہیلو اسلام آباد اینڈ ڈانس نائٹ سیناریو۔ میں آ رہا ہوں۔" اس نے قدرے بلند آواز میں کہا اور کسی شوخ سی دھن پر سیٹی بجاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔



"مبارک ہو، تمہیں اسپتال سے ڈس چارج کیا جا رہا ہے۔" نادیہ نے اس کے کمرے میں آ کر کہا۔ اس نے اس میگزین پر سے نظر ہٹا کر نادیہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ تمہیں ڈس چارج کیا جا رہا ہے۔" نادیہ آگے بڑھی اور اس کے قریب مارننگ گلوری کے تازہ شگوفے پھول رکھنے لگی۔ اس نے نظر اٹھا کر سعد کی طرف دیکھا۔ اس کا شیو پھر بڑھ آیا تھا، وہ تکیوں اور کشنز کے سہارے بیڈ پر نیم دراز تھا۔

"تمہاری صحت بہت بہتر ہو رہی ہے، ماشاء اللہ!" نادیہ نے پھول رکھنے کے بعد کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تمہارے منہ پر یہ الفاظ کچھ زیادہ ہی چڑھ گئے ہیں۔" سعد نے میگزین ایک طرف رکھنے کے بعد کہا۔ "ماشاء اللہ، سبحان اللہ، الحمدللہ، ان شاء اللہ۔" وہ رک کر ذرا سا مسکرایا۔

"اور مزے کی بات یہ ہے کہ تمہارے اجنبی سے لہجے میں یہ الفاظ بہت اچھے لگتے ہیں۔"

"ہاں!" نادیہ نے بے نیازی سے کہا۔ "یہ الفاظ بولنا بہت ضروری ہیں کیوں کہ ان سے ہمارا ایمان ظاہر ہوتا ہے۔"

"اور تم نے یہ ایمان پکڑا کیسے؟" وہ مسکرا کر بولا۔

"میں شعوری کوشش کر کے اس کے پیچھے گئی۔"

"شعوری کوشش!" وہ چونکا۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں نے دنیا کے سب مذاہب کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ نہیں نکالا کہ یہ ہی اصل دین ہے بلکہ میں نے یہ سوچ لینے کے بعد کہ یہ ہی اصل دین ہے اس کا جائزہ لیا۔ میں نے سوچا اگر یہ میرے تعقل کے سوالات کے جواب نہ دے سکا تو پھر کسی اور طرف رجوع کر لوں گی، لیکن ہوا یوں کہ مجھے میرے سارے سوالوں کے جواب مل گئے، بہت تفصیل اور وضاحت کے ساتھ۔"

"تم نے یہ فیصلہ کیوں کر لیا کہ یہ ہی اصل دین ہے۔ تقابلی جائزہ کیوں نہیں لیا سب ادیان کا؟" سعد کے لہجے میں تجسس تھا۔ "تمہاری ممی بھی تو ایک مذہب سے تعلق رکھتی ہیں، اسی مذہب کے پیروکاروں کے درمیان تم نے اب تک کی عمر گزاری پھر تم نے اسی دین کا جائزہ لینے کا کیوں سوچا؟"

"اس لیے کہ۔۔۔ یہ میرے ڈیڈی کا مذہب تھا۔" اس نے نظریں اٹھا کر سعد کی جانب دیکھا۔

"ڈیڈی کا مذہب!" وہ ہنسا۔ "چاہے ڈیڈی کو دین مذہب جیسی کسی شے سے کوئی سروکار ہی نہ ہو' چاہے ڈیڈی کا اپنا کوئی دین ایمان ہی نہ ہو۔"

"یہ مجھے نہیں پتا۔" نادیہ نے سر ہلایا اور اٹھ کر سعد کی چھوٹی چھوٹی چیزیں سمیٹنے لگی۔

"میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ ڈیڈی سے منسوب چیزیں مجھے ہمیشہ اچھی لگتی رہی ہیں' میں ان سے ایک عجیب سا قلبی تعلق محسوس کرتی رہی ہوں۔ جیسے وہ گھر جو ڈیڈی کا تھا' جیسے وہ زبان جو ڈیڈی بولتے تھے' جیسے وہ شہر جس میں ڈیڈی رہتے تھے' جیسے وہ ملک جو ڈیڈی کا تھا۔" نادیہ کی آواز بھیگنے لگی۔ "ایسے ہی وہ مذہب بھی' جس کی ڈیڈی تقلید کرتے تھے۔" اس نے سعد کی اسپورٹس جیکٹ کو تہہ کر کے اپنے سینے سے لگایا اور مڑ کر سعد کی طرف دیکھنے لگی۔

"کتنی معصوم اور سیدھی ہے یہ لڑکی!" سعد نے دل میں سوچا۔ "اور جو کبھی یہ ڈیڈی کا وہ چہرہ دیکھ لے جو میرے سامنے بے نقاب ہو چکا ہے تو اس کی زندگی کی ساری فینسی نیشنز کیسے کٹاک کٹاک ٹوٹ جائیں۔"

"تم تیار ہو جاؤ' اسپتال کا عملہ تمہارے چیک اپ کے لیے آرہا ہے' اس کے بعد ڈسچارج سلپ مل جائے گی۔"

"ایک منٹ!" سعد نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ "مجھے ذرا سوچ لینے دو کہ ڈسچارج ہونے کے بعد مجھے کہاں جانا ہے۔"

"کیا مطلب' کہاں جانا ہے؟" نادیہ کی آنکھیں پھیلیں۔ "میرے ساتھ جانے کے علاوہ تم اور کہاں جا سکتے ہو۔"

"تمہارے ساتھ؟" سعد نے اس کی طرف دیکھا۔ "تمہارے ساتھ کہاں جاؤں گا میں؟"

"وہیں جہاں میں رہتی ہوں۔" وہ ہنوز اس کی جیکٹ سینے سے لگائے ہوئے تھی۔ "اور یقین جانو' وہ کوئی بری جگہ نہیں ہے۔" وہ اس کے قریب آئی۔ "میں اس کو تمہارے لیے اور بھی آرام دہ بنانے کی کوشش کروں گی۔ بس اب تم انکار مت کرنا۔۔۔ پلیز۔" سعد نے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا' جن میں خواہش تھی' التجا تھی اور حسرت بھی۔

"اچھا!" وہ سر جھکا کر بولا۔ "ہم وہیں چلیں گے۔"

"اوہ!" نادیہ نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ "مجھے یقین تھا' تم منع نہیں کرو گے۔"

سعد نے ڈبڈبائی ہوئی نظروں سے نادیہ کو خوش ہوتے دیکھا اور اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کی پوریں اپنی آنکھوں پر رکھ لیں۔



ادق باتیں مولوی سراج سرفراز کی سمجھ میں کم ہی آتی تھیں۔ اگر کوئی ان کے سامنے ایسی گفتگو کرتا بھی تھا تو وہ موٹے موٹے لفظ ذہن نشین کر کے بعد میں رابعہ بی بی سے ان کے معنی پوچھ لیتے تھے اور گفتگو کرنے والے کے سامنے سر ہلانے ہی پر اکتفا کرتے تھے' لیکن اس روز مولوی صاحب کی جان خوب چوہے دان میں پھنسی تھی۔ ان کا اکلوتا داماد افتخار احمد عرف کھاری اس سے پہلے کبھی بالمشافہ ان سے گفتگو کرنے نہیں بیٹھا تھا' ان دونوں کے درمیان جیسے چوری کا رشتہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے مختصر گفتگو پر ہی اکتفا کرتے تھے' لیکن اس روز کھاری ان

سے ان کی اپنی تاریخ کی باتیں چھیڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ ایسی تاریخ جسے مولوی صاحب نے بصد وقت بھلایا تھا۔

"دبھین جی تے کج نئیں بتاتیں مولی جی' آپ کو بھی تو پتا ہی ہوئے گا نا۔" وہ بہت سے سلے بخیے ادھیڑتا ہوا کہہ رہا تھا۔

"یہ کیا کہانی سنا رہا ہے۔" مولوی صاحب نے گھومتے دماغ کے ساتھ سوچا۔ "یہ سب جو اسے پتا ہے' ہمیں بھی' کہیں بیٹھ کر اسے سنایا گیا ہو گا مگر کب؟ اور مجھے خبر بھی نہیں ہوئی۔" انہوں نے سر اٹھا کر کھاری کی طرف دیکھا۔ "اس شخص کا بیٹا' ادھر اس گاؤں میں پہنچ گیا' رابعہ بیگم نے اسے دیکھ بھی لیا' پہچان بھی لیا اور اس کی کھوج میں اسے لگا بھی دیا اور مجھ سے ذکر تک نہیں کیا۔ وہ شخص جس نے آج تک ہمیں چوہے بلی کے کھیل میں الجھا رکھا ہے ذرا آہٹ ہوتی ہے اور لگتا ہے کہ بلی آئی کہ آئی۔ اس نے جھپٹا مارا کہ مارا۔"

انہیں ماضی کے جھروکوں سے جھانکتا ایک چہرہ نظر آنے لگا۔

"واہ رابعہ بی بی! عمر بھر تم نے مجھے جس اذیت کے ساتھ برداشت کیا اور خود کو ہمیشہ مجھ سے برتر خیال کیا تمہارے دماغ کا وہ غرور آج بھی نہیں گیا' جب ہی تو مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ کسی معاملے کی خبر مجھ کو بھی کر دیتیں۔" انہیں افسوس ہوا۔

"مولی جی۔" کھاری مضطرب نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ "تہانوں خبر ہوئے گی کہ سعد باؤ صاحب کا کوئی اور بھرا (بھائی) ہے کہ نہیں۔"

"سعد باؤ!" مولوی صاحب نے دل میں دہرایا اور ان کی نظروں کے سامنے من موہنی صورت والا ایک چھوٹا سا بچہ گھوما جو روتا تھا اور وہ اسے اپنے کندھے پر بٹھائے ادھر سے ادھر اس خیال سے چکر لگاتے پھر رہے تھے کہ اس طرح خوش ہو کر وہ رونا بند کر دے گا۔

"سعد باؤ کا قصہ کب دوبارہ کھل گیا۔" مولوی صاحب کو اپنی لاعلمی پر رونا آنے لگا۔

"مولوی جی آپ نے بھی تو اپنی آنکھوں سے سعد باؤ کی والدہ کو ذبح ہوتے دیکھا تھا نا۔" کھاری پوچھ رہا تھا۔ "پھر سعد باؤ کا کوئی اور بھائی تو پیدا نہیں ہو سکتا تھا نا۔"

مولوی صاحب اور تیکھے سوال' وہ اپنی سرمہ لگی آنکھوں سے کھاری کو دیکھتے ہی چلے جا رہے تھے۔

"مولوی صاحب! میں ہر طرف سے ہار کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ مجھے آپ ہی کچھ بتا دیں۔" کھاری تھا کہ فریاد کیے چلا جا رہا تھا۔

"تمہاری بھین جی جن سوالوں کا جواب نہیں دے پائیں برخوردار!" مولوی صاحب نے سر پر لپٹا چارخانہ صافہ کھول کر دوبارہ اسے سر پر باندھتے ہوئے کہا۔ "ان کے جواب میرے پاس ہو سکتے ہیں؟"

"نا کرو ایسا مولی جی!" کھاری تڑپ کر بولا۔ "تہانوں سب پتا اے۔"

"اللہ جل شانہ گواہ ہے۔ برخوردار! اس پوری داستان میں' میں تو ایک پٹے ہوئے مہرے کی طرح کبھی ادھر کبھی ادھر لڑھکتا رہا۔" مولوی صاحب نے سچائی کے ساتھ کہا۔ "سمجھ لڑھکایا جاتا رہا۔ مرحومہ آپا جی کے مجھ غریب پر بڑے احسان ہیں۔ وہ ان دنوں میرے لیے دو وقت کی روٹی کا بندوبست کرتی رہیں جب میں مسکین' یتیم مولوانوں کے گھر کی ڈیوڑھی میں پڑا ان کے گھر کے اوپر کے کاموں کے لیے بھاگتا پھرتا تھا اور ان کے گھر میں میرے لیے صبح شام دو وقت کی روٹی بھی نہیں پک سکتی تھی' کام کے عوضانے میں صرف چار لفظ قرآن پاک کی تفسیر کے سمجھا دیے جاتے اور حفظ قرآن میں معاونت دی جاتی تھی بس۔ ایسے میں اللہ بخشے آپا جی کو انہوں نے خود پیغام بھجوایا کہ دو وقت کی روٹی کنڈی بجا کر ان کے دروازے سے لے جایا کروں۔ بس اسی احسان نے مجھے ان کا غلام بنایا' رابعہ بی بی کا شوہر بنایا اور پھر سعدیہ بٹی کا باپ بنا دیا اور پھر اسی احسان کا انجام وہ دربدری' وہ چوروں کی طرح رات کے

اندھیروں میں ایک شہر سے دوسرے شہر نقل مکانی مقدر بن گئی۔

میں نہ تب کچھ جانتا سمجھتا تھا جب وہ سب ہو رہا تھا نہ ہی اب تک کچھ جان سکا ہوں' سمجھ سکا ہوں اسی لیے تو ماضی کے وہ سارے باب میں نے بھلا دیے ہیں۔ اللہ جل شانہ نے برسوں کے دھکوں اور مشقتوں کے بعد یہ سکون کا ٹھکانا نصیب فرمادیا ہے۔ عزت کی زندگی پہلی دفعہ جی رہا ہوں' زیادہ کٹ چکی' تھوڑی رہ گئی ہے' اللہ جل شانہ سے درخواست ہے' یہ بھی اچھی گزر جائے عزت کے ساتھ۔"

اب کے مولوی صاحب کو ہونقوں کی طرح منہ کھول کے دیکھنے کی باری کھاری کی تھی اور وہ دیکھے چلا جا رہا تھا۔

"میری تم کو بھی یہ ہی نصیحت ہے برخوردار!" مولوی صاحب کھاری کا ہونق پن دیکھ کر ایک دم سمجھ دار ہوگئے۔ "زیادہ تفتیشوں میں مت پڑو' جو گزر چکا وہ گزر چکا' جو ہو رہا ہے' اسے ہونے دو کیونکہ ہونی کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ چوہدری صاحب تم سے بہت پیار کرتے ہیں' تمہارے لیے اتنا ہی بہت ہے' چوہدری صاحب کی محبت کے سبب تمہیں رابعہ بیگم کی بیٹی کا ساتھ مل گیا۔ تمہاری زندگی سنور گئی۔ بس اب ادھر ادھر کے سوال کیسے' مزے سے گزارتے چلے جاؤ اپنی زندگی۔"

"سعدیہ صرف بھین جی دی بیٹی تو نئیں نا' آپ کی بیٹی وی تو ہے نا۔" کھاری کا دماغ مولوی صاحب کی گفتگو کے ایک نکتے پر اٹک گیا۔

مولوی صاحب کے چہرے پر مبہم سی مسکراہٹ ابھری۔ "میری بھی بیٹی ہے' لیکن وہ ہمیشہ سے ماں کے زیادہ قریب رہی ہے۔ اس کی تربیت' تعلیم' سلیقہ سب ماں کی محنت کا نتیجہ ہے۔"

"خیر۔" کھاری نے سر جھٹکا۔ "تو اس کا مطلب ایہہ وے کہ آپ بھی مجھے کچھ نہیں بتائیں گے۔"

"میرے پاس کچھ بتانے کو ہو تو بتاؤں نا!" مولوی صاحب نے دزدیدہ نظروں سے مسجد کے داخلی دروازے کی طرف دیکھا۔ ابھی تک ان کا ناشتہ نہیں آیا تھا۔ ان کے دل کو بے چینی سی ہونے لگی تھی۔ "جو مجھے پتا ہے نا۔" وہ دوبارہ کھاری کی طرف دیکھ کر بولے۔ "وہ تم نے خود سنا دیا۔ اب میں کیا بتاؤں۔"

"سعد باؤ دا بھرا!" کھاری نے کہا۔

"نہیں۔" مولوی صاحب نے سر ہلایا۔ "وہ ہو نہیں سکتا' ہوتا تو ہمیں ضرور خبر ہوتی۔" کھاری کی آخری امید پر بھی منوں پانی پڑ گیا۔

"لیکن اگر کوئی ہوتا بھی تو برخوردار! تمہیں اس کی اتنی کھوج کیوں ہے؟" مولوی صاحب نے پوچھا۔

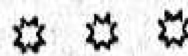
"کچھ نئیں مولی جی بس خوامخواہ۔" کھاری نے سر جھکا کر آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے ان کی نمی خشک کی۔

"چلو بھئی وہ دیکھو۔ ناشتہ آگیا۔" اتنے میں ایک بچہ پیتل کا ناشتہ دان اٹھائے مسجد میں داخل ہوا تو مولوی صاحب کے گویا سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا۔

"چھوڑو سارے سوال اور بھول جاؤ ساری فکریں۔" انہوں نے ناشتہ دان کھولتے ہوئے کھاری سے کہا۔ "ناشتہ کرو' ناشتہ۔ بھئی برخوردار!" انہوں نے ناشتہ لانے والے کو مخاطب کیا۔ "بھاگ کر گھر سے ایک گلاس اور پکڑ لاؤ۔ امی سے کہنا' سعدیہ باجی کا میاں افتخار احمد بھی ناشتہ ادھر ہی کرے گا۔" لڑکا سر ہلاتا بھاگ گیا۔

"او نئیں مولی جی!" کھاری اٹھتے ہوئے بولا۔ "مجھے بھکھ نہیں ہے۔"

"او ہو برخوردار! بیٹھو تو سہی چکھو تو سہی۔" مولوی صاحب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔



"میں آپ کا ایک ادنیٰ پرستار' آپ کے فن کا ایک حقیر سا قدردان' ملاقات کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں' کیا

شرف ملاقات حاصل ہو سکتا ہے؟ وقت؟"

خالص اردو ٹائپنگ میں بھیجا پیغام فلزا نے حیرت سے پڑھا اور سوچ میں پڑ گئی۔ بھیجنے والا کون ہو سکتا تھا۔ پیغام میں انڈر ٹون کی طرح بجتا انداز' مانوس سا لگ رہا تھا' لیکن وہ مانوس کون ہو سکتا تھا یاد آ کر نہیں دے رہا تھا۔ وہ دو دن ذہن پر زور دینے کی کوشش کرتی رہی' مگر یاد نہ کر پائی تھی۔

"آپ کی جانب سے جواب نہ موصول ہونے پر تشویش ہے۔ امید ہے کہ آپ کے مزاج بخیر ہوں گے۔" دو دن کے بعد اسی نمبر سے دوسرا پیغام وصول ہوا۔

"کون ہو سکتا ہے' جس کے پاس میرا نمبر ہو اور وہ ایسے پیغامات بھیجے۔" فلزا نے سوچا۔ "میرا نمبر تو بہت ہی محدود لوگوں کے پاس ہے۔"

"لیکن بات کہنے کا انداز کتنا مانوس ہے' یوں جیسے کوئی عرصے سے جانتا ہو' انداز سے بے تکلفی جھلکتی ہے اور اپنائیت بھی۔" پھر ایک نام نے اس کے ذہن میں روشنی کی طرح کوندا مارا۔

"اچھا تو یہ تم ہو۔" وہ بے اختیار مسکرائی۔ "تمہاری سرپرائز دینے کی عادت نہ گئی۔" اس کا ذہن ہلکا پھلکا ہونے لگا۔

"واہ سعد سلطان! اتنے عرصے کے بعد یاد بھی کیا تو کس انداز میں۔" وہ مسکراتے ہوئے سوچنے لگی۔ "ہاں تم سے ملاقات تو بہت ضروری ہے اور کرنی بھی ہے۔"

"ہاں ضرور ملاقات ہو سکتی ہے' چوہدری سردار کا فارم ہاؤس تمہارے لیے نئی جگہ تو نہیں ہو گی' اسی ویک اینڈ پر میرا وہاں جانا متوقع ہے' تم بھی آ جاؤ۔ ملاقات ہو جائے گی۔" اس نے اس نمبر پر جواب بھیجا تھا۔



سعد کا آئی فون اب وہ ہر وقت چارج ڈ رکھتی تھی' خود کو در پیش معمے کے حل کے لیے اسے سعد کے دیے ہوئے کلیوز کی کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی تھی' لیکن اس رات سے اب تک اس کا دل سعد کے آئی فون کی طرف دیکھنے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔

"کیا فائدہ ساری مارا ماری کا' کیا ضرورت جستجو میں پڑنے کی۔" اسے بے وجہ رونا آ رہا تھا۔

"سعد کے صاف اعترافات کے بعد بھی میرا دل کیوں بے یقین ہو جاتا ہے' جب میں سارہ خان کی طرف دیکھتی ہوں' کیسی مقدر کی سکندر لڑکی ہے وہ' پہلے سعد سلطان کی ہتھیلی کا پھپھولا بنی رہی اور اب بلال سلطان نے اسے جان کے ساتھ لگا رکھا ہے اور میں..." اس کا دل اڑنے لگا۔ "میں کون ہوں اس سارے چکر میں..."

"پس منظر میں اصل منظر تلاش کرنے کی کوشش کیجیے بی بی صاحب!" اسے اختری کی کہی بات یاد آئی۔ "انا اور گمان کی پٹی نظروں سے اتار دیجیے۔ آپ کو منظر صاف صاف نظر آنے لگے گا۔"

"مگر منظر ہے کہاں؟" اس نے بے دلی سے ہاتھ میں پکڑا آئی فون ایک طرف ڈال دیا۔

"تم تو بلال سلطان سے ملاقات کرنے اور ان سے کھاری کی حقیقت معلوم کرنے گئی تھیں نا۔ تمہیں اس سے کیا واسطہ کہ بلال سلطان کے گھر میں اب سارہ خان رہتی ہے یا انجلینا جولی' تم کیوں یہ خبر سنتے ہی وہاں سے واپس بھاگ لیں۔" اچانک دماغ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔

"ایک بار پھر پیش منظر دیکھ کر انا' گمان اور فریب کا شکار نہیں ہو گئیں کیا تم؟" دماغ روبرو آ کر کھڑا ہو گیا۔

"اگر تم رک کر انتظار کرتیں تو کیا پتا بلال سلطان سے ملاقات میں معاملے کی اصل شکل تمہارے سامنے آ جاتی۔"

"ہونہہ!" دل نے بے زاری ظاہر کی۔ "تمہاری بلا سے بلال سلطان کے گھر سارہ خان رہتی ہے یا کوئی اور تمہارا اس معاملے سے کیا لینا دینا۔ تمہارا تعلق سعد سلطان سے ہے اور تمہیں اسی کی کھوج لگانی ہے' بلال سلطان جیسے روکھے اور بددماغ آدمی سے مل کر فائدہ بھی کیا ہونا تھا' ان کا کیا ہے' چاہے تو سامنے دیکھ کر بھی ملاقات سے انکار کردیتے۔" دل نے اس کے جذبات کا دفاع کیا۔

"لیکن۔" دماغ کچھ کہنا چاہتا تھا' لیکن اسی دم حیرت انگیز طور پر سعد کا آئی فون بجنے لگا۔

دشت تنہائی میں اے جان جہاں لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے' تیرے ہونٹوں کے سراب

اس نے تیزی سے ہاتھ بڑھا کر فون پکڑا' مخصوص کالر ٹیون کے ساتھ فون کی اسکرین پر دی آرٹسٹ کا نام روشن ہو رہا تھا۔ ازلی و ابدی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے فون آن کرکے کان سے لگالیا۔

"جتنے تمہارے چہرے ہیں' شاید اتنے ہی نمبر بھی اپنے نام رجسٹر کروا رکھے ہیں تم نے۔" کال کرنے والی بغیر کسی سلام دعا کے شروع ہوگئی۔ "اتنے دن سے یہ نمبر بند کر رکھا تھا نا تم نے اور اپنی دانست میں غائب بھی تھے' دیکھ لو جس دوسرے نمبر سے تم نے مجھے اپنے تئیں گمنام پیغام بھیجا میں نے نمبر بھی پہچان لیا اور پیغام بھی۔ یہ بتاؤ کدھر چھپے ہوئے ہو۔ یہ بات پوچھنے کے لیے میں نے دانستہ اس مانوس نمبر پر کال کی چیک کرنے کے لیے کہ جو میں سمجھ رہی ہوں' وہ ٹھیک سمجھ رہی ہوں یا نہیں اور دیکھ لو میں ٹھیک سمجھی۔"

ماہ نور نے بے یقینی کے ساتھ بے تکلفی کے اس مظاہرے کو سنا اور فون کان سے ہٹا کر ایک بار پھر اس کی اسکرین کو یوں دیکھا جیسے اس میں کال کرنے والی کی تصویر نظر آرہی ہو۔ پھر اس نے دوبارہ فون کان سے لگالیا۔

"اب خاموش کیوں ہوگئے' لگ گئی نا چپ' ہوگئے نا گنگ؟" وہ آواز کہہ رہی تھی۔ "تم نے ملاقات کا وقت مانگا ہے نا؟" ماہ نور کے کان کھڑے ہوئے۔

"تو ملاقات تو بہت ضروری ہے' ماضی کی آغوش میں سوئے جس قصے کو تم چھیڑ گئے تھے اس کی بازگشت کے پیچھے چلتی میں بھی ادھر ہی پہنچ گئی جہاں سے تم سن کر میرے پاس آئے تھے' میں ممنون ہوں کہ تم نے زندگی بھر اپنی طرح میرے سینے میں گڑے تیر کو یوں ہلایا کہ وہ نکالا ہی چاہتا ہے' ہیلو۔ ہیلو۔ ارے اب بولتے کیوں نہیں میری مردم شناسی پر کہیں بے ہوش تو نہیں ہوگئے۔" ہنسی کی آواز۔ "چلو نہ بولو۔ بس اتنا بتادو کون ہے نا وہاں ملاقات جہاں میں نے تمہیں بتایا ہے۔ ہیلو۔ ارے ہو نا۔ ہیلو۔ ہیلو!"

آواز کہہ رہی تھی اور کہے جارہی تھی' لیکن ماہ نور کال کاٹ چکی تھی۔

"دی آرٹسٹ۔" اس نے کال لاگ کو چیک کیا۔ اس نمبر اور نام سے آنے والی کالز اور میسجز کی پوری تاریخ فون میں محفوظ تھی۔ اس نمبر سے دوبارہ دوبار کال آئی' لیکن اس نے وصول نہیں کی۔ وہ اس نمبر کی تاریخ دیکھ رہی تھی۔ فون کالز کی تعداد محدود مگر موجود تھی۔ پیغامات ذو معنی اور ناقابل فہم۔ یہ کون تھی جو اس قدر آشنا اور بے تکلف تھی۔

سوچ کا ایک در مزید وا ہوگیا۔ "دشت تنہائی میں' یہ وہی کالر ٹیون تھی جس کی کال کھاری کی شادی پر جاتے ہوئے راستے میں سعد نے چار بار کاٹی تھی اور اس کے پوچھنے پر کہا تھا۔

"تم یہاں بہت خوش ہو۔ میں تمہیں بتا کر ناخوش نہیں کرنا چاہتا۔"

"اوہ خدا! یہ کیا گورکھ دھندا ہے اور اس میں کہاں۔ میں پھنس گئی۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے سوچا اور دوبارہ فون کی طرف متوجہ ہوئی۔

فضل دین ولد کرم الٰہی

سائیں ڈھوک کھوکھراں نزد چکری وکیلاں
تحصیل گوجر خان ضلع راولپنڈی

اس نمبر سے آنے والے ایک پیغام میں ایک پتا بھیجا گیا تھا۔
فضل حسین اور میمونہ آنٹی۔" ماہ نور کو اب تک اس معمے کے تمام ٹکڑے ازبر ہو چکے تھے اس نے چونک کر اس پیغام کو بار بار پڑھا جس کے جواب میں سعد کی طرف سے بھرپور شکریہ ادا کیا گیا تھا۔
"فضل دین ولد کرم الہی۔"
اس نے ایک مرتبہ پھر پڑھا اور اپنے فون میں موجود نقشوں والی سہولت میں ڈھوک کھوکھراں نزد چکری وکیلاں کا نقشہ تلاش کرنے لگی۔



اس کی نظروں کے سامنے روشنیاں تھیں اور رنگ تھے۔ شور تھا' قہقہے' تالیاں' سیٹیاں پر اس کے کان ہر ہر صورت کو سن رہے تھے۔ وہ ان سب سے مانوس تھا۔ شاید وہ ایسی ہی رونقوں میں پلا بڑھا تھا' مگر ایسا کیوں تھا کہ اب یہ رونقیں بھی اسے سیاہ عباؤں میں ملبوس ماتم کرتی مخلوق نظر آنے لگی تھیں' مگر وہ پھر بھی اس سب کا حصہ اور ان کے درمیان موجود تھا۔

پنڈال سے باہر نکل کر اس نے اپنے سر پر رکھی پیلی وگ اتار کر ہاتھ میں پکڑی اور خود چھولداریوں کے قریب گرے درخت کے ایک موٹے تنے پر بیٹھ گیا اس کے سامنے روشنیاں اور رنگ تھے۔ لوگ باگ' زندگی کی مصروفیات' مسائل اور پریشانیوں سے منہ موڑ کر گھڑی دو گھڑی کی اس تفریح کی طرف بھاگے چلے آتے تھے اور وہ سب جو یہاں آنے والوں کے لیے تفریح کا' خوشیوں کا' تالیوں اور سیٹیوں کا اہتمام کرتے تھے۔ خود اپنے مسائل اور پریشانیوں کا کیا علاج کرتے تھے' کون جانتا تھا۔

وہ سامنے دیکھتے ہوئے سوچتا چلا جا رہا تھا تب ہی اسے اپنے شانے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ اس کے پیچھے اسی تنے پر خان چاچا بیٹھا تھا۔

"کیا بات ہے شہزادے! کئی دن سے میں دیکھ رہا ہوں' کچھ اداس اداس ہے تو۔" خان چاچا نے اس سے پوچھا تھا۔

وہ کچھ دیر تک اسے جواب دینے کے بجائے خاموش بیٹھا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ خان چاچا جس نے بلیو ہیون سرکس کو اپنی زندگی کے بہترین سال دیے تھے۔ برسوں اس نے خان چاچا کو ہاتھ میں پتلی چھڑی پکڑے' باریک چمڑے جڑی لاٹھی پکڑے کرتب بازوں کو مختلف کرتب سکھاتے دیکھا تھا' کرتب سکھانے والا خان چاچا دل' گردے اور جگر کا اتنا سخت تھا کہ بڑوں' بچوں' مردوں' عورتوں' جانوروں کی پنڈلیوں' پیروں اور پشتوں کی کھالیں اڑاتے اسے ذرا سا بھی رحم نہیں آتا تھا۔ اس کا کام کرتب بازوں کو تربیت دینا تھا اور اس معاملے میں وہ کسی کو اس وقت تک بخشنے کا قائل نہیں تھا جب تک سیکھنے والے کی ایک ایک جنبش اس کے قابو میں نہ آجاتی۔

اسی خان چاچا نے بلیو ہیون سرکس کے لیے شیروں کو بلیاں اور ہاتھیوں کو چوہے بنا کر ان سے کام لیا تھا۔ اس کے سدھائے جانور سرکس رنگ میں جا کر یوں اشاروں پر حرکت کرتے تھے جیسے جنگل کی وحشت سے ان کا دور دور تک واسطہ نہ ہو۔ اس کے تربیت یافتہ نٹ' ایکروبیٹس' مسخرے' جادوگر بلیو ہیون سرکس کو دل کھول کر کما کر دیتے رہے تھے۔

مگر اب یہ ہی خان چاچا بوڑھا ہو رہا تھا بلکہ شاید بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس نے خان چاچا کی جھلسی ہوئی سیاہ پڑتی

رنگت، سفید بالوں جن کو کن پٹیاں چھوڑ کر اس نے سرخ مہندی میں رنگ رکھا تھا۔ پیلے اور کیڑا کھائے ہوئے دانتوں اور کھنچی ہوئی جلد والے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور گزرتے ہوئے ماہ و سال کے چکر پر مزید ایمان لے آیا۔

"دیکھ کیا رہا ہے، بتانا؟" خان چاچا نے اسے خود کو یوں گھورتے دیکھ کر ہولے سے ہنس کر کہا اور جیب سے سستے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر اس میں سے ایک سگریٹ باہر کھینچ لیا۔

"تم ریٹائر ہو گئے ہو خان چاچا! یا دل چھوڑ دیا ہے، پریکٹس رنگ میں کبھی نظر نہیں آئے۔" اس نے خان چاچا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"لے!" وہ ہنس دیا۔ "سوال تو میں نے تجھ سے کیا تھا تو نے جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ ہی سے سوال کر دیا۔"

"بتانا!" اس نے اصرار کیا۔

"دیکھ میرے شہزادے! وقت انسان کی عمر کو آگے دوڑاتا چلا جاتا ہے۔" خان چاچا نے سگریٹ کا دھواں ناک سے چھوڑتے ہوئے کہا۔ "عمر کے گھوڑے کی باگ کسی کے ہاتھ میں نہ کبھی آئی ہے نہ آئے گی، ہر بندہ اس سرپٹ دوڑتے گھوڑے کے ساتھ بس بھاگا چلا جاتا ہے اس کا خیال ہوتا ہے کہ زندگی کا سامان کر رہا ہے' اسی لیے فرصت نہیں ہے، پر پھر ایک دن اس گھوڑے کا دوڑتا قدم پہلی بار ٹھٹکتا ہے' پھر غلط پڑتا ہے پھر ٹھوکر کھاتا ہے ٹھوکر کھا کر گرتا ہے' سنبھلتا ہے' اٹھتا ہے پھر سے دوڑنے کی کوشش کرتا ہے' مگر نہ وہ چال رہتی ہے نہ ہی رفتار۔ اس وقت بندے کو پتا چلتا ہے۔ عمر گزر گئی اب بونس کی زندگی شروع ہو گئی۔"

"ہاہا۔ بونس کی زندگی!" وہ ہنسا۔

"ہاں۔ میرے جاپانی شہزادے، بونس کی زندگی۔" خان چاچا نے سر ہلایا۔ "بس جمع خرچ حساب کتاب، یہ ہی رہ جاتا ہے باقی انسان کی زندگی میں، میری بھی عمر گزر چکی ہے۔ اب میں بونس والے سالوں میں داخل ہو چکا ہوں، حساب کتاب، جمع خرچ۔" اس کے اپنے کیڑا کھائے دانت نکالے اور سگریٹ کا کش لگانے لگا۔

"جمع خرچ، حساب کتاب!" وہ بڑبڑایا۔ "خان چاچا اس جمع خرچ حساب کتاب میں ابھی پریا کے کھاتے کی باری بھی آئی کہ نہیں۔" اس نے خان چاچا کی طرف دیکھا۔ "پریا، میرا مطلب ہے پریا رانی!"

اس کا سوال سن کر خان چاچا کا سگریٹ کا کش لینے کے لیے منہ کی طرف جاتا ہاتھ وہیں رک گیا۔

"اس کا کھاتہ جانے دے یار۔" اس نے ہاتھ جھٹک کر ادھ جلی سگریٹ دور پھینک دی۔

"اس کا کھاتہ کیسے جا سکتا ہے خان چاچا' تم نے اسے اپنے ہاتھوں پالا پوسا' اسے سرکس کی شہزادی بنایا اور پھر اسے بھول گئے' کیسے مانوں تم اسے بھول گئے۔"

"یادداشت ختم ہو جائے تو ذہن سے نام مٹ جاتا ہے' شکل بھول جاتی ہے پر میں کیا کروں میری تو کم بخت یادداشت بھی قائم ہے' ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔" خان چاچا نے سر دونوں ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے کہا۔

"پھر اس کا کھاتہ کیسے جانے دو گے' یہ بتاؤ۔"

"رات کو سونے کے لیے لیٹتا ہوں نا شہزادے! تو فلم چلتی ہے آنکھوں کے سامنے۔" خان چاچا نے سامنے دیکھا۔ "وزیر آباد لگا تھا سرکس جس کے ختم ہونے پر اپنے خیمے اکھاڑتے ہوئے ہماری نظر اس چند مہینوں کی بچی پر پڑی تھی جس کی ماں یا شاید جس کا باپ اسے ننگی زمین پر روتے ہوئے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔"

"ایسا!" اس نے یہ بات پہلی بار سنی تھی۔

"ہاں ایسا ہی۔" خان چاچا کے چہرے پر تلخی پھیلی۔ "شیرو نے بچی اٹھائی تھانے لے گیا۔ مسجدوں میں اعلان کرائے، رپورٹ درج کرائی، سرکس تین دن وزیر آباد میں ہی رکا رہا پر بچی کے ہوتوں سوتوں کا کوئی پتا نہیں چلا۔

رکھے ہیں جیسے بچی کو یوں سنبھالا جیسے وہ ہم میں سے ہر کسی کی ہی بچی ہو' وہ ننھی بھی اتنی ہی پیاری کہ سب ہی کو اس سے پیار آ جاتا تھا۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ کوئی دعوے دار نہ آیا نہ ہی پولیس کسی ماں کو' کسی باپ کو ڈھونڈ سکی۔ شیرو کو اتنے دنوں میں نئی سوجھ بوجھ تھی اس نے پولیس سے معاملہ کر لیا' بچی سرکس کے قافلے کے ساتھ اگلے پڑاؤ پر روانہ ہو گئی۔"

"بے چاری' بے نام نشان بچی۔"

"ہاں بے نام نشان بچی۔" خان چاچا نے سر ہلایا۔ "لیکن اس میں ہم میں سے کسی کا کوئی قصور نہ تھا کہ وہ بے نام نشان تھی۔"

"یہ بھی ہے۔"

"اس دنیا میں یہ واقعہ کوئی غیر معمولی نہیں کہ کوئی یوں بے نام و نشان بچہ کہیں پھینک گیا' آئے روز ایسے واقعات ہمیشہ سے ہی رونما ہوتے رہتے ہیں۔" خان چاچا نے کہا۔

"اور پھر اس کے بعد شیرو نے وہ بچی آپ کے حوالے کر دی؟" اس نے سوال کیا۔

"اس نے نہیں' میں نے خود لے لی' میں نے اس سے کہا۔ بچی کے ہڈ پیر سخت ہو جائیں گے تو میرے حوالے کرو گے' اسے ٹریننگ دو گے پھر کام مشکل ہو جائے گا۔ بہتر ہے ابھی سے مجھے پکڑا دو بچی۔"

"اور یہ نہیں سوچا تھا کہ بچی ہیومین سرکس کا سرمایہ بننے والی تھی۔"

"ہاں۔" خان چاچا عجیب سے انداز میں ہنسا۔ "شیرو کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اللہ نے اسے چھپر پھاڑ کر عطا کیا تھا ایک بچی جو آنکھ ہی سرکس کی آغوش میں کھولنے والی تھی' اسے سرکس کی شہزادی بننے سے کون روک سکتا تھا۔"

"اور پھر آپ نے اس کی ہڈیوں اور پیروں کو اٹھایا ہی اس ساخت پر کہ وہ لچک کی اعلا مثال بن گئے۔"

"ہاں۔" خان چاچا کے چہرے پر دکھ کا تاثر ابھرا۔ "اس بچی کو احساس ہونے دیے بغیر کہ وہ کس مقصد کے لیے پال پوس جا رہی ہے' میں نے اسے اپنی انگلیوں کے اشاروں پر حرکت کرنا سکھا دیا۔"

"اور آپ کو ایک بار بھی خیال نہ آیا کہ اگر وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں ہوتی تو وہ کبھی اپنی بچی کو ایسی اذیت کا شکار نہ بننے دیتے۔"

"اس کے ماں باپ۔" خان چاچا کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ پھیلی۔ "وہ جو اس کے کبھی تھے ہی نہیں' وہ جو خود ایسے سنگ دل تھے کہ بچی کو عین سامان بردار گھوڑا گاڑی کے پہیے کے قریب یوں رکھ کر بھاگ لیے کہ ادھر کوئی انجانے میں گھوڑے کو چابک مارتا' ادھر گھوڑا گاڑی سرکتی اور بچی کے اوپر سے گزر جاتی۔ ایسے ماں باپ کے بارے میں یوں سوچتے ہو؟" خان چاچا نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"اور وہ آپ سے جھرجھری آ گئی۔"

"میں نے تو پھر بھی مقدور بھر کوشش کی اسے پڑھانے لکھانے کی' نینسی پیٹر کے پاس اسے بٹھا آتا تھا جو اسے پڑھاتی بھی تھی' پریوں کی دنیا کی' جادو کی دنیا کی کہانیاں سناتی تھی' میری ان ہی کوششوں کی وجہ سے ہی تو وہ سرکس کی باقی لڑکیوں سے بہت مختلف بہت منفرد تھی۔"

"مگر آپ یہ نہیں بھولیں کہ کرتبوں میں مہارت حاصل کرتے ہوئے آپ کے چابک اور چھڑی نے کتنی بار اس کی کھال ادھیڑی تھی۔" اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

"ہاں مجھے یاد ہے' مگر یہ تو اس دنیا کا حصہ ہے۔ ہم اسے کتنا بھی منفرد بنا لیتے' بننا تو پھر بھی اسے سرکس ہی کا حصہ تھا اور وہ تو سرکس کی بچی تھی۔ اس کا مقابلہ کوئی دوسرا کیسے کر سکتا تھا۔ اس کی مہارت ہماری عزت تھی۔ وہ تو

ہماری پریا رانی تھی۔"

"ہاں جب ہی... وہ ہارے گری تو آپ سب اس کے پس منظر سے نکل کر کہیں اور چلے گئے۔ یوں جیسے کبھی اس کی زندگی کا حصہ ہی نہیں تھے۔ شیرو تو خیر ہے ہی پیسہ بنانے والا بندہ۔ اس کے رشتے ناتے' دوستی تعلق سب پیسے سے جڑے ہیں' لیکن آپ... خان چاچا! آپ تو اس کے خان بابا تھے۔ آپ نے تو ذرا سی بچی کو اپنے ہاتھوں پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ آپ نے کیسے اسے گرنے کے بعد سسک سسک کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔"

"ہاں... میں نے اسے مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔" خان چاچا کا لہجہ بے تاثر ہو گیا۔ "میں یہ ہی چاہتا تھا کہ وہ مر جائے۔"

"لیکن کیوں؟"

"وہ جس طرح زخمی ہوئی تھی' بچ بھی جاتی تو چارپائی پر پڑی بے بسی کی تصویر بنے رہنے کے سوا اس کی کوئی زندگی نہیں تھی۔ میرے وسائل کتنے محدود ہیں' تم جانتے ہو' شیرو اور اس کے بندے زخموں سے جراثیم پیدا کرتی اس لڑکی کو زیادہ دن برداشت کرتے نہ ہی اس کی دوا دارو اور خوراک کا انتظام کرتے' وہ سسکتی تھی نا' چند دن بعد اس نے ایڑیاں رگڑنی تھیں اور اس کی وہ اذیت میری برداشت سے باہر ہو جاتی' اسی لیے میں چاہتا تھا' وہ مر جائے جتنی جلد ہو سکتا تھا مر جائے۔"

"خان چاچا! رشتوں کی' تعلق کی' محبت کی کوئی ویلیو ہی نہیں۔" الفاظ بہت مشکل سے اس کے منہ سے نکلے۔

"محبت تو تم بھی اس سے کرتے تھے نا۔ تم کیوں بھاگ لیے تھے اسے چھوڑ کر' کیوں نہیں اس کے ساتھ ساتھ رہے۔" خان چاچا کے لہجے میں تلخی ابھری۔

"وہ رات یاد ہے آپ کو جب شیرو... آپ اور دوسرے چند خاص لوگ جن میں آنٹی پیٹر بھی شامل تھیں' اکٹھے بیٹھے تھے۔"

"یاد ہے۔" خان چاچا کا لہجہ ایک بار پھر بے تاثر ہوا۔

"اس رات میں کتنا بولا تھا' چیخا تھا' چلایا تھا' میں نے سب کے سامنے ہاتھ جوڑے' منتیں کی تھیں' عمر بھر بلیو ہیون کے لیے بلا معاوضہ کام کرنے کی بات کی تھی۔ اگر وہ سب پریا رانی کا علاج کروا دیتے' لیکن کیا وہاں کوئی ایک کان بھی ایسا موجود تھا جس نے میری سنی' کوئی ایک ایسی زبان تھی' جس نے مجھے دھتکارا نہ ہو۔ احمق اور پاگل نہ کہا ہو۔"

"نہیں۔ کوئی ایک بھی نہیں۔" خان چاچا سامنے دیکھ رہا تھا "بلکہ ان میں چند زبانیں ایسی بھی تھیں جو تم دونوں کے تعلقات کو مشکوک قرار دے کر کیچڑ اچھال رہی تھیں۔"

"پھر... پھر بھی آپ کہتے ہیں' میں بھاگ لیا' میں کیوں بھاگ لیا؟" اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں درد اتر آیا۔ "میں اس لیے بھاگ لیا کہ مجھ سے اتنے سفاک رویوں کا سامنا نہیں کیا جاتا تھا۔ مجھ سے پریا رانی کی اذیت برداشت نہیں ہوتی تھی۔ میں بھاگ لیا۔ شاید سرکس سے باہر مجھے کوئی ایسا کام مل جائے کہ میں جس سے کم دنوں میں اتنا کما لوں' جس سے اس کی تکلیف میں کچھ کمی آ جائے۔ آپ کو کیا پتا خان چاچا! اس کے علاج کے لیے پیسہ کمانے کی خاطر میں نے چاہا' میں چور بن جاؤں' میں ڈاکو بن جاؤں کہ سب سے زیادہ تیزی سے پیسہ اسی کام میں ہاتھ لگتا ہے' لیکن میری بدقسمتی میں چاہنے کے باوجود وہ بھی نہیں بن سکا۔" اس نے مایوسی سے سر جھکا لیا۔

"مجھ سے بنا ہی نہیں گیا اور جب میں کچھ نہیں کر سکا تو میں نے خود کو تقدیر کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ جدھر تقدیر لے گئی میں چلتا گیا۔ میں نے دل سے ساری یادیں' ساری شکلیں نکال پھینکیں' نہ میں کچھ یاد کروں' نہ مجھے اذیت کا احساس ہو' حالانکہ اذیت تو میرے ہر طرف تھی' میرے اندر' میرے باہر' میرے دائیں بائیں' آگے پیچھے'

پر یارانی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرچکی ہوگی کوشش کے باوجود یہ اذیت ہر دم میرے ساتھ تھی۔"

"یہ اذیت ہر دم میرے بھی ساتھ ہے۔" خان چاچا نے نئی سگریٹ نکالتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ سوچ لیتا کہ پری مرچکی ہے مجھے سکون دیتا ہے 'مرجانا اس اذیت سے بہتر ہے 'جو دوسری صورت میں اسے سہنی پڑتی۔"

"وہ مری نہیں خان چاچا!" ر کونے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "وہ زندہ ہے" اسی دنیا میں بلکہ اسی ملک میں رہتی ہے۔"

خان چاچا سکتے کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ دیر تک اسے یوں ہی دیکھتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی انگلیوں میں دبی سگریٹ جلتے جلتے اپنے اختتام کو پہنچ گئی اور اس کی حرارت نے اس کی انگلیوں کو مس کرنا شروع کر دیا۔



میری پیاری سہیلی!

السلام علیکم۔

امید ہے کہ بفضل خدا! بخیریت ہوگی۔ یہ خط میں تمہیں از زبان منڈی لکھوا رہی ہوں۔ جب سے یہاں آئی ہوں' تمہاری کوئی خیریت معلوم نہیں۔ اب ہار کر یہ خط عزیزی سلمٰی سے لکھوا رہی ہوں 'جو ہماری مسجد کے مؤذن صاحب کی بڑی بیٹی ہے۔ مجھے پتا نہیں کہ جو پتا مولوی سراج سرفراز اس خط کے لفافے پر لکھیں گے 'وہ درست بھی ہوگا یا نہیں۔ یہ خط تم تک پہنچ بھی پائے گا یا نہیں۔ مگر ایک چھوٹی سی امید پر یہ خط بجھوا رہی ہوں۔

میری پیاری بہن! ہم یہاں پہنچے تو علاقہ بالکل اجنبی لگا۔ زبان بھی ادھر کے لوگوں کی کچھ اور ہی سی ہے۔ اوئی بہن! میرا تو جی الجھتا رہا 'کئی دن کہ یہ ہم کدھر آگئے۔ لیکن پھر چند ہی دنوں میں جیسے زندگی بدل گئی۔ یہاں لوگ مولوی سراج سرفراز کی بہت عزت کرنے لگے ہیں۔

مولوی کے گن تو مجھ پر بھی یہاں آنے کے بعد کھلے۔ وہ تو جناب علم و حکمت کی بہت سی باتیں سیکھ چکا۔ جب یہاں کے لوگوں کو سناتا ہے تو لوگ جھوم جھوم جاتے ہیں۔ ہمیں مسجد کی چھت پر ایک بڑا کمرہ مع غسل خانہ اور لیٹرین دے رکھی ہے انہوں نے صبح شام کھانا ادھر 'ادھر سے ہمارے گھر خود حاضر ہو جاتا ہے۔ طرح طرح کے سالن اور قسم قسم کی روٹی بھی' چاول بھی 'ارے میں تو کھانے پکانے سے بھی چھوٹی 'مگر پھر بھی کیا ہے کہ دل عجیب طرح اڑا اڑا ہی رہتا ہے۔ پرانی محفلیں یاد آتی ہیں۔ تمہارا ساتھ 'تمہاری محبت 'تمہاری باتیں۔ ہائے وہ دن کدھر گئے۔ تم نے مجھ گنوارن کو ایسی بنا دیا کہ پڑھے لکھے بھی بات کرتے دس دفعہ سوچیں۔ اب میرے روپ میں تمہاری جھلک تو نظر آتی ہے 'مگر تم کہیں نہیں ہو۔

اچھا خیر۔۔۔ میں تو اپنی لے کر بیٹھ گئی 'تم سناؤ کیسی ہو تم۔ اکیلی اپنی کھٹیا پر پڑی رہتی ہو یا محلے دار نیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ یقیناً "اس بے وفا' ہرجائی کا کچھ اتا پتا پایا نہ ہوگا اب تک 'ہائے کیسا بے رحم 'سفاک شخص ہے کہ جاتے جاتے بہانے بنا کر ہمارا بچہ بھی لے گیا۔

جوں جوں میری زچگی کے دن قریب آرہے ہیں توں توں تمہارا دکھ دل میں محسوس ہوتا ہے اور بھی شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ اللہ جانے تمہارے اندر ایسا صبر اور بے حسی کیسے اتر آئی 'نہ یاد کرتی ہو 'نہ روتی ہو 'دل یاد سے غافل ہو گیا۔ آنکھ کے آنسو خشک ہو گئے۔ سچ بتاؤ۔ کیا ابھی بھی ایسا ہی ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو میں کیسے سوچوں کہ مجھ سے دوری تمہیں میری یاد بھی دلاتی ہوگی۔

مولوی سراج سے تمہاری بات کروں تو کہتا ہے آپا جی۔۔۔ بڑے صبر والی بی بی ہیں ہم ان کا دل اتنا کچھ سہ چکا ہے کہ صبر کا وصف کسی چیز کو کسی نئی بات کو، کسی نئے دکھ اور کسی نئی جدائی کو دل پر حاوی نہیں ہونے دیتا۔ دل کی اس کیفیت کو وہ کوئی بھی نام دیتے رہیں۔ لیکن مجھے اس وقت وہ نام یاد نہیں آرہا۔

مولوی سراج سے یاد آیا کہ یہاں آکر موصوف نے علم کے موتی تو بانٹنے شروع کیے تو کیے ہی ہیں' جناب والا نے حکمت بھی شروع کردی تھی ساتھ کے ساتھ۔ یہ بات پڑھ کر تمہیں ہنسی آئی ہی ہوگی۔ نجانے کہاں سے حکمت کے چند نسخے ان کے ہاتھ لگ گئے۔ اب ان کے دن تو مسجد کی خدمت میں گزرتے ہیں اور رات جڑی بوٹیاں پیسنے ان میں شہد ملا کر گولیاں اور معجونیں بنانے میں گزر جاتی ہے۔

فرماتے ہیں پیٹ بھر کر روٹی کھانے کے لیے بندے کو محنت مزدوری کرنی ہی پڑتی ہے۔ ہائے اللہ ماری۔۔۔ روٹی ہی سر پر سوار رہی ساری عمر۔ یاد ہے مولوانوں کے گھر سے روٹی لینے آنے کے چکر میں ہی تو ہمارے ساتھ دعا سلام بڑھی تھی۔ میں مولوی کو دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ روٹی کا چکر انسان کو کیا سے کیا بنا ڈالتا ہے۔ چلو ایک "ٹکڑا گندم کی روٹی" کے لیے ہی سہی مولوی سراج ٹس سے مس تو ہوئے۔

خود اپنا حال کیا سناؤں' جوں جوں زچگی کے دن قریب آرہے ہیں' دل کی بے قراری بڑھتی جارہی ہے' نہ کچھ کھانے کو دل چاہتا ہے' نہ پیاس لگتی ہے' بس دل ہی گھبراتا رہتا ہے۔ دن رات تمہاری بتائی دعاؤں کا ورد کرنے میں مصروف رہتی ہوں۔ ان ہی دعاؤں کا صدقہ اللہ تعالیٰ مجھے خیریت سے فارغ کرے۔ دعاؤں سے یاد آیا کہ تم تو حج پر جانے سے پہلے مجھے مسلمان ماننے ہی پر تیار نہیں تھیں۔ کیسے کلمہ پڑھا کر مجھے مشرف بااسلام کرتی رہی تھیں۔

توبہ۔۔۔ توبہ۔۔۔ مجھ بے چاری کو بالکل ہی لادین سمجھنے بیٹھی تھیں۔

اب میرا خیال ہے کہ بہت سی باتیں ہوگئیں۔ خط کے لفافے پر جو پتا مولوی سراج لکھیں گے ہم اس پتے پر جواب لکھ کر ضرور بھجوانا۔ اپنی خیریت سے آگاہ کرنا نہ بھولنا۔ لو اب میں رخصت ہوتی ہوں۔

فقط تمہاری بہنوں جیسی سہیلی
رابعہ کلثوم



لاہور

بہت ہی پیاری بہن رابعہ کلثوم!

بعد سلام دعا کے عرض ہے کہ تمہاری چٹھی سے تمہاری خیریت معلوم ہوئی۔ دل کو سکون ملا اور خوشی ہوئی کہ تم اس اجنبی جگہ پر مطمئن و مسرور ہو' اللہ تعالیٰ تمہیں اس سے بھی بڑھ کر نوازے۔

تمہاری وفاداری اور محبت کا میرے پاس کوئی جواب نہیں کہ تمہاری وفاداری اور محبت انمول ہیں۔ جن حالات میں تم نے اور سراج سرفراز نے میرا ساتھ دیا۔ ان حالات میں تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ تمہاری محبت اور قربانی میری زندگی کا انمول خزانہ ہیں۔

میں یہاں ٹھیک ہوں بفضل تعالیٰ کوئی مسئلہ' کوئی پریشانی مجھ کو لاحق نہیں ہے۔ محلے دار میرا بہت خیال رکھتے ہیں اور میرا اللہ میرے ساتھ ہے اور جب اللہ میرے ساتھ ہے تو مجھے کوئی مسئلہ ہو بھی نہیں سکتا۔

تمہارے خط سے جہاں تمہارے اچھے حالات کی خبر ملی' وہاں یہ دکھ بھی دل میں محسوس کیا کہ تم نے ابھی تک سراج سرفراز جیسے بڑے دل کے مالک شخص کی قدر کرنا سیکھی' نہ ہی عزت کرنا۔ میری بات یاد رکھنا' دین و دنیا'

دونوں کی محبت سے مالا مال ہو جاؤ گی جب خود میں یہ دو وصف پیدا کر لو گی۔ اللہ تعالیٰ تمہاری رہنمائی فرمائے۔ میری بہن ... نفس ... تو تم مسلمان۔ خالی کلمہ پڑھ لینے سے نہیں۔ حج بیت اللہ کر لینے سے نہیں بلکہ ... یقین کر لینے سے ہی منزل پاؤ گی۔

اللہ تعالیٰ تمہیں خیریت سے ... میرے لیے بھی دعا کرتی رہنا۔ سراج سرفراز کو بہت ادب و احترام سے میرا سلام ... ہو سکے تو میں تمہارے قریب کسی کے گھر میں اگر ٹیلی فون لگا ہو تو نمبر لے کر اگلی چٹھی میں لکھ بھیجو۔ اللہ تعالیٰ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

تمہاری مخلص بہن
شہناز سلطان



"میں نے سب معلومات حاصل کر لیں۔ تمہارے علاج اور ٹریننگ کے لیے چین سے بہتر آپشن ہی نہیں۔"
بلال سلطان نے سارہ سے کہا۔

"جاپان میں ایسی کوئی سہولت دستیاب نہیں؟" سارہ کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ اس نے یہ سوال کیوں کیا تھا۔

"میں نے بتایا نا کہ میں نے سب معلومات حاصل کر کے ہی یہ فیصلہ کیا کہ تمہیں چین بھجوایا جائے۔ صوفی اور یہی تمہارے ساتھ جائیں گی۔" انہوں نے ٹوسٹ پر مارجرین پھیلاتے ہوئے کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ آپ مجھے ایک فیری لینڈ میں لے آئے ہیں۔"
سارہ نے ممنون نظروں سے انہیں دیکھا۔

"میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیا کبھی تم نے سعد کا بھی شکریہ ادا کیا تھا؟" انہوں نے سیب کا جوس گلاس میں نکال کر سارہ کے سامنے رکھا۔

"سعد" سارہ نے ان کی طرف دیکھا۔ "اس سے تو میں ہمیشہ لڑتی رہی۔ اسے تنگ کرتی رہی کہ وہ مجھ پر ترس کھاتا تھا۔"

"کیا واقعی وہ تم پر ترس کھاتا تھا؟"

"مجھے معلوم نہیں۔"

"یقیناً وہ ایسا نہیں کرتا تھا۔ ترس کھانے اور خلوص میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بہت بڑا فرق... تم دونوں کے درمیان فرق کو سمجھ نہیں پائیں شاید۔"

"آج آپ نے پہلی بار سعد کو ایڈووکیٹ کیا ہے۔" وہ ذرا سا مسکرا کر بولی۔

"میرا خیال ہے کہ اب کے بعد کی زندگی میں مجھے ہمیشہ اس کو ایڈووکیٹ ہی کرنا ہے۔ کیونکہ جو فوٹ پرنٹس میں نے اس کے دیکھے ہیں۔ وہ کسی بھی ایسی جگہ نہیں جاتے جہاں جانے پر مجھے امبریس ہونا پڑے۔ میں ان تمام اتفاقات کا بے حد ممنون ہوں جن سے دوچار ہونے پر میں سعد کا اصل چہرہ دیکھ پایا۔"

"گویا اس سے پہلے آپ اس سے بدگمان تھے۔" سارہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"بدگمانی اور غلط فہمی کے اگر ایک ہی سے معنی ہیں تو شاید میں تھا۔"

"لیکن دونوں الفاظ کے معنی مختلف ہیں۔"

"اگرچہ ان کے اوصاف ایک سے ہیں۔" وہ مسکرائے۔ "تم جوس کیوں نہیں پی رہیں، تمہیں دو گلاس سیب کا جوس پینا چاہیے۔ سیب اینٹی آکسیڈنٹ ہوتا ہے اور تمہارے لیے اینٹی آکسیڈنٹ غذا بہت اچھی ثابت

ہو گی۔"

"میں پی رہی ہوں۔" اس نے فوراً" گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ "ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں پوچھو۔"

"آپ نے کبھی ماہ نور کو یہاں نہیں بلایا؟"

"ماہ نور!" وہ ایک دم ہنس دیے اور پھر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ "تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟"

"آپ شاید جانتے نہیں۔ ماہ نور سعد سے شدید محبت کرتی ہے۔ بلکہ شاید آپ جانتے ہیں کیونکہ آپ ہی نے کہا تھا کہ ماہ نور، سعد کے دل کا معاملہ ہے۔"

"اگر وہ دونوں ایک دوسرے کے دل کا معاملہ ہیں تو انہیں یہ معاملہ خود حل کرنا چاہیے۔ میں اس معاملے میں کیوں آؤں۔" انہوں نے ایک مبہم سی بات کی۔

"آپ سعد کے معاملات سے Indiffrence (لاتعلقی) کیوں ظاہر رہے ہیں۔" جبکہ آپ خود کہتے ہیں کہ اس کے فوٹ پرنٹس بہت اسٹرونگ ہیں۔" سارہ کے لہجے میں دکھ تھا اور شکوہ بھی۔

"میں Indiffrence شو کر رہا ہوں۔" انہوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ تم خود ہی بتاؤ کہ "تم خود کس کا معاملہ تھیں۔ تم سے میں نے لاتعلقی کیوں ظاہر نہیں کی؟"

سارہ کے پاس ان کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"کچھ باتیں ان کہی رہنے دی جائیں تو بہتر ہوتا ہے۔" کچھ دیر بعد وہ نرمی سے بولے۔ "سعد زندگی کے کچھ معاملات کو معمہ بنا کر مجھ سے دور گیا ہے۔ اسے یہ معمہ خود حل کرنا چاہیے۔ میں یہاں بیٹھ کر دوسروں کے سامنے اسے ایڈووکیٹ کر سکتا ہوں، لیکن اگر اس کے سامنے خود کو ایڈووکیٹ کرنے لگوں گا تو اس کا معمہ کبھی حل نہ ہو گا۔"

سارہ نے ان کی بات سنی، اگرچہ ان کی بات پوری طرح اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن اس نے مزید سوال کرنے سے گریز کیا۔



"تمہیں زندگی میں اتنا آگے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔" سعد نے نادیہ کے فلیٹ کی بالکونی میں کھڑے، بغیر پیچھے مڑے نادیہ کو مخاطب کر کے کہا۔

"اور مجھے تمہیں یہاں اپنے اس دو کمروں کے فلیٹ میں دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔" نادیہ نے اس کے لیے سوپ بناتے ہوئے ہاتھ روک کر جواب دیا۔ "اگرچہ یہ تمہارے شایان شان ہرگز نہیں ہے۔ اس کے منے سے باتھ روم میں تو تمہارا دم ضرور گھٹتا ہو گا۔"

"تم جانتی نہیں کہ میں اس حادثے سے پہلے سوچتا تھا کہ میں پکاڈلی میں سڑک کے کنارے کپڑا بچھا کر گٹار بجا کر آنے جانے والوں سے نذرانہ وصول کر کے ... اپنی روٹی اور مکھن کا انتظام کرنے والا ہوں۔" وہ آہستہ قدموں سے چلتا کمرے میں آیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں چھڑی تھی۔ جس کا سہارا ... لینے کی اس کے ڈاکٹر نے اسے پرزور تلقین کر رکھی تھی۔

"بڑے لوگوں کے خوابوں کی دنیا بھی خوب ہوتی ہے۔" نادیہ نے چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ان بھکاریوں کی زندگیوں کی سختی سے تم واقف نہیں ہو۔ اس حادثے میں تو تم موت سے بچ گئے، لیکن اگر واقعی میں تم اپنے خوابوں کی اس دنیا کے منظر میں چلے جاتے تو شاید ایک آدھ دن سے زیادہ جی نہ

"مجھے اپنی قوت ارادی ہی کو تو آزمانا تھا۔" وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"قوت ارادی کو تو تم اب میرے بنائے ہوئے کھانے کھا کر بھی آزما سکتے ہو۔" نادیہ مسکرائی۔ "نہیں کھا کر تم زیادہ سے زیادہ کتنے دن زندہ رہ سکتے ہو۔"

"شاید بہت دن تک۔" وہ مسکرایا۔ "کیونکہ ان کھانوں میں تمہاری محبت بھی شامل ہے اور خلوص بھی۔"

"دل کو رکھنے کو ایسی باتیں کر دینی چاہئیں۔" اس نے ڈش واشر میں چند برتن رکھتے ہوئے کہا۔

"میں واقعی سحر زدہ ہوں، تمہیں یہ سب کرتے دیکھ کر۔" سعد نے سچائی کے ساتھ کہا۔ "مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اتنی اونچی اور لمبی جست لگانے میں کامیاب ہو گئیں۔"

"جبکہ اس کا حوصلہ بھی تم ہی نے مجھے دیا تھا۔ یاد کرو وہ سب، جو میرے لیے اپنی گزشتہ ملاقات میں تم نے کہا تھا، وہی تو نقطہ آغاز ثابت ہوا۔"

"میں شکر کرتا ہوں کہ میں تمہارے لیے کچھ کر پایا۔"

"تو میں تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے اپنا چیلسی والا گھر چھوڑ کر میرے پاس رہنا پسند کیا۔" نادیہ نے اس کے سامنے پلیٹ اور سوپ کا پیالہ رکھتے ہوئے کہا۔

"وہ میرا گھر نہیں ہے۔ وہ ڈیڈی کا گھر ہے۔" وہ رکھائی سے بولا۔

"جو ڈیڈی کا ہے، وہ تمہارا بھی تو ہے۔" اس نے اس کے سامنے سوپ کا پیالہ رکھا۔

"جو ڈیڈی کا ہے وہ تمہارا بھی تو ہے۔" سعد نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"مگر مجھ سے تو ڈیڈی بھی کا اظہار لاتعلقی کر چکے۔" اس کے چہرے پر دکھ بھری مسکراہٹ ابھری۔

"وہ تم سے کر چکے تھے۔ اب میں نے ان سے اظہار لاتعلقی کر دیا ہے۔" وہ چبا چبا کر بولا۔

"یہ تم نے بالکل بھی اچھا نہیں کیا۔"

"انہوں نے بھی تمہارے ساتھ بالکل بھی اچھا نہیں کیا تھا۔"

"کیا تم ان سے میرے ساتھ کیے کا انتقام لے رہے ہو۔" وہ چونک کر بولی۔

"کاش میں اتنا اچھا ہوتا۔" اس نے اپنے پیالے میں سوپ ڈالتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں اتنا بے غرض نہیں ہوں، میں ان سے اپنی وجوہات کی بنا پر لاتعلق ہو چکا ہوں۔" نادیہ نے کچھ دیر یک ٹک اس کی طرف دیکھا اور پھر سرہلاتے ہوئے بولی۔

"جو ڈیڈی نے میرے ساتھ کیا اس کے باوجود میں آج تک ان سے بدگمان نہیں ہوئی۔ جو زمینی حقائق ان کی نظروں کے سامنے لائے گئے، ان کی روشنی میں انہیں وہی کرنا چاہیے تھا جو انہوں نے کیا۔"

"تم بہت اچھی اور نیک دل ہو، بدقسمتی سے میں ایسا نہیں ہوں۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

"جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ تم کسی بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو کر ڈیڈی سے بدگمان ہو گئے ہو، اگرچہ مجھے کسی بھی تفصیل کا علم نہیں۔" نادیہ نے کہا۔

"معلوم ہو جانے پر تم بہت دکھی ہو جاؤ گی۔ لہٰذا رہنے دو۔" سوپ میں چمچہ ہلاتے ہوئے کہا۔

"میں خود کو ابھی تک ڈیڈی سے بہت قریب محسوس کرتی ہوں۔ میرا یہ حال اس وقت بھی تھا جب مجھے ان سے جدا کر دیا گیا تھا۔ تمہیں شاید یاد نہ ہو۔ ممی مجھے بازو سے پکڑے گھسیٹتی تھیں اور میں اپنا دوسرا بازو ڈیڈی کی طرف بڑھاتے ہوئے روتی تھی، چیختی تھی، چلاتی تھی۔"

"مجھے وہ منظر کبھی نہیں بھولا۔ تم روتی تھیں، چیختی اور چلاتی تھیں، لیکن ڈیڈی کے دل پر رتی بھر اثر نہیں ہوا

تھا۔"

"ہم چیزوں کا مثبت انداز میں بھی تو جائزہ لے سکتے ہیں۔" نادیہ نے کہا۔ "ڈیڈی کو جو تنہا کیا گیا وہ بہت تکلیف دہ تھا۔ وہ کیسے اثر لیتے؟"

"مجھے کہنے دو کہ تمہارا دل بہت بڑا ہے۔" سعد نے سوپ ختم کر کے پاستا کی پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"وہاں سے آنے سے ایک رات پہلے جب مجھے معلوم ہوا کہ مجھے وہاں سے جانا ہو گا' میں ڈیڈی کے کمرے میں اس نیت سے گئی کہ ان سے درخواست کر سکوں' مجھے نہ جانے دیں' مجھے ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لیں' لیکن وہ وہاں نہیں تھے۔ انہوں نے خود کو لائبریری میں بند کر لیا تھا۔" نادیہ نے یاد کیا۔

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔"

"لیکن تمہیں یہ تو معلوم نہیں کہ میں نے سوچا تھا کہ میں ڈیڈی کے کمرے سے ان کی کوئی ایسی چیز اٹھاؤں جس سے ان کی خوشبو آتی ہو' میں نے وہاں سے ایک چیز چرا لی تھی۔ میں چھوٹی تھی' مگر میری کوشش لاجواب تھی۔" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیا کبھی ڈیڈی نے میرے چلے جانے کے بعد اپنی کسی چیز کے گم ہو جانے کا ذکر نہیں کیا تھا۔" پھر وہ سعد کی طرف دیکھ کر بولی۔

"کسی ایک معمولی سی چیز کے گم ہو جانے سے ان کے خزانے میں کون سی کمی آ گئی ہو گی۔" جو وہ یاد کرتے۔

"شاید کوئی کمی نہ آئی ہو۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "مگر جو چیز میں نے اٹھائی' وہ یقیناً" ان کے لیے بہت اہم ہو گی' کیونکہ خاصی پرانی ہو جانے کے باوجود انہوں نے اسے بہت سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔"

"ایسی کون سی چیز تھی؟" وہ پہلی بار چونکا۔

"میرے پاس ابھی بھی موجود ہے۔ میں تمہیں دکھاتی ہوں۔" وہ اپنے اسٹڈی ٹیبل کی طرف بڑھی۔ سعد دلچسپی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ لڑکی اپنا خلوص کس بے حس انسان کے لیے لٹا رہی تھی۔

"یہ دیکھو!" چند لمحوں بعد جو چیز نادیہ نے اس کی نظروں کے سامنے کی اس نے ایک بار پھر اسے چونکا دیا تھا۔ وہ ایک بہت پرانا والٹ تھا۔ جس کی اوپری سطح ادھڑ چکی تھی اور جو یقیناً" کسی زمانے میں بہت سستے داموں خرید آگیا ہو گا۔

"میں ہر روز اسے دیکھتی ہوں۔ اگرچہ اس کے اندر کچھ بھی نہیں' سوائے ایک پرانی تصویر کے۔" نادیہ کہہ رہی تھی۔ سعد نے والٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ والٹ کے سب خانے خالی تھے۔ جبکہ ایک ادھڑی ہوئی جیب کے پلاسٹک کور کے پیچھے سے ایک شکستہ بلیک اینڈ وائٹ تصویر جھانک رہی تھی۔ اس نے تصویر نکال کر نظروں کے سامنے کی اور جیسے اس پر سکتہ سا طاری ہونے لگا تھا۔



"ہم تو ایسے اہم نہیں ہیں کہ کوئی ہمارا انٹرویو کرنے ادھر کو آئے۔" میمونہ افضل حسین نے ہاتھ سے آنکھوں کے اوپر چھجا بنا کر ماہ نور کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے لیے تو آپ کچھ ایسے ہی اہم ہیں۔" ماہ نور نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ وہ بہت زیادہ خواری کے بعد ان دونوں کے اس ٹھکانے پر پہنچنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ اپنی اس خواری میں اپنی تنہائی اور اس تلاش کے اختتام پر ساری کوشش کی بے مقصدیت ظاہر ہونے کے خوف نے اسے بے کل کیے رکھا تھا۔

جب ہی وہ معمول سے زیادہ مرجھائی ہوئی نظر آرہی تھی۔

"مگر ہم تو تمہیں جانتے ہی نہیں۔" میمونہ بی نے قطعیت سے سرہلاتے ہوئے کہا۔ "نا۔ بالکل بھی نہیں۔"

"میں تو آپ کو جانتی ہوں نا اماں جی۔۔۔ پلیز مجھے گھر کے اندر داخل ہونے دیں۔" ماہ نور نے ایک بار پھر زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

"کیسے اندر آنے دیں ہم تمہیں جانتے تو ہیں گے نہیں۔"

"میں بلال سلطان اور سعد سلطان کے ریفرنس سے آپ کے پاس آئی ہوں اماں جی۔۔۔! ان دونوں کو تو آپ جانتی ہوں گی۔" ماہ نور نے آخری کوشش کی۔ یہ دونوں نام جیسے اس کے لیے کھل جا سم سم کا سا منتر ثابت ہوئے۔ بڑی بی نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا اور خود ایک طرف ہٹ گئیں۔

"جانتی تو میں ابھی بھی نہیں ہوں تمہیں۔" ماہ نور کے اندر داخل ہو جانے پر وہ اس کے پیچھے پیچھے آتے ہوئے بولیں۔ "مگر ہماری چوکھٹ پر کھڑے ہو کر ان دو ناموں کو اتنی بلند آواز میں دوبارہ تمہیں لینا کبھی۔"

"کیوں۔۔۔ بہت مشکوک نام ہیں کیا؟" ماہ نور رک کر ان کی طرف پلٹی۔

"یہ تو میں نہیں کہتی ہوں مگر ڈر لگتا ہے۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے آگے لے آئیں، جہاں ایک مخبوط الحواس بڑے میاں ڈوری والا آلہ سماعت کان میں لگائے کان سے ریڈیو جوڑے چارپائی پر بیٹھے تھے۔

"یہ لڑکی کہتی ہے۔ اسے بلال صاحب اور سعد بابا نے بھیجا ہے۔" میمونہ بی نے بڑے میاں کے قریب جا کر ان کے ہاتھ سے ریڈیو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے ان کے کان میں بلند آواز میں کہا۔

"مجھے انہوں نے نہیں بھیجا۔ میں نے یہ نہیں کہا۔" ماہ نور نے پیچھے کھڑے بلند آواز میں کہا۔ "میں ان کے ریفرنس سے آپ سے کچھ پوچھنے آئی ہوں۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ آیئے آیئے۔ بیٹھیے بیٹھیے۔" بڑے میاں نے ماہ نور کی طرف دیکھنے کے بعد چارپائی پر اپنے قریب ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ادھر بیٹھو۔" پھر انہوں نے ماہ نور کو براہ راست مخاطب کیا۔

ماہ نور دو قدم آگے بڑھ کر چارپائی پر ان کے قریب بیٹھ گئی۔



سعدیہ نے سامنے بیٹھے کھاری کو دیکھا۔ "چند ہفتوں میں ہی بے چارا شیدائی ہو گیا ہے۔" اس نے تاسف سے سوچا۔ "نہ کپڑوں کا ہوش ہے نہ ہی ڈھنگ کے جوتوں کا' کھانا پینا' بات کرنا سب بھولتا چلا جا رہا ہے۔ بڑے ہی ظالم ہیں چوہدری صاحب جو اس کے ساتھ ایسا مذاق کر گئے۔"

کھاری پچھلے دو گھنٹوں سے چپ چاپ اپنی جگہ پر بیٹھا تھا اس کی نظریں خلا میں کسی ایک ہی نکتے پر جمی تھیں۔ سعدیہ نے اسے کئی بار مخاطب کرنا چاہا تھا۔ لیکن وہ جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ تقریباً" سوا دو گھنٹے کے بعد وہ اپنی اس کیفیت سے باہر نکلا تھا۔ اس نے سعدیہ کی طرف دیکھا اور پھر برآمدے کی دیوار پر لگے وال کلاک کی طرف دیکھنے لگا۔ کلاک کی سوئیاں دیکھ کر وہ جیسے ہڑبڑا کر اٹھا۔

"اچھا فیر سعدیہ باؤ۔۔۔ میں چلنا آں۔" اس نے سعدیہ کو مخاطب کیا۔ "میرا ٹیم ہو گیا ہے۔ میرے جانے دا ٹیم ہو گیا ہے۔" وہ برآمدے سے اترتی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

"ابھی سے۔۔۔ ابھی تو دودھ والی گاڑیوں کا وقت نہیں ہوا کھاری!" سعدیہ چونکی۔

"گڈیاں نوں چھوڑو میں اپنے ٹیم کی بات کر رہا ہوں۔"

کھاری سیڑھیاں اتر کر آگے بڑھ گیا۔ چلتے چلتے وہ اپنے اور سعدیہ کے کمرے کی طرف کھلنے والے لوہے کے ڈبل دروازے تک پہنچا اور مڑ کر سعدیہ کو دیکھتے ہوئے خدا حافظ کہنے کے انداز میں ہاتھ ہلا کر باہر نکل گیا۔

سعدیہ عجیب سی الجھن میں گرفتار ہو گئی۔ کھاری دودھ اٹھانے والی گاڑیوں کی آمد کے وقت سے خاصا پہلے چلا گیا تھا۔

عین اسی وقت فارم ہاؤس پر کام میں مصروف چند لوگوں نے ماسٹر کمال کو پاگلوں کی طرح کھاری کے کمرے والے حصے کی طرف دوڑتے دیکھا تھا۔

''او ہو... کیا ہو گیا ماسٹر جی! خیر تو ہے؟'' راستے میں جب وہ ماسی رشیدہ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تو وہ گھبرا کر بولی۔

''اوئے خیر کوئی نہیں رشیدہ بی بی! کھاری کو دیکھو' اس کا حال پوچھو جا کر' دو گھنٹے پہلے وہ میدے کی دکان سے گندم میں رکھنے والی گولیاں خرید کر نکلا ہے۔ جبکہ فارم ہاؤس کے سب بھڑولوں کی گندم میں کیڑے مار گولیاں میں نے خود پرسوں ہی رکھوائی ہیں۔ اوئے بیڑا غرق' جا کر دیکھو' وہ شیدائی کس واسطے گولیاں لایا ہے۔''

ماسٹر کمال نے دہائی دینے کے انداز میں پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔

''ہائے نی میری قسمت!'' ماسی رشیدہ' ماسٹر کمال سے بھی زیادہ بوکھلا کر بولی۔ اور سر پیٹتے ہوئے کھاری کے کمرے کی طرف لپکی۔



فارم ہاؤس کے بڑے گیٹ پر چوہدری سردار کی گاڑی آکر رکی تھی۔ چوہدری صاحب کے ساتھ گاڑی میں شہر سے آنے والی وہ مہمان بھی بیٹھی تھی جو کچھ ہفتے قبل چوہدری صاحب سے ملنے فارم ہاؤس آئی تھی۔

عین اسی وقت اسی گاؤں میں ایک اور قیمتی اور بڑی گاڑی داخل ہوئی تھی۔ گاؤں والوں نے یہ گاڑی اور گاڑی والا پہلے کبھی اس گاؤں میں نہیں دیکھے تھے۔ گاڑی والا دیکھنے میں ہی بہت پیسے اور شان و شوکت والا نظر آتا تھا۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ وہ چوہدری سردار کے فارم ہاؤس کے راستے کے بجائے مولوی سراج سرفراز کی مسجد کا راستہ پوچھ رہا تھا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں)

کنیز نبوی



یہ ان دنوں کی بات ہے، جب میں جوان تھا۔ بوڑھا تو خیر میں اب بھی نہیں ہوں۔ بھلا مرد پر بھی کبھی پچاس سال میں بڑھاپا وارد ہوتا ہے؟ خیر پچاس سالوں میں تو اب عورتوں پہ بھی بڑھاپا نہیں آتا۔ وہ بھی جوان ہی لگتی ہیں۔

اف یہ میں کیا فضول سی بات لے کر بیٹھ گیا۔ وہ میں آپ کو بتا رہا تھا اپنی نوجوانی کی بات۔

یعنی جب مجھے نئی نئی نوکری ملی تھی، ساتھ میں چھوکری بھی۔ نئی نویلی دلہن اور میں اور بن سنور کر آفس جاتا تھا۔

ارے یہ تو میں نے آپ کو بتایا ہی نہیں کہ کیا نوکری

جناب میں بینک میں کیشیر لگا تھا اور ساری سہولیات سے مستفید ہو رہا تھا۔

تب اتنی منگائی بھی نہیں تھی کہ کسی مہمان کو دو وقت کی روٹی کھلاتے جان جاتی ہو لوگوں کی۔

اور ہم تو ویسے بھی سندھی اور اوپر سے سید۔ مہمان اللہ کی رحمت، اپنا رزق آپ لے کے آنے والا، آجائے تو سو بسم اللہ کرتے۔ کھانا کھلائے بغیر جانے نہیں دیتے، لوگوں کے دل بہت بڑے تھے، شاید وہ جانتے تھے کہ رزق کا مالک اوپر بیٹھا ہے۔ جو ہاتھی کو من چیونٹی کو کن (دانہ) دیتا ہے۔ بہر حال میں آپ کو قصہ سنا رہا تھا کہ میں پانچ بجے فارغ ہو کر گھر آتا، سو ظاہر ہے سارا دن بھوکا تو نہیں رہ سکتا تھا اور تھا بھی بھوک کا کچا۔

اور سب سے اہم بات تو آپ کو سنائی ہی نہیں کہ میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ فلیٹ شیئر کرتا تھا، فیملی ساری گاؤں میں اور میں حیدر آباد میں تھا۔

افوہ پھر بات کہیں اور چلی گئی۔ بات ہو رہی تھی کھانے کی، میں روز قریبی ہوٹل میں کھانا کھاتا تھا۔

ایک دن میں ابھی نوالہ توڑ ہی رہا تھا کہ ایک بہت مفلوک الحال فقیر کو دیکھا، بھوک اس کی آنکھوں سے پکار کر کہہ رہی تھی کہ "مجھے کھانا کھلاؤ" مجھے اس پر بہت رحم آیا، بیرے سے اک بندے کا کھانا اور منگوایا اور لے جا کر اس کے سامنے رکھ آیا۔

میں کھانا کھاتے ہوئے اس کے چہرے کے تاثرات کو جانچتا رہا۔ کھانا کھاتے وہ مست ہو گیا تھا اپنے ارد گرد سے بالکل بے خبر جیسے آخری بار کھانا کھا رہا ہو۔

خیر آج کل تو شادیوں میں اس کا عام رواج ہے لوگ کھانے پر اسی طرح ٹوٹتے ہیں جیسے آخری بار کھا رہے ہوں، ایسی بد تہذیبی جو ہر تہذیب کو بھلا دیتی ہے، ہر کوئی آپے سے باہر۔

پھر یہ روز کا معمول بن گیا، مجھے مزہ آنے لگا تھا وہ عین کھانے کے وقت آموجود ہوتا۔

میں ہوٹل میں داخل ہوتے ہی ارد گرد کا جائزہ لیتا، وہ کہیں نظر نہیں آتا، مگر حیرت انگیز طور پر میں نوالہ توڑ کر ابھی منہ میں ڈال نہیں پاتا کہ اچانک میری نظر اس پر پڑ جاتی۔

اور میں حسب معمول بیرے کو اک اور آرڈر کر دیتا۔

میرے اس معمول کو پورے تین ماہ ہو گئے تھے، اب تو ہوٹل کے سارے ملازم مجھے دیکھ کر دو آدمیوں کا

کھانا لے آتے۔ سب کو پتا تھا کہ روزانہ میں وہیں آتا ہوں اور میرے ساتھ وہ فقیر بھی کسی جن کی طرح سے آموجود ہوتا ہے۔

وہ حلیے سے فقیر لگتا' مگر حرکتوں سے نہیں' اس کے بڑے کشکول میں اگر کسی نے اٹھنی چونی ڈال دی تو ڈال دی' نہ صدا نہ دعا' گلے میں مالا' لبوں پہ خاموشی' آنکھوں میں اداسی' مجھے لگتا کبھی وہ بہت خوش حال رہا ہو گا کبھی لگتا۔ وہ ناکام عاشق ہے' میں سوچتا۔ کبھی میں اس کا حال احوال پوچھوں گا' کس کھیت سے اگا' کہاں پہنچا' کیا ہوا' مگر یہ صرف میں نے سوچا' پوچھنے کا ٹائم ہی نہیں ملتا تھا۔

میں بل دے کر فوراً" آفس آتا اور کام میں لگ جاتا' جہاں حساب کتاب کرتے دماغ ہی چکرا کے رہ جاتا۔

جمعرات کی شام کام ختم کر کے میں اپنے گاؤں چلا جاتا' وہاں بیوی' ماں' باپ اور بہن کے ساتھ خوب گپیں لگاتا۔ گاؤں گھومتا۔ زمین کا چکر لگاتا اور جمعہ کا دن بھی وہیں گزارتا۔ ہفتے کی صبح کو فجر پڑھ کر نکلتا سیدھا آفس آتا۔

ارے آپ کہیں کنفیوز تو نہیں ہو گئے تب چھٹی جمعہ کی ہوتی تھی۔

اور ہفتے کے دن پھر وہی ہوٹل وہی فقیر وہی معمول۔

میں نے اس سے کبھی نہیں پوچھا کہ جمعے کے دن وہ کھانا کہاں کھاتا ہے' ظاہر ہے جو خیرات ملتی ہو گی اسی سے کھالیتا ہو گا۔

میرے ذہن میں یہی تھا' مگر میں نے کبھی ہوٹل مالک سے بھی نہیں پوچھا۔ اک دن پتا نہیں میرے دل میں کیا آیا شاید تین ماہ تک اسے کھانا کھلا کر میں فخر محسوس کرنے لگا تھا یا مجھے اپنی سخاوت پر غرور ہو گیا تھا۔

میں کھانے سے فارغ ہو کر اس کی طرف آیا۔ آج



میں نے اپنے لیے اور فقیر کے لیے چکن کڑھائی کا آرڈر دیا تھا اور سیر ہو کر کھانے کے بعد ہوٹل کے اس کونے میں آیا تھا جہاں حسب معمول وہ کھانا کھا رہا تھا۔

"اگر میں نہ ہوتا تو تمہیں کون کھلاتا؟" میں نے بھنویں اچکا کر ہنس کر کہا۔ مجھے محسوس ہوا یہ کہتے ہوئے میرا لہجہ خود بخود فخریہ سا ہو گیا ہے۔

نوالہ اس کے حلق میں اٹکا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کی آنکھوں میں حیرت بجلی کی طرح کوندی۔ اس نے مجھے دیکھا اور اس کی نظریں اوپر اٹھ گئیں۔

پھر اس نے شکایت بھری نظروں سے مجھے دیکھا' میں نے واضح طور پر یہ شکایت پڑھی۔

اس نے آدھی روٹی کھائی تھی' بقیہ ڈیڑھ روٹی اور سالن چھوڑ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

"تیرا اور میرا معاملہ تو مچھلی والا ہو گیا۔"

اس کی آواز میں تمسخر نمایاں تھا۔ میرے قدم جیسے زمین سے جکڑ گئے ہوں' جس حلیے کا وہ فقیر لگتا تھا' اس کی آواز ویسی کمزور نہ تھی بہت بھاری اور مضبوط آواز تھی' میں حیران ہو رہا تھا' اس کی آواز اور جواب پر' اس کا جواب میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ آج ہم نے مرغی کھائی پھر یہ فقیر نے مچھلی کا ذکر کیوں کر رہا تھا۔

میں نے چاہا کہ میں اس سے پوچھوں مگر اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ گیا اور دیکھتے دیکھتے سامنے نکڑ کی گلی میں چلا گیا۔

میں آفس آگیا۔ پتا نہیں کیوں اچانک میری طبیعت بوجھل سی ہو گئی تھی شاید آج سالن میں گرم مسالا زیادہ ہو گیا تھا۔ میں نے کولڈ ڈرنک منگوا کر پی مگر فرق نہیں پڑا۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھ سے بیٹھا بھی نہیں جا رہا' سر آج چھٹی جلد چاہیے۔" میں نے منیجر سے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ سید صاحب آپ چلے جائیں گھر۔" منیجر ابھی یہی کہہ رہا تھا کہ مجھے دل میں درد محسوس ہوا' اچانک تیز درد' میں وہیں کرسی کے سہارے بیٹھ گیا۔

"گیس کا درد بہت شدید ہوتا ہے توبہ توبہ اللہ محفوظ رکھے۔" میرے کولیگ نے کہا۔

میں اٹھ نہیں پا رہا تھا آفس کے لوگ راجپوتانہ اسپتال لے گئے۔ وہاں ایڈمٹ ہونا پڑا' ٹیسٹ ہوئے' تو پتا چلا مجھے تو ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور میں ہارٹ پیشنٹ ہوں۔

انجیو گرافی کرانے میں کراچی آیا تو ڈاکٹرز نے کہا کہ آپ کا توبائی پاس ہو گا۔ دو شریانیں بند ہیں۔ میری ماں' بہن' بیوی رو رو کر سب کا برا حال' دعائیں' صدقات' قرآن خوانی' درود ختم۔

کیا کچھ نہ کیا انہوں نے۔

ماں کی دعاؤں کے سائے میں اسپتال میں ایڈمٹ ہوا' میرا کامیاب بائی پاس ہوا۔

مجھے اپنی بیماری میں بھی وہ فقیر کئی بار یاد آیا۔

تین ماہ کی چھٹی منظور ہو چکی تھی' گھر میں بیٹھ بیٹھ کر بور ہو گیا تو ایک دن دل بہلانے کو جا کر نہر کے کنارے بیٹھ گیا' دھان کی فصل کے دن تھے۔ دریائے سندھ میں مچھلی کی بہتات تھی اور اس بہتات سے سندھ کی نہریں بھی فیض یاب ہو رہی تھیں۔

میں نہر کنارے بیٹھا ان بچوں کو دلچسپی سے دیکھنے لگا' جو مچھلی پکڑنے کو کنڈی لگائے' کتنی دیر سے بیٹھے تھے' جس بچے کے کنڈے میں مچھلی پھنستی وہ اچھلتا کودتا ناچتا پھڑپھڑاتی مچھلی کو مضبوطی سے ہاتھوں میں اٹھا کر گھر کی اور بھاگ جاتا۔

میں یہ سارا منظر بڑے شوق اور دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ تب ہی حافظ صاحب بھی ہوا خوری کے لیے نہر کنارے آگئے ان کی عادت تھی کہ وہ ہر بات کا پہلو تاریخ سے جوڑتے۔

سو بچوں کو یوں مچھلیوں کے پیچھے خوار ہوتے دیکھ کر ان کو مچھلی کے بارے میں کوئی تاریخی واقعہ یاد نہ آتا' یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"سید صاحب! حضرت سلیمان کی مچھلی کا واقعہ سنا ہے آپ نے؟"

میں مسکرا دیا۔ "ہاں حافظ صاحب بچپن میں والدہ سنایا کرتی تھیں۔ اب تو یاد نہیں۔۔۔"

"سبحان اللہ، کیا شان تھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی، اللہ نے اسے کیسی شان دار بادشاہی بخش دی تھی۔ ایک دن کہنے لگے۔

"یا اللہ مجھے اجازت دے میں تیری مخلوق کی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔۔۔"

اللہ سائیں نے فرمایا۔ "رازق میں ہوں، تُو تو خود کھانے والا ہے۔ تُو کیا کھلائے گا۔"

حضرت سلیمان نے کہا۔ "یا اللہ صرف ایک ماہ کی اجازت چاہتا ہوں۔۔۔"

اللہ سائیں نے فرمایا۔ "یہ تیرے بس کا کام نہیں ہے۔"

کہا۔ "ایک ہفتے کی اجازت دے دے۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "یہ بھی تیرے لیے ممکن نہیں۔"

کہا۔ "اچھا ایک دن کے لیے ہی دے دے۔"

بالآخر اللہ سے اک دن کی اجازت مل ہی گئی، جنوں کو حکم ملا۔ کھانا پکانے کا، ہوا کو حکم ہوا ٹھنڈی ہو جا کہ کھانا خراب نہ ہو، دیگیں پکتی رہیں۔ پکتی رہیں۔ اتنا کھانا تیار ہوا کہ ایک تیز رفتار آدمی چلتا تو دسترخوان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچنے میں ایک ماہ لگ جاتا۔

تیاری مکمل ہوئی تو سلیمان علیہ السلام نے کہا۔ "یا اللہ میرا دسترخوان تیار ہے۔ اب مخلوق کو بھیج۔"

اللہ نے فرمایا۔ "پہلے کسے کھلائے گا، زمین والوں کو یا پانی والوں کو۔"

سلیمان علیہ السلام نے کہا۔ "پہلے پانی والوں کو۔"

تب ایک مچھلی آئی اور کہنے لگی۔ "نبی اللہ آج ہماری دعوت ہے؟"

کہا۔ "صرف تمہاری نہیں، سب کی دعوت ہے۔" وہ ایک طرف سے آئی، سارا دسترخوان ایک لقمہ میں ہڑپ کر گئی۔

سلیمان علیہ السلام انگشت بدنداں۔

کہنے لگی۔ "اور لائیے۔"

سلیمان علیہ السلام نے کہا۔ "تو تو سب کچھ کھا گئی۔"

کہنے لگی۔ "مہمان کو بھی بھلا طعنہ دیا جاتا ہے، نبی اللہ یہ تیرا کام نہیں ہے، یہ رب ہی ہے جو سب کو دیتا اور کھلاتا ہے، آج تیرے دسترخوان کی وجہ سے مجھے بھوکا رہنا پڑے گا، میرا رب مجھے روزانہ ایسے تین لقمے کھلاتا ہے، جو تو ساری مخلوق کے لیے تیار کر بیٹھا تھا۔"

حافظ صاحب بات مکمل کر کے ہنسنے لگے، مگر مجھے ہنسی نہیں آئی۔

مفلوک الحال فقیر۔

"تیرا اور میرا معاملہ مچھلی والا ہو گیا۔"

یہ بات مجھے اب سمجھ میں آئی تھی۔

میرے ذہن میں روشنی کا کوندا لپکا۔

"یہ تیرا کام نہیں ہے۔" فقیر کی زیرلب خود کلامی۔

"میں نہ ہوتا تو تمہیں کون کھلاتا۔" متکبر آواز۔

یہ واقعی میرا کام نہیں تھا۔

اور تین ماہ میں میرا ظرف ناکام ہو گیا۔

میں متکبر ہو گیا، ایک دم سے طعنہ دے مارا، میں خود کو رزاق سمجھنے لگا۔

انسان کتنا جلد باز اور جاہل واقع ہوا ہے۔ تکبر کرتا ہے، اک چھوٹی سی نیکی پر اور ڈبو دیتا ہے نیکی سمیت خود کو۔ میں واپس آیا، ہوٹل کے مالک سے، بیرے سے سب سے اس کا پتا پوچھا۔

"اس دن کے بعد ہم نے اسے پھر یہاں نہیں دیکھا۔"

سب نے یہی بتایا۔

میں اس فقیر کو سالوں ڈھونڈتا رہا، بھٹ شاہ گیا، ہو سکتا ہے وہاں مل جائے، سہون گیا، مگر اسے نہ ملنا تھا نہ ملا۔

میرے اندر ندامت ہے، پشیمانی ہے۔ شرمندگی سے مرا جاتا ہوں۔ کاش وہ مجھے کہیں ملے تو معافی مانگ لوں۔

اللہ سے تو کئی بار معافی مانگی۔ توبہ کی۔ مگر لگتا ہے وہ حشر تک مجھے نہیں ملے گا۔

☆

کون بتلائے کیا ہے حقیقت اور بنا افسانہ کیا
دل کی بستی کیا بستی ہے' بسنا کیا' لٹ جانا کیا

برسوں لے جو رشتے جوڑے' پل بھر نے وہ توڑ دیے
پیارے! اب ٹوٹے ٹکڑوں سے اپنا جی بہلانا کیا

آج تو جوں توں کٹ جائے گا' کل کی سوچ کیا ہوگی
جو گزری سو گزر چکی' اِترانا کیا' پچھتانا کیا

جانے کتنے ڈوبنے والے ساحل پر بھی ڈوب گئے
پیارے طوفانوں میں رہ کر اتنا بھی گھبرانا کیا

سود و زیاں کی باتیں چھوڑو' اور ہی باتیں چھیڑو بھی
عشق کے ہاتھوں کیا کھویا ہے' کیا پایا' دہرانا کیا

اپنی رام کہانی میں بھی جگ بیتی کا جادہ تھا
پلکیں جھپکی جاتی ہیں' اب ختم ہوا افسانہ کیا

خلیل صدیقی

پتا ملا ہے' وہ تھا میرا ہم سفر' بہت دیر بعد جا کر
کہاں کہاں سے ملی ہے مجھ کو خبر' بہت دیر بعد جا کر

میری تمنا ہے' اب کے تم پھر ملو تو جی بھر کے مسکرائیں
کہ دیکھنا ہے یہ روشنی کا سفر' بہت دیر بعد جا کر

مجھے بتاؤ میں کیوں نہ اس اُٹھتی دھول کے ساتھ بیٹھ جاؤں
مجھے خبر ہے وہ آئے گا بام پر' بہت دیر بعد جا کر

خراب موسم میں ہر شجر سے لرزتے پتوں نے کیا کہا تھا
کہ پھول آنے لگے ہیں اب شاخ پر' بہت دیر بعد جا کر

قیامتوں کی طرح گزاریں گے یہ مہ و سال ہجرتوں کے
تمام ہوگا جدائیوں کا سفر' بہت دیر بعد جا کر

مری غزل میں جب آئے جعفر نظر انہیں معرکے ہنر کے
ہوئے مرے معترف سب اہل نظر' بہت دیر بعد جا کر

جعفر شیرازی



روپ نگر کو چھوڑ کے جب سے اس نگر کو آئے ہیں
صحرا صحرا دھوپ کڑی ہے، پیڑ نہ کوئی سائے ہیں

جنگل جنگل آگ لگی ہے، دریا دریا پانی ہے
نگری نگری، تھاہ نہیں ہے لوگ بہت گھبرائے ہیں

سچائی ہے امرت دھارا، سچائی انمول سہارا
سچ کے رستے چل کے سب نے، ٹھور ٹھکانے پائے ہیں

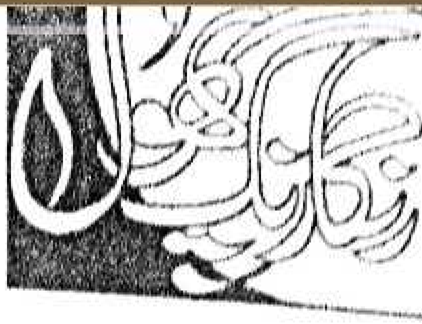
دولت تو ہے آنی جانی، روپ نگر کی رام کہانی
دھن کے لوبھی دھرتی پر کب سکھ سے رہنے پائے ہیں

جھوٹ کا ڈنکا بجتا تھا جس وقت جمیلؔ اس نگری میں
ہر رستے، ہر موڑ پہ ہم نے سچ کے علم لہرائے ہیں

جمیل عظیم آبادی

تجھے میں بھول تو جاتا
مگر تیرے تعلق سے
جو چہرے سامنے آئے
جو رستے سامنے آئے
جو لمحے سامنے آئے
جو رشتے سامنے آئے
انہیں کیسے بھلاتا میں
تجھے کیسے بھلاتا میں ؟

اعتبار ساجد



ماہِ رمضان کی فضیلت

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور شیاطین زنجیروں میں کس (باندھ) دیے جاتے ہیں۔"

اسمِ اعظم

کسی نے خواجہ ابراہیم بن ادھم سے پوچھا۔
"کیا آپ کو اسم اعظم یاد ہے؟ فرمائیے وہ کون سا ہے؟" انہوں نے جواب دیا۔
"معدے کو لقمہ حرام سے پاک رکھو اور دل کو دنیا کی محبت سے خالی کر دو تو پھر جو اسم پڑھو گے وہی اسم اعظم ہے۔" (کلیاتِ عشق)
نوال افضل گھمن۔ گجرات

حکمت کی بات

اردشیر بابکان (ایران کا ایک بادشاہ) نے ایک حکیم سے پوچھا۔
"انسان کو دن بھر میں کتنی غذا کھانی چاہیے؟"
حکیم نے کہا "ڈیڑھ پاؤ۔"
بادشاہ نے کہا "اتنی سی مقدار بھلا کیا طاقت دے گی۔"
حکیم نے کہا "جہاں پناہ... انسان کی صحت کے لیے اتنی مقدار کافی ہے... جو شخص اس سے زیادہ کھاتا ہے، وہ غذا کا بوجھ اٹھاتا ہے۔"

غیر مطمئن ملازم کا نقصان

میری رائے یہ ہے کہ معمولی تنخواہ پر رکھے دس ملازموں کی جگہ اچھے محنتی اور کام کرنے والے پانچ ملازم زیادہ تنخواہ پر رکھنا اچھا ہے اور کوشش کرنی چاہیے کہ ملازم خوش اور مطمئن رہیں اور ان کو وقت پر تنخواہ ملتی رہے۔ غیر مطمئن اور بد دل ملازم کو کسی صورت نہ رکھا جائے کیونکہ وہ دشمنوں کی طرح نقصان کا باعث ہوتا ہے۔
(ناقابلِ فراموش۔ از دیوان سنگھ مفتون)

مستنصر حسین تارڑ نے کہا ہے کہ،

- دیوار میں چنی ہوئی ہر اینٹ دیوار ہے۔ اگر ایک اینٹ بھی نکل جائے تو دیوار، دیوار نہیں کھنڈر کہلائے گی۔
- کشتی لے کر سمندر میں آنے والے انسان بہت بڑے ہیں لیکن تنہا کشتی لے کر نکلنے والا انسان اس سے بھی بڑا ہوتا ہے۔
- ہوا میں تعمیر کردہ محل نہایت پائیدار ہوتے ہیں۔ وہ آپ خود بناتے ہیں۔ کسی ٹھیکے دار سے نہیں بنواتے۔
- خیالات کی آمدنی کم ہو تو لفظوں کی فضول خرچی سے پرہیز کرو۔
- وقت ایک ایسا آوارہ گرد ہے جس کے پاس ایک جگہ پر قیام کرنے کے لیے کوئی خیمہ نہیں۔
- دانا کی دانائی صرف کتابوں میں ہی نہیں، زندگی کی اونچی نیچی چٹانوں کے پیچ و خم میں چھپی ہوتی

ہے۔

افلاطون نے کہا،

"کام کی تیزی کو طلب مت کرو بلکہ اس کی عمدگی طلب کرو۔ بے شک لوگ یہ نہیں پوچھیں گے کہ کتنے وقت میں اس کام سے فارغ ہوا۔ بلکہ یہ دیکھیں گے کہ اس کی پختگی اور بناوٹ کی عمدگی کیسی ہے۔"

نسبت سنیعہ۔ کہروڑ پکا

یہی تو ہے زندگی،

- ہمیں جان لینا چاہیے کہ زندگی مشکل ہے۔ اگر ہم اس حقیقت کو جان لیں تو پھر اس میں مزید کوئی مشکل نہیں رہتی۔
- مسئلہ یہ ہے کہ جو ہم بوتے ہیں اس کے بالکل برعکس کاٹنا چاہتے ہیں۔ ہم وہی کچھ کاٹیں گے جو کہ بوئیں گے۔
- خود کو تمام اچھائیوں، خوبیوں، خامیوں، جسامت اور خصوصیات کے اعتبار سے مکمل طور پر قبول کیجیے۔
- اپنے اعمال اور فیصلوں کی مکمل ذمہ داری قبول کیجیے۔
- جن چیزوں پر آپ کو اختیار نہیں، ان کے بارے میں پریشان ہونے کے بجائے ان چیزوں پر اپنی توجہ مبذول کریں جو آپ کے اختیار میں ہیں۔
- اس حقیقت کو جانیے کہ آپ کو اشرف المخلوقات پیدا کیا گیا ہے۔
- انسان اس وقت تک ناکام نہیں ہوتا جب تک وہ ناکامی قبول کر کے کوشش ترک نہ کردے۔ ہمت کبھی نہ ہاریں۔
- آپ حالات کو نہیں بدل سکتے لیکن خود کو ان کے مطابق ڈھال سکتے ہیں۔
- مشکل اور پریشانی ہمیں کچھ سکھانے کے لیے آتی ہے۔ ہر مسئلے کا حل موجود ہے۔ ہمارا کام اس حل کو تلاش کرنا ہے۔

- حکمت ایک درخت ہے جو دل میں اُگتا، دماغ میں پلتا اور زبان پر پھل دیتا ہے۔
- خوابوں کے سفر میں۔ ہم سفر بناتے نہیں جاتے، بن جاتے ہیں۔

گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکا

سبق،

آپ نے وہ قصہ تو سُنا ہی ہوگا کہ ایک کسان ایک صبح منہ اندھیرے اپنے کھیتوں کو پانی دینے کے لیے اُٹھا تو اس نے دیکھا کہ اُس کے گھر کی چار دیواری کے ناب دان میں ایک بڑی خوبصورت سی چمکتی رسّی پڑی ہوئی ہے۔ اُس نے جھٹ رسّی اُٹھالی اور اسے کھینچنا شروع کر دیا۔ ابھی ذرا ہی زور لگایا تھا کہ فضا ایک دل خراش دھاڑ سے گونج اٹھی۔ تب کسان کو معلوم ہوا کہ وہ رسّی نہیں شیر کی دم تھی۔ شیر بھی اُٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اب اگر کسان دُم چھوڑتا ہے تو شیر یقیناً پلٹ کر حملہ کرے گا۔ اگر پکڑے رکھتا ہے تو بھلا کب تک پکڑے رہے گا؟ کسان ابھی اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ اُسے دُور ایک بدھ بھکشو جاتا نظر آیا۔ کسان نے اُسے آواز دے کر بلایا اور کہا۔

"یہ سامنے میرا کلہاڑا پڑا ہے، اس سے شیر کے سر کے پرخچے اڑا دو۔"

بھکشو نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور کہا۔

"نا بابا نا... جیو ہتیا بہت بڑا پاپ ہے... میں کسی کی جان نہیں لے سکتا۔" یہ کہہ کر چل دیا۔

کسان دانت کچکچا کر رہ گیا کہ اب کیا کرے؟ آخر اُس کے ذہن میں ایک تجویز آئی۔ اُس نے بھکشو کو دوبارہ بلا کر اس سے کہا۔

"اچھا چلو تم جیو ہتیا نہ کرو۔ ایک کام کرو کہ یہاں آ کر شیر کی دُم پکڑ لو۔ اس کی جیو ہتیا میں کر لوں گا۔ ورنہ اگر میں نے اس کی دُم چھوڑ دی تو یہ ہم دونوں کی جیو ہتیا کر دے گا۔"

بھکشو کو قربانی کے شیر کی دم پکڑنا بھی اعانت مجرمانہ ہی محسوس ہوا۔ مگر کسان بار بار شیر کی دم چھوڑ دینے کی دھمکی دے رہا تھا۔ بالآخر اس نے کہا۔

ہے تو یہ بھی بہت بڑا پاپ، مگر چلو میں دم تھ

لیتا ہوں۔"

کسان نے بھکشو کو شیر کی دُم پکڑا دی۔ اپنی کلہاڑی اٹھا کر کندھے پر رکھی اور کھیتوں کی طرف چل دیا۔ بھکشو نے واویلا مچایا۔

"ارے... ارے... کدھر جا رہے ہو!... مارو... اس شیر کو مارو... ورنہ یہ ہم دونوں کو مار دے گا۔"

کسان نے کہا۔ "نا بابا نا... تم ہی نے بتایا ہے کہ جیو تیا بہت بڑا پاپ ہے۔ جو پاپ تم خود نہیں کرتے وہ مجھ سے کیوں کروانا چاہ رہے ہو۔"

ثمرہ، اقرأ۔ کراچی

یہ عبرت کی جا ہے،

ظالم عباسی خلیفہ واثق باللہ جس نے ظلم و بربریت کی ایک نئی تاریخ رقم کی تھی۔ اس کی موت کا وقت قریب تھا اور موت کی غشی اس پر طاری تھی۔ کسی نے کہا۔ شاید یہ ختم ہو چکا ہے۔ اس کے قریب جانے کی کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ آخر کار اللہ ہی آگے بڑھا اور سانس کا پتا چلانے کے لیے ناک پر انگلی رکھی۔ اچانک واثق نے آنکھیں کھول دیں۔ اللہ ہی پر دہشت اور گھبراہٹ طاری ہو گئی لیکن یہ اس کی آخری ہچکی تھی پھر وہ مر گیا۔ اس کی لاش پر چادر ڈال دی۔ کچھ ہی دیر بعد محسوس ہوا کہ لاش کی اوپر تنی چادر ہل رہی ہے۔ چادر اٹھائی تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک چوہا واثق باللہ کی آنکھیں نکالے بھاگے جا رہا ہے۔

(مولانا مناظر احسن گیلانی)

اعتماد،

چھتری بارش کو نہیں روک سکتی لیکن اس کی وجہ سے ہم بارش میں بغیر بھیگے کھڑے رہنے کے قابل ہوتے ہیں۔ اسی طرح اعتماد ہمیں کامیابی نہیں دلاتا لیکن یہ ہمیں وہ قوت دیتا ہے، جس کے ذریعے ہم مشکلات کا سامنا کر سکتے ہیں۔

حنا سلیم اعوان۔ آخون باندی

تسلی،

ایک یہودی زار و قطار رو رہا تھا۔ اس کی بیٹی نے دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔

"آپ روئیں مت۔ روبن کی موت آئی تھی، مر گیا۔ ٹھیک ہے وہ میرا بوائے فرینڈ تھا اور آپ کا بزنس پارٹنر۔ ابھی اسے دفن کیے چار گھنٹے ہوئے ہیں۔"

باپ پھر رونے لگا۔ بیٹی اٹھی اور ٹیلی فون کیا۔ پھر باپ کی طرف مخاطب ہو کر بولی۔

"اب آپ روبن کو بالکل بھول جائیں۔ ابھی کچھ دیر میں میرا نیا بوائے فرینڈ یہاں پہنچ رہا ہے اور وہ آپ کا بزنس پارٹنر بن جائے گا۔"

یہ سنتے ہی یہودی کے آنسو بالکل خشک ہو گئے اور خوش ہو کر بولا۔

"اب پھر گورکن کی خدمات حاصل کرنا پڑیں گی۔"

ترقی کا راز،

نادر بادشاہ نے جب دلی پر قبضہ کیا تو اسے ہاتھی کی سواری پیش کی گئی۔ ہاتھی پر بیٹھ کر اس نے مہاوت سے کہا۔

"اس کی لگام میرے ہاتھ میں دے دو۔"

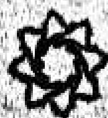
مہاوت نے کہا۔ "حضور! اس کی لگام نہیں ہوتی بلکہ یہ میرے اشارے پر چلتا ہے۔"

نادر شاہ یہ سن کر ہاتھی سے اتر آیا اور کہنے لگا۔

"میں ایسی سواری پر نہیں بیٹھتا جس کی لگام کسی اور کے ہاتھ میں ہو۔"

دو چیزیں،

انسان اپنی طرف سے پوری کوشش، پوری تدابیر اختیار کرتا ہے اور جب کامیابی اس کے قریب جا پہنچتی ہے تو دو چیزیں اس کے اور کامیابی کے بیچ حائل ہو جاتی ہیں۔ ایک موت اور دوسری تقدیر۔



خالدہ جیلانی



ثمینہ اکرم ——— رحیم یار خان

جو چل سکو تو کوئی ایسی چال چل جانا
مجھے گماں بھی نہ ہو اور تم بدل جانا

سعدیہ اکبر ——— لاہور

ہم سے کیوں مانگے حساب جاں کوئی عمر بھر
کون ہیں، کیا ہیں، کہاں ہیں؟ ان سوالوں میں رہے

فریحہ اصغر ——— گجرات

ایک کو دوسرے سے سہل نہ جان
ہر کوئی، ہر کسی سے مشکل ہے

لائبہ انور ——— کراچی

تقدیر ہنس رہی ہے کہ میں سوختہ نصیب
جنگل میں آ گیا ہوں جو گھر میں لگی ہے آگ

محوش کامران ——— فیصل آباد

کل کے اندیشوں سے اپنے دل کو آزردہ نہ کر
دیکھ یہ ہنستا ہوا موسم یہ خوشبو کا سفر

سارہ فرقان ——— جہلم

شاید کوئی خواہش روتی رہتی ہے
میرے اندر بارش ہوتی رہتی ہے

کرن انور ——— ڈی جی خان

جس کے ہاتھ میں پتھر، کماں، تیر نہ ہو
کوئی بھی ایسا مرے شہرِ مہرباں میں نہ تھا

شازیہ سحر ——— ملتان

دعائیں میں نے مانگی تھیں رُت بدلنے کی
فراز میرا نشیمن ہی گلستاں میں نہ تھا

سونیا خان ——— کراچی

عمروں کی دوستی کا صلہ یہ ملا کہ وہ
رخصت ہوا تو بس یونہی رسماً ملا کے ہاتھ

عابدہ پروین ——— لاہور

میں محبت کے قرینوں سے نہیں ہوں غافل
تجھ کو جانا ہے تو ہنس ہنس کے چلا جا مرے دوست
اب کے آشوبِ زمانہ تھا قیامت کا فراز
کیسے کیسے مرے دشمن ہوئے کیا کیا مرے دوست

نصرت الزہرہ ——— سکھر

قربتوں میں بھی جدائی کے زمانے مانگے
دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے
ہم نہ ہوتے تو کسی اور کے چرچے ہوتے
خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

حمیرا خالد ——— کراچی

پلک جھپکتے ہی دنیا اجاڑ دیتی ہے
وہ بستیاں جنہیں بستے زمانے لگتے ہیں

رافعہ راشد ——— حیدر آباد

فراز ملتے ہیں غم بھی نصیب والوں کو
ہر اک کے ہاتھ کہاں یہ خزانے لگتے ہیں

مدیحہ راحت ——— گوجرہ

مانا کہ تم اُجالوں کے اُجالے ہو
مگر اک دیا احتیاطاً گھر رکھنا
دل توڑنا تو سبھی کو آتا ہے
تم دل جوڑنے کا کوئی ہنر رکھنا

فوقیہ رباب چیمہ ——— بورے والا

تھیں طویل اتنی مسافتیں کوئی میرے ساتھ نہ چل سکا
وہ یقیں کی حد تک ٹھہر گیا میں گماں سے آگے گزر گیا

نخبہ اکرم ——— گاؤں گوریکی

کوئی گودکن نہیں ملتا
آدمی خود میں اگر مر جائے



امبر گل کی ڈائری سے

بعض غزلیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کو ایک بار پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ دل کی گہرائیوں میں اتر گئی ہوں۔ سلیم کوثر کی ایسی ہی ایک غزل سب قارئین بہنوں کے نام۔

کوئی سچے خواب دکھاتا ہے، پر جانے کون دکھاتا ہے
مجھے ساری رات جگاتا ہے، پر جانے کون جگاتا ہے

کوئی دریا ہے جس کی لہریں، مجھے کھینچ رہی ہیں اور کوئی
مری جانب ہاتھ بڑھاتا ہے، پر جانے کون بڑھاتا ہے

وہی بے خبری، وہی جیون کا بے انت سفر اور ایسے میں
کوئی اپنی یاد دلاتا ہے، پر جانے کون دلاتا ہے

کہیں اس معلوم سی دنیا میں، کوئی نامعلوم سی دنیا ہے
کوئی اس کے بھید بتاتا ہے، پر جانے کون بتاتا ہے

میری تنہائی میں ایک نئی تنہائی ہے جس کے رنگوں میں
کوئی اپنے رنگ ملاتا ہے، پر جانے کون ملاتا ہے

کوئی کہتا ہے یہ رستہ ہے اور تیرے لیے ہے یہ رستہ
کوئی اس میں خاک اڑاتا ہے، پر جانے کون اڑاتا ہے

کوئی کہتا ہے یہ دنیا ہے، اور تیرے لیے ہے یہ دنیا
کوئی اس سے خوف دلاتا ہے، پر جانے کون دلاتا ہے

کوئی کہتا ہے اس مٹی میں کئی خواب ہیں اور ان خوابوں سے
کوئی بیٹھا نقش بناتا ہے، پر جانے کون بناتا ہے

کوئی ہر شے کے سینے میں کہیں موجود ہے ظاہر ہونے کو
کوئی اپنا آپ چھپاتا ہے، پر جانے کون چھپاتا ہے

کوئی دیکھا اَن دیکھا ہر پل چپ چاپ لکھے جاتا ہے مگر
کوئی مجھ میں شور مچاتا ہے، پر جانے کون مچاتا ہے

مجھے دنیا اپنی چھب دکھلاتے روز چلی آتی ہے مگر
کوئی دونوں بیچ آجاتا ہے، پر جانے کون آجاتا ہے

ثناء اُجالا کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر باقی صدیقی کی یہ غزل آپ سب کی نذر۔

داغِ دل ہم کو یاد آنے لگے
لوگ اپنے دیے جلانے لگے

کچھ نہ پاکر بھی مطمئن ہیں ہم
عشق میں ہاتھ کیا خزانے لگے

یہی رستہ ہے، اب یہی منزل ہے
اب یہیں دل کسی بہلانے لگے

خود فریبی سی خود فریبی ہے
پاس کے ڈھول بھی سہانے لگے

اب تو ہوتا ہے ہر قدم پہ گماں
ہم یہ کیسا قدم اٹھانے لگے

اس بدلتے ہوئے زمانے میں
تیرے قصے بھی پرانے لگے

رخ بدلنے لگا فسانے کا
لوگ محفل سے اُٹھ کے جانے لگے

ایک پل میں وہاں سے ہم اُٹھے
بیٹھنے میں جہاں زمانے لگے

اپنی قسمت سے ہے مفر کس کو
تیر پر اُڑ کے بھی نشانے لگے

ہم تک آئے نہ آئے موسم گل
کچھ پرندے تو چہچہانے لگے

شام کا وقت ہو گیا باقی
بستیوں سے شرار آنے لگے

مدیحہ راحت کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر امجد اسلام امجد کی یہ نظم قارئین کی نذر۔

عشق کے علاقے میں، حکم یار چلتا ہے
ضابطے نہیں چلتے
حسن کی عدالت میں، عاجزی تو چلتی ہے
مرتبے نہیں چلتے
دوستی کے رستوں کی پر روش مزدوری ہے
سلسلے تعلق کے خود سے بن تو جاتے ہیں
لیکن ان شگوفوں کو، ٹوٹنے بکھرنے سے
روکنا بھی پڑتا ہے
چاہتوں کی مٹی کو، آرزو کے پودے کو
سینچنا بھی پڑتا ہے
رنجشوں کی باتوں کو، بھولنا بھی پڑتا ہے

حرا قریشی کی ڈائری سے

لفظوں کی کمان سے نکلتے ہی جذبوں کے تیر شورش بپا کرتے ہیں اور جب یہ جذبے یادوں کی دہلیز پر گھٹنے ٹیک کر دو زانو بیٹھ جائیں تو بھی نہیں ہٹتے ہیں خواہ دستک دیتی ہوا رخ موڑ لے۔ آتے طوفان راہ بدل لیں بادل ٹوٹ کر برس جائے، یہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ فنا کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی درد، ایسا ہی کرب فرحت عباس شاہ کی نظم "شدت" میں ہے۔

یاد کی
یہ بھی تو مجبوری ہے
کھڑکیاں بند ملیں دل کی
تو بے چینی سے
سر پٹختے ہوئے دہلیز پہ مر جاتی ہے

وردہ بٹ کی ڈائری سے

اس سال بہت پیاری دوست نے شادی کے بعد حسن نثار کی کتاب "پچھلے پہر کا چاند" تحفے میں دی۔ ان کی یہ غزل میری ڈائری کی زینت بنی۔ آپ بھی پڑھیں۔

میں کون ہوں، میں بھی تو نہیں بتا پایا
میں تم سے اپنا تعارف نہیں کرا پایا

نجانے کتنے برس اس سے بات ہوتی رہی
میں اس کو اصل کہانی نہیں سنا پایا

وہ میرا کھردرا لہجہ، کرخت سا چہرہ
میں اپنی روح کا چہرہ نہیں دکھا پایا

نجانے آج وہ کیسا ہے اور کہاں پر ہے
میرا یہ دکھ کہ میں اس کو نہیں بھلا پایا

ٹی وی فنکارہ

باتیں سلمیٰ حسن سے

شاہین رشید

1 ""اصلی نام؟"
"سلمیٰ حسن۔"
2 "پیار کا نام؟"
"سلمیٰ ہی بلاتے ہیں۔"
3 "جنم دن / سال اور شہر؟"
"23 فروری / 1975ء / کراچی۔"
4 "ستارہ / قد؟"
"Pisces (حوت) / 5 فٹ 4 انچ۔"
5 "بہن بھائی / آپ کا نمبر؟"
"ایک بڑی بہن ایک چھوٹا بھائی / میں درمیان کی۔"
6 "تعلیمی قابلیت؟"
"ماسٹرز ان ہسٹری۔"
7 "کیا بننے کا ارادہ تھا؟"
"صرف ڈگری لینی تھی۔"
8 "کام آئی؟"
"بس مختلف طریقوں سے آگئی۔ پڑھنے سے انسان کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے اور شخصیت بنتی ہے۔"
9 "شوبز میں آمد؟"
"جب چھوٹی تھی تب ہی سے آئی ہوں۔ امی کی ایک دوست کے ذریعے آئی۔"
10 "پہلا ڈرامہ؟"
"دھوپ میں ساون۔"
11 "وجہ شہرت؟"
"بچپن میں "کڈز کلب" کیا تھا اس نے شہرت دی تو مزید آفرز آئیں پھر ڈرامہ "رابعہ زندہ رہے گی" نے مزید شہرت دی۔"
12 "زندگی کی پہلی کمائی؟"
"کڈز کلب کے ایک شو کے دو ہزار ملتے تھے۔"
13 "کیفیت؟"
"بے حد خوشی ہوئی تھی اور گھر والوں پر خرچ کر دیے تھے۔"
14 "شوبز کی برائی؟"
"انسان کو فیم (شہرت) مل جاتا ہے تو وہ حقیقت سے دور ہو جاتا ہے۔"
15 "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"
"ساڑھے چھ بجے میری صبح ہوتی ہے۔ بیٹی کی وجہ سے جلدی اٹھتی ہوں۔"
16 "رات؟"
"ساڑھے بارہ بجے رات ہوتی ہے۔"
17 "صبح اٹھ کر کیا دل چاہتا ہے؟"
"دوبارہ سو جاؤں۔"
18 "گھر والوں کی کوئی بات، جو اچھی نہیں لگتی؟"
"پتا نہیں لیکن کبھی کبھی لگتا ہے کہ گھر والے مجھ سے یہ expect (توقع) کرتے ہیں کہ میں بہت اسٹرونگ ہوں۔"
19 "اپنے حکمرانوں سے ایک شکایت؟"
"کہ بھئی قانون بناتے ہیں تو نافذ بھی کریں..... تاکہ قانون کی بالادستی نظر آئے۔"
20 "قومی تہوار مناتی ہیں؟"
"بالکل..... بہت شوق سے۔ 14 اگست خاص طور پر کیونکہ میری بیٹی فاطمہ اب بڑی ہو رہی ہے تو اسے یہ احساس دلانا ضروری ہے کہ 14 اگست ہمارے لیے کیوں اہم ہے۔"
21 "اپنی جسمانی ساخت میں کوئی کمی محسوس کرتی ہیں؟"
"ناک تھوڑی چھوٹی ہونی چاہیے تھی۔"
22 "شدید بھوک میں مزاج کیسا ہو جاتا ہے؟"

"شاپنگ تو ہوتی ہے مگر خاموش ہو جاتی ہیں۔"

23 "حلقہ احباب وسیع ہے یا حلقہ یاراں؟"

"میں کافی اکیلی رہتی ہوں۔ اس لیے کوئی بھی نہیں ہے۔"

24 "شدت سے کس دن کا انتظار کرتی ہیں؟"

"کسی دن کا بھی نہیں۔"

25 "کھکن میں بھی جانے کے لیے تیار رہتی ہیں؟"

"تھائی لینڈ۔ آج کل تو کافی برے حالات ہیں تھائی لینڈ کے۔"

26 "خوشی کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟"

"یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ ہمارے اردگرد کون لوگ ہیں اور ان سے کس طرح خوشی شیئر کی جاسکتی ہے۔"

27 "دوسرے ممالک کی کون سی بات متاثر کرتی ہے؟"

"سب سے پہلے انسان جس بات سے متاثر ہوتا ہے وہ صفائی اور ضابطہ اخلاق ہے۔"

28 "نارمل انسان ہیں یا ضدی؟"

"ضدی تو ہوں مگر کمپرومائز بھی کرلیتی ہوں۔"

29 "کب دماغ خراب ہونے لگتا ہے؟"

"جب کوئی مجھ سے جھوٹ بولے اور مجھے معلوم ہو کہ یہ بندہ یا بندی جھوٹی ہے۔"

30 "غصے میں کیفیت؟"

"بس چلے تو جس پہ غصہ آرہا ہوتا ہے اس کا سر پھاڑ دوں۔"

31 "مردوں میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟"

"ایمان داری۔ کردار کی مضبوطی۔"

32 "اور کیا بری لگتی ہے؟"

"جھوٹ..... جھوٹ بولنے والے مرد برے لگتے ہیں۔"

33 "کوئی شخص ٹکٹکی باندھ کر آپ کو دیکھے تو؟"

"زیادہ تر تو میں اگنور ہی کردیتی ہوں کہ شاید پاگل ہے۔"

34 "پرائز بانڈ نکلنے کی منتظر رہتی ہیں؟"

"نہیں..... کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ نہیں نکلے گا۔"

35 "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"



"اپنے ابو کے غصے سے۔"

36 "کوئی چیز جو وقت سے پہلے مل گئی ہو؟"

"شہرت..... کافی کم عمری میں مل گئی تھی۔"

37 "اکاؤنٹ کون سا پسند ہے سنگل یا جوائنٹ؟"

"سنگل۔"

38 "کس ملک کی شہریت لینے کی خواہش ہے؟"

"کسی ملک کی نہیں..... اپنے پاکستان سے زیادہ دن دور رہ نہیں سکتی۔"

39 "شاپنگ کے لیے سب سے پہلے کس چیز کی شاپ پہ جاتی ہیں؟"

"بچوں کی شاپ پر..... فاطمہ کے لیے چیزیں خریدتی ہوں۔"

40 "آپ دنیا میں کیوں آئیں؟"

"اگر یہ بات پتا چل جاتی تو زندگی سکون میں آجاتی۔"

41 "پیسہ خرچ کرتے وقت کیا سوچتی ہیں؟"

"اگر یہ چیز نہ لوں تو ان پیسوں سے اور کیا چیز لی جاسکتی ہے۔"

42 "کیا پسند ہے تنقید یا تعریف؟"
"دونوں اگر پوائنٹ کے ساتھ کی جائے تو۔"
43 "ایک برا وقت جو آپ نے گزارا؟"
"ہاں۔۔۔ کیوں نہیں اور شاید سب کی زندگی میں اچھے اور برے وقت آتے ہیں۔"
44 "تحفہ کون سا اچھا لگتا ہے؟"
"اگر کوئی دل سے آپ کو سپورٹ کرے تو اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں ہوتا۔"
45 "ایک بات جو موڈ پر اچھا اثر ڈالتی ہے؟"
"بات نہیں بلکہ خوشگوار ماحول موڈ پر اچھا اثر ڈالتا ہے۔"
46 "پسندیدہ پروفیشن؟"
"بہت مشکل ہے بتانا۔۔۔ آج تک سمجھ میں نہیں آیا۔"
47 "کیا آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتی ہیں؟"
"بستر چھوڑ دیتی ہوں۔ کیونکہ فاطمہ کو اسکول بھیجنا ہوتا ہے۔"
48 "مخلص کون ہوتے ہیں؟"
"اپنے ہی ہوتے ہیں۔"
49 "چھٹی کہاں انجوائے کرتی ہیں؟"
"گھر پہ ہی۔۔۔ گھر سے بستر کوئی جگہ نہیں۔"
50 "لباس میں کیا پسند ہے؟"
"شلوار قمیص۔"
51 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"صرف اور صرف اپنے کمرے میں۔"
52 "اپنی شخصیت کے لیے ایک جملہ؟"
"یہ تو روز بدلتی رہتی ہے۔"
53 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتی ہیں؟"
"گھر والوں کے۔"
54 "بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟"
"میری ایک دوست ہے "کیف غزنوی" اس کے ساتھ وقت گزارتی ہوں۔"
55 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائیں؟"
"...میں۔۔۔ کیونکہ اگر کوئی بات تنگ کرے تو اس کی کال ریسیو نہیں کرتی۔"
56 "اچانک مہمان آجائیں تو؟"
"یہ مہمانوں پر منحصر ہے کہ کون ہے۔۔۔ ویسے ۔۔۔ اچھا ہی لگتا ہے۔"
57 "مہمان بننا کیسا لگتا ہے؟"
"زیادہ اچھا نہیں لگتا اس لیے کم ہی جاتی ہوں۔"
58 "پارلر میں آئیں تو کیا کریں گی؟"
"اب تو سب کچھ اتنا زیادہ ہو چکا ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں گی۔"
59 "چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"
"مجھے جیولری اسٹ کے نیچر جمع کرنے کا بہت شوق تھا اب فاطمہ کو اس کام میں لگا دیا ہے۔"
60 "کس قسم کی نصیحت بری لگتی ہے؟"
"فاطمہ کو کوئی نصیحت کرے تو مجھے برا لگتا ہے۔ کیونکہ ہر ماں اپنے بچے کو الگ ہی انداز میں دیکھ رہی ہوتی ہے اور آپ اپنے بچے کو کچھ بھی کہہ لیں مگر دوسروں کی بات برداشت نہیں ہوتی۔"
61 "انسان کی زندگی کا سب سے اچھا دور کون سا ہوتا ہے؟"
"ہمیں احساس نہیں ہوتا لیکن میرے خیال میں سب سے اچھا دور اسکول اور یونیورسٹی کا ہوتا ہے۔"
62 "وقت کی پابندی کرتی ہیں؟"
"بہت زیادہ۔"
63 "کن لوگوں پر دل کھول کر خرچ کرتی ہیں؟"
"اب تو صرف فاطمہ پر ہی کرتی ہوں۔"
64 "کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ 'اپنا بیڈ' چٹائی یا ڈائننگ ٹیبل؟"
"چٹائی اور ڈائننگ ٹیبل دونوں پسند ہیں۔"
65 "کانٹی نینٹل کھانوں میں کیا پسند ہے؟"
"جاپانی کھانے پسند ہیں۔"
66 "اگر آپ کے علاوہ ساری دنیا سو جائے تو آپ کیا چیز لینا پسند کریں گی؟"

"سکون۔"

67 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"

"کم ہی دلچسپی ہے۔ فیس بک پہ گیم کھیلتی ہوں۔"

68 "فاطمہ کے لیے دلی خواہش؟"

"کہ وہ میری زندگی میں اعلا تعلیم حاصل کرلے۔"

69 "ایک کھانا جو آپ بہت اچھا پکا لیتی ہیں؟"

"کھاؤسے۔"

70 "عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟"

"میرا خیال ہے' مرد زیادہ نرم دل ہوتے ہیں۔"

71 "اگر آپ کو کوئی اغوا کرلے تو گھر والوں کا ردعمل؟"

"میرا خیال ہے کہ ابو سب کچھ دے دیں گے۔"

72 "آپ کس کو اغوا کرنا چاہیں گی اور تاوان میں کیا وصول کریں گی؟"

"اپنا بھ بچن کو اور ڈھیر ساری باتیں کرکے چھوڑ دوں گی۔"

73 "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"

"کیڑوں سے..... نہیں ان سے مجھے ڈر نہیں لگتا۔"

74 "خودکش حملہ آور بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟"

"میرے خیال میں دونوں ہی ہوتا ہے۔"

75 "رویے جو تکلیف کا باعث بنتے ہیں؟"

"بدتمیزی' جھوٹ۔"

76 "شادی کی رسموں میں پسندیدہ رسم؟"

"نکاح۔"

77 "تحفہ دینا چاہیے یا کیش؟"

"تحفہ..... کیونکہ یادگار رہتا ہے۔"

78 "کھانا اور ناشتہ کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟"

"کھانا تو کسی کے ہاتھ کا بھی پکا ہوا کھالیتی ہوں مگر ناشتہ صرف اپنے ہاتھ کا پسند ہے۔"

79 "کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟"

"نپولین بونا پارٹ۔"

80 "اپنا فون نمبر کتنی بار تبدیل کیا؟"

"جب سے موبائل لیا ہے صرف دوبار۔"

81 "گھر سے نکلتے وقت کیا چیزیں لازمی پاس رکھتی ہیں؟"

"موبائل اور والٹ۔"

82 "لوگوں میں جلدی گھل مل جاتی ہیں؟"

"کوشش کرتی ہوں۔ مگر تھوڑا ٹائم لگتا ہے۔"

83 "اپنی غلطی کا اعتراف کرلیتی ہیں؟"

"بہت آسانی سے۔ نہیں بھی ہوتی تو کرلیتی ہوں۔"

84 "آپ کی کوئی اچھی اور بری عادت؟"

"شاید بغیر احساس کیے لوگوں سے زیادہ توقعات وابستہ کرلیتی ہوں' یہ بری عادت ہے اور اچھی عادت یہ کہ اگر کسی کو دوست مان لیتی ہوں تو پھر اس کے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار رہتی ہوں۔"

85 "منہ سے گالیاں کب نکلتی ہیں؟"

"جب کوئی گاڑی میری گاڑی کو مار جائے تو۔"

86 "غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"

"نہیں۔ کبھی نہیں۔"

87 "غصے میں پہلا لفظ منہ سے کیا نکلتا ہے؟"

"کیا بکواس ہے۔"

88 "شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟"

"جب آپ اس کو اپنی ذاتی زندگی کا حصہ بنا لیتی ہیں۔"

89 "بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتی ہیں؟"

"لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے۔"

90 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"

"فون۔"

91 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا رکھتی ہیں؟"

"پانی اور موبائل فون۔"

92 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"

"جب چیزیں سنبھلنے میں نہ آرہی ہوں۔"

101 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے؟"

"زوال دیکھ چکی ہوں۔"

☆



نادرہ خاتون



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

مسز کرن نعمان۔۔۔ کراچی

جون کا شمارہ بھی اپنے ٹائٹل سے لے کر بیوٹی بکس تک بہت اچھا تھا۔

"کرن کرن روشنی" خواتین ڈائجسٹ کا بہت پیارا سلسلہ ہے۔

"رہ نورد شوق" میں نے بہت ہی شوق سے پڑھا ہر رائٹر کو۔ خاص طور پر یہ سوال کہ وہ کن کن مصنفین کو اور کون سی کتابیں شوق سے پڑھتی ہیں۔ یہ جان کر مجھے بہت خوشی محسوس ہوئی کہ تمام تر مصنفین نے جن کتب کا ذکر کیا وہ نا صرف یہ کہ میں پڑھ چکی ہوں بلکہ اکثر کتابیں میرے پاس موجود ہیں۔

اور ایک اپنی پسندیدہ رائٹر کا ذکر میں ان کے ناول کے حوالے کے ساتھ کروں گی۔ عنیزہ سید "جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم" بے انتہا خوب صورت تحریر۔ اب بات ہو جائے کچھ "عہد الست" کی تو تنزیلہ ریاض نے اس میں مشرقی اور مغربی رنگوں کے امتزاج سے چار کہانیاں لکھی ہیں چار ندیوں کو ایک دریا میں کیسے ڈھالتی ہیں اور اب میں بات کروں گی کچھ اس ناول کے بارے میں جسے آپ نے اس ماہ کی خاص پیش کش قرار دیا۔ "محبت داغ کی صورت" یہ پڑھنے کے بعد دو دن میں یہ سوچتی رہی کہ اس تحریر اس انداز بیاں کی ستائش کے لیے کون سے الفاظ استعمال ہو سکتے ہیں۔ میں آپ کو آج ایک بات بتاتی ہوں کہ ویسے تو میں پچھلے پچیس یا چھبیس سال سے شعاع اور خواتین پڑھ رہی ہوں، مگر مستقل نہیں' یہ سلسلہ ٹوٹتا جڑتا رہا تقریباً" دو سال قبل یہ سلسلہ سائرہ رضا کی تحریر نے ہی ایک بار پھر جوڑا تھا۔ "پھر آیا برف کا موسم" شاید یہی نام تھا اس کہانی کا۔ عفت سحر طاہر کا ناول "بن مانگی دعا" بھی اچھا جا رہا ہے' پر اس کا انداز خاصا پرانا لگ رہا ہے' اس کی رفتار بھی کافی آہستہ ہے۔ "ماہ تمام" اس ماہ تمام ہو گیا۔ ہیپی اینڈنگ بہت اچھی لگی۔ آمنہ ریاض اتنا اچھا ناول لکھنے پر مبارک باد کی مستحق ہیں۔ افسانے بھی اس ماہ سب ہی بہت اچھے تھے۔ سمیرا حمید اپنے منفرد انداز کی وجہ سے ٹاپ پر رہیں۔ اس بار کلیم عثمانی کی غزل اور یوسف خالد کی نظم بہت متاثر کن لگیں۔ "ہمارے نام" میں اس بار بہن آمنہ بتول کا خط بہت اچھا لگا۔ میں ایک بہت بڑی جوائنٹ فیملی میں رہتی ہوں۔ کم و بیش تیس پینتیس لوگوں کی فیملی ہے' مگر حیرت ہے کوئی بھی ایسا نہیں جسے پڑھنے کا شوق ہو' میں شادی سے پہلے بھی پڑھتی تھی' شادی کے بعد پڑھنے کا سلسلہ تقریباً" ختم ہو گیا' کچھ عرصے کے لیے ملک سے باہر چلی گئی تھی' واپس آئی تو بڑے بیٹے کی پیدائش کا وقت قریب تھا' پھر گھر کے کام کاج' بچے کی دیکھ بھال' مگر میں کتاب سے زیادہ عرصے دور نہ رہ سکی اور کچھ ہوا یہ کہ جہاں اتنے لوگ ہوں وہاں محلاتی سازشیں بھی ضرور ہوتی ہیں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں اپنے ضمیر سے مطمئن ہوں' جس نے نہ تو کسی کا کبھی برا چاہا' نہ ہی ان محلاتی سازشوں میں حصہ لیا۔ اس لیے اپنا دھیان زیادہ تر کتابوں کی طرف لگا لیا اور اس سلسلے میں' میں اپنے شوہر نعمان کی بہت بہت ممنون ہوں۔ بہت مہنگی بکس انہوں نے مجھے میری فرمائش پر لے کر دیں اور خود سے گفٹ بھی کیں۔

ج : پیاری کرن! کرن کرن روشنی کے سلسلے میں ہم انتہائی احتیاط برتتے ہیں اور مستند کتابوں سے نقل کرتے ہیں۔ دارالاسلام جو سعودی پاکستانی اشتراک سے قائم کردہ ادارہ ہے ان کی شائع کردہ کتاب ابن ماجہ سے ہم نے احادیث نقل کی ہیں۔ بیان کی تحقیق ہے۔

بہت سی پرانی مصنفین لکھنا چھوڑ چکی ہیں اور کچھ چینلز پر مصروف ہیں' اس لیے آپ کو ان کی تحریریں نظر نہیں آتیں' لیکن ہماری بہت سی نئی مصنفین بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں' تنزیلہ ریاض کا ناول بہت دلچسپ انداز میں آگے بڑھ رہا ہے' کردار واضح ہوں گے تو دلچسپی مزید بڑھے گی۔ عدنان بھائی کے سلسلے میں خط شامل نہیں ہوتے' صرف جوابات شائع کیے جاتے ہیں' اگر خط شامل کیے جاتے ہیں' تو ان کا بہت سا حصہ ایڈٹ کردیا جاتا ہے۔ اس صورت میں آپ کو صحیح اندازہ نہیں ہو پاتا کہ جواب کس بات کا اور کیوں دیا گیا ہے۔ مطالعہ بلاشبہ بہت اچھی عادت ہے۔ اس سے انسان بہت سے لڑائی جھگڑوں اور فضول باتوں سے دور رہتا ہے اور پھر مطالعہ سے ہمیں سیکھنے' جاننے کا موقع بھی ملتا ہے۔ یہ آپ کی خوش نصیبی ہے کہ آپ کے شوہر آپ کو کتابیں لاکر دیتے ہیں ورنہ شوہر حضرات کو عموماً" بیوی کے مطالعہ کرنے سے چڑ ہوتی ہے۔

ہاجرہ عرفان۔۔۔ سیالکوٹ

دو دنوں میں پورا ڈائجسٹ پڑھ ڈالا' حالانکہ شوہر نے خوب سنائیں' مگر ہمارے کان پر جوں نہ رینگی۔ ان کے کہنے پر تو ہم دو بچوں کی ماں ہیں۔ اب انہیں بھی تو ہماری ماننی ہوگی۔ پورے دو دن ناشتے کے بغیر گئے۔ میں صبح صبح ہی ڈائجسٹ پڑھتی ہوں۔ خالی دماغ کے ساتھ بہترین تحریر "محبت داغ کی صورت" مزہ آگیا۔ شیطان کی بات سن کر تو ہم دہل ہی گئے۔ منکر سے انکار اور نہ ماننا۔ بہترین افسانے پرادن اور خسارہ تھے۔ "عہد الست" واہ تنزیلہ جی یو آر سو گریٹ "بن مانگی دعا" بہت بورنگ ہے۔ پلیز دو' تین قسطوں میں کام تمام کریں۔ لکھائی اگر گندی ہے تو معاف کردیں۔ شوہر آنے والے ہیں اور اگر ہم نے آج کھانا اچھا نہ بنایا تو ڈائجسٹ بند۔۔۔ اور لفظ جب تصویر بنتے ہیں ضرور شروع کریں اور ہر ماہ ایک پرانی مصنفہ کا انٹرویو شائع کریں۔ یہ میری اور میری ساس اور دادی ساس کی التجا ہے۔

ج : ہاجرہ اپنے شوہر کو اتنا زچ نہ کریں' وہ تنگ آکر آپ کے رسالے پڑھنے پر پابندی لگادیں۔ یہ تو اچھی بات نہیں ہے کہ شوہر کو دو دن تک ناشتا نہ دیں آپ انہیں ناشتا دے کر بھی رسالے پڑھ سکتی تھیں اور ان کے کہنے پر ماں بننے والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا آپ کو بچے اچھے نہیں لگتے۔ آپ کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہیں جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

فوقیہ رباب چیمہ۔۔۔ بورے والا

"کرن کرن روشنی" کے بعد سب سے پہلے سائرہ رضا کا مکمل ناول "محبت داغ کی صورت" پڑھا۔ بہت اچھوتا اور عمدہ ٹاپک تھا۔ خصوصاً" جائز اور ناجائز کا فرق بہت خوب صورتی سے واضح کیا۔ بہت مزہ آیا پڑھ کر اور عفت سحر طاہر سے گزارش ہے کہ بن مانگی دعا میں ابیہا کو اب مشکلات سے نجات دلادیں۔ افسانے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ سب قابل تعریف تھے۔ خصوصاً" سمیرا حمید اور فرح بخاری کے افسانے دل موہ لینے والے تھے' بہت دل کو چھوئے۔

ج : پیاری فوقیہ! کافی عرصہ کے بعد شرکت کی آپ نے۔ خیریت تو تھی' کہاں تھیں آپ' خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ام دعا۔۔۔ میرپور آزاد کشمیر

ہر کہانی پڑھنے کے بعد سوچتی ہوں "ہاں اس پر تبصرہ کروں گی" مگر وقت کی کمی' دو چھوٹی بیٹیوں کا ساتھ۔۔۔ سلام ان ماؤں کو جو بچوں کے ساتھ اپنی "غیر نصابی سرگرمیاں" جاری رکھتی ہیں۔ اپنا تو حال یہ ہے کہ کنگھی بھی دو دن بعد کرنا نصیب ہوتا ہے۔ (اب پتا نہیں ہوتی ہے یا ہوتا ہے) خیر ان دنوں آپ کے اور ہمارے رسالوں میں سمیرا حمید' سحر ساجد' شہلا رضا' صباحت یاسمین کا ڈنکا بجتا ہے۔ باقی بھی اچھے ہیں اور پرانے تو بہت ہی اچھے اگر سمیرا اور شہلا کی تحاریر یہ اس طرح گماں ہوتا ہے جیسے صحیح اردو ادب کو پڑھ رہے ہیں۔

ج : ام دعا! لگتا ہے کہ آپ کو سندھ اسمبلی کی اسپیکر

سائرہ رضا شہلا رضا بہت اچھی لگتی ہیں' تب ہی آپ نے سائرہ رضا کے بجائے شہلا رضا لکھا۔ کورسز کے بارے میں تجویز اچھی ہے' مگر عملی طور پر ممکن نہیں ہے۔ صرف لکھ کر سکھایا نہیں جاسکتا' اس کے لیے ضروری ہے کہ باقاعدہ کلاسز ہوں اور عملی طور پر کرکے بتایا جائے۔ تب ہی کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

شائستہ اکبر۔ گنڈو کالونی

گزرے۔ دو' تین برسوں نے زندگی کے بہت سے رنگ دکھائے۔ رشتوں کی بے قدری' محبتوں میں جھول' دکھاوا' بناوٹ' کچھ اپنی غلطیاں' زندگی نے بہت بری طرح آزمایا۔ "محبت داغ کی صورت" سائرہ رضا کے اس ناول نے بہت کچھ یاد کرنے پر مجبور کردیا۔ "جو بھولا کبھی نہیں" محبت دھوکا نہیں دیتی' اتنا تو جان گئی ہوں' بس غلطیاں اور بے اعتباری جان لیوا ہوتی ہے۔ پھر زندگی سزا کے طور پر گزارنی پڑتی ہے۔

ج :۔ شائستہ زندگی میں غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں۔ بات یہ ہے کہ اپنی غلطیوں کا ادراک' اعتراف کرکے ان کی تلافی کی کوشش کی جائے' جو لوگ اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کرتے' وہ بار بار غلطیوں کو دہراتے ہیں۔ آپ کے ساتھ کیا ہوا یہ تو ہم نہیں جانتے' لیکن اچھی بات یہ ہے کہ آپ کو اپنی غلطیوں کا احساس ہے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔ زندگی نے آپ کو آزمایا ہے تو نوازے گی بھی ضرور۔ ان شاء اللہ۔

مدیحہ راحت۔ گاؤں دھرم کوٹ گوجرہ

خواتین ڈائجسٹ کا اور میرا ساتھ اسکول کے زمانے سے ہے اور آج میں ایم ایس سی کرنے کے بعد سائنس ٹیچر کے فرائض ادا کررہی ہوں۔ خواتین ڈائجسٹ کا ہر سلسلہ لاجواب ہے۔ خصوصاً "کرن کرن روشنی" "آپ کا باورچی خانہ" اور "بیوٹی بکس" میری آپ سے درخواست ہے کہ قاری بہنوں کے لیے ایک ایسا سلسلہ بھی شروع کریں جو لباس کے انتخاب اور نئے رجحانات کے بارے میں رہنمائی کرے۔

اب آتے ہیں ناولز کی طرف تو موجودہ مصنفین بہت زبردست لکھ رہی ہیں' لیکن رخسانہ نگار عدنان کہاں مصروف ہوگئی ہیں' ان کی کہانیوں کو بہت مس کررہی ہوں۔ مئی کے شمارے میں ایک ہندی ادب کا ترجمہ پڑھا کے آپ کی یہ کاوش بہت پسند آئی۔ اس کو جاری رکھتے ہوئے فرانسیسی' جرمن اور دوسرے اہم ممالک کے ادب میں سے بھی کچھ دیا کریں۔ اس سے ملکی ادب کے ساتھ غیر ملکی ادب سے بھی شناسائی حاصل ہوسکے گی۔ سائرہ رضا بہت حساس موضوعات پر بہترین لکھتی ہیں۔ "یقین کامل ہی بندگی ہے" بہت پسند آیا تھا۔

ج :۔ مدیحہ گاؤں میں رہنے کے باوجود آپ نے اعلا تعلیم حاصل کی اور اب علم کی روشنی دوسروں میں بانٹ رہی ہیں' یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

سمیرا خان۔ بدین ملکانی شریف

ج ۔ہمارے گاؤں سے سات میل دور جھڈو شہر ہے۔ جہاں سے یہ پرچہ ملتا ہے۔ وہاں کے ماحول کی وجہ سے منگوانا مشکل ہے۔ مجھے خواتین ڈائجسٹ سے جنون کی حد تک عشق ہے۔ اس کو میں کبھی بھول کر بھی نہیں چھوڑ سکتی۔

اور ہاں آپی۔ میں خواتین ڈائجسٹ کی سالانہ خریدار بننا چاہتی ہوں۔ تو کیا میں خواتین ڈائجسٹ کے ایڈریس پر پیسے منی آرڈر کردوں؟ لیکن کتنے؟ پھر کیا مجھے دسمبر کا پرچہ مل سکتا ہے۔ اگر ہاں۔ تو پلیز آپی میں اپنا ایڈریس لکھ رہی ہوں آپ اس پر مجھے وی پی کردیں میں جتنا خرچ آیا ادا کردوں گی۔

ج ۔ سمیرا۔ آپ درج ذیل ایڈریس پر 700 روپے منی آرڈر کردیں۔ آپ کو سال بھر تک گھر بیٹھے پرچا ملتا رہے گا۔

خواتین ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی

منی آرڈر فام پر اپنا ایڈریس صاف صاف لکھیں اور یہ بھی لکھیں کہ آپ سالانہ خریدار بننے کے لیے رقم بھجوا رہی ہیں۔

شائزہ لاریب۔ چکوال

یہ خط لکھنے کی وجہ "کوہ گراں تھے ہم" کی رائٹر عنیزہ سید تک ایک پیغام پہنچانا ہے۔ عنیزہ جی آپ سے ایک

درخواست ہے کہ پلیز سعد بلال کو ماریئے گا مت۔ اس طرح کے ناول میں ہیرو زیادہ تر مرجاتے ہیں۔

ج :۔ پیاری شازیہ! آپ نے خط لکھا' خوشی ہوئی۔ مگر سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ دو ماہ سے ہمارے پرچے کیوں نہیں خرید سکیں اور کن رویوں کے بدلنے کی وجہ سے پریشان ہیں۔ بہرحال ہم آپ کے لیے دعاگو ہیں اور آپ سے صرف اتنا کہیں گے کہ حالات کچھ بھی ہوں ہمت سے کام لیں اور صبر و تحمل کا دامن نہ چھوڑیں۔ ان شاء اللہ اچھا وقت ضرور آئے گا۔

حیا بنگش۔۔۔ کوہاٹ

اب آتی ہوں جون کے شمارے کی طرف سب سے پہلے "بن مانگی دعا" عفت آپی کا ناول پڑھا۔ شروع سے ہی بہت زبردست جا رہا ہے یہ ناول۔ ہمارے نام میں گل مہتاب (محلہ چراغ) نے لکھا ہے پلاٹ پرانا ہے۔ گل مہتاب جی کوئی کہانی نئی نہیں' یہ لکھنے والا ہے جو اسے نیا اسلوب رہتا ہے۔ ایمن اسرار! آپ واقعی بہت تنقید کرنے والی ہیں مجھے بلاوجہ تنقید کرنے والوں پر بہت غصہ آتا ہے۔ "بن مانگی دعا" کے بعد "عہد الست" پڑھا۔ ٹائٹل جتنا زبردست' ناول اس سے زبردست۔ نور محمد ہی وہ چھوٹا بچہ ہے اور میرے خیال میں امائمہ کا بھائی بھی وہی ہے۔ ماہ تمام کا اینڈ میری خواہش کے مطابق ہی ہوا۔

ج :۔ پیاری حیا! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ یہ سلسلہ آپ کی رائے کے لیے ہے۔ خواہ تعریف ہو یا تنقید یہ ایمن اسرار کی رائے تھی۔ اور ہر ایک کو اپنی رائے رکھنے کا حق حاصل ہے۔ آپ غصہ نہ کریں۔ متعلقہ مصنفین تک تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ آپ کی فرمائش پر رس گلے کی ترکیب دی جا رہی ہے' کہانیاں ابھی پڑھی نہیں ہیں۔

ہاجرہ ہمیش یوسف زئی۔۔۔ گاؤں اسماعیلہ صوابی

سائرہ رضا اور نمرہ احمد کی پرستار ہوں اور ان کے ہاتھ چومنے کو دل کرتا ہے' میرا حمید بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ سلسلہ وار ناول تو سب ہی اچھے ہیں' مگر "کوہ گراں تھے ہم" کی تو کیا ہی بات ہے۔ "عہد الست" بھی کافی اچھا جا رہا ہے۔ مستقل سلسلوں میں "ہمارے نام" بہت شوق سے پڑھتے ہیں' کیونکہ ہمیں لوگوں کے خیالات پڑھنے میں بہت مزہ آتا ہے۔

ج :۔ پیاری ہاجرہ! آپ نے صحیح لکھا۔ آپ کے گاؤں سے آپ پہلی ہیں جن کا خط ہمیں موصول ہوا ہے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ آئندہ بھی شرکت کرتی رہیے گا۔

شاء رحمٰن۔۔۔ گوجرانوالہ

کہنی سنی نے ہمیشہ کی طرح امید کا دامن تھمایا۔ سب سے پہلے بات کروں گی "کوہ گراں" کی عجب آگہی سی ملتی ہے اسے پڑھ کر۔ "عہد الست" نام ہی لرزا دیتا ہے اور جب اس عہد کا جواب "نعم" ہاں یاد آتا ہے تو روح شرمسار۔۔۔ شرمسار۔۔۔ تنزیلہ ریاض نے تقدیر کو کس قدر خوب صورت الفاظ کا جامہ پہنایا۔

قدرت کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا جاتا۔ قدرت پر تو راضی ہوا جاتا ہے۔ تقدیر پر قانع ہو جاؤ اور تقدیر کو زیر

آمنہ اجالا۔۔۔ ڈہرکی

نابینا جنم لیتی ہے اولاد بھی اس کی
جو قوم دیا کرتی ہے تاوان میں آنکھیں

وزیرستان' کراچی اور کئی دیگر شہروں کو آگ میں جلتے دیکھ کر اندر تلخی ہی تلخی سرائیت کر جاتی ہے۔ پل پل مرتے لوگوں کا دکھ اپنی جگہ' لیکن زندہ بچ جانے والوں کے دکھ تو اس سے بھی سوا ہیں کہ ان کا شمار تو شاید نہ زندوں میں کیا جا سکتا ہے اور نہ مردوں میں۔ جانے وطن عزیز کے لوگوں کے قسمت میں کیا ہے۔ یہ آگ لگانے والے چھپے ہوئے تو نہیں۔

اجلے کپڑوں میں رہو یا کہ نقابیں ڈالو
تم کو ہر رنگ میں مگر خلق خدا جانتی ہے

ج : پیاری آمنہ! حقیقت تو یہ ہے کہ قوم ہی نابینا ہو گئی ہے۔ سابقہ حکمرانوں کی غلط سوچ اور غلط اقدامات کا نتیجہ پوری قوم کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ عالمی دہشت گردی کو اپنی جنگ کہہ کر ہم نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا' اس کا حاصل یہی ہونا تھا کہ ہمارے شہر جل رہے ہیں' ہمارے لوگ مر رہے ہیں اور ہم بے بسی سے تماشا دیکھ رہے ہیں۔

نہیں زیر کرو' حق۔۔۔ ہاہ۔۔۔ کیا کہیں بس یہی کہ قدرت نے

تقدیر لکھی تو اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ جیسا اس نے لکھا ویسا ہم کو کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ جیسا ہم کرنے والے تھے ویسا اس نے لکھ دیا۔ بے شک وہ دلوں کی چھپی بات جانتا ہے۔ "ماہ تمام" بھی تمام ہوا۔ مجھے اس ناول کے ساتھ کچھ خاص لگاؤ نہ ہو سکا۔ بہت ہی عام موضوع کو بے جا طوالت کا شکار کیا گیا۔ بہرحال پسند اپنی اپنی اور "بن مانگی دعا" بھی ایسا ہی ہے اسی فہرست میں "رہ نورد شوق" بہت شوق سے پڑھا۔ اب بات کروں گی اپنی پسندیدہ مصنفین عمیرا احمد اور سائرہ رضا کی۔ دونوں کے پاس لفظوں کے خزانے' موضوعات کا ڈھیر' سوچ' لکھنے کا انداز' کمال' اعلا' بلند پایہ' واہ اور آہ... دونوں کو ساتھ لے کر چلتی ہیں۔ "محبت داغ کی صورت" کیا کہوں سائرہ آپ کے لیے؟ آپ کی ہر کہانی' ہر سطر' ہر حرف' ہر لفظ میں ہزار معنی پنہاں ہوتے ہیں۔ فرمائش ثمینہ عظمت علی سے کہ تشنگی کے کشکول میں اک آدھ سیرابی کی بوند ڈال دیں' کوئی افسانہ' طنز نامہ' حیرت نامہ' کوئی... کچھ بھی... کچھ بھی۔

ج :۔ ثنا اتنے خوب صورت تبصرے کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ آپ افسانے لکھیں۔ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔

زاہدہ ملک ۔۔۔ لاہور

میں آپ کو ہمیشہ بہت محبت سے خط لکھتی ہوں۔ ظاہری سی بات ہے خواتین سے رشتہ جو پرانا ہوا اور لگاؤ کی تو آپ پوچھیں ہی نا' میں اپنی زندگی میں ہر کام اتنے طریقے اور سبھاؤ سے کرتی ہوں کہ سب حیران رہ جاتے ہیں۔ گھر کا گھنٹوں میں نہیں' منٹوں میں کرتی ہوں۔ غصے میں آنے والے کے سامنے ہرگز نہیں بولتی' مگر سامنے والے کا غصہ ٹھنڈا ہو جانے پر اسے غصے کے نقصانات ضرور بتاتی ہوں۔ اپنی جاب پر نکلتے وقت راستہ اتنے اچھے طریقے سے طے کرتی ہوں کہ کبھی کسی کو برا بھلا نہیں کہنا پڑا۔ یہ سب کس کی وجہ سے ممکن ہوا' ظاہری سی بات ہے خواتین ڈائجسٹ کی بدولت۔ اس چھوٹی سی ڈبیا میں ہاتھی بند ہے۔ خواتین ڈائجسٹ میں شامل ہونے والی احادیث کتابی شکل میں مل سکتی ہیں؟ یا آپ کس کتاب سے انہیں شائع کرتے ہیں نام بتا دیں؟

ج :۔ پیاری زاہدہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ احادیث کی چھ کتابیں ہیں جو صحاح ستہ کہلاتی ہیں۔ صحیح بخاری' صحیح مسلم' ابن ماجہ' سنن نسائی' جامع ترمذی اور سنن ابو داؤد یہ کتابیں آپ کو کسی بھی اسلامی کتب خانہ سے مل سکتی ہیں۔ ہم ان ہی کتابوں سے شائع کرتے ہیں آپ کے افسانے ابھی پڑھے نہیں' پڑھ کر ہی رائے دی جا سکتی ہے۔

عفیفہ خیام ۔۔۔ راولپنڈی

سائرہ جی! واقعی میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں آپ کو سراہنے کا حق ادا کر سکوں' ابھی تو دل و دماغ سے "اب کر میری رفوگری" کا تاثر ختم نہیں ہوا تھا کہ آپ نے ایک اور دھماکے دار ناول تحریر کر دیا۔ اللہ آپ کا زور قلم اسی طرح تاحیات برقرار رکھے۔ (آمین) گزشتہ ناول میں آپ نے یہ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ دین کے احکامات کو چھوڑ کے جب معاشرتی رواجوں (مطلب ذات برادری) کو اہمیت دی گئی تو کتنی زندگیاں تباہ ہوئیں اور "محبت داغ کی صورت" اس میں سائرہ جی نے یہ بتایا کہ اللہ نے ہمیں اس دو دھاری تلوار' مطلب دنیا میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کا پابند کر کے بھیجا ہے اور جس طریقے سے آپ نے شیطان کا کردار بیان کیا' ناول کے اس حصے کو سراہنے کے لیے کم از کم میرے پاس تو الفاظ نہیں ہیں۔ خاص طور پر ابلیس مردود کا آخری سوال۔ یہ تو ہو گیا تبصرہ' لیکن ازاے ناول کچھ باتیں میری ناقص عقل میں نہیں سمائیں۔ شجرۃ الدر اور سنان نے جب پہلی دفعہ اپنی پاکیزہ محبت کو داغ دار کیا تو اس وقت ان دونوں نے رخصتی کا کیوں نہیں سوچا؟ اور حد تو یہ کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید سے مزید بڑھتے گئے۔ ناول میں بہت سے مقام ایسے آئے کہ شجرہ سے بے تحاشا نفرت محسوس ہوئی۔ پریگیننسی کے بعد بھی نہ اس نے اپنی عزت کی پروا کی' نہ بیوہ ماں اور نہ ہی اپنے محسن ماموں اور ممانیوں کی۔ اس پر کسی بھی ذلت کا کوئی بھی اثر کیوں نہیں ہوا؟ کیا ڈگریوں کی اور اونچے مقام پر پہنچنے کی لگن کسی انسان' خاص کر لڑکی کو اتنا بے حس بنا دیتی ہے؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا نا کہ سنان سے محبت بھی محض مطلب کی محبت تھی کہ وہ ہی ہمیشہ اس کے لیے آگے بڑھنے میں معاون ثابت ہوتا تھا اور اینڈ میں آ کر محترمہ کو اپنے بیٹے پر پیار آ رہا ہے۔ آنسو بہائے جا رہے ہیں تو میں صرف یہ کہوں گی کہ تف ہے۔ اس نے اس وقت کے

رونے پر اور اپنے بیٹے کے ساتھ اظہار محبت پر.... ایک پاکیزہ رشتے کو ایسا داغ دار کردیا ان دونوں نے کہ محبت صرف اور صرف داغ کی صورت میں ہی باقی رہی' ان کی اور ان کے بچے کی زندگی میں؟ اور آخر میں آپ کو ایک رائے دینی تھی کہ کیا خیال ہے خواتین ڈائجسٹ میں ایک صفحہ کالم نویسی کے لیے مختص کردیا جائے اور ہر خاص و عام کو اپنا ٹیلنٹ دکھانے کی دعوت دی جائے۔

ج :۔ عفیفہ! شجرہ کا کردار شروع سے ایک ایسی لڑکی کا دکھایا گیا ہے جو' کچھ بھی کرتی' پوری یکسوئی سے کرتی۔ اردگرد سے لاپروا' آگے پیچھے سے بے خبر' اس کی لاپروائی اور بے خبری کو مصنفہ نے کئی جگہ واضح بھی کیا ہے۔ سنان کے ساتھ اتنا وقت گزارنے کے باوجود اس نے نوٹ نہیں کیا کہ اس کی ٹانگ میں لنگ ہے۔ جب تک اس نے خود توجہ نہیں دلائی۔ اور سنان سے محبت بھی غرض پر مبنی نہیں تھی۔ ایسا ہوتا تو وہ کامیابی حاصل کرنے کے بعد پیچھے ہٹ جاتی۔ رخصتی کا خیال بھی اس لیے نہیں آیا کہ اس کی پوری توجہ اپنی پڑھائی کی طرف تھی۔ اس نے اپنی فطرت کے عین مطابق دوسری طرف نہ دیکھا نہ ہی سوچا۔ پھر جب اسے اپنی بدلی حالت کا علم ہوا تو وقت کافی آگے نکل چکا تھا۔ کالم کا سلسلہ شروع کرنے کی تجویز کی دیگر قارئین نے تائید کی تو غور کریں گے۔

علینہ ابتہاج.... ڈیرہ اسماعیل خان

"ماہ تمام" کا اینڈ حسب توقع ہی ہوا' لیکن تنزیلہ جی کا "عہد الست" پہلی قسط میں بہت الجھ گیا تھا۔ سائرہ رضا کے ناول نے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ اور افسانے سارے بس ٹھیک تھے۔ مجھے مزہ نہیں آیا۔ حیا بخاری ہمارے شہر سے تعلق رکھتی ہیں' یہ جان کر بہت خوشی ہوئی اور کیا فرح بخاری کا تعلق بھی یہیں سے ہے۔ غزل میں کلیم عثمانی کی غزل بے حد پسند آئی۔ "کرن کرن روشنی" میں اویس قرنی کی فضیلت نے مبہوت کردیا اور ایک شکوہ آپ اشعار کے صفحات کم سے کم کیوں کرتے جارہے ہیں۔ ہمارے گھر میں خواتین' کرن' شعاع اس وقت سے آرہے ہیں جب میں شاید پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ نمرہ احمد میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ ان کے سارے ناول پڑھے اور "جنت کے پتے" میرا پسندیدہ ناول ہے۔

ج :۔ علینہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید' شاعری کے صفحات بڑھانے کی کوشش کریں گے۔ نمرہ احمد کا ناول اس ماہ شامل ہے۔ تنزیلہ ریاض نے اب تک جو بھی لکھا ہے' وہ قارئین نے بے حد پسند کیا ہے اور ایک طویل عرصہ گزرنے کے باوجود ان کی کہانیاں قارئین بھلا نہ پائے ہیں۔ یہ کہانی بھی بہت دلچسپ ہے۔ آپ کو الجھن اس لیے محسوس ہوئی کہ کہانی چار ٹریک پر ہے اور ویسے بھی پہلی قسط میں تو صرف کرداروں کا تعارف ہی ہوتا ہے۔ آپ آگے پڑھیں' بہت دلچسپ ناول ہے۔ یقیناً" پسند کریں گی۔

ایمان فاطمہ.... نوڈیرو

میں نے جب بھی خواتین اور شعاع کو پڑھا' پہلے سے بڑھ کے پایا۔ "کرن کرن روشنی" بہت اچھا سلسلہ ہے۔ سب سے زیادہ "بن مانگی دعا" اور "ماہ تمام" اچھے لگے اور افسانے بھی سب ہی اچھے تھے۔ آپی میں آپ سے ایک چھوٹی سی فرمائش کرنا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ ایک' دو کہانیاں سندھی کلچر پہ بھی لکھیں۔

ج :۔ آپ نے خط لکھا' بہت خوشی ہوئی۔ سندھی کلچر پہ بہت سی کہانیاں شائع ہوچکی ہیں۔ کنیز نبوی نے کئی مکمل ناول اور سدرۃ المنتہی نے مکمل ناول اور ناولٹ لکھے ہیں۔ نسیم آمنہ بھی سندھی کلچر پر لکھتی رہی ہیں۔

سعدیہ سعید.... ڈیرہ غازی خان

جس کہانی نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا ہے' وہ عنیزہ سید کی "جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم" ہے۔ مجھے سعد کا کردار بہت پسند آیا۔ اس کے بعد عفت سحر طاہر کا ناول "بن مانگی دعا" اچھا جارہا ہے۔ عفت جی آپ نے ازمیر بٹ کے افسانے لکھنا کیوں چھوڑ دیے۔ اب بات ہوجائے "ماہ تمام" کے بارے میں۔ آخری قسط بہت اچھی لگی آمنہ جی! آپ نے مہک کی کچھ خاص بے عزتی نہیں کی۔ تنزیلہ ریاض کا ناول بہت اچھا جارہا ہے۔ "عہد الست" اور سائرہ رضا کا مکمل ناول "محبت داغ کی صورت" بھی پسند آیا۔

ج :۔ پیاری سعدیہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

اقراء ملک.... گوجرانوالہ

ماڈل بھی اچھی تھی اگر آپ ماڈل کے ڈریسز مکمل

دیر تو ہو گئی [illegible] فیشن کرے [illegible] ہوگئے۔ [illegible] سیریل [illegible] سے پہلے [illegible] تم [illegible] سب سے [illegible] تو [illegible] رشتہ [illegible] چھوڑ کر خود [illegible] چلے گئے اور [illegible] سے [illegible] کے ساتھ [illegible] رات کو [illegible] دوست [illegible] بہت شکریہ [illegible] دعا کی ہے اللہ مجھے [illegible] کرنے والا [illegible] آمین!

قارئین متوجہ ہوں!

1 خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں۔ تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2 افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کرسکتے ہیں۔

3 ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4 کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5 مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں۔ ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6 تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7 خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ادارہ خواتین۔ 37 اردو بازار کراچی۔

"بہن مانگی دعا" میں عفت سحر طاہر سے گزارش ہے کہ یہ سیریل جلد ختم کریں تو کہانی ہٹ ہوگی۔ ورنہ......

ج: پیاری اقرا! ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کو بہت اچھا ساتھی ملے۔ لیکن پیاری بہن! ایک بات ذہن نشین کرلیں۔ حقیقی زندگی کہانیوں سے قدرے مختلف ہوتی ہے۔ کہانیاں لفظوں کا کھیل ہوتی ہیں۔ ان میں ہر جذبے کا اظہار الفاظ کے ذریعے کیا جاتا ہے، جبکہ حقیقی زندگی میں جذبے تو ہوتے ہیں، لیکن ان کے اظہار کے لیے خوب صورت الفاظ نہیں ہوتے۔ یہاں جذبوں کا اظہار الفاظ سے نہیں عمل سے کیا جاتا ہے اور کبھی کبھی عمل سے بھی نہیں ہوپاتا کیونکہ زندگی کے تقاضے مسائل اور مصروفیات اتنی مہلت ہی نہیں دیتیں۔

نائلہ اصغر۔ حافظ آباد

میرا یہ پیغام صرف سائرہ رضا کے لیے ہے۔ "محبت داغ کی صورت" طویل ناول ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ ایک جملہ "میں اس کا حکم نہیں مانتا۔ میں نے انکار کی قسم کھائی ہے۔ لیکن اسے تو مانتا ہوں نا۔ روز حشر تک مومنوں کو بھٹکاتا رہوں گا۔ میں نے قسم کھائی ہے، مگر ان انسانوں کی کہانی سنو۔ میں تو ہوں ہی منکر۔ یہ سالے نہ تو منکری کا اقرار کرتے ہیں اور نہ ہی مانتے ہیں۔" یہ پورے ناول کی جان ہے۔ اسے پڑھا اور اپنے رب سے معافی طلب کی۔ سائرہ اللہ آپ کو جزائے خیر عطا کرے۔

ج: نائلہ ہماری دعائیں بھی سائرہ رضا کے ساتھ ہیں۔ اللہ ان کے قلم کو اور طاقت عطا فرمائے اور وہ ہمیشہ اسی طرح لکھتی رہیں۔

آمنہ شیرازی۔ آزاد کشمیر

خواتین بہت ہی منفرد ڈائجسٹ ہے۔ اس ماہ کی کہانیاں دل کو چھو گئیں۔

ج: بہت شکریہ آمنہ!

☼

خبریں و بریں

واصفہ سہیل



چھاپ

خوب صورت اداکارہ عائزہ خان کہتی ہیں کہ میں نے ہمیشہ معیاری ڈراموں میں ہی کام کیا ہے۔ اس وجہ سے میرے کام کو پسند کیا جاتا ہے۔ (ویسے تو آج کل ہر ڈرامے میں آپ نظر آرہی ہیں۔ اس لیے معیار؟) میں نے ہمیشہ وہی کردار کیے ہیں جو میں آسانی سے کرسکوں۔ (جی روتے دھوتے یا لڑتے جھگڑتے) سستی اور جلدی شہرت حاصل کرنے کی مجھے خواہش نہیں۔ (بھئی یہ جلدی اور سستی شہرت کا کیا مطلب ہے؟) میری اداکاری اور میرے کام نے مجھے نہ صرف ملک بلکہ بیرون ملک بھی شہرت سے نوازا ہے۔ (کون سے ممالک میں؟) میں ہمیشہ کردار لینے سے پہلے اسکرپٹ ضرور پڑھتی ہوں۔ (پھر بھی اندازہ نہیں لگا سکیں کہ آپ کے کرداروں میں یکسانیت آتی جارہی ہے۔) کوئی ایسا ویسا کردار کرکے میں اپنے کیریئر پر چھاپ نہیں لگانا چاہتی۔ (عائزہ کردار تو بس کردار ہوتا ہے 'یہ ایسا ویسا کیا ہوتا ہے؟) بامقصد ڈراموں میں کام میری اولین ترجیح ہے۔ (کسی ایک ڈرامے کا مقصد بتا دیں تو مانیں!)

سفر

اداکارہ میرا جو ہر جگہ ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں کہ کہیں تو کامیاب ہوجائیں لیکن...؟ اب سننے میں آیا ہے کہ حکومت سندھ نے اداکارہ میرا کو پولیو مہم کا ایمبسڈر مقرر کردیا ہے۔ (یعنی گرتی ہوئی دیوار کو...؟) میرا کہتی ہیں کہ یہ میرے لیے بہت اعزاز کی بات ہے۔ (اور پولیو کے لیے؟) کہ حکومت سندھ نے عوام میں پولیو کی آگاہی مہم کے لیے مجھے اعزازی سفیر چنا ہے۔ میں پولیو کے خاتمے کے لیے ہر ممکن اقدام میں تعاون کروں گی۔ (کس سے؟) پوری دنیا سے پولیو کی بیماری ختم ہوچکی ہے 'لیکن بدقسمتی سے پاکستان میں ابھی بھی پولیو کی بیماری ہے' جس کی وجہ سے بیرون ملک سفر سے قبل بچوں اور بڑوں کو پولیو کے قطرے پلانا لازمی قرار دے دیا گیا ہے۔ (میرا! کچھ یاد ہے کہ بیرون ملک جاتے ہوئے آپ کتنی مرتبہ پی چکی ہیں 'بھئی پولیو کے قطرے؟) میرا کی خواہش ہے کہ پولیو کو نصاب میں شامل کیا جائے 'تاکہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اس کے بارے میں معلوم ہوسکے۔ (میرا نصاب کی کتابیں پڑھی جاتی ہیں؟ سندھ میں تعلیم کی حالت شاید آپ کو پتا نہیں ہے۔ ورنہ) ہاں اگر آپ ٹی وی پر تشہیری مہم چلائیں تو شاید لوگوں پر کچھ اثر ہوجائے۔



مشن

راحت فتح علی خان کہتے ہیں کہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ فیصل آباد سے اٹھنے والی آواز آج پورے پاکستان ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں پسند کی جائے گی۔ کیونکہ میرا تو مشن تھا کہ میں اپنے چچا استاد نصرت فتح علی خان صاحب کی طرح قوالی میں بہت ترقی کروں اور میرے زیادہ تر چاہنے والے اس میں ہوں۔ میرا پہلا گانا لاگی تم سے من کی لگن۔ جس کی کمپوزیشن خان صاحب نصرت فتح علی خان نے ہی کی اور یہ وہ گانا ہے جو سپرہٹ ہوا۔ راحت فتح علی خان کہتے ہیں کہ میری بیوی میرے گھر کی کمانڈر ہیں۔ وہ میرا میرے گھر اور بچوں کا بہت خیال رکھتی ہیں۔

اکتاہٹ

فہد مصطفیٰ کافی عرصے سے ایک مارننگ شو کر رہے تھے اور خواتین کی نسبت وہ کافی بہتر انداز میں یہ شو کر رہے تھے۔ (ظاہر ہے فارغ جو تھے) لیکن اب وہ مارننگ شو کی روٹین سے تنگ آگئے ہیں۔ (تنگ آگئے ہیں یا پھر کام زیادہ مل گیا ہے؟) اور کوئی تخلیقی کام کرنا چاہتے ہیں۔ (جی فلم اور ٹی وی دونوں میں جو مصروف ہیں۔) فہد مصطفیٰ پورا چاند اور نامعلوم افراد نامی دو فلموں میں بھی کام کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ آج کل ایک پرائیویٹ چینل کے انعامی پروگرام کی میزبانی کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔ جو کہ فہد کی پرسنالٹی سے بالکل میچ نہیں کر رہا ہے۔ اس پروگرام میں فہد عجیب جھینپے جھینپے سے لگ رہے ہیں۔ (جی لیکن اماؤنٹ کے سامنے سب کی بولتی بند نہیں ہوتی، بلکہ چلنے لگتی ہے مزید تیز۔)

مثال

پاکستان کو بدنام کرنا ہو، مذاق اڑانا ہو، ہمارا میڈیا سب سے آگے نظر آتا ہے۔ (بین الاقوامی میڈیا کی بات تو جانے ہی دیں، ان کی نظر میں تو سارے ہی مسلمان دہشت گرد، خودکش بمبار ہیں۔) عورتوں پر تیزاب پھینکنے کے واقعات پر اب تک کتنے ہی پروگرام پیش کیے جا چکے ہیں۔ ہر چینل نے اس میں اپنا حصہ ڈالنا فرض سمجھا۔ ایک ڈاکومنٹری بنا کر بین الاقوامی ایوارڈ بھی حاصل کر لیا گیا۔ پوری دنیا کو بتایا گیا کہ پاکستانی دہشت گردی کے علاوہ یہ کام بھی بخوبی سرانجام دے سکتے ہیں۔ اساتذہ کی زیادتی اور مار پیٹ کے واقعات بھی بار بار دکھائے جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے پاکستان میں کوئی اچھا کام ہوتا ہی نہیں۔

لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے۔ پاکستانی قوم میں ایسے



لوگ بھی ہیں جو بے غرض ہو کر دوسروں کے لیے جان بھی دے سکتے ہیں۔ ایثار و قربانی کی ایسی ہی ایک مثال پچھلے دنوں سامنے آئی جب نصراللہ شجیع نے ایک بچے کو بچانے کے لیے اپنی جان دے دی۔

نصراللہ شجیع اسکول کے پرنسپل تھے۔ وہ اپنے اسکول کے بچوں کو لے کر پکنک منانے بالاکوٹ کے مقام پر دریائے کنہار کے کنارے گئے تھے۔ ایک بچہ پانی میں گر گیا تو —— نصراللہ شجیع نے لوگوں کے منع کرنے کے باوجود اپنے شاگرد سفیان کو بچانے کے لیے دریائے کنہار میں چھلانگ لگادی۔ یہ بھی نہ سوچا کہ انہیں تیرنا نہیں آتا۔ پانی کا تیز ریلا انہیں بہالے گیا۔ کسی دوسرے کے بچے کو بچانے کے لیے اپنی جان کی قربانی دینا ایک استاد کا یہ جذبہ قابل تحسین ہے۔

نصراللہ شجیع جماعت اسلامی کراچی کے رہنما تھے۔ کیا کسی چینل پر ایک پروگرام پیش کر کے پاکستان کا یہ چہرہ دنیا کو نہیں دکھایا جاسکتا یا کوئی ٹاک شو ہوتا' اس سے پہلے بھی جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والی ایک معلمہ نے جلتی ہوئی وین میں پھنسے اپنے شاگردوں کو بچانے کے لیے بھڑکتی آگ میں چھلانگ لگادی تھی۔ حالانکہ وہ خود نکل چکی تھیں 'لیکن بچوں کو بچانے کے لیے اپنی جان کی پروانہ کی۔ بچوں کو بچالیا' لیکن خود نہ بچ سکیں اس کا ذکر بھی میڈیا پر نظر نہ آیا۔ ظاہر ہے 'وہ ملالہ تو نہیں تھیں کہ ان پر پروگرام کیے جاتے' ٹاک شوز ہوتے 'اخبارات ۔۔ ایڈیشن شائع کرتے۔ اس دہرے معیار کو کیا کہا جائے؟

ذہنی تناؤ

فرانسیسی ماہرین کے مطابق رس سے بھرپور پھل تربوز اور خربوزہ ذہنی تناؤ کو کم کرنے میں کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ ایک تحقیق کے مطابق ان پھلوں کے رس اور گودے میں قدرتی طور پر ایسے اجزا موجود ہوتے ہیں جو نہ صرف ذہنی تناؤ کو کم کرتے ہیں' بلکہ اس کا مکمل طور پر خاتمہ بھی کر دیتے ہیں۔ تربوز اور خربوزے کے استعمال سے ذہنی تناؤ کش ادویات اور ان کے مضر اثرات سے بچاؤ بھی ممکن ہے۔

کچھ ادھر ادھر سے

★ فرانس جیفورے نے کہا تھا کہ جس شخص کے نظریات میں تعصب ہو' وہ ان کے دفاع میں حد سے زیادہ تشدد کرتا ہے۔ (ڈاکٹر ضیاء الدین خان)

اقبال نے کہا تھا کہ تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے لیکن یہ بات پرانی ہوگئی۔ رنگ' زبان اور نسل کی عصبیت آگے آگئی۔ اسی لیے روشنی کا شہر باطنی اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اب شہر خرابات میں ہر رند دلی ہے۔ (ڈاکٹر ضیاء الدین خان)

امارات ایرلائن نے طاہر القادری پر اپنی ایرلائن کے ذریعے سفر پر تاحیات پابندی لگانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ طاہر القادری کو امارات ایرلائن کی طرف سے قانونی کارروائی کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔ ایرپورٹ پر طیارہ اترنے کے بعد بھی طاہر القادری طیارے میں بیٹھے رہے انہوں نے نہ کسی کو اترنے دیا نہ کسی کو اندر آنے دیا۔ بلکہ جہاز کے دروازوں کے سامنے کھڑے ہو کر مسافروں کو اترنے سے روکتے رہے۔ امارات ایرلائن حکام کی رائے میں اس طرح سے طیارے کو روکے رکھنا اور اس میں بیٹھے رہنا ہائی جیکنگ کے زمرے میں آتا ہے۔

★ ٹرینوں کا راستے میں کھڑا ہو جانا تو معمول ہے اور چین کے انجن بھی ہانپ جاتے ہیں۔ شیخ رشید صاحب اپنے کارناموں کے بوجھ سمیت ٹرین میں سوار ہوتے تو جانے کس جنگل میں گاڑی رک جاتی۔ ایسی جگہ جہاں ذرا سا پانی بھی دستیاب نہ ہوتا لیکن شیخ رشید اسے سازش قرار دیتے۔ شیخ صاحب نے سانحہ لاہور کو جواز بنا کر اپنی لاج رکھ لی۔ میلہ سجا ہی نہیں رومال بھی بچ گیا 'چلیے پسینہ پونچھنے کے کام آئے گا۔ (بین السطور' جسارت)

آپ کا باورچی خانہ

حمیرا رضا

انتہائی مصروفیت کے دن گزارتے ہوئے اچانک چند دن فراغت کے میسر آئے تو خیال آیا کہ کیوں نا عرصے سے دل میں دبی خواہش پر عمل کرتے ہوئے آپ کا باورچی خانہ میں شرکت کی جائے۔

کھانا پکاتے ہوئے ہمیشہ پسند ناپسند کا خیال ہی رکھنا پڑتا ہے۔ اس بات کا تجربہ پچھلے گزرے ہوئے ایک ماہ میں ہوا' ابھی نئی نئی شادی جو ہوئی ہے (یہ سلسلہ حمیرا نے 2009 میں لکھا تھا جواب کاغذات کے ڈھیر سے دریافت ہوا ہے ___) جناب کوئی نئی چیز بنائی اور پسند نہ آئی تو انتہائی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ لہٰذا خاموشی سے سسرال کی روٹین کو اپنایا اور ان کے اشاروں پر چلنے لگی' کھانوں میں غذائیت اللہ نے رکھی تو ہاتھ میں ذائقہ امی کی طرف سے مل گیا۔ رہا صحت کا خیال تو جناب یہ خیال رکھنے کے لیے چاچو موجود ہیں۔ وہ ہی سبزیاں' دالیں' پھل۔ گھر میں زیادہ لاتے ہیں جو ان کی نظر میں صحت کے لیے زیادہ مفید ہیں (جبکہ میرے خیال میں قدرت کے کارخانے میں کوئی چیز ناکارہ یا بے کار نہیں)

2۔ مجھے ہمیشہ سے ہی اچانک آنے والے مہمان متاثر کرتے ہیں۔ اپنی عزیز ترین ہستیوں سے اچانک ملنے کی خوشی میرے اندر بجلی کی سی تیزی اور پھرتی پیدا کر دیتی ہے۔ اور وہ کام جو کچھ دیر پہلے میں سستی اور بیزاری سے کر رہی ہوں۔ زبردست طریقے سے پایہ تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں۔ لہٰذا کسی بھی انداز میں مہمانوں کی آمد پریشان کن نہیں لگتی۔ مہمانوں کی تواضع موسم اور وقت کے اعتبار سے پکنے والے کھانوں سے کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں "دھواں گوشت" خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ جھٹ پٹ تیار ہونے والی لذیز ترین ڈش ہے۔ اسے کھانے کے بعد مہمان انگلیاں چاٹتے رہ جاتے ہیں۔

دھواں گوشت

ترکیب:

چکن	ایک کلو
مناسب سائز کے ٹکڑوں میں کٹی ہوئی	
دہی	ایک پاؤ
پیاز	ایک درمیانہ سائز باریک کٹا ہوا
لہسن	ایک کھانے کا چمچ
سرخ مرچ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
پسا دھنیا	ایک چائے کا چمچ
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچ
ہلدی	ایک چائے کا چمچ
تیل	ایک کپ
آلو	آدھا کلو
مناسب سائز میں کٹے ہوئے	

ترکیب

ایک باؤل میں چکن دہی' پیاز' لہسن' سرخ مرچ' نمک' پسا دھنیا' سفید زیرہ' ہلدی ڈال کر تقریباً آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اب پتیلی میں تیل گرم کریں اور اس تمام آمیزے کو اس میں ڈال کر ڈھکن سے اس وقت تک کے لیے ڈھک دیں' جب تین حصے دہی خشک ہو جائے اب مناسب سائز میں کٹے ہوئے آلوؤں کو اس میں ڈال کر پندرہ سے بیس منٹ تک دم دیں' تیار ہونے پر کوئلے کا دھواں دے دیں۔ مزیدار "دھواں گوشت" تیار ہے۔ پھلکوں کے ساتھ پیش کریں اور داد سمیٹیں۔

3۔ شادی سے پہلے کچن کی صفائی کے لیے کبھی خصوصی اہتمام نہیں کیا خیر سے روز کی صفائی ہی اتنا دل لگا کر کیا کرتی تھی کہ تفصیلی یا خصوصی صفائی کے لیے مزید اہتمام کی گنجائش باقی نہیں بچتی تھی۔ امی کے گھر میں خود ہی صفائی ستھرائی کرتی تھی سسرال میں ماسی کے سر پر کھڑے ہو کر صفائی کرواتی ہوں لیکن بات وہیں آجاتی ہے کہ اپنے ہاتھ سے کی جانے والی صفائی ہی دل کو مطمئن کرتی ہے۔ سنک میں گندے برتن پڑے ہوں اور مجھے کوکنگ کرنی پڑے تو وحشت گھیر لیتی ہے۔ ماسی کا انتظار کیے بغیر برتن دھونا شروع کر دیتی ہوں۔ بس پر بچاری ٹی روکتے ہی رہ جاتے ہیں۔ رات کے جھوٹے برتن ماسیوں کے آسرے پر چھوڑنا زہر لگتا ہے۔ ویسے بھی بقول میری امی کے برکت اٹھ جاتی ہے۔

4۔ ناشتے کی بھی خوب کہی اسکول' کالج' یونیورسٹی تک پتا ہی نہ تھا کہ ناشتا آخر ہوتا کیا ہے؟ خالی پیٹ جانا (اپنی مرضی سے ورنہ امی تو ہمیشہ ناشتہ پیچھے لے کر بھاگا کرتی تھیں اور ہم آگے آگے) اب یہ عادت انتہائی پختہ ہو چکی ہے تو بارہ ایک بجے تک بھوک کا احساس ہی نہیں ہوتا اس کے باوجود سب کا ساتھ دینے کے لیے ناشتہ کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں ہفتے کے سات دن مختلف ناشتہ تیار ہوتا ہے۔ کبھی پراٹھے انڈے تو کبھی سالن روٹی' کبھی سلائس جیم' کبھی بالائی پراٹھا' کبھی رات کے بنے دال چاول آلو کے پراٹھے تو کبھی مولی کے پراٹھے' کبھی گوبھی دال کے پراٹھے غرض کہ بندھی روٹین نہیں ہے ہماری اور جہاں تک میری بات ہے تو میں انڈے پیاز کا سالن روٹی کے ساتھ کھا کر خوش رہتی ہوں۔ ناشتے کے بعد چائے کا کپ لازمی ہے۔ میں سب کچھ ہی اچھا بناتی ہوں یہ چیزیں تو ہمارے گھر کا حصہ ہیں لہٰذا سب ہی بنانا جانتے ہیں اس لیے ترکیب نہیں دے رہی۔

5۔ کھانا گھر سے باہر کھانا میری نظر میں فیشن سے زیادہ اسٹیٹس سمبل بنتا جا رہا ہے۔ شادی سے پہلے تو اکثر بڑے بھائی کے ساتھ ہم گھر والے باہر جا کر کھانا کھا آتے تھے خاص طور پر عید کے دوسرے تیسرے دن تو لازماً" باہر ہی کھانا کھاتے تھے۔ بازاروں میں شاپنگ کرتے ہوئے بھی بہت کچھ کھایا اور انجوائے کیا۔ چونکہ شادی نئی نئی ہے لہٰذا تقریباً" روزانہ ہی باہر جا کر کچھ نہ کچھ کھا لیتے ہیں اور جس دن باہر کچھ نہیں کھا رہے ہوتے تو اس دن گھر پر دعوت کے مزے اڑائے جاتے ہیں ہاہاہا۔

6۔ یہ سب سے اہم سوال کیا ہے آپ نے بھلا بے موسمی کھانے بھی لذت دے سکتے ہیں۔ قطعاً" نہیں۔ کھانا ہمیشہ موسم کو مدنظر رکھ کر ہی پکایا جاتا ہے ایک تو یہ صحت کے حوالے سے بہتر ہے دوسرا میرے جیسا بندہ تو صدمے سے ہی مر جائے گرمیوں میں سردی اور سردی میں گرمی کے کھانے کھا کر۔

7۔ دیکھئے جناب عمر تو میری سولہ سال ہے (ہاہاہا سفید جھوٹ ہے مگر پھر بھی یقین کر لیں میرا سیروں خون بڑھ جائے گا ویسے بھی ڈاکٹر نے مجھے خون کی کمی کا بتایا ہے) مگر تجربہ پچاس سالہ ہے کہ جب بھی کھانا جلدی اور افراتفری میں بنا سب نے ہی منہ بسورا' سو سو کیڑے نکالے گئے لعن طعن کی گئی (یہ باتیں ماضی قریب کی ہیں) اور جب جب محنت اور جانفشانی سے پکایا تعریف کسی نے نہیں کی اور پتیلیوں کی پتیلیاں چاٹ گئے معاملات اس حد تک خراب ہوئے کہ پکانے والی (یعنی کہ مجھے) کو آخر میں اپنے لئے کبھی انڈا تلنا پڑا تو کبھی کچھ نہ بچنے کی صورت میں غصہ پینا پڑا یعنی ہر دو صورتوں میں میں نے ہی نقصان اٹھایا۔ اس کے باوجود محنت سے بنا کھانا ہی اچھا لگتا ہے میں بھی محنت اور خوشی سے پکاتی ہوں اور انجوائے کرتی ہوں۔

ارے یاد آیا میرے ہاتھ کے بنے پراٹھوں کے بڑے بھائی دیوانے ہیں اور اب جبکہ میں امی کی طرف آئی ہوئی ہوں تو فرمائش کر کے بنواتے ہیں۔ اس کے علاوہ امی چائنیز رائس کی عاشق ہیں وہ بھی میرے ہاتھوں کے۔

8۔ عام حالات میں ہزاروں ٹپس یاد رہتی ہیں اب موقع پر ایک ٹپ یاد نہیں آ رہی جو یاد ہیں وہ بارہا بتائی جا چکی ہیں لہٰذا پھر کبھی سہی۔

عید منائیں... ہمارے ساتھ

صبا سحر

گلاب جامن

ضروری اجزا :

خشک دودھ	دو کپ
میدہ	ایک کھانے کا چمچہ
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
انڈا	ایک عدد
گھی	ایک کھانے کا چمچہ
چینی	دو کپ

ترکیب :

خشک دودھ میں میدہ' بیکنگ پاؤڈر اور گھی مکس کریں۔ اور انڈے سے گوندھ لیں اور چھوٹی چھوٹی بالز بنا کر ہلکے گرم تیل میں ہلکی آنچ پر فرائی کریں۔ گولڈن کلر آجائے تو پہلے سے تیار شیرے میں ڈال کر پکائیں۔ گلاب جامن پھول جائیں تو الائچی پاؤڈر ڈالیں اور ڈش میں نکال کر بادام کی ہوائیاں چھڑک دیں۔

چکن چوکور

ضروری اجزا :

مرغی کا قیمہ	ایک کپ
آلو ابلے ہوئے	دو عدد
سرخ مرچ' کالی مرچ	آدھا' آدھا چائے کا چمچہ
سموسے کی پٹیاں	دس عدد
نمک' تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

فرائنگ پین میں تیل گرم کرکے قیمہ اور ایک چمچہ لہسن ادرک پیسٹ ڈال کر بھونیں۔ قیمہ کی رنگت تبدیل ہو جائے تو مرچیں ڈال کر خوب بھونیں۔ جب روغن اوپر آجائے تو اتار لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر آلو ہری مرچ' ہرا دھنیا اور ایک پیاز چوپ کرکے مکس کر دیں۔ سموسے کی پٹیوں کو چوکور کاٹ لیں۔ ایک حصہ کے اوپر قیمہ اور آلو والا آمیزہ رکھیں۔ اس کے اوپر دوسرا حصہ رکھ کر کناروں کو میدے کی لئی سے اچھی طرح چپکا دیں اور گرم گہرے تیل میں سنہری ہونے تک تلیں۔ کیچپ کے ساتھ منفرد اور مزے دار چکن چوکور سے افطار کا لطف دوبالا کریں۔

چکن کٹلس

ضروری اجزا :

چکن	آدھا کلو
سفید سرکہ	دو کھانے کے چمچے
آلو	آدھا کلو
انڈے کی سفیدی	دو عدد
بریڈ کرمبز	ایک کپ
نمک	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

بغیر ہڈی کا چکن دھو کر تھوڑے سے پانی میں ابال لیں۔ پھر ٹھنڈا کرکے چوپر میں پیس لیں۔ ابلے ہوئے آلوؤں کا بھرتہ بنالیں اور چکن میں مکس کر دیں۔ ساتھ ہی سرکہ' کالی مرچ' سرخ مرچ' نمک' ہرا مسالا اور بھنا ہوا پسا زیرہ شامل کر دیں اور تھوڑی دیر رکھ کر گول کٹلٹس بنالیں۔ اب ان کو ایک ایک کرکے پہلے انڈے کی سفیدی میں ڈبوئیں' پھر ___ بریڈ کرمبز میں لپیٹیں پھر ___ گرم تیل میں تل لیں۔ گولڈن براؤن ہو جائیں تو ٹشو پیپر پر نکالیں اور چلی سوس یا املی کی چٹنی کے ہمراہ پیش کریں۔

ویجی ٹیبل رولز

ضروری اجزا :

بند گوبھی' شملہ	ایک' ایک عدد
ہری پیاز' گاجر	ایک ایک کپ
چائنیز نمک	آدھا چائے کا چمچہ
سویا سوس	ایک کھانے کا چمچہ
لہسن	ایک کھانے کا چمچہ

رول کی پٹیاں	حسب ضرورت
انڈا	ایک عدد
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

تیل گرم کرکے اس میں لہسن اور پیاز فرائی کریں، پھر اس میں [illegible] کے ساتھ ہرا دھنیا، ہری مرچیں، نمک، [illegible] مرچ، چائنیز نمک، سویا ساس ڈال کر [illegible] کے بعد ٹھنڈا کرکے رول کی پٹیوں میں بھر کر [illegible] سے چپکائیں اور گرم تیل میں فرائی کرلیں۔ [illegible] کیچپ یا چٹنی کے ساتھ [illegible] کریں۔

چکن سموسے

ضروری اجزا :

مرغی کا قیمہ	آدھا کلو
[illegible]	[illegible]
[illegible]	چار عدد
[illegible]	آدھا کپ
چلی ساس، سویا ساس	چار چار کھانے کے چمچے
سموسے کی پٹیاں	حسب ضرورت
انڈے	تین عدد
نمک، تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

دو عدد انڈوں کو سخت ابال کر چھیل لیں اور چوپ کرلیں۔ فرائنگ پان میں تیل گرم کرکے اس میں ایک چمچہ لہسن ادرک پیسٹ ڈال کر فرائی کریں۔ اس کے بعد قیمہ، نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر، چائنیز نمک اور دو کھانے کے چمچے سویا ساس ڈال کر درمیانی آنچ پر بھونیں پھر اس میں ہری پیاز، بند گوبھی، ہرا دھنیا اور ہری مرچیں ڈال کر تین سے چار منٹ تک فرائی کریں۔ آخر میں چوپ کیے ہوئے انڈے اور بقیہ سویا ساس، چلی ساس ڈال کر مکس کریں اور آمیزے کو پلیٹ میں نکال کر رکھیں۔ آمیزہ ٹھنڈا ہوجائے تو اسے سموسے کی پٹیوں میں بھریں۔ ایک انڈا پھینٹ کر سموسے کی پٹیوں کے کنارے پر لگائیں اور گرم تیل میں سنہری ہونے تک تلیں اور افطار کا لطف بڑھائیں۔

رس ملائی

ضروری اجزا :

دودھ	ایک کلو
خشک دودھ، چینی	ایک کپ
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
انڈا	ایک عدد
گھی	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب :

دودھ میں چینی، چند دانے الائچی اور بادام پستے ڈال کر ابال لیں۔ سوکھے دودھ میں بیکنگ پاؤڈر، انڈا اور گھی ملا کر (گھی اگر جما ہوا سخت ہو تو زیادہ اچھا ہے) گوندھ لیں۔ ہاتھ چکنا کرکے چھوٹی چھوٹی ٹکیہ بنالیں۔ جب دودھ میں جوش آجائے تو درمیانی آنچ کرکے ساری ٹکیہ ڈال دیں اور وقفے وقفے سے پتیلی ہلاتے رہیں۔ دس منٹ بعد یہ پھول جائیں گی۔ دودھ گاڑھا ہوجائے تو اتار لیں اور ٹھنڈا کرکے پیش کریں۔

چاول کے کرسپیز

ضروری اجزا :

چاول پسے ہوئے	ڈیڑھ کپ
بیسن	آدھا کپ
زیرہ، سرخ مرچ	ایک ایک چائے کا چمچہ
گھی	ایک چوتھائی کپ
کوکونٹ ملک	ایک کپ

ترکیب :

ایک بڑے برتن میں تمام اجزا تھوڑے سے پانی کے ساتھ مکس کرلیں۔ آمیزہ بہت زیادہ گاڑھا ہو نہ بہت زیادہ پتلا۔ کسی صاف کپڑے یا تھیلی میں آمیزہ ڈال کر چھوٹا سا سوراخ کردیں۔ اگر آپ اس پوٹلی کو سنبھال سکیں تو ٹھیک ہے ورنہ اس میں سوراخ کرکے کوئی پتلا سا پائپ یا ٹیوب لگادیں جس سے آمیزہ نکل سکے۔ گرم اور گہرے تیل میں جلیبیوں کی طرح آمیزہ ڈالیں۔ کرسپیز کا شیپ آپ اپنی مرضی سے بنا سکتے ہیں۔ سنہرے ہوجائیں تو ٹشو پیپر پر نکال لیں۔ اوپر سے نمک چھڑک کر کیچپ کے ساتھ افطار پہ ایک نئی ترکیب متعارف کروائیں۔

آم کی لسی

ضروری اجزا :

بڑے آم	چار عدد
دہی، دودھ	ایک، ایک پاؤ
چینی	آدھا کپ
نمک	ایک چٹکی
پودینہ	چند پتے

ترکیب :

آم چھیل کر ٹکڑے کاٹ لیں۔ گٹھلیاں نکال دیں۔ بلینڈر میں آم، دودھ، دہی، چینی اور نمک ڈال کر بلینڈ کر لیں۔ برف ڈال کر ایک بار پھر بلینڈ کریں۔ گلاس میں نکالنے کے بعد پودینے کے پتوں سے سجاوٹ کر کے پیش کریں۔

بنارسی سویاں

ضروری اجزا :

سویاں	ایک پاؤ
چینی	ڈیڑھ پاؤ
گھی	دو کھانے کے چمچے
بادام	حسب ضرورت

ترکیب :

ساس پان میں چینی اور ایک گلاس پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے رکھ دیں۔ دوسری طرف الگ برتن میں گھی ڈال کر سویاں ہلکی آنچ پر بھون لیں۔ جب ایک تار کا شیرہ تیار ہو جائے تو اس میں سویاں ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ پانچ منٹ کے بعد اتار کر ڈش میں نکال لیں اور کترے ہوئے بادام اور کھویا چھڑک کر پیش کریں۔ مزے دار بنارسی سویاں تیار ہیں۔

رس گلے

ضروری اجزا :

خالص دودھ	ایک کلو
کھویا	ایک چھٹانک
میدہ	آدھا پاؤ
چینی	آدھا کلو
پھٹکری	ایک چٹکی

ترکیب :

دودھ کو پکنے کے لیے رکھ دیں۔ ابال آجائے تو پھٹکری ڈال دیں۔ دودھ پھٹ جائے تو اتار لیں اور نتھار کر پنیر بنا لیں۔ اب اس میں کھویا اور میدہ ملا کر ایک گھنٹہ تک خوب مکس کریں۔ جتنا زیادہ اچھا مکس کریں گی، اتنے ہی نرم اور رسیلے ہوں گے۔ رس گلوں کا شیپ دیں۔ درمیان میں سبز الائچی کے دانے ڈالتے جائیں۔ چینی میں پانی ملا کر پتلا سا شیرہ بنا لیں۔ پھر رس گلے ڈال کر چولہے پر چڑھا دیں۔ پھول جائیں تو اتار لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر پیش کریں۔

مسور کی دال کے کٹلس

اجزا :

مسور کی دال	ایک کپ
سوجی	دو کھانے کے چمچے
انڈا	ایک عدد
بریڈ کرمبز	حسب ضرورت
پنیر	تین چوتھائی کپ
لہسن پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

دال بھگو کر پیس لیں۔ پھر اس میں سوجی، نمک، پنیر، زیرہ، لہسن پیسٹ، ہرا دھنیا، ہری مرچیں اور پسی سیاہ مرچ مکس کر دیں۔ تھوڑی دیر رکھ کر اس کے کٹلس بنا لیں۔ پہلے انڈے میں ڈبوئیں، پھر بریڈ کرمبز میں رول کریں پھر گرم تیل میں ڈال کر خستہ کر لیں اور افطار پہ چٹنی یا کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔



سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- رانیہ
میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافر ---------- موسیٰ رضا

عدنان

نفسیاتی اَزدواجی اُلجھنیں

شاہدہ نور' ملتان

س : ہم چھ بہنیں ہیں۔ اس کے بعد دو بھائی ہوئے۔ یہ بھی بدنصیبی ہی کہیے کہ...... بہنوں کے درمیان بہت کم وقفہ ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب بہنیں تقریباً" ایک ساتھ بڑی ہو ئیں ہمارے ہاں جوائنٹ فیملی سسٹم ہے۔ ابو سب سے بڑے ہیں باقی بہن بھائی چھوٹے ہیں۔ ہم بہنیں ابو پر بوجھ نہیں تھیں لیکن باقی سارا خاندان ان کے لیے پریشان تھا کہ جلد از جلد رشتہ کردیا جائے۔ ویسے بھی ابو بیمار رہتے تھے۔ باقاعدہ نوکری بھی نہیں کرپاتے تھے۔ ہم بہنیں زیادہ تعلیم بھی نہیں حاصل کرسکیں۔ جو بھی رشتہ آتا۔ سارا خاندان ابو پر زور دیتا کہ رشتہ کردیں۔ بڑی بہن معمولی شکل و صورت کی ہیں جبکہ باقی بہنوں کا رنگ صاف اور نقوش اچھے تھے۔ جو بھی رشتہ دار تھے' انہوں نے چھوٹی بہنوں کے لیے رشتہ دیا۔ ابو یہ نہیں چاہتے تھے کہ بڑی بہنوں سے پہلے چھوٹی بہنوں کی شادی ہو' لیکن رشتہ داروں کے ہاتھوں مجبور ہو گئے' یوں یکے بعد دیگرے چار چھوٹی بہنوں کی شادیاں ہو گئیں۔ بڑی بہن احساس کمتری کا شکار ہو کر مزید مرجھاتی گئیں۔ اس وقت ان کی عمر 35 سال ہے لیکن وہ چالیس سال کی نظر آتی ہیں۔ اس پر خاندان والوں کی باتیں' ہر کوئی ترس کھاتا ہے۔

بڑے چچا کا بیٹا جو تقریباً" ان کا ہم عمر ہے میٹرک پاس ہے۔ مکینک ہے۔ اچھا کام جانتا ہے چچا نے اس کے لیے بہن کا رشتہ دیا ہے۔ بہن رضامند ہیں۔ وہ لڑکا بھی انہیں پسند کرتا ہے۔ مسئلہ صرف ایک ہے کہ وہ کہیں بھی ٹک کر کام نہیں کر پاتا۔ دوسرے اس کو نشہ کرنے کی عادت ہے۔ چچا کہتے ہیں وہ نشہ کرنا چھوڑ دے گا۔ ابو نے انکار کیا تو بہن بہت ناراض ہوئیں اور احتجاجا" کھانا چھوڑ دیا۔ وہ کہتی ہیں۔ آپ شادی کردیں' آگے میرا نصیب جبکہ ابو کا کہنا ہے۔ شادی کے بعد اگر نہ نبھ سکی تو پھر زیادہ مسئلہ ہوگا۔

ج : نشہ کی عادت چھوڑی جاسکتی ہے' لیکن اس کے لیے مضبوط قوت ارادی کی ضرورت ہے۔ نشہ چھوڑنا مشکل ضرور ہے۔ ناممکن نہیں۔ پہلے تو یہ جائزہ لینا ہوگا کہ وہ لڑکا واقعی نشہ چھوڑنا چاہتا ہے اگر وہ نشہ چھوڑنا چاہتا ہے تو اس کو کچھ وقت دیں اگر اس دوران وہ نشہ چھوڑ دے تو پھر شاید آئندہ بھی ایسا کرسکتا ہے' دوسری صورت میں تو بہتر یہی ہے کہ کسی دوسرے رشتے کا انتظار کرلیا جائے۔ شادی نہ ہونا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے جتنا شادی ہونے کے بعد ٹوٹ جانا کیونکہ اس دوران اگر بچے ہوجائیں تو ان کا بھی مسئلہ ہوتا ہے۔

نشہ کے عادی ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں ایک بہت بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ وہ ٹک کر کام نہیں کرتا۔ ایسی صورت میں وہ بیوی بچوں کا بوجھ کیسے اٹھائے گا۔

بہن کو سمجھائیں۔ انہیں اچھی کتابوں کے مطالعہ کی جانب راغب کریں۔ ممکن ہو تو ان سے کہیں کہ وہ پڑھائی کا سلسلہ پرائیویٹ طور پر شروع کریں یا سلائی کڑھائی کا کوئی ہنر سیکھ لیں' اس سے انہیں مصروفیت بھی ملے گی اور آمدنی کا ایک ذریعہ بھی ہوسکتا ہے۔

انیلا' کراچی

ج : پیاری بہن! واقعی یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ اس صورت میں جبکہ خاندان میں بھی آپ کے رشتہ کی بات پھیل چکی تھی۔ لیکن آپ کے سامنے پوری زندگی پڑی ہے ـــــ کوئی فیصلہ تو آپ کو کرنا ہوگا۔ ایک ایسے شخص کے نام پر آپ اپنی

قیمتی زندگی برباد نہیں کر سکتیں؟ جس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ اپنی ناپسندیدگی ظاہر کر سکتا۔ اس نے آپ کے اتنے قیمتی سال برباد کرا دیے۔ ویسے بھی دنیا میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں جس کے لیے، جس کی محبت میں انسان اپنی زندگی جو ایک بار ملتی ہے تباہ کر لے۔ تایا کی خاموشی بہت کچھ کہہ رہی ہے۔ وہ سب کچھ جانتے ہیں پھر بھی اگر کوئی شک ہے تو آپ کے والد اس لڑکے کو فون کریں اور اس سے صاف صاف بات کریں۔ اگر واقعی وہ شادی کر چکا ہے تو بہتر ہے کہ آپ بھی اپنی زندگی میں آگے بڑھیں اور اپنے بارے میں سوچیں۔

ایک بات پورے یقین سے کہی جا سکتی ہے اور بے شمار تجربات اور مشاہدات نے اسے ثابت بھی کیا ہے۔ دل کے رشتے بہت دیر تک نہیں قائم رہتے۔ آپ اپنی زندگی کے بارے میں والدین کا فیصلہ قبول کر لیں۔ نئی زندگی شوہر اور بچوں میں آپ اس وابستگی کو بھول جائیں گی بلکہ ایک وقت آئے گا کہ اس لگاؤ کے بارے میں سوچ کر آپ کو ہنسی آئے گی۔

ش'ن۔ گجرات

شادی کو تین سال ہونے والے ہیں۔ ڈیڑھ سال کی بیٹی ہے اور سسرالی لڑائی جھگڑے کی وجہ سے تین ماہ سے میکے آئی ہوئی ہوں۔ لڑائی عام گھریلو باتوں سے شروع ہوئی اور اتنی بڑھی کہ مجھے میکے آنا پڑا۔

لڑائی کے دوران نند نے میرے والد صاحب کو بھی برا بھلا کہا اور کہا کہ میری ماں کی قسمت خراب ہے، جو تم جیسی بہو بیاہ کر لے آئی ہیں۔ جس پر والد صاحب کو غصہ آیا اور انہوں نے کہا کہ میرے شوہر مجھے لینے کے لیے نہ آئیں۔ میرے ہسبنڈ ایک ڈیڑھ ماہ تک مجھے لینے آنے کے لیے اصرار کرتے رہے لیکن اب وہ بھی فون آف کر کے ناراض ہو گئے ہیں۔

میں اعلا تعلیم یافتہ ہوں جبکہ میرے شوہر صرف میٹرک ہیں جاب کرنا چاہتی ہوں لیکن اصلی اسناد ہسبنڈ کے پاس ہیں۔ لیکن اب انہوں نے فون ہی بند کیا ہوا ہے اور اسناد بھی ان کے پاس ہیں۔

میری ساس ——— نے اپنے چھوٹے بیٹے، بیٹی کا رشتہ میرے بھائی اور میرے ساتھ کرنا چاہا تھا۔ میرے بھائی کی رضامندی نہیں تھی۔ اس طرح چھوٹی نند کا بیاہ اس کی پھپھو کے گھر ہوا لیکن اس نے ادھر سے طلاق لے لی اور ایک اور جگہ شادی کی وہ ادھر بھی اتنی خوش نہیں ہے۔ جس بنا پر میری ساس مجھے اتنا اچھا نہیں سمجھتی ہیں۔

خدارا مجھے کوئی اچھا مشورہ دیں، جس سے میری پریشانی دور ہو اور میرا گھر بھی بس جائے۔

ج:۔ اچھی بہن! آپ کا مسئلہ ہمارے گھروں کا عام مسئلہ ہے۔ رشتہ داروں میں شادیاں ہوں تو اس طرح کے مسائل زیادہ سامنے آتے ہیں۔ آپ کی خالہ کو غصہ ہے کہ ان کی بیٹی کا رشتہ آپ کے بھائی سے نہیں کیا گیا۔ وہ الٹی سیدھی باتیں کر کے یہ غصہ نکالتی ہیں۔ پھر ان کی بیٹی اپنے گھر میں خوش نہیں ہے تو اس وجہ سے اور زیادہ غصہ آتا ہے۔

آپ کے والد صاحب کو یہ غصہ ہے کہ ان لوگوں نے آپ کے سامنے انہیں برا بھلا کہا۔ صورت حال یہ ہے کہ دونوں غصے میں کچھ نہیں سوچ رہے ہیں، اب فیصلہ آپ کو کرنا ہے اگر آپ اپنے شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی ہیں تو اپنے کسی بہن بھائی سے یا کزن سے بات کریں۔ وہ آپ کے شوہر سے مل کر انہیں سمجھائیں کہ وہ دوسروں کی باتوں میں آ کر اپنا گھر برباد نہ کریں۔ اپنی بیٹی کا خیال کریں اور آپ کو لینے کے لیے آ جائیں۔ آپ کے والد صاحب نے غصہ میں کچھ کہہ دیا تو غصہ میں کہی گئی باتوں کا اثر نہیں لینا چاہیے۔

دوسری صورت میں تو پھر ایک ہی راستہ ہے۔ علیحدگی کا راستہ لیکن یہ راستہ اتنا آسان نہیں ہے کیونکہ آپ کی بیٹی بھی ہے۔ اسے ماں کے ساتھ ساتھ باپ کی بھی ضرورت ہے اسناد کی تو ڈپلی کیٹ نکلوائی جا سکتی ہے لیکن دنیا میں کوئی بھی دوسرا شخص آپ کی بیٹی کا باپ نہیں ہو سکتا اگر آپ کے شوہر آپ کے ساتھ اچھے ہیں اور آپ کو ان سے کوئی شکایت نہیں ہے تو بہتر ہے کہ آپ اپنا گھر بچائیں۔ بڑوں کی لڑائی میں اپنا گھر توڑنا دانش مندی نہیں ہے خصوصاً اس صورت میں جبکہ آپ ایک بیٹی کی ماں بھی ہیں۔





بیوٹی بکس

امت الصبور

ارم بتول۔۔۔ کراچی

س : گرمی کے موسم میں میرے چہرے کا رنگ سنولاتا جاتا ہے۔ جلد مرجھائی ہوئی نظر آتی ہے لیکن سب سے زیادہ جو مسئلہ ہوتا ہے وہ کیل ہیں۔ ان کی وجہ سے چہرے کا رنگ زیادہ کالا نظر آتا ہے۔ کوئی ایسی ترکیب بتائیں جس سے چہرہ نکھرا ہوا نظر آئے اور کیلوں سے نجات مل جائے۔

ج : گرمی میں چہرے کی جلد بہت متاثر ہوتی ہے۔ جلد کے مسام چکنائی زیادہ خارج کرنے لگتے ہیں جو جم کر کیل بن جاتے ہیں۔ کیلوں سے نجات اور چہرے کی رونق اور جلد کی تازگی کے لیے کچھ نسخے دیے جا رہے ہیں۔ اس سے دوسری بہنیں بھی استفادہ کر سکتی ہیں۔

چہرے کا اچھی طرح مساج کرنے اور پھر بھاپ دینے سے کیلوں سے نجات خاصی حد تک ممکن ہے۔ چہرے پر کوئی بھی اچھا موئسچرائزر لگا کر دس منٹ تک اچھی طرح مساج کریں۔ اس کے بعد بھاپ لیں۔ بھاپ لینے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی بھی دیگچی میں پانی کھولا کر اسے چولہے سے اتار لیں۔ پھر سر پر تولیہ پھیلا کر اپنا چہرہ دیگچی سے اڑتی ہوئی بھاپ کے سامنے اس طرح کر لیں کہ ساری بھاپ چہرے پر آئے۔ پانچ منٹ بعد تولیہ نیم گرم پانی میں بھگو کر اس سے ہلکے ہاتھوں سے چہرہ رگڑیں۔ خاص طور پر وہ جگہیں جہاں بلیک ہیڈز موجود ہوں۔ ہلکے ہاتھوں سے بلیک ہیڈز دبائیں۔ وہ باہر نکل آئیں گے۔ پھر چہرہ تولیے سے صاف کر کے ٹھنڈے پانی سے دھو لیں اور برف کا ایک ٹکڑا لے کر چہرے پر پھیر لیں۔ اس سے آپ کی جلد کے وہ مسام بند ہو جائیں گے، جو بھاپ لینے سے کھل گئے تھے۔ اس کے بعد چاہیں تو دس منٹ کے لیے کوئی اچھا سا ماسک لگا لیں۔

ماسک نہیں ہے تو چہرے پر ٹماٹر کا گودا لگا لیں۔ دس منٹ بعد سادہ پانی سے چہرہ دھو لیں۔ منہ دھونے کے لیے کوئی معیاری فیس واش یا بیسن استعمال کریں۔

تھوڑے سے دہی میں تھوڑا سا بیسن ملا لیں۔ چہرے پر لیپ لیں۔ دس منٹ بعد سادہ پانی سے چہرہ دھو لیں۔ کھانے کا ایک چمچہ سرکہ لے کر اس میں لیموں کا رس نچوڑ لیں۔ روئی کی مدد سے اسے چہرے پر جہاں جہاں بلیک ہیڈز موجود ہوں لگائیں۔ دس منٹ بعد چہرہ سادہ پانی سے دھو لیں۔

چہرے کی صفائی کا خاص خیال رکھیں۔ دن میں پانچ، چھ مرتبہ چہرہ صاف پانی سے دھوئیں۔ دودھ یا بالائی میں چند قطرے لیموں کا رس ملا کر چہرہ رگڑ کر صاف کر لیں۔ پھر سادہ پانی سے دھو لیں۔ چہرے پر شہد لگائیں۔ پندرہ منٹ بعد سادہ پانی سے دھو لیں۔ شہد میں جراثیم کش خصوصیت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ بلیک ہیڈز کے لیے اکسیر ہے۔

پودینے کی تازہ پتیاں پیس کر چہرے پر لگا لیں۔ پندرہ منٹ بعد سادہ پانی سے دھو لیں۔ جلد کی رنگت کھل اٹھے گی۔

دو چمچے دہی میں چند قطرے سرکے کے ملائیں اور ہلکا سا مساج کر کے لیپ کر لیں۔ خشک ہو جائے تو سادہ پانی سے دھو لیں۔ چہرے کی جلد کے لیے بہترین ہے۔

☆